ادب اور تہذیب کا باشعور ترجمان

گفتگو

سہ ماہی

۴

مدیر .... سردار جعفری

سالانہ چندہ .... بیس۲۰ روپے

قیمت فی جلد چھ۶ روپے

بیرون ہند (معہ ڈاک خرچ بذریعہ رجسٹری) پچاس شلنگ

مقام اشاعت — ۲۰. کھیتان بھون. جے ٹاٹا روڈ. بمبئی ۱

طباعت: یونیورسل لیتھو پریس. ۲۳. نوروجی اسٹریٹ بمبئی ۲

مالک ایڈیٹر پرنٹر پبلشر سردار جعفری

جنوری، فروری، مارچ سنہ ۱۹۶۸ء

عنوانِ گفتگو

پیش گفتار

غالب کا صد سالہ جشن

مشاہیر سے ملاقات

ایک غزل ایک نظم

ناول

تین نظمیں

تاریخی داستان

تین غزلیں چار نظمیں

مضامین

تین نظمیں

افسانے

جشنِ انقلاب

پانچ غزلیں

پانچ غزلیں

ایک رباعی پانچ غزلیں

اور غزلیں

نظمیں

پیش گفتار

(۱)

ویت نام

سرفروشانِ محبّت کے جنوں کے آگے
سرِ قاتل بھی، سرِ دار بھی خم ہوتا ہے
دستِ جلاد سے گر جاتی ہے شمشیرِ ستم
حرفِ حق سینۂ باطل پہ رقم ہوتا ہے

سردار جعفری

(۲)

ہمارا عہد

"ہمارا عہد اپنے خوف ناک جرائم یا حیرت انگیز ایجادات و اختراعات کے لئے نہیں بلکہ اس لئے یاد کیا جائے گا کہ جب سے تاریخ طلوع ہوئی ہے آج پہلی بار بنی نوعِ انسان میں یہ سوچنے کی ہمت پیدا ہوئی ہے کہ تمدّن کی برکتیں ساری نسلِ انسانی کے لئے یکساں طور سے فراہم کی جا سکتی ہیں۔"

آرنلڈ ٹوائن بی

انعام و اکرام

فراقؔ گورکھپوری اس عہد کے سب سے بڑے غزل گو سمجھے جاتے ہیں لیکن اُن کی شاعرانہ عظمت صرف غزل کی صنف تک محدود نہیں ہے شاعری کی دوسری اصناف میں بھی اُن کا سکہ چلتا ہے۔ تنقید کی دنیا میں بھی اُن کا مقام بلند ہے۔ یہ مسرت کی بات ہے کہ اس سال اُن کو سوویت لینڈ نہرو ادبی انعام ملا اور راشٹر پتی نے پدم بھوشن کا اعزاز عطا کیا۔ ساہتیہ اکیڈمی کا انعام انھیں تین سال پہلے مل چکا ہے۔ فراقؔ کی ذات اور شاعری ہر طرح کے انعام و اکرام کی مستحق ہونے کے باوجود ان سب سے بلند ہے۔ ادارۂ گفتگو فراقؔ صاحب کو غالبؔ کے اس شعر کے ساتھ مبارکباد پیش کرتا ہے ؎

ترے جواہرِ طرفِ کلہ کو کیا دیکھیں
ہم اوجِ طالعِ لعل و گہر کو دیکھتے ہیں

غالبؔ کا ایک اور شعر ہے ؎

دیکھ کر تجھ کو چمن بسکہ نمو کرتا ہے
خود بخود پہنچے ہے گل گوشۂ دستار کے پاس

اور اس سال ساہتیہ اکیڈمی کا اردو انعام قرۃ العین حیدر کے پاس آگیا۔ "پت جھڑ کی آواز" مکتبہ جامعہ نے ۱۹۶۵ء میں شائع کی تھی۔ اور یہ کتاب گزشتہ سال میں انعام کی حقدار تھی لیکن رائے شماری کی مجوبہ کاریوں نے اُس سال اس کتاب کو رد کر دیا اور اخباروں میں خبر چھپ گئی کہ اُردو کی کوئی کتاب انعام کے قابل نہیں سمجھی گئی۔ خوشی کی بات ہے کہ اس سال اس غلطی کا اعادہ نہیں کیا گیا۔ ہم قرۃ العین حیدر کے ساتھ ساتھ ساہتیہ اکیڈمی کو بھی اس صحیح انتخاب پر مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

عینی اُردو زبان کی ممتاز افسانہ نگار اور ناول نویس ہیں۔ افسانہ نگار تو اور بھی ہیں لیکن ناول نویسی میں عینی کا درجہ سب سے زیادہ بلند ہے۔ انھوں نے گزشتہ بیس سال میں ایک طویل تخلیقی سفر طے کیا ہے۔ اُن کی بعض تخلیقات جدید عالمی ادب کی بہترین تخلیقات کے ساتھ رکھی جا سکتی ہیں۔ "آگ کا دریا" کے بعد اُن کا نیا ناول "آخرِ شب کے ہم سفر" "گفتگو" میں سلسلہ وار شائع ہو رہا ہے ؎

ہر لحظہ نیا طور، نئی برقِ تجلی
اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

سردار جعفری

یادِ رفتگاں

نذر سجاد حیدر

۱۷ اکتوبر ۱۹۶۷ء کو محترمہ نذر سجاد حیدر کا انتقال ہوگیا۔ بچپن میں جو نام سب سے پہلے سنے ان میں ایک نام اُن کا بھی تھا۔ جاڑوں کی لمبی راتوں میں دالان کے پردے گرا دیے جاتے تھے اور ایک بڑے سے کمرے میں تمام بہن بھائیوں کے پلنگ ایک قطار میں بچھے ہوتے تھے۔ میری بڑی بہنیں لالٹین کی روشنی میں لحاف اوڑھے اس دور کی مقبول اصلاحی ناولیں پڑھ کر سناتی تھیں۔ وہ ناولیں زیادہ تر مولانا راشد الخیری، عباسی بیگم اور نذر سجاد حیدر کی ہوتی تھیں۔ "اختر النساء بیگم"، "اور آہِ مظلوماں" کے نام مجھے اس زمانے سے یاد رہ گئے۔

مولانا رازق الخیری کے الفاظ میں "اگر یہ جاننا پڑے کہ خود عورتوں میں کس نے سب سے پہلے اپنی جنس کی مظلومیت اور بے چارگی پر آنسو بہائے اور اُن کے شرعی حقوق کے حصول کی ان تھک کوششیں کیں، اُردو کی سب سے بڑی افسانہ نگار کون تھی، کس کی مضمون نگاری نے برصغیر میں تہلکہ مچا دیا تھا، سب سے پہلی ناول نگار خاتون کا نام کیا ہے، عظیم المرتبت بلند پایہ لکھنے والیوں میں اُردو کی کون سی مصنفہ ہے جس کی ساٹھ برس کی تحریروں میں کتنا ہی تلاش کیا جائے مشرقی شرافت کے خلاف کوئی ایسا لفظ نہ نکلے گا جس سے نسوانی وقار مجروح ہو، تو ان سوالوں کے جواب میں صرف ایک نام لیا جائے گا — نذر سجاد حیدر"۔ (عصمت۔ دسمبر ۱۹۶۷ء)

اُن کی تحریروں کی دوسری خصوصیت کی طرف حجاب امتیاز علی نے اشارہ کیا ہے۔

"اس وقت میرے صدمے کی وجہ صرف یہ نہیں ہے کہ مرحومہ ہند و پاکستان کی سب سے پرانی ناول نگار اور افسانہ نویس خاتون تھیں جو اُٹھ گئیں بلکہ میرے صدمے کی وجہ پرانی یادیں بھی ہیں۔ اُن کی موت کی اچانک اطلاع پا کر پرانی یادوں نے مجھے بے تاب کر دیا ہے۔ وہ اس دور کی لکھنے والیوں میں سے تھیں جب ادیب خواتین انگلیوں پر گنی جا سکتی تھیں۔ عطیہ فیضی، زہرا فیضی، میری والدہ مرحومہ عباسی بیگم، میری خالہ صالحہ سلطانہ مرحومہ اور مرحومہ نذر سجاد حیدر، سب ایک ہی دور کی مشہور و معروف ادیب خواتین تھیں۔ بچپن میں جب میں نے اُن کی کتاب "اختر النساء" پڑھی تو ان کی سیرت نگاری پر انگشت بدنداں رہ گئی اور آج بھی میں ادب کے سلسلے میں اُن کا لوہا مانتی ہوں۔ اُن کی تحریروں میں بلبل کے لہجے کی حلاوت اور کوئلوں کی کوک کی نرماہٹ ہوتی تھی۔" عصمت کا "ایامِ گزشتہ" کے عنوان سے جو روزنامچہ اُن کا چھپتا رہا اُسے میں بھول نہیں سکتی۔

(عصمت۔ دسمبر ۱۹۶۷ء)

مرحومہ ایک صاحب طرز ادیبہ تھیں۔ طویل علالت کی وجہ سے اُن کا قلم برسوں پہلے رُک گیا تھا۔ لیکن شاید یہ کہنا صحیح ہو کہ انھوں نے اپنا قلم اپنی بیٹی قرۃ العین حیدر کو ورثے میں دے دیا ہے جو آج نئے میدانوں اور نئی بلندیوں کی تلاش میں جولاں ہے۔

گفتگو ۷

سراج لکھنوی

لکھنؤ اسکول کی آخری شمع بھی بجھ گئی۔ ۲۳ جنوری ۱۹۶۸ء کو سراج لکھنوی کا انتقال ہوگیا۔ وہ محفل جس کی رونق عزیز، صفی، ثاقب، آرزو، یاس یگانہ اور سراج رہ چکے تھے۔ اب کہاں۔ پرانی بساط اُٹھ چکی ہے۔ بس اُس ادا، اُس تہذیب اور شائستگی، اُس روایت اور وضع داری کی داستانیں باقی رہ جائیں گی۔ نئی غزل میں اس کے جلوے نظر نہیں آئیں گے۔ اور لکھنؤ کا وہ شاعرانہ مذاق نہیں جھلکے گا۔

آپ کے پاؤں کے نیچے دل ہے
اک ذرا آپ کو زحمت ہوگی

یہ شعر سراج صاحب سے زیادہ مشہور رہا۔ آخری بار میری ملاقات اُن سے مارچ ۱۹۶۲ء میں ہوئی۔ ایک مشاعرے کے لیے بمبئی آئے تھے۔ میرے گھر بھی تشریف لائے۔ اپنا مجموعہ "شعلۂ آواز" عطا کیا اور بڑی دیر تک اپنا کلام سناتے رہے۔ اُن کی شاعری پر حالاتِ زمانہ کا بہت نمایاں اثر تھا۔

شرحِ ناداری ہیں خالی ہاتھ سوکھی آستیں
اب تو ماتھے پر مشقت کا پسینہ بھی نہیں

اس صحبت میں انھوں نے جو آخری غزل سنائی۔ اس میں بھی لکھنؤ کا قدیم مزاج غزل کے جدید رنگ سے ہم آہنگ ہوگیا تھا۔ اس سلسلے میں ترقی پسند تحریک کے اثرات کا ذکر کیا اور ہماری گزشتہ دنوں کی تنگ نظری کی شکایت بھی کی۔ ملک کے حالات سے بہت دل برداشتہ تھے۔ لیکن حالات کے سامنے پسپا ہونے کے لیے تیار نہیں تھے۔ وہ غزل اب بھی کانوں میں گونج رہی ہے۔

غزل

سلام اے حسرتِ نشیمن، قفس کا بھی آسرا نہیں ہے
چمن سے اُڑ جاؤں بن کے خوشبو، یہ بے وفائی روا نہیں ہے
لئے پھرا کونین دل کے اندر، مرے مقدر میں کیا نہیں ہے
خفا نہ ہو وقت کے خداؤ، مری کوئی التجا نہیں ہے

گفتگو ۸

خبر رہائی کی مل چکی ہے، چراغ پھولوں کے جل رہے ہیں
مگر بڑی تیز بدروشنی ہے، قفس کا در سوجھتا نہیں ہے

یہ عالمِ ممکنات صدقے، تمام نظمِ حیات صدقے
ان آنکھوں پر کائنات صدقے، ترے اشاروں میں کیا نہیں ہے

مرا مزاجِ جنوں بہاروں کے معجزے کا نہیں ہے قائل
نگاہِ فن کار نے ابھی تک کوئی گریباں سیا نہیں ہے

ستم کے بانی ترے مظالم ہیں اور اللہ برکتیں دے
ابھی مرا امتحاں لئے جا، ابھی یہ دل کربلا نہیں ہے

بہشتِ آدم نہیں ہے دنیا، کرم محبت کے مجرموں پر
فریب دینا خطا ہے لیکن فریب کھانا خطا نہیں ہے

یہاں کے جھگڑوں سے بھی نپٹ لو فلک کے تارے بھی توڑ لانا
نئے جہاں کی تلاش کیوں ہے، تمہاری دنیا میں کیا نہیں ہے

نہ پاسِ تازگیٔ شبنم، بہارِ جوشِ نمو ٹھہر جا
جمی ہے اُس پر نگاہ گلچیں، جو پھول ابھی تک کھِلا نہیں ہے

زہے دل آویزیٔ تعلق، نہ کیوں ہو حشرِ سکوت برپا
سراج لب بندِ مدعا ہم، وہ حالِ دل پوچھتا نہیں ہے

یہ آواز ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئی ہے۔ اب ایسے لوگ پیدا نہ ہوں گے۔
پھر نہ دکھلائے گا شکلیں یہ زمانہ ہرگز

سردار جعفری

غالب کا صد سالہ جشن

ایک غزل اور دو جدید نقاد

(۱) گدائے طاقتِ تقریر ہے زباں تجھ سے
کہ خامشی کو ہے پیرایۂ بیاں تجھ سے

احتشام حسین۔ "چونکہ تیری وجہ سے خاموشی ہی بیان کا زیور یا لباس یا طریقہ بن گئی ہے اس لئے اب اگر میں یا میری زبان بولنا چاہے تو اس کی صورت صرف یہی ہے کہ وہ تجھ سے طاقت گویائی کی بھیک مانگے۔ گویا تو نے ایسا کر دیا ہے کہ ہمیشہ خاموش رہتا ہوں۔ اب اگر بولنا چاہوں تو تیرے سہارے اور اشارے کے بغیر نہیں بول سکتا۔"

آل احمد سرور۔ "جب تو خاموشی تک کو بیان کی سلاست عطا کر سکتا ہے تو میں تجھ سے کیوں نہ قوتِ گویائی مانگوں۔"

(۲) فسردگی میں ہے فریادِ بے دلاں تجھ سے
چراغِ صبح و گلِ موسمِ خزاں تجھ سے

احتشام حسین۔ "اس شعر میں خدا یا قدرت کے جابر ہونے کا عقیدہ بڑی خوبی سے بیان ہوا ہے۔ اے خدا، صبح کا چراغ اور موسم خزاں کے پھول دونوں (چراغ اور پھول ہونے کے باوجود) تیری ہی وجہ سے افسردہ ہیں اور بے دلوں کی طرح فریاد کر رہے ہیں۔ اس فریاد بے دلاں میں نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا رنگ ہے۔"

آل احمد سرور۔ "اگر عاشق اپنی بے دلی میں تجھ سے فریاد کرتے ہیں تو کیا تعجب ہے کیونکہ افسردگی کے سارے مظاہر کا بھی تو ہی سبب ہے۔ چراغ صبح اور گل خزاں دونوں ہی افسردہ ہوتے ہیں۔"

(۳) بہارِ حیرتِ نظارہ، سخت جانی سے
حنائے پائے اجل، خونِ کشتگاں تجھ سے

احتشام حسین۔ "مشتاق قتل کر دئے گئے ہیں، خون بہہ رہا ہے اور بہہ کر موت کے پیروں میں مہندی کی طرح لگ گیا ہے۔ مہندی پاؤں میں لگی ہو تو کوئی چلتا نہیں موت بھی خون کی مہندی لگا کر رک گئی ہے

اور تڑپتے ہوئے عشاق سخت جانی کی وجہ سے مر نہیں سکتے۔ دیکھنے والوں کے لئے یہ حیرتِ نظارہ کی بہار ہے۔ چاہے یہ بہار خونِ کشتگاں کی مان لیجئے۔ چاہے اس پوری کیفیت کی کہ بسمل تڑپ رہے ہیں اور مر نہیں سکتے۔"

آل احمد سرور۔ "معشوق عاشق کا خون بہائے اور نہ اس کے جمال کا نظارہ کرے۔ یہ کیفیت سخت جانی ہی کی وجہ سے بنھ سکتی ہے۔ معشوق کے کرم سے عشاق کا خون اجل کے پاؤں کی حنا بن گیا ہے۔ سخت جانی اس لئے کرم ہے کہ اس کی وجہ سے نظارے کی مدت بڑھ گئی ہے۔"

(۴) پری بہ شیشہ و عکسِ رُخ اندر آئینہ
نگاہِ حیرتِ مشاطہ خوں فشاں تجھ سے

احتشام حسین۔ "اس کا مطلب واضح نہیں ہے۔"

آل احمد سرور "محبوب آئینے کے سامنے محوِ آرائش ہے گویا پری شیشے میں بند ہوگئی ہے۔ مصرع میں و تشبیہ کے لئے ہے۔ اس کیفیت کو دیکھ کر مشاطہ کی نگاہوں سے خون ٹپکنے لگتا ہے یعنی مشاطگی بھی اس منظر کو دیکھ کر بے تاب ہوجاتی ہے۔"

(۵) طراوتِ سحر ایجادیٔ اثر یک سو
بہارِ نالۂ و رنگینیٔ فغاں تجھ سے

احتشام حسین۔ "زور اس پر دیا ہے کہ نالے میں بہار کی کیفیت اور فغاں میں رنگینی تو ہی پیدا کرسکتا ہے۔ نالۂ صبح گاہی اور فغان سحر کے اثر سے صبح کا پیدا ہوجانا یا شگفتہ ہوجانا تو ایک بات ہے۔ لیکن تیری وجہ سے تو خود نالۂ سحر اور فغانِ صبحدم میں کیفیت پیدا ہوجاتی ہے۔ گویا جو چیزیں اپنی نوعیت اور خصوصیت کے لحاظ سے بُری ہیں اُن میں بھی تو حسن اور کیفیت پیدا کرسکتا ہے۔ جیسے۔ نغمہ بن جاتا ہے گرداں نالہ میرا جائے ہے۔"

آل احمد سرور "اثر کے نور کی تازگی تو بعد کی چیز ہے۔ نالۂ و فریاد کی رنگینی بھی تیری ہی عنایت ہے۔"

(۶) چمن چمن گُل آئینہ در کنارِ ہوس
اُمید محوِ تماشائے گلستاں تجھ سے

احتشام حسین۔ "یہ شعر بھی ٹھیک سمجھ میں نہیں آیا ہے۔ اس شعر میں مجھے بیدل کی نازک خیالی نظر آرہی ہے میری ہوس کی گود میں پھول ہی پھول ہیں لیکن کون سے پھول؟ اصل اور واقعی نہیں بلکہ وہ پھول جو آئینے میں تصویر کی طرح دکھائی دیتے ہیں۔ اس طرح تیری وجہ سے امید ہر وقت گلستاں

گفتگو

(وہ ہی فرضی اور خیالی) کے تماشے میں محو رہتی ہے۔"

آل احمد سرور۔ "آئینے کو گل سے فارسی میں تشبیہ دی جاتی ہے۔ ہوس صرف آرزو کے معنی میں ہے۔ قدرت نے آرزو کی گود میں کثرت سے آئینے رکھ دئے ہیں جن میں امید مرادوں کے باغ کا نظارہ کر رہی ہے۔"

(۷)
نیاز، پردۂ اظہارِ خود پرستی ہے
جبینِ سجدہ فشاں تجھ سے، آستاں تجھ سے

احتشام حسین۔ "نیازمندی کا اظہار، عبودیت کا اظہار حقیقتاً خود پرستی کے مظہر ہیں۔ جبین بھی تیری ہی وجہ سے جبین ہے اور آستان بھی تیرے ہی تعلق سے آستان ہے۔ ہم کس شمار میں ہیں۔ پھر بھی ہم جو سجدے کرتے ہیں تو حقیقت میں اپنی ہی ذات کا اظہار مقصود ہوتا ہے۔ اظہارِ عبودیت کو پردہ بناکر یعنی اپنے آپ کو نہ ظاہر کر کے ہم اپنے آپ ہی کو ظاہر کرتے ہیں۔"

آل احمد سرور۔ "جب ہماری جبین بھی تیری ہے اور آستاں بھی تیرا ہے تو عبادت کے کیا معنی۔ ہم نے خودی کے اظہار پر مصلحتاً ایک پردہ ڈال دیا ہے۔"

(۸)
بہانہ جوئیِ رحمت، کمیں گرِ تقریب
وفائے حوصلہ و رنجِ امتحاں تجھ سے

احتشام حسین۔ "یہ شعر بھی میرے ذہن میں واضح نہیں ہے۔"

آل احمد سرور۔ "رحمت الٰہی جو بہانے ڈھونڈھتی ہے، بخشش کی تمہید اٹھا رہی ہے۔ ورنہ ہماری وفاداری اور امتحان میں مشقت اٹھانا بھی اس کی بدولت ہے۔ ہمارا اس میں کیا ہے۔"

(۹)
اسدؔ بہ موسمِ گل در طلسمِ کنجِ قفس
خرام تجھ سے، صبا تجھ سے، گلستاں تجھ سے

احتشام حسین۔ ....

آل احمد سرور۔ "جب آزادانہ خرام اور صبا اور گلستاں سے لطف اندوز ہونا تیری ہی مہربانی پر منحصر ہے تو افسوس ہے کہ اسدؔ طلسمِ قفس میں اسیر ہے۔ طلسمِ قفس سے قیدِ تعین مراد ہے۔

"غزل مزے کی ہے۔ غالبؔ کے فن کے ایک خاص پہلو کو ظاہر کرتی ہے۔"

سردار جعفری۔ غالبؔ کی یہ غزل نسخۂ حمیدیہ میں موجود ہے۔ یہاں مالک رام کے مرتب کئے ہوئے دیوان سے نقل کی گئی ہے۔ پروفیسر احتشام حسین اور پروفیسر آل احمد سرور کے بیان کئے ہوئے مطالب اُن کے خطوط سے نقل کئے گئے ہیں جو انھوں نے ۱۹۵۶ء میں جب میں ہندوستانی بک ٹرسٹ کے لئے

دیوان غالب مرتب کر رہا تھا، میرے استفسار کے جواب میں لکھے تھے۔

قیاس یہ ہے کہ غالب نے یہ غزل اپنی نوعمری کی مشقِ سخن کے زمانے میں کہی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ بعض اشعار میں ردیف (تجھ سے) شاعر کی استادانہ گرفت سے باہر ہو گئی ہے۔ اس غزل کے ساتھ اگر غالب کی ایک فارسی غزل بھی پڑھی جائے تو دونوں کا لطف بڑھ جاتا ہے ؎

فارسی غزل

نشاطِ معنویاں از شراب خانۂ تست — فسونِ بابلیاں فصلے از فسانۂ تست

بجام و آئینہ حرفِ جم و سکندر چیست — کہ ہر چہ رفت بہر عہد در زمانۂ تست

فریب حسنِ بتاں پیش کش اسیرِ تو ایم — اگر خطست و گر خال دام و دانۂ تست

ہم از احاطۂ تست اینکہ در جہاں مارا — قدم بہ بتکدہ و سر بر آستانۂ تست

سپہر را تو بہ تاراجِ ما گماشتۂ — نہ ہر چہ دزد ز ما بُرد در خزانۂ تست

مرا چہ جرم گر اندیشہ آسماں پیماست — کہ تیز گامیِ توسن ز تازیانۂ تست

کمانِ چرخ و خدنگ از بلا دُبر ز قضا — خدنگ خوردۂ ایں صید گہ نشانۂ تست

سپاسِ جودِ تو فرض است آفرینش را — دریں فریضہ دو گیتی ہماں دو گانۂ تست

تو اے کہ محوِ سخن گسترانِ پیشینی
مباش منکرِ غالب کہ در زمانۂ تست

مشاہیر سے مُلاقات

علامہ اقبال — از — خلیفہ عبدالحکیم

حکیم اجمل خاں — قاضی عبدالغفار

مولانا وحیدالدین سلیم — علی اختر

ای۔ ایم فارسٹر — عزیز احمد

مولانا محمد علی — ڈاکٹر یوسف حسین خاں

مولوی عنایت اللہ — جانکی پرشاد

بہت سے مشاہیر — مرزا فرحت اللہ بیگ

مولوی عظمت اللہ — عصمت اللہ

اکبر الٰہ آبادی — نیاز فتحپوری

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم

علامہ اقبال

ذاتی طور پر مجھے بہت کم مشاہیر سے اس طرح ملنے کا موقع ملا ہے کہ جسے میں ملاقات شمار کرسکوں۔ مجھے نظرتاً مشاہیر سے گہری اور بے تکلف ملاقات کا چسکا ہے۔ لیکن اس چسکے کو میں مطالعہ کے ذریعے سے پورا کرتا ہوں۔ اگر مشاہیر مصنف تھے تو ان کی تصنیف بڑے ذوق شوق سے پڑھتا ہوں اور دوسروں نے جو کچھ اس کے متعلق لکھا ہے، اس کے مطالعہ سے بھی لطف اٹھاتا ہوں۔ عام طور سے خط و کتابت کو لوگ نصف ملاقات قرار دیتے ہیں۔ میرا تجربہ یہ ہے۔ کسی کی تصنیف کا مطالعہ اس انداز سے کہ گویا مصنف آپ سے مخاطب ہو، نصف ملاقات سے بہت زیادہ بہتر ہوتا ہے۔ آپ اگر چاہیں تو اس کو تین چوتھائی ملاقات کہہ لیں۔ کوئی مصنف نہ کسی خط میں اور نہ کسی مخاطب کے ساتھ اتنی باتیں کرتا ہے جتنی کہ اس کی تصنیف میں مل جاتی ہے۔ اگرچہ وہ کسر اس میں ضرور باقی رہ جاتی ہے جس کو انگریزی میں PERSONEL TOUCH کہتے ہیں اس کا ترجمہ اردو میں ذرا مشکل ہے۔ اس کو ذاتی میل کے یا محض صحبت کے لفظ سے تعبیر کریئے۔ کسی بڑے آدمی کے ساتھ اس طرح میل سے جو اثرات طبیعت پر ہوتے ہیں ان کا کوئی اور بدل نہیں ہے۔ بڑے آدمیوں کی صحبت کے متعلق کسی نے کہا ہے کہ جب وہ بولے تو کسی حقیقت پر روشنی پڑے اور ۔

خاموش رہے تو ایک عالم ہووے

خاموشی میں بھی ایسے شخصوں کے اثرات عام لوگوں کی گویائی سے بہت زیادہ موثر ہوتے ہیں۔ میں نے کہیں پڑھا کہ ٹینی سن، کارلائل سے ملنے آئے۔ سرما کا موسم تھا، آتش دان کے آگے آمنے سامنے کرسیوں پر بیٹھے رہے۔ ادھر ادھر کے دو چار فقروں سے زیادہ گفتگو نہ ہوئی۔ کافی عرصہ تک خاموش ہی بیٹھے رہے۔ اس کے بعد ٹینی سن رخصت ہونے کے لئے اٹھے تو کارلائل نے بڑے خلوص اور تپاک سے کہا کہ الفرڈ پھر بھی کبھی آنا تم سے مل کر بہت لطف حاصل ہوا۔ صحبت اولیا کے متعلق مولانا روم کا ایک مشہور شعر ہے ۔

یک زمانے در حضور اولیا بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

اولیا کی صحبت میں تھوڑا سا عرصہ بھی سو سال کی مخلصانہ اور بے ریا عبادت گزاری سے بہتر ہے۔ اگرچہ کسی اور

شاعر محض کا شعر ہوتا تو اس کو مبالغہ قرار دیا جاتا۔ لیکن یہ عارف رومی کا تجربہ اور ان کا بیان ہے جو مبالغہ سے کوسوں دور
سو فی صدی حقیقت نگار ہیں۔ مشاہیر نہ سب اولیا ہوتے ہیں اور نہ سب عالم و مفکّر و مصنف لیکن ان سب کے معاملے میں یہ
امر مشترک ہے کہ ذاتی ملاقات سے ان کے نفس و حیات کے جو پہلو نمایاں رہتے ہیں۔ وہ کسی اور ذریعے سے نہیں ہو سکتے۔ لوگ
ڈاکٹر جانسن کی کتابوں سے اتنا لطف نہیں اُٹھاتے جتنا کہ بوسول کی نوشتہ جانسن کی سوانح حیات سے۔ اگر ہر مشہور آدمی
کو ایک بوسول مل جاتا تو ان لوگوں کی زندگیوں کے وہ پہلو بھی ظہور میں آجاتے جو نہ ان کے اعمال میں واضح طور پر نظر آتے ہیں
اور نہ ان کی تصانیف میں اگرچہ اس حقیقت کو فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ کسی بڑے انسان سے ملنے والا شخص اپنے ظرف کے
مطابق ہی حاصل کرتا ہے۔ اس تمہید کے بعد اب میں علامہ اقبال سے اپنے میل جول کا ذکر کرتا ہوں۔ میں لاہور کے ایک مدرسہ
میں ابھی ابجد خواں تھا کہ اقبال کا نام کانوں میں پڑنے لگا۔ انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسہ میں دور دور سے واعظ
اور شاعر اور خطیب اور لیڈر جمع ہوتے تھے۔ مولانا نذیر احمد جیسے ادیب اور خطیب اور مولانا گرامی جیسے شاعر وہاں قوم
کو رلاتے، شرماتے اور گرماتے تھے۔ اقبال اس وقت گورنمنٹ کالج لاہور میں پروفیسر تھے۔ وہ اس وقت نوجوان
ہوں گے۔ لیکن ہم اپنی کم عمری کی وجہ سے پچیس برس کے شخص کو بھی بزرگ سمجھتے تھے۔ اقبال وہاں بڑی بڑی طویل دس
دس بارہ بارہ بندوں کی نظمیں ایک خاص لے میں پڑھتے تھے جو بڑی پُر سوز اور درد انگیز ہوتی تھیں۔ اقبال کی شاعری
کا سکّہ سب سے پہلے یہیں پر بیٹھا اور چند سال میں سب کو محسوس ہونے لگا کہ ایک نیا ستارہ شاعری کے افق پر ابھرا
ہے جس کے اندر یہ ممکنات معلوم ہوتے ہیں کہ وہ آگے چل کر مہتاب و آفتاب بن جائے۔ اسی زمانے میں انجمن
حمایت اسلام کے ایک جلسے ہی میں علامہ شبلی نے یہ پیشین گوئی کی تھی کہ جب حالی اور آزاد کی کرسیاں خالی ہوں گی
تو لوگ اقبال کو ڈھونڈھیں گے۔ اس زمانے میں میری ان سے ذاتی ملاقات بعید از قیاس بات تھی۔ ولایت جانے
سے قبل اور واپسی کے کئی سال بعد تک اقبال حمایت اسلام میں نظمیں سناتے رہے۔ میں نے پورا "شکوہ" اور
"شمع و شاعر" انھیں جلسوں میں ان کی زبان فیض ترجمان سے سنا ہے۔ شمع اور شاعر انھوں نے پُر سوز لے میں پڑھی
اور شکوہ بغیر لے کے بڑے پُر جوش اور موثر انداز میں۔ لوگ ان کی لَے کے دل دادہ تھے۔ شور مچانا شروع کیا کہ
لَے سے پڑھیئے۔ انھوں نے کہا کہ لَے سے پڑھنے کی نظم نہیں ہے۔ اس پر ایک بد ذوق وکیل بولے کہ اگر لے سے پڑھیں
تو میں ایک کثیر رقم انجمن کو چندے میں دوں گا۔ اس پر اقبال کو غصہ آگیا اور اس شخص کو ڈانٹ دیا کہ تم کو نہیں
معلوم کہ کس قسم کے اشعار لَے سے پڑھنے چاہئیں اور کس قسم کے سادہ اور موثر طریقے سے۔ موسیقی ہر کلام کے لئے
موزوں نہیں ہوتی۔ یہ دَور گزر گیا۔ اقبال ولایت کی واپسی پر بیرسٹری کرتے تھے۔ شاعری کم کرتے تھے۔ لیکن لوگ
ان کی شاعری کے گرویدہ ہو چکے تھے۔ کبھی کبھار اُن کی کوئی نظم شائع ہوتی تھی تو ارباب ذوق کو محسوس ہوتا تھا
کہ ایک بڑی نعمت آسمان سے نازل ہوئی ہے۔ ابھی تک اقبال کو پوری طرح یہ احساس نہیں تھا کہ میں شاعری سے
کیا عظیم الشان کام لے سکتا ہوں۔ اور شاید کسی قدر اس خیال کا احساس باقی تھا، جو انھوں نے یورپ کے قیام کے

گفتگو ۲۹

دوران میں اپنے رفیق عبد القادر کے سامنے ظاہر کیا تھا کہ شاعری کے ذوق نے ہماری قوم میں سے جوشِ عمل کو زائل کر دیا ہے اس لئے ارادہ ہے کہ شاعری کو ترک کر دوں۔

مدیرِ مخزن سے کوئی اقبال جا کے میرا پیام کہہ دے ‏ ‏ ‏ ‏ کہ کام جو کر رہی ہیں قومیں انھیں مذاقِ سخن نہیں ہے

اقبال کے بیرسٹر بننے کی کوشش کو میں ایک بڑا خوفناک حادثہ سمجھتا ہوں۔ اس فن سے اُن کا کوئی خاص لگاؤ نہیں تھا لیکن انھوں نے دو وجوہ سے یہ پیشہ اختیار کیا تھا۔ ایک تو پیٹ پالنے کے لئے اور دوسرے اس لئے کہ اس میں ملازمت کے مقابلے میں انسان زیادہ آزاد ہوتا ہے۔ آزاد ان معنوں میں کہ وکیل حکومت کا ملازم نہیں ہوتا اور مقدمہ لینا نہ لینا بھی اپنے اختیار کی بات ہے لیکن غمِ روزگار ہمارے ملک میں اہلِ کمال کو پوری طرح آزاد نہیں ہونے دیتا۔

علامہ خود ہی فرماتے ہیں

وہ چیز نام ہے دنیا میں جس کا آزادی ‏ ‏ ‏ ‏ ستی مزدور ہے دیکھی کہیں نہیں میں نے

میں نے ایک روز عرض کیا۔ ڈاکٹر صاحب یہ وکالت کا پیشہ دنیا داری کا نچوڑ ہے۔ حرص و ہوس، بغض، ظلم، جھوٹ، بہتان۔ عدالتوں کی فضا اس تمام شیطنت سے لبریز ہوتی ہے۔ اس میں انسانوں کے ادنیٰ تر جذبات کی نفسا نفسی اور افراتفری ہوتی ہے۔ آپ جیسے لطیف جذبات اور افکار کے انسان کے لئے تو یہ پیشہ کسی طرح بھی موزوں نہیں ہو سکتا۔ فرمانے لگے کہ نہیں اس میں سے ایک بڑا فائدہ یہ نکلتا ہے۔ کہ انسان کی ان خباثتوں کو عریاں دیکھ کر طبیعت میں بڑا ردِ عمل پیدا ہوتا ہے اور اس کثافت سے گھبرا کر روح بے تابی سے لطافت کی طرف گریز کرتی ہے۔ مجھے خیال ہوا کہ علامہ محض طبیعت کی تسکین کے لئے یہ جواز نکال رہے ہیں۔ وہ دل و دماغ جو اعلیٰ ترین جذبات اور افکار کی آفرینش کا اہل تھا۔ وہ اس جھگڑے میں الجھا رہتا تھا۔ کہ زید اور عمرو دو فریقوں میں سے اس فریق کو حق بجانب ثابت کیا جائے جس کے آپ وکیل ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ وہ فضول اور بے بنیاد مقدمے نہیں لیتے تھے۔ ان کو روپے کی ضرورت ضرور تھی لیکن اس کی بے جا ہوس نہیں تھی۔ چنانچہ ایسا بھی ہوتا تھا کہ ایک موکل اصرار کر رہا ہے کہ آپ میرا مقدمہ لیں اور معقول نقد معاوضہ محنت بھی پیش کر رہا ہے۔ لیکن وہ اس کو سمجھاتے جاتے ہیں کہ دیکھو بھائی تمھارے مقدمے میں کچھ جان نہیں ہے خواہ مخواہ اپنا روپیہ ضائع مت کرو۔ اور موکل اس پر مصر ہے کہ آپ کو اس سے کیا جیتنا ہارنا میری قسمت کا معاملہ ہے۔ آپ اُجرت لیجئے اور میری طرف سے پیش ہو جائیے۔ لیکن اقبال کو وہ آمادہ نہ کر سکا اور ناراض ہو کر واپس ہو گیا۔ ان کی اس وکالت کی زندگی کا ایک واقعہ مجھے یاد آ گیا جو ایک سبق آموز لطیفہ ہے۔ ایک مولوی صاحب ان کے پاس آیا جایا کرتے تھے۔ کچھ دینیات اور فقہ کے مسائل پر گفتگو کرتے تھے اور کچھ اپنے ورثۂ پدری کے جھگڑے کے متعلق۔ وہ اپنے والد مرحوم کے ترکہ ہی سے اپنی بہن کو حصۂ شرعی دینا نہیں چاہتے تھے اور انگریزی قانون کا سہارا ڈھونڈتے تھے۔ پنجاب میں دنیا داری کے بڑے بڑے مدعی صوم و صلوٰۃ کے پابند لوگ ورثہ کے معاملے میں عدالتوں میں کھڑے ہو کر علی الاعلان یہ کہہ دیتے ہیں کہ ہماری برادری یا ہمارے علاقہ میں ورثہ شرعِ محمدی کے مطابق فیصلہ ہوتا ہے۔ یہ مولوی صاحب اقبال کو ہمیشہ طعنہ دیتے تھے کہ تم اس قدر علمِ دین رکھنے کے باوجود اور اسلام اور اس کے نبیؐ سے اس قدر

عشق کا دعوے کرنے پر بھی داڑھی کیوں نہیں رکھتے۔ آخر ایک روز تنگ آکر اقبال نے کہا کہ دیکھئے مولوی صاحب علم اور ایمان کے باوجود ہر شخص کے عمل میں کچھ نہ کچھ کمزوری ہوتی ہے۔ آپ کی کمزوری اور خلاف شرع حرکت یہ ہے کہ آپ بہن کو حصہ نہیں دیتے اور میری کوتاہی یہ ہے کہ میں داڑھی منڈاتا ہوں۔ لائیے ہاتھ بڑھائیے اس وقت ایک معاہدہ ہو جائے جس سے آپ کی اور میری کمزوریاں بیک وقت رفع ہو جائیں۔ آپ بہن کو ورثہ میں حصہ دے دیجئے اور میں داڑھی بڑھا لیتا ہوں لیکن مولوی صاحب کو ہمت نہ ہوئی اور اقبال تمام عمر بے ریش ہی رہے۔

اقبال وکالت میں کچھ وقت صرف نہیں کرتے تھے، اس کو محض پیٹ پالنے کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ صرف ہائیکورٹ میں اپیل کے مقدمے لیتے تھے۔ جن میں دردسری کم ہوتی ہے اور علم و عقل اور نکتہ چینی سے زیادہ کام لینا پڑتا ہے۔ مقدمے بھی چن کر تھوڑی تعداد میں لیتے تھے۔ اس وجہ سے میرا خیال ہے کہ ان کی وکالت کی آمدنی کبھی ایک ہزار روپے ماہوار سے زیادہ نہیں ہوئی۔ وہ طبیعتاً شاعر اور عالم اور علم دوست شخص تھے۔ لیکن میں نے ایک بات ان کی زندگی میں ایسی دیکھی جو مشاہیر میں سے شاید ہی کسی کی زندگی میں ملے۔ ان کا دروازہ ہر وقت کھلا رہتا تھا اور ہر شخص ان کے پاس ہر وقت بے تکلف چلا آتا تھا۔ ان کے گھر اور ان کی صحبت پر حافظ کا یہ شعر صادق آتا ہے ؎

ہر کہ خواہد گو بیا و ہر کہ خواہد گو برو   گیر و دار و حاجب و درباں درین درگاہ نیست

شاعری کی وجہ سے وہ ہر دلعزیز بہت تھے۔ نہ صرف طالب علموں اور علم دوست لوگوں کو ان سے ملنے کی آرزو رہتی تھی بلکہ ایسے لوگوں کو بھی جو ان کو بڑا شاعر اور صاحب کمال سمجھ کر ان سے ملاقات کو ایک نعمت سمجھتے تھے۔ سوا ان اوقات کے جن میں وہ کوئی مقدمہ تیار کر رہے ہوں۔ وہ اپنی آرام کرسی پر بیٹھے رہتے تھے۔ اگر کوئی شخص پاس نہ ہو تو کوئی کتاب پڑھتے تھے یا ایک نہایت لغو اور روح خراش کام میں مشغول ہوتے تھے۔ اور وہ تھا امتحانوں کی جوابی بیاضیں۔ چنانچہ ان کے پاس مختلف امتحانوں کے پرچے آتے تھے۔ سال کے بعض مہینوں میں جب کبھی میں ان سے ملا تو دیکھا کہ مہمل جوابات کی ورق گردانی ہو رہی ہے۔ مجھے ان کے اس مشغلے پر اس وقت اتنا افسوس نہیں ہوتا تھا۔ جتنا اب ہوتا ہے کہ غم روزگار اور زندگی کی مجبوریوں نے اس یگانۂ عصر کے قیمتی اوقات اور قوتوں کو کن کاموں میں لگا رکھا تھا۔ اس جوہر ناشناس تمدن کو کیا کہئے جو ایک غیر معمولی صاحب کمال کو بھی معمولی سادہ زندگی بسر کرنے کے لئے غم روزگار سے بے پروا نہ کر سکے۔ اسی وقت اور اسی محنت کو اگر وہ کسی علمی کام یا شاعری میں صرف کر سکتے تو لاتعداد انسان اس سے مستفید اور لطف اندوز ہوتے۔ اُس زمانے میں ابھی اُردو نظم و نثر لکھنے والے صاحب کمال ہونے پر بھی معقول معاوضہ حاصل نہ کر سکتے تھے۔ ایک مرتبہ اقبال نے مجھ سے فرمایا کہ اگر ہماری قوم میں اہل قلم اچھا روزگار پیدا کر کے اطمینان کی زندگی بسر کر سکتے تو میں اس کے سوا اور کوئی کام نہ کرتا۔ یہ اُس زمانے کی بات ہے جب اقبال ایک اچھے شاعر مشہور تھے۔ لیکن ابھی تمام قوم کے دل و دماغ پر ان کا قبضہ نہیں ہوا تھا۔ اور معقول قیمت پر اُردو کتابیں خریدنے کا رواج نہیں ہوا تھا۔ مولانا شبلی جیسے مشہور مصنف بھی کوئی علمی کتاب پانچ سو سے زیادہ نہیں چھپواتے تھے۔ عرصے سے اصحاب مطبع کہ

اپنا مجموعۂ کلام چھپواؤ لیکن وہ ٹس کر ٹال دیتے تھے۔ اس بارے میں یہاں تک ٹال مٹول ہوئی کہ حیدرآباد میں ایک صاحب نے اخباروں اور رسالوں سے ان کی تمام مطبوعہ نظمیں جمع کر کے ان کی اجازت کے بغیر اور بغیر ان کو خبر کیے ایک مجموعہ چھپوا کر فروخت کرنا شروع کر دیا۔ جس سے وہ بہت برہم ہوئے۔ کوئی اچھا شاعر اپنے مختلف زبانوں کے کلام کو جوں کا توں شائع کرنا نہیں چاہتا۔ بعض نظموں کے متعلق وہ چاہتا ہے کہ دنیا انھیں فراموش کر دے۔ بعض اشعار میں رد و بدل کرتا ہے، کہیں کچھ مٹاتا ہے، کہیں کچھ اضافہ کرتا ہے۔ کچھ نہ پوچھیے کہ ان صاحب نے کیا غضب کیا۔ اور اقبال کو ان پر کس قدر غصہ آیا۔ اقبال نے سب سے پہلے 'اسرارِ خودی' کو اپنے صرفے سے طبع کرایا اور صرف پانچ سو نسخے چھپوائے۔ ان میں سے بہت سے نسخے دوست احباب نے اُچک لیے جن ملنے والوں کو وہ اس حکیمانہ شاعری کے سمجھنے اور لطف اٹھانے کا اہل سمجھتے تھے، ان کو خود بھی ایک نسخہ تحفتاً عنایت فرماتے تھے۔ میں اس زمانے میں ایم۔ اے میں فلسفہ پڑھتا تھا، اور جب کبھی موقع ملتا فیض صحبت کے لیے ان کی خدمت میں حاضر ہو جاتا تھا۔ آپ نے منشی طاہر دین کو بلایا اور کہا کہ ان کو ایک نسخہ دے دو۔ لیکن ان سے قیمت نہ لینا۔ فرمانے لگے کہ ہمارے زمانے کے امرا کی کتب بینی کا شوق ملاحظہ ہو۔ میرے ایک دوست نے 'اسرارِ خودی' کا ایک نسخہ ایک بڑے دولت مند نواب کے یہاں بھیجا دیا۔ نواب صاحب کے ایک بھائی ہیں۔ مجھے خبر ملی ہے کہ وہ دونوں نواب آپس میں اس نسخہ پر جھگڑ رہے ہیں کہ یہ کس کا ہے، میرا ہے یا تمھارا، لیکن اتنی ہمت نہیں ہوتی کہ ایک روپیہ خرچ کر کے دوسرا نسخہ خرید لیں۔ اسی طرح ایک روز ناقدریِ عالم کی شکایت کرنے لگے۔ میں نے اپنی عمر میں دو تین مرتبہ سے زیادہ کبھی تعلّی یا تفاخر کا فقرہ ان کی زبان سے نہیں سنا۔ اپنے آپ کو بڑا جتانا اور بتانا ان کی سیرت کا جزو نہیں تھا۔ کہنے لگے کہ دیکھو زمانے زمانے کا فرق ہے۔ فیضی کو اکبر مل گیا، جس سے فیضی کے کمال نے بھی پرورش پائی اور شہرتِ دوام بھی حاصل کی۔ فیضی کے پاس کیا تھا جو میرے پاس نہیں ہے۔ لیکن زمانہ پلٹا کھا گیا ہے۔ اس زمانے میں ان کے دل میں احساس پیدا ہو رہا تھا کہ میں اپنے افکار اور اپنی شاعری کی قوت سے قوم کے دل و دماغ میں انقلاب پیدا کر سکتا ہوں۔ یورپ میں کہی ہوئی دو نظموں میں سے یہ دو شعر اس احساس کے شاہد ہیں ؎

میں ظلمتِ شب میں لے کے نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کو — شرر فشاں ہوگی آہ میری نفس مرا شعلہ بار ہوگا

زمانہ دیکھے گا جب مرے دل سے محشر اٹھے گا گفتگو کا — مری خموشی نہیں ہے گویا مزار ہے حرفِ آرزو کا

اس مضمون کے وہ اشعار بھی ہیں جن میں انھوں نے اپنے رفیق عبد القادر کو مخاطب کیا ہے ؎

اُٹھ کہ ظلمت ہوئی پیدا افقِ خاور پر — بزم میں شعلہ نوائی سے اُجالا کر دیں

شمع کی طرح جئیں بزم گہِ عالم میں — خود جلیں دیدۂ اغیار کو بینا کر دیں

اس زمانے میں سر اکبر حیدری نے ایک خط میں ان سے دریافت کیا تھا کہ لاہور میں بیٹھے کیا کر رہے ہو، اس کے جواب میں انھوں نے لکھا کہ ایک گوشے میں بیٹھا ہوا ایشیا کے دل و دماغ میں انقلاب پیدا کر رہا ہوں۔ اگر اقبال نے یہ سب کر دکھایا ہوتا

تو اس قسم کی باتیں محض شاعرانہ تعلّی اور جذبے کی سرشاری ہوتیں۔ لیکن زمانہ شاہد ہے کہ ان کا یہ احساس ایک حقیقت اور ایک انقلاب ذہنی کا پیش خیمہ تھا۔

کوئی اخبار، کوئی رسالہ، کوئی ہندوستان اور مسلمانوں کی حیاتِ ملّی سے بحث کرنے والی کتاب اُٹھا کر دیکھیے اہم مسائلِ حیات کے متعلق کسی مضمون نگار کا مضمون مطالعہ کیجئے، اس میں یا سطح پر یا تہ میں اقبال ضرور موجود ہوگا۔ وطن پرست اس کے وطن کے ترانے الاپتے پھرتے ہیں، صوفی اس کے صوفیانہ اشعار پڑھ کر وجد کرتے ہیں۔ فلسفی اس سے فلسفہ اخذ کر رہے ہیں۔

خود اقبال مجھ سے ایک روز فرمانے لگے کہ دیکھو بھئی غالب بھی کس قدر صاحبِ بصیرت شخص ہے۔ اُس نے اپنی شاعری کے مستقبل کی نسبت جو پیشین گوئی کی نظم لکھی ہے۔ اس میں کہا ہے کہ:

حسرت جوہرم در مذاقِ فتنہ جا خواہد گرفت رزمگاہِ نازِ شیخ و برہمن خواہد شدن

فرمانے لگے مذاقِ فتنہ، کیا عمدہ ترکیب ہے انسان کی جبلتوں اور اس کے جذبات کے متعلق بہت سے الفاظ تراشے گئے ہیں لیکن غالب نے بعض انسانوں کی جبلّت کے لئے کیا عمدہ اصطلاح وضع کی ہے، غالب نے اپنے کلام کے متعلق جو پیشگوئی کی تھی وہ خود اقبال کے متعلق غالب کے مقابلے میں کہیں زیادہ پوری ہو رہی ہے۔ شیخ بھی اس کی سند سے گفتگو کرتا ہے، اور برہمن بھی، اور ذوقِ فتنہ کا جو ظہور ہے وہ ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔

اقبال کی گفتگو میں بھی یہی بات تھی۔ ہر قسم کا شخص ان سے ملتا تھا اور وہ ہر شخص سے اس کے مذاق کی بات کرتے تھے۔ وہ کافر کے کفر سے، ملحد کے الحاد سے، متقی کے تقوے سے اور گنہ گار کی گنہ گاری سے، اور رند کی رندی سے براہِ راست واقف تھے۔ اور ہر صنف سے جب وہ بات کرتے تھے تو سننے والے کو یہ احساس نہیں ہوتا تھا کہ سنی سنائی باتیں کر رہا ہے اور اس کی اصلیت سے واقف نہیں۔ اس لئے ان کی گفتگو کبھی بے معنی اور پھسپھسی نہیں ہوتی تھی۔ اور ایک بڑی خوبی ان میں یہ تھی کہ ان میں تصنع کا نام و نشان نہیں تھا۔ ان کو یہ خواہش نہیں تھی کہ لوگ مجھے خواہ مخواہ متقی یا صوفی سمجھیں۔ جیسے تصوف کی باتیں صوفیائے کرام کی طرح کہتے تھے۔ اسی طرح رند سے رندی کی باتیں بھی اسی انداز سے کرتے تھے کہ اس کو محسوس ہوتا تھا کہ یہ شخص بھی کوچۂ گزشتہ میں سے ہے۔ حیدرآباد میں کھانا کھاتے ہوئے ایک شخص کا ذکر نکل آیا۔ میں نے کہا کہ آدمی تو پارسا ہے لیکن کسی قدر بے وقوف ضرور ہے۔ جھٹ سے انگریزی میں بولے [illegible] یعنی پارسائی اور حماقت اکثر یکجا نظر آتی ہیں۔ ان کی طبیعت میں لطیف قسم کی ظرافت بہت تھی۔ لیکن کبھی کسی کو ذلیل کرنے کے لئے اس کی ہنسی نہیں اُڑاتے تھے۔ چونکہ وہ خود ظرافت پسند تھے اس لئے ان کے بے تکلف ہم نشین بھی ان سے ہنسی مذاق کی باتیں کرتے تھے۔ میرے سامنے کی بات ہے لاہور کے ایک حکیم صاحب کبھی کبھی ان کے پاس آ بیٹھتے تھے وہ ذرا رند مشرب تھے۔ اربابِ نشاط کے کوٹھوں پر بھی نظر آتے تھے۔ اقبال نے ہنس کر پوچھا، کہیے حکیم صاحب آج کل اس طبقے میں کس کس کے پاس آنا جانا ہے۔ حکیم صاحب بولے، اجی کہاں اب تو بس یہیں آتا ہوں..... بعض اوقات علمی باتوں میں بھی ان کا اندازِ بیان ظریفانہ ہوتا تھا۔ ایک روز فرمانے لگے۔ مدجیزیں خاص انگریزوں کی ایجاد ہیں ان میں ایک ہے (Paying guest) یعنی وہ مہمان جس سے اپنے گھر کی قیمت وصول کی جائے لیکن اس کے باوجود

گفتگو ۳۰

میان کہلانے اور دوسرے (Honesty is the best Policy) یعنی دیانت داری بہترین تدبر و مصلحت ہے۔ اور
قومیں تو دیانت داری کو دین و ایمان اور اخلاق اور تزکیۂ نفس کے ساتھ وابستہ کرتی رہیں لیکن اس قوم نے اس کو بطور پالیسی کے
اختیار کرنے کی تلقین کی، اس طرح فرمایا کہ لوٹ مار، جبر، ظلم، ناجائز مطالبے یہ سب کچھ پہلی جابرانہ اور بے آئین حکومتوں میں بھی تھا اور
موجودہ آئینی حکومتوں میں بھی ہے فرق صرف یہ ہے کہ اب حکومتیں یہ کرتی ہیں کہ جو کچھ کرنا ہے اسے پہلے لکھ لو اور اس کا نام رکھو ضابطہ
اور قانون اور پھر جو جی چاہے کرو۔ بس اپنے ہر فعل میں کسی قانون اور ضابطے کا حوالہ دے کر اس کو جائز بنا لو، بس لکھ لینا اور بغیر لکھے
کرنا اصل فرق یہی ہے۔ اقبال کے ایک دوست بہت سیاہ فام تھے اور اقبال ان کی رنگت پر ہمیشہ طبع آزمائی کرتے رہتے تھے۔
یہ صاحب نائٹ یعنی سر ہو گئے۔ اقبال نے کہا انگریزوں نے تمھیں صحیح خطاب دیا ہے لیکن خطاب کیا ہے۔ محض تمھاری حقیقت
بیان کر دی ہے۔ تم پہلے بھی نائٹ یعنی شب سیاہ ہی تھے۔ اس طرح یہ صاحب ایک انگریزی ڈنر میں جس میں اقبال بھی تھے، سیاہ
ڈریس سوٹ اور سیاہ موزے اور شوز پہنے ہوئے آئے جو رنگ جسم کا تھا وہی لباس کا۔ اقبال نے بڑے تعجب سے ان کو دیکھ کر
کہا کہ ارے یہ تمھیں کیا ہو گیا کہ تم برہنہ ہی اس دعوت میں چلے آئے۔ میرا خیال ہے کہ اگر کوئی شخص اقبال کے لطیفے اس کے ہم نشینوں
سے پوچھ پوچھ کر جمع کرے تو ظرافت کا ایک دلچسپ مجموعہ بن جائے۔

میں ابھی کہہ چکا ہوں کہ ان کا گھر ہمیشہ ہر شخص کے لیے کھلا رہتا تھا اور جو شخص جتنی دیر چاہے اُن کے پاس بیٹھا رہتا
تھا۔ بظاہر یہ تضیع اوقات معلوم ہوتی ہے۔ بعض لوگوں کے دل میں یہ خیال پیدا ہوگا کہ یہ شخص مطالعہ کب کرتا تھا۔ بڑے بڑے مسائل
کے متعلق سوچتا کب تھا۔ اور شعر کس وقت کہتا تھا اور ہر کس و ناکس کو کیوں اجازت عام تھی کہ جب تک چاہے اس کے پاس بیٹھ کر
اس کا وقت ضائع کرے۔ میں نے تو کبھی یہ سوال ان سے نہیں کیا شاید اس لئے کہ میں خود ان کا وقت ضائع کرنے والوں میں
سے ایک تھا۔ لیکن بعض اور لوگوں نے ان سے کہا تو جواب دیا کہ میرا وقت ضائع نہیں ہوتا۔ رنگ برنگ کے لوگ میرے
پاس آتے ہیں اور طرح طرح کی باتیں کرتے ہیں یہ بھی براہ راست نوعِ انسان کے مطالعہ کا ایک ذریعہ ہے۔ اصل مطالعہ انسانی فطرت
کا مطالعہ ہی ہے۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی تھی جو میں نے ان کی صحبت میں محسوس کی کہ خواہ کوئی شخص بھی ان کے پاس بیٹھا ہوا اور کوئی بات
بھی کر رہا ہو ان کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کچھ سوچ رہے ہیں۔ سنانے والے کی بات بھی سن رہے ہیں اور خود سوچتے بھی جاتے
ہیں۔ باتیں کرنے والے کو یہ وہم و گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ اس وقت کیا عجیب و غریب مضامین اقبال کے دماغ میں پیدا
ہو رہے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ اقبال جس کسی بھی محفل میں ہوتے تھے وہ باہمہ و بے ہمہ ہوتے تھے، سب کے ساتھ بھی ہیں اور سب سے
الگ بھی۔ رقص و سرود کی محفل میں بیٹھے ہیں، سب لوگ گانے سے لطف اٹھا رہے ہیں اور اٹکھیلیاں کر رہے ہیں، اِدھر اُدھر کی
چھیڑ چھاڑ ہو رہی ہے لیکن یک بیک اقبال کی طرف جو دیکھا تو کمال رقت سے ان کی آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے ہیں گویا وہ
نغمہ جو دوسروں کے لئے نشہ اندوز رہا تھا وہ اس شخص کو خدا جانے کس سوز و گداز کے عالم میں پہنچا دیتا تھا۔ اقبال کے بعض
ہم نشین اس کے اس اندازِ طبیعت کو سمجھ گئے تھے باتیں ہو رہی ہیں، انھوں نے دیکھا کہ اقبال خاموش ہے اور ایک خاص قسم

قسم کی کیفیت اس کے چہرے پر نمودار ہے وہ سمجھ جاتے کہ اشعار نازل ہو رہے ہیں چنانچہ وہ کچھ عرصے کے لئے اقبال کو اس کیفیت میں چھوڑ دیتے تھے۔ اس کے بعد ان کو معلوم ہوتا کہ مقدس لاجواب نظم ہم سے باتیں کرنے کے دوران میں ہی اس پر نازل ہوئی، اس سے آپ اندازہ کر لیجئے کہ اقبال کے لئے بھی کوئی صحبت تضییع اوقات کا موجب نہیں بن سکتی تھی۔ ایسی طبیعت بھی خدا کی کیا بڑی نعمت ہے۔ جس کو جلوت میں بھی خلوت حاصل ہو۔ یہ صوفیا کے "دست بکار و دل بیار" کا معاملہ ہے۔ یہ لوگ انسانوں کے ساتھ اسی طرح رہتے ہیں جس طرح بطخ پانی میں۔ چاروں طرف سے پانی کے تھپیڑے پڑ رہے ہیں۔ لیکن پر خشک کے خشک ہیں۔

گفتگو ۲۲

قاضی محمد عبدالغفار صاحب

حکیم اجمل خاں

۲۹ ردسمبر ۱۹۲۷ء کی صبح کو ۲ بج کر ۲۰ منٹ پر ہندوستان اور ہندوستان کے مسلمانوں کا ایک بہت بڑا قائد اِس دارِ ناپائدار سے رخصت ہوگیا، اس قائد کو بہ حیثیت ایک قائد کے ساری دنیا جانتی تھی۔ اسلامی ممالک اور ایشیائی ممالک میں اس کا نام روشن تھا۔ ہندوستان کے ایک بہت بڑے طبیب اور طبِ قدیم کے ایک مجتہد کی حیثیت سے بھی اس کا مقام بہت بلند تھا، اتنا بلند کہ وہ اپنے زمانے میں سب سے بڑا طبیب حاذق سمجھا گیا، لاکھوں مریض ہر سال اس کے دروازے پر آتے تھے اور اس کے کمالِ فن سے مستفید ہوتے تھے۔ اُس کے خاندان میں (ڈیڑھ) سو سال تک مسلسل اور بلا فصل اس فن کے بڑے بڑے ماہرین پیدا ہوئے تھے، بابر کے وقت سے محمد شاہ کے زمانے تک تاجدارانِ مغلیہ کے درباروں میں خاندانِ شریف خانی کے افراد شاہی اعتماد کے حامل رہے، خاندانِ شریفی کے اس آخری چشم و چراغ کی شخصیت سے بھی سارا ہندوستان واقف تھا۔ جس کی محفلیں قدیم تہذیب و تمدن کے بہترین خصائص کی آئینہ دار تھیں۔ اس ایک شخص کی ان تمام حیثیتوں سے ہندوستان کی وہ دنیا جو میرے عہدِ شباب کی دنیا تھی۔ خوب واقف تھی۔ دلی میں اجمل خاں بے تاج کے تاجدار کہے جاتے تھے اور اُس زمانے کی دلی کے ہندو اور مسلمان یکساں شریف منزل کے اس اولوالعزم مکین کے سامنے سرِ نیاز جھکایا کرتے تھے۔ غرض یہ کہ اجمل خان کے علم و فضل، کمالِ فن اور سیاسی قیادت کے ڈنکے بج گئے تھے۔ لیکن میں خوش نصیب تھا کہ اس عظیم شخصیت کو دوسری حیثیتوں سے تو جانتا ہی تھا لیکن سب سے زیادہ میں نے انھیں ایک انسان کی حیثیت سے دیکھا اور پہچانا۔ انسانیت کی بہترین خصوصیات اور دلی کے قدیم تمدن کے اس عجیب و غریب مجموعہ کو میں نے بہت ہی قریب سے دیکھا اور اگر کوئی مجھ سے سوال کرے کہ خود میری زندگی کا بہترین زمانہ کون سا تھا تو ایک لمحہ توقف کئے بغیر میں کہوں گا کہ یہ وہ زمانہ تھا جب میں تقریباً بیس سال تک اجمل خاں کے قریب ترین نیاز مندوں میں شمار کیا جاتا تھا۔ اُس زمانے میں جو کچھ میں نے پایا اور سیکھا تو اس کو اگر ترازو کے ایک پلہ میں رکھ دیا جائے اور دوسرے پلے میں میری زندگی کا باقی زمانہ رکھ دیا جائے تو یقین جانئے پلہ وہی بھاری رہے گا جس میں میری عمر کا وہ حصہ رکھا ہوگا جو حکیم اجمل خاں کی دل نواز صحبتوں میں گزرا۔ یہ ایک طویل داستان ہے لیکن اس مختصر صحبت میں اتنا تو میں کہہ سکتا ہوں کہ شریف منزل کی ان صحبتوں میں جہاں بابر، ہمایوں اور اکبر کی بلند اقبال ترکمانوں کا یہ بیٹا شمعِ محفل ہوتا تھا۔ مجھے اس بات کا سبق حاصل

گفتگو ۲۳

ہولکالسانیت کسے کہتے ہیں اور قدیم مشرقی تہذیب کیا ہوتی ہے۔

حکیم صاحب کو پہلی دفعہ جب میں نے دیکھا تو وہ میری نفسیات کا ایک عجیب واقعہ ہے۔ میری جوانی کا زمانہ تھا۔ اور وہ جوانی بھی بہت سرکش تھی، سیاسی مشاغل نے کریلے کو نیم چڑھا بنا دیا تھا، پھر وہ صحبتیں مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر انصاری اور مولانا محمد علی کی! یہ شاید ۱۹۱۲ء یا ۱۹۱۳ء کی بات ہے۔ جب میں مولانا محمد علی کے اخبار "ہمدرد" کا مددگار مدیر تھا، اس زمانے میں مولانا نے ہم چند پُرجوش نوجوانوں کا ایک جتھا اپنے گرد و پیش جمع کر لیا تھا اور سیاسی فضا کی بڑھتی ہوئی گرمی نے ہم سب کو "بھک سے اُڑ جانے والا مادہ" بنا دیا تھا۔ ایک دن مولانا نے مجھے ایک بند لفافہ دیا اور فرمایا کہ وہ لفافہ براہ راست حکیم صاحب کو دیا جائے۔ میں پہلی دفعہ وہ لفافہ لے کر شریف منزل گیا۔ اندر پہنچا تو دیکھا کہ باہر کا دالان ملاقاتیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا ہے، اندر کے دالان میں حکیم صاحب تشریف رکھتے تھے۔ درمیانی دروازوں کو بھی مریضوں اور دوسرے اہلِ غرض نے روک رکھا تھا۔ اس دربار کی یہ شان دیکھ کر میں کچھ بدمزہ سا ہوا، اور اور بھی زیادہ بدمزہ ہوا جب عرصے تک حکیم صاحب دوسرے اصحاب سے گفتگو کرنے میں مصروف رہے اور انھوں نے میری طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ یہ مجھے یاد ہے کہ ان کے چہرے پر تیموری نسل کے خد و خال دیکھ کر میں کچھ مرعوب تو ہوا لیکن یہ بھی یاد ہے کہ حکیم صاحب کی بے توجہی پر مجھے غصہ بھی بہت آیا تھا۔ اُن کے انداز میں میں نے کچھ ایسی تمکنت پائی جو میرے ان جمہوری خیالات سے ٹکرائی جو اُس زمانے میں ہم جوانوں پر چھائے ہوئے تھے۔ چنانچہ میں انھیں بہت مغرور آدمی سمجھا۔ چند منٹ انتظار کرنے کے بعد میں ناراض ہو کر پلٹ پڑا اور سیدھا مولانا محمد علی کے پاس آیا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ مرحوم ابھی مولانا نہ ہوئے تھے اور عوام کے لئے صرف مسٹر محمد علی اور ہم جوانوں کے لئے محض محمد بھائی تھے۔ میں نے کہا۔ محمد بھائی! یہ کس کے پاس آپ نے مجھے بھیج دیا؟ اُن کی تو گردن بھی فرطِ غرور سے نہیں مڑتی! لاحول ولا قوۃ! مولانا مرحوم ہنسنے لگے اور فرمایا تو تو بالکل دیوانہ ہے۔ آج جو سوچتا ہوں تو واقعی میں دیوانہ تھا۔ چند ہی روز میں یہ حقیقت مجھ پر منکشف ہوئی کہ جس شخص کو میں مغرور سمجھتا تھا وہ تو غریبوں اور کمزوروں کے سامنے اس طرح جھکتا تھا کہ شاید میں بھی نہ جھک سکتا، البتہ سرفرازوں کے مقابلے میں میں نے کبھی اس کی گردن کو جھکتے ہوئے نہیں دیکھا۔ قصہ مختصر یہ کہ اجمل خان اعظم سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ اور یہ وہی اجمل خاں تھے جن کی نیازمندی کو میں نے بعد کے بیس برسوں میں اپنی زندگی کا عزیز ترین سرمایۂ صد فخر و مباہات سمجھا! کس قدر پُرتمکین تھا اس کا ظاہر اور کس قدر لذت بخش، روح پرور، پاکیزہ اور دل نواز تھا اس کا باطن۔ اُن کی عمر کا نصف آخر ایک درویشی کا عالم تھا۔ خود ہی اپنی مجنونی زندگی کے اس راز کی جانب یوں اشارے کیا کرتے تھے کہ!

تو شیریں کار باش و باز بنگر سر خرامے را ۔۔۔ کہ من در زیرِ دلقِ خود قبائے کوہ کن دارم

نہاں در سینہ دارم آفتاب داغ سوزاں را ۔۔۔ بیا اے شعلہ رو بنگر چراغ زیرِ داماں را

یہ چراغ زیرِ داماں ہر کس و ناکس کے روبرو ہمیشہ زیرِ داماں ہی رہا، اُن کی فطرت اپنی نمود سے بہت گھبراتی تھی۔ ان کی جلوت میں سنجیدگی اور متانت کی حدود ہمیشہ قائم رہتی تھی۔ لیکن خلوت میں وہ عجیب و غریب انسان اپنی انسانیت کے چہرے سے نقاب کا ایک گوشہ اٹھا دیا کرتا تھا۔ مگر صرف ایک ہی گوشہ! پوری طرح تو وہ کبھی خلوت میں بھی بے نقاب نہ ہوا۔ آپ یہ یقین نہ

گفتگو ۲۳

کریں گے کہ میں نے اپنی عمر میں کبھی ایک دفعہ بھی نہ تو ان کو ایک دفعہ قہقہہ مار کر ہنستے دیکھا اور نہ ہی غیض و غضب کے لہجہ میں بات کرتے ہی ان دونوں انتہاؤں کے درمیان ایک بہت خفیف اور سدا بہار مسکراہٹ تھی جو ہر وقت اُن کے ہونٹوں پر کھیلا کرتی تھی، اور یہ مسکراہٹ ان کی فطرت کا آئینہ تھی۔

اس وقت نہ میں اُن کی سیاسی قیادت کا ذکر کر سکتا ہوں اور نہ ان کے فنی کمالات کی مثالیں پیش کر سکتا ہوں۔ لیکن البتہ اشعار میں اُن کی روح کا جو عکس کبھی کبھی ظاہر ہوا کرتا تھا، اس کے چند نمونے پیش کرتا ہوں، جن میں اُن کے احساسات اور افکار کے خد و خال واضح ہوتے ہیں۔ وہ مشاعروں کے شاعر نہ تھے۔ لیکن ان کی مخصوص محفلوں میں شعر و سخن کا چرچا ہمیشہ رہا کرتا تھا۔ شام کی محفل میں ایک طرف استادِ گرامی بیٹھے ہوئے تھے دوسری طرف مولانا ابو الکلام آزاد تشریف رکھتے۔ ایک پہلو میں حضرت سائل تشریف فرما ہوتے تھے اور دوسرے پہلو میں تاباں چہکتے ہوتے تھے۔ یہ محفل دہلی کی قدیم محفلوں کی آخری یادگار رہی جسے میری آنکھوں نے دیکھا اور جس کے مزے دل و دماغ نے اٹھائے۔ حکیم صاحب کی شاعری شاعروں کی شاعری نہ تھی وہ صرف اسی مختصر محفل تک محدود رہا کرتی تھی، اُن کا ایک دیوان تو ایک دفعہ دورانِ سفر میں سی۔ آئی۔ ڈی نے چرا لیا تھا۔ شاید یہ سمجھ کر کہ اس بیاض میں کوئی سیاسی راز مندرج ہوگا۔ وہ مجموعہ تو پھر کبھی ہاتھ نہ آیا، شاید اب بھی وہ گورنمنٹ کے کسی تہ خانے کی الماری میں بم کے نخوں اور انقلابیوں اور دہشت انگیزوں کی دستاویزوں کے ساتھ رکھا ہوا مل جائے۔ لیکن اس واقعہ کے بعد کا کلام خود میں نے جمع کر کے جرمنی کے ایک مطبع میں طبع کروایا تھا اور اب بھی وہ دیوانِ شیدا کے نام سے غالباً بازار میں ملتا ہوگا۔ اس مجموعہ کے چند اشعار آپ کو سناتا ہوں۔

جس طرح زندگی کے دوسرے مشاغل میں اسی طرح شعر و سخن کی محفلوں میں بھی حکیم صاحب کا کردار اور ان کے اجتہاد کی قوت ایسی نہ تھی کہ ان کے گرد و پیش کوئی شخص بھی اسے محسوس نہ کرتا ہو، ان کا وجودِ اخلاقی اتنا وزن اور وقار رکھتا تھا کہ بڑے بڑے زبان دانوں کی زبانیں بند ہو جایا کرتی تھیں۔ سیاسی زندگی کے میدان میں قدم رکھا تو شعر و شاعری بھی اس رنگ سے محروم نہ رہی۔ اپنی قوم اور ملک اور خصوصاً عالمِ اسلام کے متعلق جو جوش ان کی طبیعت میں تھا اس کا صحیح اندازہ سوائے خاص خاص احباب کے کسی کو نہ ہو سکتا تھا۔ پبلک کے سامنے ان کی تقریروں اور تحریروں کی سنجیدگی اُن کے اندرونی جوش اور ولولے کا صحیح پرتو نہ تھی۔ مگر کبھی کبھی شاعری کے تخیل میں وہ اپنے دل کی بھڑاس نکال لیا کرتے تھے اور اپنے جذبات سے بے اختیار ہو کر کھل جایا کرتے تھے۔ اور برطانوی سامراج کے خلاف یہ الفاظ ان کی زبان سے نکل جاتے تھے۔

بداں منزل کہ می دانی رسیدن آرزو دارم
شکستِ دشمنِ اسلام دیدن آرزو دارم

کہ تا برہم زنم بنیادِ ایں چرخِ ستم آئیں
بیا اے ہم نشیں آہے کشیدن آرزو دارم

چو بردید ز فیضِ خواجۂ یثرب پر و بالم
بسوئے اوجِ آزادی پریدن آرزو دارم

امان و مصطفےٰ کامل دو قطبِ چرخِ اسلام اند
فلک آسا بہ پیشِ شاں خمیدن آرزو دارم

یاکسی وقت اپنی ملت کی مایوس کن حالت سے بے چین ہوکر اپنی مایوسی کا ایک درد انگیز لہجہ میں یوں اظہار تے تھے۔

میں کہاں سے لاؤں دوائے دل میں کروں تو چارہ دِل کیا　　نہ اثر نوائے عراق میں نہ کشش حدیٔ حجاز میں

یا کبھی ان کی حق پرستی کا ولولہ ان کے قلم سے ایک پیامِ زندگی یوں لکھواتا تھا۔

آواز یہ مسلم کی مسلم کو سنا دینا　　اسلام کی عزت کو دل سے نہ بھلا دینا
شمشیر نہ ہو تو کیا اسلام تو باقی ہے　　اللہ کے نعروں سے دنیا کو ہلا دینا
ممکن نہیں اب ہم تم مل کر رہیں دنیا میں　　یہ فیصلۂ آخر یورپ کو سُنا دینا
قدرت ہے اگر ہم میں ہم تم کو مٹا دیں گے　　طاقت ہو اگر تم میں تم ہم کو مٹا دینا

خم خانۂ شعر و سخن میں ان کی شعر نوازی کیفیات قلب کا ایک بے پناہ تقاضا تھا جس سے وہ بچ نہ سکتے تھے۔ جب ایک ناقابل بیان کیف ان کے جذبات پر طاری ہوتا تھا تو وہ شعر کے پردوں میں اپنے لئے ایک راستہ بناتے تھے اور جب کبھی ان کے افکار عالیہ سنجیدگی اور اعتدال کی دیواروں کو ہلا دیتے تھے تو ان کے اشعار سے ایک ایسی مست کر دینے والی موسیقی پیدا ہوتی تھی جس کو بادی النظر میں ان کے نہایت سنجیدہ اور پُرتمکین ظاہر سے کوئی مناسبت نہ ہوتی تھی۔

ابر تند آمد بہ سر بر میگساران را چہ شد　　بادہ برافروخت ساغر بادہ خواران را چہ شد
چہرہ برافروخت شمعِ بزم پروانہ کجا است　　حسن از پردہ بروں شد بیقراران را چہ شد

تو آگہ نیستی از شورشِ عشقِ منِ شیدا　　کہ شور از آہ سوزان در دل پروانہ می ریزم

حکیم صاحب کو دلی یعنی ہندوستان کی تہذیب کے زوال کا بہت زیادہ احساس تھا اور وہ اپنی بے تکلف صحبتوں میں اکثر اس نقش آخری کا ماتم کیا کرتے تھے۔ از راہ خود بینی نہیں بلکہ ایک تاریخی نقطۂ نظر سے وہ خوب جانتے تھے کہ وہ خود تہذیب قدیم کی آخری نشانی ہیں اور دہلی کے گزرے ہوئے عہدِ اقبال کا آخری نقش ہیں۔

اب کہاں وہ مے کدے میں شب کی بزم آرائیاں　　اک سبو باقی رہا ہے وہ بھی کچھ ٹوٹا ہوا

بس ایک ذات حضرت شیدا کی ہے یہاں　　دہلی سے رفتہ رفتہ سب اہل ہنر گئے

خود اپنی زندگی کی روداد اس طرح بیان کرتے ہیں۔

روزِ ازل سے تا بہ ابد اپنی جیب کا　　تھا ایک تار جس کو میں بیٹھا سیا کیا

غرض کہ اس بدنصیب ملک کی زندگی میں وہ ایک شعلۂ مستعجل تھا جو میری آنکھوں کے سامنے ایک لمحہ بھڑکا اور غائب ہو گیا خود میری زندگی میں وہ ع

اک دھوپ تھی کہ ساتھ گئی آفتاب کے

گفتگو ۲۶

علی اختر

مولانا وحیدُالدین سَلیمؔ

مولوی وحید الدین صاحب سلیم سے میں یوں تو اُس وقت سے واقف ہوں جب نہ مجھے خود اپنے مستقبل کی خبر تھی اور نہ مولانا کسی ایسی منزل تک پہنچے تھے جو ابدیت کی سرحدوں سے مل جاتی ہے، یہ وہ زمانہ تھا۔ جب وہ علی گڑھ میں تھے اور وہاں ہندوستان کے منتخب ارباب علم و عقل کی صحبت میں ان کی غیر معمولی صلاحیتوں کی تربیت ہو رہی تھی۔ مولانا فارسی اور عربی کے اس قدیم مکتب کے تربیت یافتہ تھے جس میں بوریے پر بیٹھ کر اور استادوں کی جلیں بھر کر علم و یقین کی منزلیں طے کی جاتی تھیں۔ ان مکتبوں میں نہ دولت و ثروت کا کوئی تصور تھا، نہ حکومت و اقتدار کا کوئی سوال۔ سیدھی سادی زندگی کے اصول سکھائے جاتے تھے، اور استاد شاگردوں کی تعلیم سے بڑھ کر ان کی ذہنی ترقی اور نشو و نما کا خیال رکھتے تھے۔ خود میرے استاد مولانا نصیر الدین صاحب ایک صاحب دل اور صاحب اوقات بزرگ تھے۔ جن سے میں نے عربی اور فارسی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی ہے، وہ میرے گھر ہی پر تشریف رکھتے تھے، اور حال یہ تھا کہ اگر میں کسی وجہ سے کسی دن نہ پڑھ سکوں تو اس دن وہ میرے گھر پر کھانا نہیں کھا سکتے تھے۔ میرے بزرگوں کے اصرار پر فرمایا کرتے تھے کہ جب میں نے محنت نہیں کی تو صلۂ محنت حاصل کرنے کا مستحق میں کیونکر ہو سکتا ہوں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ گو فکر و دانش اور علم و آگاہی کے لحاظ سے انسان قدیم منزل حیات سے بہت آگے ہے لیکن وہ گہری نظر، فکر لبیط اور سیرت و اخلاق کا وہ اصول محکم کہیں نہیں پایا جاتا۔ غرض مولانا سلیم نے اسی مدرسے میں تعلیم پائی تھی اور اسی کا اثر تھا کہ ان کی زندگی نمائش و تکلف اور مصنوعی اصول حیات سے بالکل مختلف تھی۔ وہ ایک کمرے میں میلی سی چادر بچھائے بیٹھے رہتے تھے، اور جو لوگ ان کی خدمت میں حاضر ہونے کا تجربہ رکھتے تھے، انھیں معلوم تھا کہ یہیں علمی مسائل ہنس بول کر سمجھا دیے جاتے تھے۔ پُرانے بزرگوں کی ایک عادت یہ بھی تھی کہ موقع بہ موقع ظرافت اور خوش مزاجی سے بچوں کے لچکیلے ذہنوں پر کوئی دباؤ ڈالے بغیر مطالب واضح کر دیا کرتے تھے۔ مولانا بھی اپنی غیر معمولی ذہانت کے ساتھ نہایت خوش مزاج واقع ہوئے تھے اور میں نے خود دیکھا ہے کہ کسی سوال پر طالب علم ان سے اُلجھ رہے ہیں اور وہ ایک

زیرلب تبسم کے ساتھ ان کو جواب دیتے چلے جا رہے ہیں۔ میرے والد مرحوم سے چونکہ ان کے بہت قدیم تعلقات تھے۔ اس لئے حیدرآباد میں کبھی کبھی ہفتہ ہفتہ بھر وہ میرے ہی غریب خانے پر قیام رکھتے تھے، اکثر ایسا ہوا ہے کہ رات کا وقت ہے۔ مولانا صحن میں پلنگ پر لیٹے ہوئے ہیں اور ان کے سامنے کرسی پر بیٹھ کر ان سے باتیں کر رہا ہوں۔ ان باتوں میں عہدِ قدیم کے ارباب علم کے تذکرے بھی ہوتے تھے، شاعروں کے مقامات پر بھی گفتگو کی جاتی تھی اور فنِ شعر پر بھی بحثیں چھڑ جاتی تھیں۔ مذہبی اور قومی نظریوں پر بھی بات چیت ہوتی تھی۔ ایک ایسی ہی صحبت میں میں نے مولانا سے ان کی ابتدائی تعلیم کے حالات دریافت کئے۔ فرمانے لگے "اسے کیا پوچھتے ہو، آج سے ساٹھ ستر برس پہلے ادھر کا ہندوستان کچھ اور تھا۔ میں لاہور میں پڑھتا تھا، اور مجھے دو روپے مہینہ ملتا تھا، جس میں سے ایک روپیہ میں اپنی والدہ کو بھیجتا تھا اور ایک روپیہ اپنے لئے رکھتا تھا، غور کیجئے کیا زمانہ تھا، اور کتنے سکون سے گزر رہا تھا آج اس کا تصور بھی دشوار ہے کہ ایک روپیہ ماہانہ میں کوئی شخص اپنی زندگی گزار سکتا ہے۔

مولانا سلیم کو مولانا حالی سے عشق تھا، اس کی وجہ کچھ تو یہ تھی کہ مولانا حالی کی ذات سے پانی پت کو جو شہرت نصیب ہوئی وہ محتاج اظہار نہیں دوسرے مولانا حالی کی ذات بجائے خود اس عہد کے علم و عقل کا دریائے ناپیدا کنار تھی۔ ان کی سیرت و اخلاق کا جواب بھی زمانہ پھر پیش نہ کر سکا۔ ایک رات اس قسم کے مسائل پر بحث ہو رہی تھی اس میں موازنہ انیس و دبیر کا ذکر آ گیا، مولانا سلیم نے ایک قہقہہ لگایا اور پلنگ پر اٹھ کر بیٹھ گئے میں اس پر کچھ حیران ہوا اور میں نے دریافت کیا واقعہ کیا ہے مولانا کچھ دیر ہنستے رہے اور پھر فرمایا کہ دنیا بھی عجیب جگہ ہے لوگ موازنہ انیس و دبیر کو مولانا شبلی کی تصنیف قرار دیتے ہیں، حالانکہ مولانا شبلی کو اس سے دور کا تعلق بھی نہیں ہے۔ یہ تو مولانا حالی کے وہ چند ناتمام نوٹ ہیں جو وہ لکھنؤ کے ایک ہوٹل میں موازنہ کے متعلق انیس و دبیر کے مرثیے کو سامنے رکھ کر مجھے لکھواتے رہتے تھے، مولانا شبلی بھی اکثر ان صحبتوں میں شریک رہے ہیں اور چونکہ غیر معمولی ذہین تھے اس لئے اس تمام مواد کو لے اڑے اور قبل اس کے کہ مولانا حالی موازنہ انیس و دبیر کی تکمیل فرماتے مولانا شبلی نے انہیں بنیادوں پر موازنہ شائع کرا دیا اور تم جانتے ہو مولانا حالی نے اس کا کیا جواب دیا انھوں نے مولوی شبلی صاحب کو لکھا کہ آپ کی تصنیف بہت قابلِ قدر ہے آپ نے بہت سے الجھے ہوئے مسائل کو واضح کیا ہے میں خود بھی اس پر کچھ لکھنے کا ارادہ کر رہا تھا مگر حق یہ ہے کہ یہ کام آپ ہی کے لئے تھا، پہلے تو میں نے یہ خیال کیا کہ مولانا سلیم اپنی عادت کے مطابق کوئی لطیفہ بیان کر رہے ہیں لیکن میرے اصرار پر بڑی سنجیدگی سے انھوں نے اس کا یقین دلایا کہ یہ بالکل واقعہ ہے۔ انھوں نے مجھ سے کہا کہ میں وہ مسودات بھی دکھا سکتا ہوں جو میں نے اس وقت ترتیب دئے تھے اور وہ میرے پاس پانی پت میں محفوظ ہیں۔

ایک دن میں نے دریافت کیا کہ مولانا شاعری کی جو صلاحیت آپ میں ہے اُسے دیکھتے ہوئے مجھے اس پر تعجب ہے کہ آپ نے مولوی حالی اور مولوی شبلی صاحب کی طرح ایسی نظمیں نہیں لکھیں جو آپ کو انھیں کی طرح مقبول بنا دیتیں مولانا کچھ بے چین سے ہوئے اور کہنے لگے کہ اول تو شروع سے میں نے اس پر کم توجہ کی دوسرے مولوی حالی صاحب

کے مقابلہ میں میرا کیا مقام تھا۔ تیسرے برا ہوا اس غم روزگار کا کہ اس سے سر اٹھانے کی فرصت نہ مل سکی۔

اسی طرح ایک مرتبہ قدیم ارباب علم کا ذکر آیا اور گفتگو ڈپٹی نذیر احمد صاحب تک پہنچی، میں نے پوچھا "مولانا کیا یہ صحیح ہے کہ ڈپٹی صاحب اکبر حسین صاحب اکبر کی طرح بہت محتاط تھے؟"

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ سود بھی لیا کرتے تھے۔ کہنے لگے کہ یہ سب تو مجھے معلوم نہیں لیکن میں اپنا ایک تجربہ بیان کرتا ہوں، میری دو بھانجیوں کی شادی کا معاملہ تھا، دو مرتبہ میرے کہنے پر شادی کی تاریخ بڑھائی جا چکی تھی حالات کچھ ایسے تھے کہ سید صاحب کا ہاتھ بھی تنگ تھا، میری کچھ کتابیں پریس میں جا چکی تھیں لیکن ان کی رقم وصول ہونے میں بھی دیر تھی۔ آخری تاریخ کو جب چار پانچ روز رہ گئے تو مجھے یکایک ڈپٹی نذیر احمد کا خیال آیا اور میں پہلی گاڑی سے دہلی روانہ ہو گیا۔ اُن کے دولت کدہ پہ پہنچ کر میں نے اطلاع دی وہ کچھ لکھ رہے تھے، مگر کام چھوڑ کر فوراً باہر آ گئے اور مجھے دیکھ کر فرمایا۔ ارے بھائی وحید الدین تم کیسے آ گئے، خیریت تو ہے؟ میں نے عرض کیا سب خیریت ہے۔ میں اپنی ایک ضرورت سے حاضر ہوا ہوں اور مختصر الفاظ میں میں نے واقعہ بیان کر دیا، ڈپٹی صاحب اُلٹے پاؤں واپس ہوئے اور کوئی دس منٹ کے بعد باہر آئے۔ ہاتھ میں ایک تھیلی تھی اور پیچھے آدمی کھانا لئے ہوئے ساتھ تھا۔ میں نے پانچ سو روپے کا مطالبہ کیا تھا۔ چنانچہ وہ تھیلی انھوں نے مجھے دے دی اور فرمایا کہ اس میں آپ کی مطلوبہ رقم ہے، کھانا کھائیے اور گاڑی ایک گھنٹے کے بعد جاتی ہے، اس سے تشریف لے جائیے، میں چاہتا تھا کہ دو ایک روز آپ قیام کریں، لیکن شادی کی تاریخ قریب ہے۔ اس لئے آپ کو جانا چاہئے۔ یہ عرصہ گزر گیا۔ میں پانی پت سے علی گڑھ واپس ہوا اور کچھ ایسی صورتیں بن پڑیں کہ مجھے رقم امید سے زیادہ مل گئی۔ میں پانچ سو روپے لے کر فوراً ڈپٹی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا، مجھے دیکھتے ہی فرمانے لگے ارے بھائی اتنی عجلت کیا تھی، رقم بہر حال ادا ہو جاتی۔ میں نے کہا آپ نے جو احسان فرمایا ہے میں اس کا کیا شکریہ ادا کروں، چونکہ رقم مل گئی تھی اس لئے میں نے مناسب سمجھا کہ ادا کر دی جائے۔ ڈپٹی صاحب نے رقم لے لی اور اس میں سے پچاس روپے مجھے واپس دے اور فرمایا کہ یہ ہماری طرف سے بچیوں کی سلامی دینا۔ اس کے بعد مولانا سلیم کچھ دیر خاموش رہے پھر کہنے لگے کہ تم نے جو سنا ہے ایسی بہت سی باتیں میں نے بھی سنی ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ پرانے لوگ مردم شناس ہوتے تھے اور ہر شخص کے ساتھ اس کی سطح پر ملا کرتے تھے۔ ممکن ہے کہ ڈپٹی صاحب کسی کا مطالبہ پورا نہ کر سکے ہوں اور اس نے ان کے متعلق ایسے افسانے مشہور کر دئے ہوں اور بھی کسی کو بدنام کرنے کے لئے کسی کے اعزہ و اقربا کیا کم ہوتے ہیں۔ غرض ان صحبتوں میں ایسی بیسیوں باتیں بیان ہوتیں۔ بہت سے علمی مسائل پر گفتگو ہوتی اور فن شعر پر تقریباً ہر صحبت میں بحث ہو ہی جاتی تھی، میں نے قدیم فن شعر کے بعض رسوم و قیود کو ترک کر دیا ہے۔ چنانچہ میں ایطاء کا قائل نہیں ہوں، میں نے بعض تحریروں میں بھی ترمیم کی ہے لیکن مولانا باوجود ایک روشن خیال بزرگ ہونے کے اس سلسلے میں کسی اقدام پر تیار نہیں تھے۔

مولانا کے متعلق یہ بھی مشہور ہے کہ ان کی احتیاط بخل کی حد تک پہنچ گئی تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ حال ان سب بزرگوں کا

تھا جو عہدِ مغلیہ کی تباہی اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے۔ لیکن میرا تجربہ یہ ہے کہ میں جب کبھی مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا انھوں نے بغیر کچھ کھلائے واپس نہیں ہونے دیا۔ اگرچہ انھوں نے زندگی کی بے شمار فصلیں دیکھی تھیں اس کے باوجود وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ میرے اب صرف دو دوست ہیں۔ ایک بھائی والد اور دوسرے ڈاکٹر عبد الکریم، یہ ڈاکٹر عبد الکریم وہی بزرگ ہیں جو مدت سے ملیح آباد میں مقیم ہیں اور جن کے مکان پر مولانا نے طویل و شدید علالت کے بعد اس دارِ فانی کو خیرباد کہا۔ اس حقیقت سے بہت کم لوگ واقف ہیں کہ مولانا سلیم کی جزرسی اور احتیاط کے وجوہ کیا تھے۔ ان کے ذمہ ایک بڑے خاندان کی پرورش تھی، جن میں بیوائیں بھی تھیں اور یتیم بھی، اس کے ساتھ ان کی زندگی بھی ابتدا سے بہت سادہ رہی تھی، اس لئے ظاہری نمائشوں میں گم ہو جانے والوں کی نظروں میں وہ جچتے نہ تھے۔ میں اسے مانتا ہوں کہ مولانا سلیم نہ کوئی بہت بڑے شاعر تھے نہ ایسے عالم جن کو ان کے علمی فضائل سے دیکھا جاتا ہے لیکن جیسا کہ میں نے کہا ہے ایک تو انھیں مولانا حالی صاحب کی صحبت ہمیشہ حاصل رہی دوسرے وہ ایسی جگہ رہے جہاں ہندوستان کے بڑے بڑے اربابِ فکر جمع تھے اور انھیں کی صحبت نے ان کے ذوقِ علم کی پرورش کی۔ ان کو اردو کی تعمیر و تکمیل کی دھن تھی اور اس سلسلے میں انھوں نے جو خدمات انجام دی ہیں وہ ہرگز بھلائی نہیں جا سکتیں۔ بعض کے خیال میں وہ لا مذہب بھی تھے لیکن اس کی وجہ علی گڑھ کا وہ کھلنڈرا پن تھا جو اُن کے مزاج میں رچ گیا تھا، ورنہ میں نے ان سے حشر و نشر اور دوسرے مسائل پر بھی گفتگو کی ہے اور جب کبھی وہ سنجیدگی سے اس طرف آتے تھے تو اکابرِ مذہب کے نام بڑی عزت و احترام سے لیا کرتے تھے، اور ان بنیادی مسائل پر ان کی نظر بہت وسیع تھی۔ مولانا سلیم نے کافی عمر پائی، اپنی محبت سے وہ مقام حاصل کیا جس نے ان کو ہندوستان کے قدیم مشاہیر کی صفِ اول میں ایک ممتاز جگہ دی ہے۔ ہوا کا رخ بدل چکا ہے، اور اب اس کی کوئی امید نہیں کہ ایسے پابندِ وضع و منکسر اور مخلص افراد اس خاک کی سطح پر زندگی کی سانس لے سکیں۔

عزیز احمد

ای۔ ایم۔ فاسٹر

میں جب ۱۹۳۵ء میں تعلیم کے لئے یورپ گیا تو مولوی عبدالحق صاحب کا ایک تعارفی خط مسٹر ای۔ ایم فاسٹر کے نام لیتا گیا۔ اُس وقت تک میں نے اُن کا کوئی ناول نہیں پڑھا تھا، اس لئے خط پڑا رہا اور میں نے کئی مہینوں تک اسے بھیجا بھی نہیں۔ سرما کی چھٹیوں میں جب میں پیرس جا رہا تھا اور رود بار انگلستان بہت طوفانی تھا، میں نے ان کے ناول (Passage to India) یا سفرِ ہند کو پڑھنے کی کوشش کی۔ میں نے اس سے پہلے ہندوستان کے متعلق کپلنگ کے ناول پڑھے تھے اور میں سمجھتا تھا کہ یہ ناول زیادہ سے زیادہ کپلنگ کا ردِعمل ہوگا۔ لیکن فاسٹر کے اس ناول کا انصاف، اس کا طنز، اس کی انسانی رواداری، اس کا چھپتا ہوا اخلاص یہ سب ایسی خصوصیتیں تھیں کہ میں مسحور سا رہا۔ پیرس پہنچ کر اسی رات میں نے ناول پورا پڑھ ڈالا۔ اور اس کا خاتمہ آج تک ذہن میں گونجتا ہے۔ اس صدی کے دوسرے عشرے میں متوسط طبقے کے انگریز اور ہندوستانی میں دوستی ناممکن تھی۔ فیلڈنگ اور ڈاکٹر عزیز کی آخری جدائی جدید انگریزی ناول نگاری کے شاہکاروں میں ہے، ہندوستانی ڈاکٹر کا یہ دعویٰ تھا کہ ہندو مسلمان اور سکھ سب ایک ہو جائیں گے اور ہندوستان کو آزاد کرائیں گے اور اس وقت ایک انگریز اور ایک ہندوستانی میں دوستی ممکن ہو سکے گی۔

یہ صورتِ حال پھر فاسٹر ہی کی یاد دلاتی ہے جن کے نزدیک انسان اور انسان کی دوستی سے زیادہ مقدس کوئی اور رشتہ نہیں۔

تعطیلات کے خاتمے پر جب میں دوبارہ لندن پہنچا تو میں نے مولوی صاحب کا تعارفی خط فاسٹر کو بھیجا اور اُن سے ملاقات کی درخواست کی، انھوں نے فوراً جواب دیا، وہ اس زمانے میں بہت علیل تھے۔ صحت یابی کے لئے اور تبدیلِ آب و ہوا کے خیال سے ولٹ شائر جا رہے تھے۔ انھوں نے لکھا کہ جب وہ لندن آئیں گے تو مجھے خود ہی اطلاع دیں گے تاکہ میں اُن سے مل لوں۔ مسٹر فاسٹر اس کے بعد ولٹ شائر سے برِاعظم یورپ چلے گئے۔ کئی مہینے گزر گئے۔ یہاں تک کہ ایک دن خلافِ توقع مجھے اُن کا ایک خط ملا۔ جس کا مضمون یہ تھا۔ "میں بہت دنوں سے اس کی کوشش کر رہا ہوں کہ آپ سے ملاقات کا

کوئی انتظام کروں۔ ایک موقع بہرحال نکل آیا ہے اگر آپ کو فرصت ہو تو اگلے اتوار یعنی ۴ر اکتوبر کو میں لندن آرہا ہوں اور مجھے بڑی خوشی ہوگی اگر آپ ذرا اول وقت آجائیں۔ اور میرے ساتھ چائے پی لیں۔ ۲۶ برونزوک اسکوائر میں چار بجے آجائیے شام کو مجھے کہیں اور جانا ہے مگر ہمیں بات چیت کرنے کو گھنٹے بھر کے قریب وقت مل سکے گا۔ برنزوک اسکوائر تو آپ جانتے ہوں گے۔ آپ کی رہائش گاہ سے بالکل قریب ہے۔ بہتر یہ ہوگا کہ آپ مجھے ایک چھوٹی سی چٹھی بھیجدیں کہ آپ آسکیں گے یا نہیں۔ اسی برونزوک اسکوائر کے پتے پر۔ آپ کا مخلص ، ای۔ ایم ، فاسٹر

میں نے فوراً شکریے کے ساتھ ان کی دعوت قبول کرلی۔ ان کا خط مجھے ۲ر اکتوبر کو ملا تھا۔ میں قریب ہی ٹارنگٹن اسکوائر میں رہتا تھا۔ میں فوراً برونزوک اسکوائر پہنچا۔ نمبر ۲۶ پر میں نے اُن کا نام دیکھا۔ لیکن اس فلیٹ کو انھوں نے فارسٹر نہیں بلکہ فاسٹر کے نام سے رکھا تھا۔ آلڈس ہکسلے نے بھی اس طرح ایک فلیٹ اپنا نام ذرا بدل کر لے رکھا تھا۔ انگلستان کے یہ مشاہیر یہ احتیاط اس لئے کرتے ہیں کہ ان کے قدردان ان کو زیادہ نہ ستائیں۔

۴ر اکتوبر کو میں فارسٹر صاحب سے ملنے کو چلا تو لندن اور خصوصًا بلومسبری پر وہ سناٹا چھایا ہوا تھا جو ہر اتوار کی خصوصیت ہے۔ میں نے ان کی ہدایت کے مطابق گھنٹی کا کھٹکا دبا دیا۔ ایک معمّر آدمی نے جو سیاہ سوٹ پہنے تھا اور جس کے سر کے چھدرے بالوں اور چہرے کی تراش سے میں نے فوراً پہچان لیا کہ مسٹر فارسٹر یہی ہیں۔ نیم استفہامیہ اور نیم استقبالیہ لہجے میں پوچھا "مسٹر احمد" اور پھر مصافحہ کرکے ایک صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ فوراً حیدرآباد میں ایک ایک کا حال پوچھنے لگے۔ اور مجھے یہ احساس ہوا کہ میں ان کو برسوں سے جانتا ہوں۔ چائے آئی اور اس کے ساتھ صرف توس، مکھن اور پنیر تھی۔ کہنے لگے کچھ دن ہوئے مجھے لیڈی حیدری نے گاجر کا حلوا بنوا کے بھیجا تھا، مجھے ہندوستان کی تمام مٹھائیوں میں گاجر کا حلوا بہت پسند ہے۔ پھر سر راس مسعود کا ذکر کرنے لگے۔

میں نے چائے پینے کے کمرے کے چاروں طرف نظر ڈالی، کمرے میں بالکل معمولی آرائش تھی اور ظاہر ہوتا تھا کہ مسٹر فارسٹر اس کو صرف لندن کے قیام کے زمانے میں استعمال کرتے ہیں۔ ایک ایرانی قالین تھا جو وہ ہندوستان سے لے گئے تھے۔ ایک چھوٹا سا شیلف تھا۔ میں نے بڑے اشتیاق سے کتابوں پر نظر ڈالی۔ محض یہ دیکھنے کے لئے کہ کن کن مصنفوں کا اس بے مثل ناول نگار پر اثر ہے۔ کچھ نئی کتابیں تھیں جو غالبًا ریویو کے لئے آئی تھیں۔ ان کے سوا زیادہ تر یونانی ڈرامے تھے اور ورڈسورتھ کے کلام کا مجموعہ اور ان کتابوں کو دیکھ کر مجھے استفہام کا جواب مل گیا۔ یونانی ڈرامے اور ورڈسورتھ فارسٹر کا فلسفۂ حیات زیادہ تر انھیں سے متعلق تھا۔

میں نے جدید انگریزی شاعری کا ذکر چھیڑا۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کے مداح ضرور تھے۔ مگر میں نے ان کی تعریف میں کوئی خاص جوش نہیں دیکھا، کچھ عرصے بعد ان کے مضامین کے مجموعے (Abinger Harvest) میں ٹی۔ ایس ایلیٹ کا ذکر پڑھا تو اسی تاثر کی تصدیق ہوئی۔ وہ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کی شاعرانہ شعبدہ گری کے قائل ضرور تھے۔ مگر یونان اور انسان کا ان پر اتنا اثر تھا کہ اینگلو کیتھولک تحریک میں انھیں اپنے لئے کوئی قدر مشترک نہیں مل سکتی تھی

گفتگو ۳۳

پھر انگلستان کے نوجوان شاعروں کا ذکر چھڑا۔ ڈے لیوس کے متعلق کہنے لگے کہ وہ تو اشتمالی جماعت کا رکن بھی ہے۔ آڈن کے بھی بہت معترف تھے۔ آڈن اور اشروڈ کا ڈرامہ (On the Frontier) ان کے پاس ریویو کے لئے آیا تھا۔ اس پر انھوں نے جو ریویو لکھا تھا وہ مجھے پڑھنے کے لئے دیا، ٹیلیفون کی گھنٹی بج رہی تھی اور وہ باتیں کرنے کے لئے چلے گئے۔

جب واپس آئے تو کہا تم کو معلوم ہوگا آج بہت بڑی فاشسٹ ریلی تھی اور ایسٹ انڈین فاشسٹوں اور لیبار یوں کے درمیان جھڑپ کا اندیشہ تھا۔ ابھی پولیس کے انسپکٹر کا ٹیلی فون آیا تھا۔ جھگڑا تو نہیں ہوا کشیدگی ہے۔ میں نے اور کچھ تفصیلات پوچھیں، سیاسیات کے بارے میں میں ان سے بحث نہیں کرنا چاہتا تھا، عام طور پر اُن کا شمار لیباریوں میں ہے، مگر ان کا اصلی فرقہ انسانیت اور اُن کی پارٹی تمام بنی نوع انسان ہے۔ گفتگو کا موضوع خود انھوں نے بدلا، کہنے لگے تم نے اشروڈ کے کوئی ناول پڑھے ہیں۔ اس وقت تک میں نے نہیں پڑھے تھے، میں نے کہا انگلو میکسن سے فرصت ہی نہیں ملتی۔ بہت ہنسے اور کہنے لگے۔ اشروڈ ہمارے ہونہار نئے لکھنے والوں میں ہے اور آگے چل کر وہ بہت ترقی کرے گا۔ آج اشروڈ ہالی وڈ کے قریب یوگی بن چکا ہے۔ فارسٹر کی انسانیت پرستی میں البتہ کوئی فرق نہیں آیا، اُس دن جب میں مسٹر فارسٹر سے رخصت ہو کر باہر نکلا تو برونسوک اسکوائر کے موڑ پر پیدل روش پر چاک سے ہتھوڑے اور درانتی کا نشان بنا ہوا تھا۔ یہ فاشسٹ ریلی کا ردعمل تھا۔

اس کے بعد لندن میں متعدد مرتبہ فارسٹر صاحب سے ملاقاتیں ہوئیں، میں نے اُن کے سب ناول پڑھ ڈالے۔ اور اُن کے ناولوں میں جو چیز میں کبھی نہیں بھول سکتا وہ جرأت رندانہ کی دعوت ہے، یہ دعوت کہ ایک مرتبہ تو قید اور بند توڑ کر ناممکن بات کر جاؤ، ناممکن عمل میں اپنے آپ کو جھونک دو، ان کا یہی ایک پیغام بے انتہا حرکی ہے اور ایسے ناول نگار کے یہاں جس نے یونان کے ڈرامے سے اس قدر سکون و نظم و ضبط سیکھا ہے بڑا حیرت ناک ہے، اُن کے تمام ناولوں میں میں نے ہمیشہ دیکھا کہ ایک نہ ایک کردار روحانی طور پر ذرا پُر اسرار ہوتا ہے، مجھ سے کہنے لگے کہ کیا کروں، یہ روحانیت بالکل ہندوستان کی لال مٹی کی طرح ہے۔ اس کا رنگ ملبوس پر لگ ہی جاتا ہے۔ یونان سے انھوں نے انسانی جسم کے حسن اور تناسب کی ستائش سیکھی۔ مگر وہ ان کے ناولوں میں اس قدر شائستہ ہے کہ آلڈس ہکسلے کے طنزیہ عریاں بیانات کے بالکل متضاد معلوم ہوتی ہے۔

ایک مرتبہ میں نے انھیں شفیع کے ریسٹوران میں رات کے کھانے پر مدعو کیا، کہنے لگے مجھے شامی کباب اور چپاتیاں بہت پسند ہیں ان کے سوا کچھ اور نہ کھاؤں گا، اس دن بڑی دیر تک یونان کے ڈرامہ نگاروں کا ذکر کرتے رہے، میں نے کہا آپ نے بہت کم ناول لکھے ہیں، مگر انگلستان کی نئی پود پر جتنا اثر آپ کا ہے اتنا آلڈس ہکسلے کے سوا اور کسی کا نہیں کہنے لگے کہ یہ پبلک اسکول کی تعلیم کا اثر ہے، جس زمانے میں میں کیمبرج میں پڑھتا تھا، میں نے یونانی ادب سے بہت سی چیزیں سیکھیں، مثلاً الفاظ کی قدر و قیمت، ذہنی اور علمی مباحثے کی اہمیت، معلوم نہیں تم نے ڈکنس کی کوئی کتاب پڑھی ہے یا نہیں وہ میرا ہم جماعت رفیق اور

دوست تھا۔

میں نے کہا کہ میرے خیال میں یونانی ڈرامے کا اثر آپ کے ناولوں کے مکالمے پر پڑا ہے۔ آپ کے مکالموں میں بڑی وضاحت ہے اور کردار نگاری کی صنعت بھی آپ کے یہاں انگلستان کی روایت سے ذرا مختلف ہے۔ آپ کے کردار محسوس ہوتے ہیں۔

کہنے لگے اس میں پلاٹ سازی کے کرتبوں کو بھی ذرا دخل ہے، لیکن بے شک میں یونانی ڈرامے سے بہت متاثر ہوا ہوں، کلاسیکی نثر میں کہیں کہیں ایک دم شاعری کا چشمہ پھوٹ نکلتا ہے۔

میں نے کہا یہ تو میں نے (Passage to India) اور (Howards End) پڑھنے میں بار بار محسوس کیا پھر میں (Passage to India) کا ذکر کرتا رہا۔ میں نے بعض حصوں کی تعریف کی اور یہ بھی کہا کہ ہندوستانی عورتوں خصوصاً پردہ نشین عورتوں کے متعلق جو مناظر ہیں اُن میں میرے خیال میں واقعیت زیادہ نمایاں نہیں، انھوں نے اس کو تسلیم کیا پھر میں نے کہا، بعض ہندوستانیوں کا یہ بھی خیال ہے کہ آپ کا ناول ہندوستانی زندگی کی تصویر مجموعی طور پر پیش نہیں کرتا مگر یہ توقع بھی تو غلط ہے کہ ایک ناول بجائے زندگی کے ایک باب کے کسی ملک کی پوری زندگی کی عکاسی کرے۔ فارسٹر صاحب نے میری تائید کی۔

پھر کہنے لگے یہ نتیجہ نکالنا غلط ہوگا کہ میرے ذہن اور فن کی تعمیر بالکل غیر اینگلو سیکس عناصر سے ہوئی ہے۔ مجھ پر بہت سے انگریز ناول نگاروں کا اثر ہوا ہے۔ ڈی فو، رچرڈسن، جیکوسنس، لارنس۔ مجھے وہ دوسرا لارنس بھی بہت پسند ہے عربوں کا لارنس اور باہر کے ناول نگاروں میں ٹالسٹائی اور ہنری جیمس۔

ایک مرتبہ میرے اصرار پر یونیورسٹی کالج لندن کی ایک انگریزی انجمن اتحاد میں انھوں نے ایک مقالہ پڑھنا منظور کیا جس کا عنوان تھا "برج عاج"، "یا ہاتھی دانت کا مینار" یہ اصطلاح اس زمانے میں صحافت میں عام طور پر استعمال ہونے لگی تھی اور اس سے ادب کے وہ رجحانات مراد تھے جن میں زندگی سے گریز یا فرار کی کوشش کی جاتی ہے۔ اب وہ زمانہ آگیا تھا کہ یورپ پر جنگ کے بادل امڈتے ہی چلے جاتے تھے۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے اس زمانے میں ذہنی کش مکش سے ہار کر (Connection) کو بند کردیا یہ زمانہ مسٹر فارسٹر کے لئے بھی جاجیت اور سفید آدمی کے بوجھ کے زمانے والے جہاد سے زیادہ نازک اور مہیب جہاد کا تھا۔ انھوں نے اس زمانے میں وہ بے مثل تلقین کی کہ وہ مختلف اقوام یا ممالک یا نسلوں کے آدمیوں کے درمیان انفرادی اور شخصی دوستی ان ممالک کی باہمی جنگ اور خون ریزی سے زیادہ پائدار ہے۔ ان کی انسان پرستی نے اس زمانے میں ذاتی تعلقات اور شخصی خلوص کو اس تیرہ و تاریک دنیا میں امید کی شعاع اور مستقبل کی کرن قرار دیا۔

دوسری جنگ عظیم نے بہت سے انسانیت دوست ادیبوں کی طرح فارسٹر کی کمر توڑ دی (Passage to India) کا جو ایڈیشن ([illegible]) میں شائع ہوا۔ اس میں انھوں نے ذرا یاسیت کے انداز میں لکھا کہ یہ ان کی زندگی میں اس کتاب کا آخری ایڈیشن ہوگا۔ (اس کے بعد بھی وہ ایک مرتبہ ہندوستان آئے میری بدقسمتی تھی کہ وہ جس زمانے میں حیدرآباد آئے میں یہاں نہیں تھا اور تجدید ملاقات نہ ہو سکی)

گفتگو ۳۴

ڈاکٹر یوسف حسین خاں

مولانا محمد علی

مولانا محمد علی مرحوم کی شخصیت میں بلا کی کشش تھی، وہ دوسروں کو اپنی طرف اس طرح کھینچتے تھے جیسے مقناطیس لوہے کو کھینچتا ہے۔ چونکہ طبیعت میں تصنع نام کو نہ تھا اس لئے ہر شخص سے چاہے بڑا ہو یا چھوٹا کھل کر ملتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جو شخص ان سے ایک دفعہ مل لیتا تھا تو دوبارہ ملنے کی آرزو اس کے دل کو گدگداتی رہتی تھی۔

میں نے مولانا کو پہلی مرتبہ ۱۹۲۱ء میں دیکھا اور اسی زمانے میں پہلی مرتبہ ان سے ملا۔ ان سے مل کر ہمیشہ میری یہ خواہش رہی کہ ان کے فیض صحبت سے جتنا مستفیض ہونا ممکن ہو اس میں کوتاہی نہ کی جائے۔ لیکن مجھے اس کا موقع بہت کم مل سکا۔ اس لئے کہ اس کے تھوڑے ہی دن میں وہ قیدِ فرنگ میں گرفتار ہو گئے۔ لیکن کئی سال گزرنے کے بعد پھر انھیں قریب سے دیکھنے اور ان کے ساتھ رہنے کے مواقع مل گئے۔

اسکول کی طالب علمی کے زمانے میں میرے دل و دماغ پر "ہمدرد" کے مضمون کا بڑا اثر تھا۔ پھر اس کے علاوہ پہلی جنگ عظیم کے دوران میں اپنی نظر بندی اور قید میں مولانا نے جو غزلیں لکھیں اور جن کی اشاعت اس زمانے میں ہوتی رہی ان سے میرے جذبات متاثر ہوئے۔ چونکہ اس عمر میں حافظہ اچھا تھا اور سینکڑوں اشعار یاد تھے۔ مولانا کے بھی بہت سے اشعار خود بخود بلا کسی کوشش کے یاد ہو گئے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میری ذہنی اور جذباتی تربیت میں ان اشعار کا اچھا خاصا اثر تھا۔ ان میں سے بعض اشعار مجھے آج تک یاد ہیں اور کبھی کبھی یادوں میں ابھر آتے ہیں۔ ان میں سے چند یہ ہیں:

ہم تک بھی دورِ جام پھر آئے تو کیا عجب
یہ بھی نہیں ہے گردشِ چرخِ کہن سے دور

فصلِ گل کے متمنی تو سبھی ہیں اے چرخ
کیا ضروری تھا کہ اک مرغ گرفتار بھی ہو

سنتے ہی جس کو خلق میں کہرام مچ گیا — جوہر یہ میری ہی تو کہیں داستاں نہ ہو

مولانا محمد علی جوہر کی وہ مشہور غزل جس میں قیدِ تنہائی کی تصویر کھینچی ہے مجھے پوری کی پوری یاد تھی - اب بھی چند شعر یاد ہیں۔

تنہائی کے سب دن ہیں تنہائی کی سب راتیں — اب ہونے لگیں ان سے خلوت میں ملاقاتیں

معراج کی سی حاصل سجدوں میں ہے کیفیت — اک فاسق و فاجر میں اور ایسی کراماتیں

مولانا مرحوم نے جب دہلی سے دوبارہ "کامریڈ" اور "ہمدرد" جاری کئے تو میں دونوں اخباروں کا خریدار تھا۔ ان کی تحریر کا اک اک لفظ غور سے پڑھتا تھا۔ جس سے مجھے بڑا فائدہ ہوا اور جس کا احساس مجھے اُس وقت تک نہ ہوا بلکہ بعد میں کبھی کبھی ان سے دہلی جا کر ملتا رہتا تھا۔ جب جامعہ دہلی آگئی تو مولانا سے ملنے کے مواقع بہ نسبت پہلے کے زیادہ ہو گئے، چھوٹوں سے اس طرح ملتے تھے کہ ان کی محبت انھیں گرویدہ کر لیتی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دل میں اخلاص محبت کا جو طوفان موج زن تھا اس کی لہریں بلا فرق و امتیاز ہر شخص کو اس کے ظرف کے مطابق سیراب کرتی تھیں ایک اور بات جو ہم سب لوگ ان کی صحبت میں محسوس کرتے تھے وہ یہ تھی کہ وہ اپنی حوصلہ افزائی سے ہر ایک کے جوہر کو نکھارنے کی کوشش کرتے تھے ۔ اس وقت ملک میں بہت سی ایسی نمایاں شخصیتیں ہیں جن کے جوہر مولانا محمد علی جوہر کے فیضِ صحبت ہی سے اُجاگر ہوئے۔

اگرچہ مولانا سے میری جو ملاقاتیں رہیں وہ سرسری سی تھیں لیکن ان کی عظمت کا نقش میرے دل میں گہرا ہوتا گیا۔ ان کی تحریر و تقریر نے میرے ذہن و جذبات کی جلا کی۔ چونکہ میں دل سے ان کی عظمت کی قدر کرتا تھا اس لئے ان کی ہر بات میں میرے لئے ایک دل پذیری تھی۔

زمانہ گزرتا گیا۔ خلافت اور ترک موالات کی تحریکیں بھی شروع ہوئیں اور ختم بھی ہو گئیں کبھی فرقہ واری آندھیاں اٹھیں اور کبھی سیاست کا مطلع صاف ہوا۔ غرضکہ زندگی کی دھوپ چھاؤں کی مبہم کیفیات میرے دل و دماغ پر مرتسم ہوتی رہیں۔ ذاکر صاحب کی جرمنی سے واپسی کے بعد میں ۱۹۲۶ء میں تعلیم کی غرض سے یورپ چلا گیا اور جامعہ پیرس میں شریک ہو گیا۔ یورپ کی زندگی کی رنگا رنگی اور ہمہ ہمی نے ہندوستان کی یادوں کے بہت سارے نقوش کو مدھم کر دیا۔ کئی سال تک مولانا کی کوئی تحریر پڑھنے کا بھی اتفاق نہ ہوا۔ لیکن دل میں مولانا کا احترام جو اپنا مقام پیدا کر چکا تھا وہ بدستور برقرار رہا۔

میں پیرس کی سار بون یونی ورسٹی کے قریب گلیون کے مشہور رمیوزیم کے بازو والی سڑک پر رہتا تھا۔ ایک دن صبح سویرے کسی نے میرا دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں سمجھا ملازم ہوگا جو روزانہ صبح کمرہ پر ناشتہ لاتا تھا۔ میں نے بستر ہی میں لیٹے لیٹے پکارا "انترے" یعنی دروازہ کھول کر اندر آجاؤ۔ دروازہ کھلا تو کیا دیکھتا ہوں کہ مولانا محمد علی اپنی مخصوص بالوں دار ٹوپی اور جبہ پہنے ہوئے تشریف لا رہے ہیں۔ میں ہڑبڑا کر بستر سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ مولانا حسب معمول بڑی محبت سے بغل گیر ہوئے۔ میں مبہوت تھا۔

یہ ایکدم سے کہاں سے تشریف لے آئے۔ میں اسی سوچ میں تھا کہ انھوں نے بعض ظریفانہ فقروں سے میرے تحیّر کو بے تکلفی میں تبدیل کردیا۔ میں نے مولانا کے سامنے صوفے کی کرسی پیش کی جو میرے کمرے میں تھی اور معمولی کرسی پر باز و خود بھی بیٹھ گیا۔ طالب علم کا کمرہ آپ جانتے ہیں کیا ہوتا ہے؟ کہیں کتابوں کا ڈھیر ہے اور کہیں اور سامان بے ترتیبی سے پڑا ہوا ہے۔ میں نے مولانا سے معذرت کی۔ بہت ہنسے۔ اپنی طالب علمی کے زمانے کے حالات بیان کرنے لگے۔

ہندوستان میں جب کبھی مولانا سے ملنے کا موقع ملا تو ہمیشہ وہ بڑی محبت سے پیش آتے لیکن اب اس موقع پر ان کی گفتگو میں برابر والوں کی سی بے تکلفی تھی۔ اپنی پوری داستان سناتے رہے، سفر میں کس کس کو ڈانٹا اور کس کس سے خاص ملاقاتیں رہیں جب بولتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ خوش بیانی کا دریا امڈ رہا ہے جس کے اور چھور کا پتہ نہیں۔ گفتگو میں واقعات کے بیان کے علاوہ ظرافت اور خوش بیانی کی چاشنی بڑا مزہ دیتی تھی۔ مولانا کی بے تکلفی نے میرے لئے ان کے درمیان خورد اور بزرگی کے سارے حجابات اٹھا دئے لیکن پھر بھی میں اپنی گفتگو میں محتاط تھا اور مولانا تھے کہ قصے پر قصے سنائے جا رہے تھے۔

پھر ایک دم مجھ سے پوچھا کہ وقت کیا ہوگا۔ میں نے کوٹ کی جیب سے گھڑی نکال کر دیکھی تو نو کے قریب تھے۔ مجھ سے کہنے لگے چلو جھٹ پٹ تیار ہو جاؤ، شاہد سہروردی سے ملنا ہے۔ میں نے کہا نیچے ڈرائنگ روم میں جو سب کے لئے مشترک تھا تشریف لے چلئے۔ کہنے لگے نہیں میں نہ بیٹھوں گا تم شیو کرلو۔ میں شیو کرنے گیا تو جلدی میں ایک بلیڈ لگ گیا اور دیر تک خون نکلتا رہا۔ مولٰینا نے بعد میں دیکھا تو کہنے لگے اتنی جلدی کرنے کو میں نے تھوڑی کہا تھا۔

تیار ہونے کے بعد میں نے اپنے لئے اور مولانا کے لئے ناشتہ منگایا۔ ناشتہ کے بعد ہم لوگ باہر نکلے۔ سامنے گلیونی کا میوزیم نظر پڑا۔ مولانا نے اس میوزیم کی جو ازمنۂ وسطیٰ میں فرانس کی مشہور خانقاہ تھی تاریخ بیان کرنی شروع کردی۔ میں اگرچہ تقریباً دو سال سے گلیونی میوزیم کے قریب رہتا تھا لیکن مجھے اتنی تفصیل سے اس خانقاہ کی تاریخ نہیں معلوم تھی جس تفصیل سے مولانا نے بیان فرمائی۔ پھر اس ضمن میں اس زمانے کے یورپ کی خانقاہوں، تحریک اصلاح مذہبی اور نشاۃ ثانیہ کے متعلق بڑی بصیرت افروز گفتگو کرتے رہے۔ ایک ٹیکسی کرائے پر لے کر ہم لوگ شاہد سہروردی کے پاس پہنچے جو بوائے بولون کے قریب رہتے تھے۔ گھنٹہ بھر کے قریب ٹھہرے، دوپہر کا کھانا ان کے ساتھ کھایا۔ وہاں سے مولانا کے ہوٹل پر پہنچے۔ جو پیرس کے بہترین علاقے شان زلزے کے قریب تھا۔ مجھ سے فرمانے لگے کہ "میں تین روز پیرس میں ٹھہروں گا۔ تمہارا ہرج تو ہوگا لیکن بغیر تمہارے ترجمانی نہیں ہوسکے گی۔ میں نے کہا کہ میں ہر خدمت کے لئے حاضر ہوں۔ چنانچہ ان تین دنوں میں میں صبح سے شام تک برابر مولانا کے ساتھ رہا۔

ترکی اور ایران کے سفیروں سے جو مولانا کی ملاقاتیں ہوئیں ان میں میں نے مولانا کی فرانسیسی زبان میں ترجمانی کی۔ اس لئے کہ یہ دونوں حضرات انگریزی گفتگو نہیں کرسکتے تھے۔ مولانا نے فارسی میں بھی تھوڑی دیر تک ایرانی سفیر سے گفتگو کی لیکن بعد میں وہ اردو میں کہتے جاتے اور میں فرانسیسی میں ترجمہ کرتا جاتا تھا۔ مولانا تین چار روز کے قیام کے بعد پیرس سے لندن تشریف لے گئے۔

گفتگو ۳۴

مولانا نے پیرس سے جو متعدد خطوط اپنے عزیزوں اور احباب کو لکھے ان میں میرے متعلق بہت محبت سے ذکر کیا ہے۔ مجھے ان خطوط کا علم اس وقت ہوا جب مولانا کے انتقال کے بعد یہ کتابی شکل میں مکتبہ جامعہ سے شائع ہوئے۔

میں نے مولانا سے کہا تھا کہ تعطیلات میں تین ماہ کے لئے میرا ارادہ لندن میں آکر رہنے کا ہے۔ چنانچہ لندن پہنچ کر مولانا نے مجھے لکھا کہ وہ جس مکان میں ہیں اس کا ایک کمرہ خالی ہے وہ میرے لئے محفوظ کرا لیا ہے۔ چنانچہ میں بھی لندن پہنچ گیا۔ اور کیونڈش روڈ پر اسی مکان میں ٹھہرا جس میں مولانا پہلے سے تشریف رکھتے تھے۔ مجھے اب مولانا کو بے حد قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اکثر ہوتا ہے کہ دور سے جو چمک دکھائی دیتی ہے وہ قریب سے اتنی نمایاں نہیں رہتی، لیکن یہاں معاملہ برعکس تھا۔ مولانا سے قریب رہ کر ان کی خدمت کا جو موقع ملا اسے میں اپنی زندگی کا نہایت قیمتی زمانہ تصور کرتا ہوں۔ صبح سے شام تک ساتھ رہتا تھا، کھانا ساتھ، رہنا ساتھ، ٹہلنے کے لئے ساتھ جانا سوائے ان اوقات کے جب کہ میں انڈیا آفس یا برٹش میوزیم جاتا تھا۔ میرا پورا وقت مولانا کے ساتھ گزرتا تھا۔ ایک شام میں اور مولانا قریب کے سینما کے پاس سے گزرے۔ وہاں "شیخ اور شیخ کا بیٹا" (شیک اینڈ دی سن آف شیک) کا تماشا دکھایا جا رہا تھا۔ اشتہار میں عربستان کی زندگی کے منظر دکھائے گئے تھے۔ مولانا نے فرمایا چلو دیکھیں کیا تماشا ہے۔ میں نے ٹکٹ خریدے تماشا گاہ کے اندر گئے، فلم بڑی کاوش اور خرچ سے تیار کیا گیا تھا۔ مولانا کو پسند آیا۔ وقفے کے بعد ہم دونوں گیلری میں آکر ٹہلنے لگے۔ ہمیں دیکھ کر نوجوان لڑکیوں نے "شیک اینڈ دی سن آف شیک" کے گیت گانے شروع کر دئے اور ہم دونوں کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ مولانا انگلستان میں بھی عربی جبہ جو ابن سعود نے نذر کیا تھا پہنتے تھے، اور ایک ٹھیٹھ عرب معلوم ہوتے تھے، وقفہ دس منٹ کا تھا، اس دس منٹ میں مولانا نے اس سینما کے تمام نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو اپنی ظرافت اور گفتگو سے گرویدہ کر لیا تھا۔ چنانچہ تماشا ختم ہونے کے بعد تقریباً ایک درجن اشخاص ہم لوگوں کے ساتھ ٹہلتے ہوئے مکان تک چھوڑنے آئے۔

ایک اس سینما کے واقعے پر کیا کم ہر شب روز یہی ہوتا تھا کہ کلپہم کامن میں ٹہلنے گئے ہیں، کسی سے جان پہچان نہیں لیکن چند منٹ کے اندر ان کے گرد مجمع نظر آتا تھا۔ میں شروع میں خیال کرتا تھا کہ چونکہ مولانا کا لباس عربی وضع کا ہے جس کو دیکھنے کے اہل انگلستان عادی نہیں ہیں شاید اس سبب سے لوگ مولانا میں دلچسپی لیتے ہیں۔ لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ یہ خیال غلط تھا۔ میں نے لندن میں اور بعض مواقع پر عربی لباس پہنے ہوئے لوگوں کو دیکھا لیکن کوئی ان کی جانب توجہ نہیں کرتا تھا۔ دراصل مولانا کی باتوں میں ایسی دلکشی تھی کہ لوگ خود بخود ان کی طرف کھنچتے تھے۔ حالانکہ اکثر اوقات میں نے دیکھا کہ وہ انگریز قوم کی برائیاں برملا انگریزوں کے سامنے بیان کرتے تھے لیکن پھر بھی لوگ برا نہیں مانتے تھے۔

ایک روز مسٹر ٹامس آرنلڈ مولانا سے ملنے آئے۔ مولانا نے انھیں ایسے آڑے ہاتھوں لیا کہ وہ چکرا گئے خصوصاً خلافت کے مسئلے کے متعلق انھیں سر ٹامس آرنلڈ کے خیالات سے سخت اختلاف تھا۔ لیکن باوجود اس اختلاف کے میں کچھ عرصہ بعد جب سر ٹامس سے ملا تو وہ مولانا کی قابلیت اور ان کے کیریکٹر کی تعریف میں قصیدہ خواں تھے۔ اس سے سر ٹامس آرنلڈ کی بھی شرافت ظاہر ہوتی ہے کہ رائے کے اختلاف نے انھیں تنگ نظر نہیں بنا دیا۔ جیسا کہ ایسے حالات میں اکثر ہوتا ہے۔

جارج برنارڈ شاہ اور ایچ۔جی۔ ویلس سے مولانا کے دوستانہ تعلقات تھے، ان دونوں نے انھیں اپنے ہاں مدعو کیا۔ دعوت سے
واپسی پر دونوں کی تعریف کرتے تھے، اور برنارڈ شاہ کو آدھا مسلمان کہا کرتے تھے، چنانچہ فرماتے تھے کہ برنارڈ شاہ نے ان سے کہا کہ "اگر
میں کوئی مذہب قبول کرتا تو یقیناً وہ اسلام ہوتا لیکن میں روایتی مذہب ہی کو غیر ضروری سمجھتا ہوں۔

انگلستان سے بغرض علاج جرمنی جانے سے قبل مولانا نے لندن کے مشہور ہوٹل سیوائے میں اپنے قدیم انگریز دوستوں
اور پارلیمنٹ کے بعض اراکین کو لنچ پر مدعو کیا تھا، اس موقع پر انھوں نے جو تقریر کی تھی۔ اس کی تعریف میں نے انگریزوں سے
سنی اور یہ کہتے ہوئے سنا کہ انگریزی زبان پر ایسی قدرت شاید انگریزوں میں بھی چند ہی لوگوں کو ہوگی۔

۱۹۳۰ء میں ہندوستان واپس آنے کے بعد میں جب کبھی دہلی جاتا تو مولانا سے قرول باغ میں ملنے جاتا۔ جہاں انھوں نے
ایک مکان کرایہ پر لے رکھا تھا۔ اکثر بیمار اور مالی حالت سے پریشان رہتے تھے، لیکن طبیعت کا وہی جوش وہی خلوص برابر قائم رہا۔
ان سے مل کر آدمی محسوس کرتا تھا کہ خود اس کی شخصیت میں کسی چیز کا اضافہ ہوگیا۔ بعض لوگوں سے مل کر آدمی محسوس کرتا ہے
کہ اس کی شخصیت کے عناصر میں کسی چیز کی کمی ہوئی" یہ لوگ جن کی صحبت میں ایسا احساس پیدا ہو چھوٹے قسم کے لوگ ہوتے ہیں،
مولانا کی صحبت میں جیسا انشراح قلب ہوتا تھا۔ ویسا میں نے اپنی زندگی میں بہت کم لوگوں کی صحبت میں محسوس کیا۔

مولانا کی بعض ادائیں بچوں کی سی معصومانہ تھیں، لندن میں جس ڈاکٹر کے زیر علاج تھے اس نے ذیابیطس کی شکایت
کی وجہ سے میٹھا کھانے کی سخت ممانعت کی تھی، ڈاکٹر جانتا تھا کہ مولانا کو میٹھا بے حد مرغوب ہے چنانچہ ایک مرتبہ جب کہ میں بھی
مولانا کے ساتھ ڈاکٹر کے ہاں گیا تھا تو اس نے مجھے علیحدہ بلا کر تاکید کی کہ تم مولانا کو میٹھا نہ کھانے دینا۔ میں نے کہا بہت اچھا،
پوری کوشش کروں گا، کچھ دنوں بعد جو میڈ مولانا کے کمرے کو صاف کرتی تھی، اس نے مجھ سے کہا کہ ان کے بستر میں تکیے
اور چادر کے نیچے ہمیشہ چاکلیٹ نکلتے ہیں۔ میں سمجھ گیا کہ یہ مجھ سے چھپانے کی کوشش ہے، چنانچہ ایک دن میں نے ہنسی
ہنسی میں ان چاکلیٹوں کا ذکر کر دیا، بہت ہنسے کہنے لگے کہ تمھیں کیسے خبر ہوئی، میں نے بتلا دیا کہ میڈ سے معلوم ہوا۔
کہنے لگے کہ اب میڈ کو رشوت دوں گا کہ آئندہ کسی کو نہ بتلائے۔

مولانا کی طبیعت میں انسانیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، ان کے انداز میں ایک معصومانہ بچپن پایا جاتا تھا، جو آخر تک موجود رہا۔
اور جس کی وجہ سے بھی ان میں بلا کی مقناطیسی قوت پیدا ہوگئی تھی جس سے ہر کس و ناکس متاثر ہوتا تھا۔ مولانا کی شخصیت میں علم و
عمل کی جو صلاحیتیں موجود تھیں ویسی قدرت شاذ و نادر ہی عطا کرتی ہے، وہ اگرچہ پکے دیندار مسلمان تھے لیکن ان کے
دل میں انسانیت کا درد تھا، جو حقیقی مسلمان کی شان ہونی چاہیے۔ ان کی پوری زندگی حق و صداقت کے قیام اور ظلم و
تعدی کے انسداد کے لیے وقف رہی۔ کسی شاعر نے ان کی زندگی کو ایک سر پھرے ملاح سے خوب تشبیہ دی ہے، جو عمر بھر طوفان
سے چوکھی لڑتا رہا، اور جس کو کبھی لحظہ بھر کے لیے بھی چین اور آرام نصیب نہیں ہوا، مولانا کی زندگی میں اقبال کے
"مرد مومن" کی ایک جھلک نظر آتی ہے جس کی جلالی اور جمالی کیفیات اجتماعی سرسبزی کی ضامن ہوا کرتی ہیں۔

گفتگو ۳۹

جانکی پرشاد صاحب

مولوی عنایت اللہ

ملازمت کے سلسلے میں ۱۹۲۱ء میں میرا تقرر سررشتہ تالیف و ترجمہ جامعہ عثمانیہ میں ہوا تھا، یہ وہ زمانہ تھا جب کہ جامعہ عثمانیہ اپنے ابتدائی اور آزمائشی دور سے گزر رہا تھا۔ اور اس پر تعلیمی دنیا کی نظریں لگی ہوئی تھیں، جامعہ عثمانیہ کا پہلا زینہ دارالترجمہ کا قیام تھا، جب میں ملازمت میں منسلک ہوا اس وقت دارالترجمہ کے ناظم مولوی محمد عنایت اللہ مرحوم تھے، کوئی چودہ سال مولوی صاحب کی ماتحتی کا شرف حاصل رہا۔ اس طرح مولوی صاحب کی شخصیت کا مجھے قریب سے مطالعہ کرنے کا کچھ موقع ملا۔

مولوی عنایت اللہ مرحوم سے اکثر و بیشتر طالب علمانہ سوالات کر کے میں اپنی علمی تشنگی بجھالیا کرتا تھا۔ اس ضمن میں مولوی صاحب مرحوم اپنے حالات زندگی بھی بیان کرتے جو اپنی نوعیت سے اس قابل ہیں کہ یہاں کئے جائیں۔

اس کے علاوہ اواخر اکتوبر ۱۹۲۹ء میں مولوی عنایت اللہ مرحوم کے ساتھ سرکاری کام کے سلسلے میں دہلی جانا ہوا جہاں مولوی صاحب کے خاندانی مکان واقعہ کوچہ چیلان میں دو ہفتے قیام کرنے کا موقع ملا۔ وہاں مولوی صاحب کے چھوٹے بھائی مولوی رضا اللہ صاحب سے ملاقات ہوئی۔ جن سے مولوی عنایت اللہ مرحوم کی بعض ایسی خصوصیات بھی معلوم ہوئیں جو اس زمانے میں مشکل سے کسی میں پائی جاتی ہیں۔

مولوی عنایت اللہ مرحوم کے چند دلچسپ اور موثر سوانح حیات جو کچھ خود ان کی اور کچھ ان کے عزیز و اقارب کی زبانی معلوم ہوئے اور بعض اپنے ذاتی تاثرات بیان کرنے کی سعادت حاصل کی جاتی ہے۔

مولوی عنایت اللہ چل بسے اور سب کو دیر سویر چل بسنا ہے مگر آپ کی پاک ستھری اور علمی زندگی دوسروں کے لئے مشعل راہ رہے گی۔ سچ یہ ہے کہ مولوی عنایت اللہ نے اپنے قابل فخر اساتذہ کی تعلیم اور صحبت سے پورا پورا فائدہ اٹھایا تھا جس کی بدولت ہندوستان کے چوٹی کے ادیب، بہترین مصنف، فن ترجمہ کے اعلیٰ ماہر اور اردو زبان کے سب سے زیادہ کامیاب مترجم مانے جاتے ہیں۔ مولوی صاحب نے جو بے نظیر اور محققانہ کتابیں ترجمہ و تالیف کیں یہ سب سرسید مرحوم کی تربیت کا اثر اور اپنے فاضل پروفیسروں کی تعلیم کا نتیجہ تھیں، سرسید مرحوم کی دوربین نگاہیں ان میں جو جوہر قابل دیکھ رہی تھیں اور وہ ایسے ہی ثابت بھی ہوئے۔ اسی وجہ سے سرسید کو ان سے بے حد تعلق اور لگاؤ تھا۔ چنانچہ مولوی عنایت اللہ کے پاس سرسید مرحوم کا ایک خط

گفتگو ۔۴

دیکھنے میں آیا جس میں سرسید نے تحریر فرمایا تھا کہ:

"تمہارے نام کے ساتھ مدرستہ العلوم کا رہنا بلاشبہ تمہاری خوشی کا باعث ہوگا لیکن میری سمجھ میں تمہارے نام کے ساتھ کالج کا نام رہنا کالج کی عزت کا باعث ہے۔ اگر کالج کے بچے ایسے ہوں جیسے تم ہو تو کون شبہ کر سکتا ہے کہ کالج کو اس سے فخر و اعزاز نہ ہوگا۔"

مولوی رضاء اللہ صاحب کا بیان تھا کہ مولوی عنایت اللہ مرحوم بچپن ہی سے سعادت مند، نیک طینت، اطاعت شعار، صفائی پسند اور وضع دار تھے مولوی عنایت اللہ کی والدہ محترمہ کو مولوی صاحب کے والد منشی ذکاء اللہ صاحب ہر ماہ چند اشرفیاں دیا کرتے تھے۔ اپنے والد کے انتقال کے بعد مولوی صاحب پابندی کے ساتھ اپنی والدہ کو ان کی زندگی تک اتنی ہی تعداد میں اشرفیاں دیتے رہے تاکہ والدہ کو خرچ کی کوئی تکلیف محسوس نہ ہو۔

مولوی صاحب عمر بھر مجرد رہے اس لئے شفقتِ پدری کی فطری محبت ان میں نہ ہونی چاہئے تھی لیکن کیفیت یہ تھی کہ ان کے ایک عزیز دوست مولوی سید حامد علی صاحب کے انتقال کے بعد ان کے تمام بچوں کی تعلیم و تربیت کے آپ خود کفیل رہے اور بچوں کے ساتھ ایسا سلوک اور برتاؤ تھا کہ مولوی سید حامد علی صاحب کی اولاد کبھی یہ محسوس نہ کر سکی کہ ان کے سر سے ان کے والد کا سایہ اُٹھ گیا ہے۔

سن شعور کو پہنچنے کے بعد مولوی صاحب کبھی مسجد یا عیدگاہ تشریف نہیں لے گئے اس لئے گمان ہوگا کہ وہ لامذہب ہوں گے مگر حقیقت یہ ہے کہ گھر میں اکثر اوقات یہ دیکھنے کا اتفاق ہوا کہ صبح سویرے اپنا کمرہ بند کئے نہایت خضوع و خشوع کے ساتھ بارگاہ ایزدی میں سجدے کر رہے ہیں۔

وہ فرقہ وارانہ یا کسی اور قسم کی دل آزارانہ باتوں سے ہمیشہ اجتناب کرتے تھے اور اپنی محفل میں کسی کو اس قسم کی باتیں کرنے کی اجازت بھی نہیں دیتے تھے۔

مولوی عنایت اللہ کو بچپن ہی سے علی گڑھ میں سرسید مرحوم کی صحبت نصیب ہوئی تھی اور سرسید کی طرز معاشرت اور ان کے گرد و پیش کی صفائی اور لطافت کا مولوی عنایت اللہ کے ننھے دل پر اس قدر گہرا اور دیرپا اثر ہوا کہ وہ اسے تمام عمر نہ بھولے اور اسی عمر سے یہ شوق پیدا ہوا کہ انھیں بھی ایسی ہی صفائی کے ساتھ رہنا چاہئے اور ان کے گرد و پیش کی چیزیں بھی اتنی ہی مہذب اور لطیف ہونی چاہئیں جیسی وہ علی گڑھ میں سید صاحب کے ہاں دیکھ چکے تھے۔ بعد کی زندگی میں ان کی یہ خواہش طبیعت ثانیہ بن گئی تھی۔ مولوی صاحب اگرچہ سادگی کے ساتھ رہتے تھے مگر کھانے، پینے، پہننے، اوڑھنے، لکھنے پڑھنے غرض ہر چیز میں سلیقہ اور صفائی اور لطافت کا خاص طور پر خیال رکھتے تھے۔

صاف، سلیس اور نہایت بامحاورہ ترجمہ کرنے کی جیسی حیرت انگیز قابلیت قدرت نے ان کو ودیعت کی تھی۔ اس میں ہندوستان بھر میں ان کا کوئی اور مثل شاید ہی ملے۔ صفحوں کے صفحے پڑھتے چلے جایئے کہیں کوئی مشکل اور غیر مانوس لفظ نہیں ملے گا اور پھر مشکل سے مشکل اور ادق سے ادق کتابوں کا ترجمہ ایسی روانی کے ساتھ کرتے تھے کہ دیکھ کر بے انتہا حیرت ہوتی تھی کہ

مرتبہ مولوی صاحب نے فرمایا کہ "انگریزی لٹریچر پڑھنے کا لطف ہی جاتا رہا کیونکہ جب کوئی کتاب ہاتھ میں لیتا ہوں تو بجائے انگریزی الفاظ کے انکا اردو ترجمہ ہی دماغ میں گشت کرنے لگتا ہے۔

مولوی صاحب اکثر کہا کرتے تھے کہ ترجمے کی مشکلات کچھ ایسی ہوا کرتی ہیں کہ کتنی ہی محنت اور دماغ سوزی کی جائے نہ مترجم کو اطمینان ہوتا ہے اور نہ پڑھنے والا خوش ہو کر آسانی سے مطلب سمجھتا چلا جاتا ہے۔ مگر اس سعی لاحاصل سے بھی کسی طرح چارہ نہیں دل نہیں مانتا کہ کوئی اچھی کتاب ہے خواہ کسی کی ہے اور وہ اپنی زبان میں نہ ہو۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کون سی کتاب اتنی اچھی ہے کہ ترجمہ کے لئے اسے منتخب کیا جائے، اس خصوص میں مولوی صاحب بہت خوش قسمت رہے۔ سر سید مرحوم، نواب مسعود جنگ مرحوم، نواب سر امین جنگ بہادر، نواب صدر یار جنگ بہادر، سر اکبر حیدری اور مولوی محمد عبد الرحمٰن خاں صاحب سابق صدر کلیہ جامعہ عثمانیہ جیسے جوہر شناسان علوم و معارف کی تحریک پر مولوی صاحب نے متعدد کتابیں ترجمہ یا تالیف کیں۔

مولوی عنایت اللہ کے مشہور تراجم و تالیفات کی فہرست طویل ہے، ترجمے کے شوق کی ابتدا ڈاکٹر آرنلڈ کی "پریچنگ آف اسلام" سے ہوئی تھی۔ جس کا ترجمہ سر سید کی فرمائش پر آپ نے "دعوتِ اسلام" کے نام سے کیا تھا۔ آپ کا دوسرا شاہکار "اندلس کا تاریخی جغرافیہ" ہے۔ یہ کتاب مولوی صاحب کی ایک عمر کی کاوش کا سرمایہ ہے۔ اہلِ علم حضرات کی رائے ہے کہ ایسی بے نظیر اور بلند پایہ کتاب اندلس کے متعلق کسی زبان میں موجود نہیں ہے۔ اگر مولوی عنایت اللہ اور کچھ بھی نہ لکھتے تو یہ دونوں کتابیں علمی دنیا میں آپ کا نام زندہ رکھنے کے لئے کافی تھیں۔

اس سلسلے میں فن ترجمہ سے متعلق کچھ عرض کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

ترجمہ میں مشکلات صرف علمی اصطلاحات تک ہی محدود نہیں رہتیں، ایک زبان کا طرزِ بیان، ادائے مطلب کے اسلوب، محاورات وغیرہ دوسری زبان سے بالکل جدا ہوتے ہیں۔ جو الفاظ اور جملے اجنبی زبان میں بالکل معمولی اور روزمرہ کے استعمال میں آتے ہیں ان کا ترجمہ جب کوئی دوسری زبان میں کرنے کو بیٹھے تو سخت دشواری پیش آتی ہے، ان تمام دشواریوں پر غالب آنے کے لئے مترجم کو کیسا کچھ خونِ جگر پینا نہیں پڑتا، ترجمے کا کام جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کچھ آسان کام نہیں ہے۔ بہت خاک چھاننی پڑتی ہے تب کہیں گوہرِ مقصود ہاتھ آتا ہے۔ انگلستان کے ایک بڑے عالم کا قول ہے کہ "اپنا ہی خیال اپنی زبان میں صحیح طور پر خوبی سے بیان کرنا مشکل ہوتا ہے۔ چہ جائے کہ غیر کا قول غیر زبان میں کہا ہوا اپنی زبان میں ادا کرنا۔

مولوی عنایت اللہ مرحوم کی صحبت میں ترجمے کے متعلق اور خصوصیت کے ساتھ انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کرنے کی بابت جن دو چار باتوں سے آگاہی ہوئی ان کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

مترجم کا فرض ہے کہ اصل مطلب سمجھ کر اپنی زبان میں صفائی اور سلاست سے اسے بیان کرے، جہاں تک ممکن ہو اپنی زبان کی خوبی سے بے پرواہ نہ ہو، اردو نو عمر زبان ہے اس میں اسم و فعل جس قدر قریب ہوگا اسی قدر زبان فصیح ہوگی، جس قدر ضمیریں کم آئیں گی اس قدر مطلب جلد سمجھ میں آئے گا، بار بار پیچھے مڑ کر دیکھنے میں راہ کھوٹی نہ کرنی پڑے گی، پرانے انشا پردازوں کے ہاں

فقروں کا طول قیامت خیز ہوتا ہے اور اب بھی اگر ضرورت ہے تو اس سے پرہیز نہیں، ایسی صورتوں میں مترجم کا کام ہے کہ فقرے کو اس کے اجزا میں تحلیل کر دے۔

گو مترجم کیسا ہی ماہر فن ہو مگر کسی خاص کتاب کا ترجمہ شروع کرنے سے پہلے اس کو چاہئے کہ وہ اس کے مضمون سے ضرور آشنا ہو جائے۔ اس مضمون پر اور کتابیں کبھی مشکل اور کبھی آسانی سے مل جائیں گی۔ ضرورت اس کی ہوگی کہ بہت سا وقت ان کے مطالعے میں صرف کیا جائے جب مضمون پر اس کو قدرت ہوگی تو پھر ترجمے کے وقت مصنف کے منھ سے بات نکلتے ہی وہ سمجھ جائے گا کہ آگے کیا لکھنا چاہتا ہے۔ اب اس کو ترجمہ کرنا آسان ہو جائے گا۔ اور جو کچھ لکھے گا اس میں صحت، روانی اور بے تکلفی پیدا ہو جائے گی۔ کوئی کتاب کا تا وقتیکہ اس کے مضمون سے اور کتابیں پڑھ کر اپنے کو مانوس نہ کر لیا جائے ہرگز ترجمہ شروع نہ کرنا چاہئے۔ مطالعہ اور مطالعہ بھی زیادہ۔ اچھا ترجمہ کرنے کے لئے ضروری شرط ہے۔

ترجمہ کرنے کے بعد اس کو پڑھئے، کمرہ بند کرکے زور زور سے اس کو پڑھئے۔ پڑھنے میں جہاں زبان رکے سمجھ لیجئے کہ خامی ہے اس پھانس کو نکالئے۔

ترجمہ کو عام طور پر آسان کام سمجھا جاتا ہے بعض لوگ مترجم کی نقل نویس سے زیادہ عزت کرنے کو ایک ناواجبی سی بات سمجھتے ہیں۔ مگر ترجمہ آسان کام نہیں خاص کر انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرنا اور ایسا ترجمہ کرنا کہ وہ ایک مستقل تصنیف ہو۔ نہایت دشوار ہے! انگریزی اور اردو زبانوں میں کچھ ایسا اختلاف ہے کہ اسے بیان کرتے بن نہیں پڑتا۔ واقعہ یہ ہے کہ جہاں ایک قوی زبان سے کسی کمزور یا نوعمر زبان میں خیالات منتقل کرنے کی خدمت کسی کے سپرد ہوتی ہے تو یہ خدمت تصنیف سے بھی اکثر مقاموں پر کئی چند دشوار ہو جاتی ہے، وقت اور دماغ مصنف سے بھی زیادہ مترجم کو صرف کرنا پڑتا ہے اور مترجم کی خدمت ایک علمی خدمت ہوتی ہے۔ نقل نویسی نہیں رہتی۔ مترجم کو کم و بیش وہی مدارج طے کرنے پڑتے ہیں جو مصنف کے ہیں۔ بشرطیکہ وہ اپنے ترجمے کو اپنی زبان میں وہی عزت بخشنی چاہتا ہو، جو انگریزی زبان میں انگریزی کتاب کی ہے، جو لوگ ترجمے کو آسان سمجھتے ہیں ان کو یا تو ترجمہ کا تجربہ نہیں یا علم کی قدر نہیں۔

مترجم شکریہ کا مستحق نہ ہو لیکن اگر دنیا میں مترجم نہ ہوتا تو روئے زمین پر علم کی جھیلیں اور دریا تو بہتیرے ہوتے، مگر ان کو ملا کر علم کا بحر ناپیدا کنار بنانے والا کوئی نہ ہوتا۔

مرزا فرحت اللہ بیگ

مشاہیر سے ملاقات

اس وقت میں ان پرانے نقشوں کو آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں جو اب تک میری نظر سے گزرے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی عرض کئے دیتا ہوں کہ آپ اس تقریر سے اتنا لطف نہ اٹھا سکیں گے جتنا اس مضمون پر دوسرے لوگوں کی تقریروں سے اٹھا چکے ہیں یا آئندہ اٹھانے والے ہیں۔ چند مشاہیر کا ایک خاکہ سا آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں تاکہ ان کا اور ان کی مجلس کا رنگ آپ کی آنکھوں کے سامنے پھر جائے تو پھر بسم اللہ سنئے، جہاں تک میری یاد کام کرتی ہے دہلی کے مشاہیر میں سب سے پہلے جن سے میں ملا ہوں وہ حکیم محمود خاں مرحوم ہیں۔ ایسا حکیم ہندوستان اب تک نہ پیدا کر سکا۔ نہایت وجیہ اور خوبصورت آدمی تھے۔ بہت گورا رنگ تھا۔ سر پر پٹے تھے گول بھری ہوئی داڑھی تھی جس کو یہ روزانہ کئی دفعہ چڑھاتے تھے۔ جامہ زیبی غضب کی تھی۔ کسرتی بدن تھا۔ نہایت سفید ململ کا انگرکھا، سفید پائجامہ اور دوپلی ٹوپی پہنتے تھے۔ مطب میں آتے تو معلوم ہوتا تھا کہ فرشتۂ رحمت آ گیا ہے۔ طبیعت میں غصہ بہت تھا۔ لیکن غریبوں کے آگے یہ حد سے زیادہ جھکتے تھے۔ ان کے اوصاف معلوم کرنے ہیں تو مولانا حالی مرحوم کا وہ مرثیہ دیکھئے جو حکیم صاحب کے انتقال پر انھوں نے لکھا ہے۔

تو صاحب ایک روز کا ذکر ہے کہ مطب گرم تھا۔ سینکڑوں مریض سلسلہ وار بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک صاحب آکر آخری صف میں ٹک گئے۔ مگر کھانس کھانس کر سارے مطب والوں کا ناک میں دم کر دیا۔ ہوتے ہوتے ان کا بھی نمبر آیا۔ انھوں نے اپنی بپتا بیان کی۔ دنیا بھر کا علاج کر چکا ہوں۔ کھانسی کسی طرح نہیں جاتی۔ حکیم صاحب نے نسخہ لکھ کر ان کے حوالہ کیا۔ انھوں نے نسخہ پڑھا اور کہا واہ حکیم جی واہ یہ نسخہ تو میں کئی مہینے تک پی چکا ہوں، رتی بھر فائدہ نہیں ہوا۔ جیب میں سے نسخوں کی ایک گڈی نکالی اور اس میں سے چھانٹ کر ایک نسخہ حکیم جی کے حوالہ کیا۔ دیکھا تو واقعی دونوں نسخوں میں رتی برابر فرق نہیں تھا۔ حکیم جی نے کہا میاں تمھارے اور میرے نسخہ میں یہ فرق ہے کہ میرے نسخہ کے اوپر ہوالشافی لکھا ہوا ہے اور تمہارے یہاں صرف دو لکیریں ہیں۔ بھلا جس نسخہ پر اللہ کا نام نہ ہو وہ کیا خاک فائدہ کرے گا۔ ان صاحب نے اعتراض کیا۔ حکیم صاحب نے بڑی نرمی سے کہا، میاں پیو تو دو تین روز کے بعد آکر کیفیت بیان کرنا، خدا کی قدرت دیکھئے کہ تیسرے روز پھر نبض دکھلانے میں مطب گیا۔ وہ صاحب بھی آئے۔ بالکل اچھے تھے۔ کھانسی نام کو نہیں تھی۔ حکیم جی کے دونوں ہاتھ پکڑ کر رونے لگے اور بہت کچھ

ترکیب کی اور آخر میں کہا۔ حکیم صاحب یہ بتایئے کہ یہ کیا بات ہے کہ یہ نسخہ پہلے اثر نہ کرے اور اب مرض کو جڑ مول سے اکھیڑ کر پھینک دے۔ حکیم صاحب نے کہا میاں بات یہ ہے کہ دوا وقت پر کام کرتی ہے۔ جن حکیم جی نے پہلے تم کو یہ نسخہ دیا تھا وہ دوا کا اثر تو جانتے تھے لیکن یہ نہیں جانتے تھے کہ یہ دوا کس وقت دینی چاہیے۔ چیز وقت پر کام کرتی ہے ورنہ تم جانتے ہی ہو کہ اور تو اور بے وقت کی راگنی بھی بُری معلوم ہوتی ہے۔ اس کے بعد میری طرف دیکھ کر کہنے لگے "میاں صاحب زادے' سمجھے وقت پر پڑھنا، وقت پر کھیلنا۔ یہ سبق میرے لئے تو کیا ساری دنیا والوں کے لئے ہے۔ مگر اللہ کے فضل سے عمل کون کرتا ہے۔

حکیم محمود خاں کے صاحبزادے حکیم عبدالمجید خاں مرحوم ہیں۔ نباضی میں ان کا جواب آج تک پیدا نہیں ہوا۔ یہ اتنے وجیہ تو نہیں تھے لیکن دہلی کے خوبصورت لوگوں میں شمار کئے جاتے تھے۔ ورزش سے بدن بنا ہوا تھا۔ سرخ و سفید رنگ تھا۔ سیاہ داڑھی تھی مگر ذرا ہلکی۔ یہ بھی انگرکھا پہنتے تھے مگر اکثر اس پر صدری ہوتی تھی۔ آنکھوں میں بلا کی روشنی تھی۔ اور طبیعت بھی ویسی ہی تیز تھی۔ ان کا طب یونانی آیورویدک پر بڑا احسان ہے۔ انھوں نے اس طبیہ کالج کی بنیاد ڈالی جن کو ان کے چھوٹے بھائی حکیم اجمل خاں نے تکمیل کو پہنچایا۔ اور اس کی وجہ سے ہزاروں اچھے اچھے طبیب اور وید ہندوستان میں پیدا ہو گئے۔ حکیم عبدالمجید خاں کے مطب کا بھی ایک واقعہ سن لیجئے۔ ایک روز میں بیمار ہو کر نبض دکھانے ان کے ہاں گیا۔ ان کے مطب کا یہ رنگ تھا کہ وہاں چھوٹے بڑے میں فرق نہیں کیا جاتا تھا۔ جو جس نمبر سے آتا اسی نمبر سے بیٹھتا۔ اُس روز ایک صاحب آئے۔ شیروانی زیب تن تھی۔ سر پر دستار، کمر میں گیلوس تھا۔ پہلے تو انھوں نے اگلی صف میں جگہ نکالنے کی کوشش کی مگر جب اُس میں ناکامی ہوئی تو سلسلہ میں آ کر جم گئے۔ ہوتے ہوتے ان کی نبض دیکھنے کا نمبر آیا۔ انھوں نے نہایت ادب سے ایک اشرفی نذر کی۔ حکیم جی نے کہا کہ "مطب میں میں فیس نہیں لیا کرتا"۔ انھوں نے جواب دیا کہ مفت میں کوئی بھی دل لگا کر علاج نہیں کرتا۔ حکیم جی نے کہا مجھے بھی آزما لیجئے۔ یہ کہہ کر انھوں نے نبض دیکھنے کے بعد کہا۔ فرمایئے کیا حال ہے۔ اب وقت کی بات دیکھئے کہ ان کے منہ سے نکل گیا کہ "حکیم جی اگر میں نے حال بیان کیا تو آپ نے نبض ہی کیا دیکھی۔ مجید خاں سے یہ بات کہی جائے اور ان کو تاؤ نہ آئے۔ کہنے لگے کہ آپ بیٹھ جایئے میں آپ کی نبض آخر میں دیکھوں گا۔ میں نے دل میں کہا "میاں فرقت ذرا ٹھہر جاؤ اب مزہ آئے گا۔" چنانچہ میں نبض دکھا کر ایک کونے میں جا بیٹھا۔ جب سب مریضوں سے حکیم جی نبٹ چکے تو کہا صاحب اب آپ آیئے۔ وہ سامنے جا بیٹھے، حکیم صاحب بڑی دیر تک ان کی نبض دیکھتے رہے اس کے بعد کہنے لگے۔ فرمایئے اب آپ اپنا حال کہتے ہیں یا میں کہوں۔ انھوں نے کہا آپ ہی فرمایئے۔ مجید خاں نے کہا۔ دیکھئے جہاں میں غلطی کروں فوراً مجھے ٹوک دیجئے۔ یہ نہ ہو کہ آپ اس معاملہ میں میری رعایت کریں۔ اس کے بعد انھوں نے مریض کا حال بیان کرنا شروع کیا۔ کہ "پہلے تم کو یہ مرض ہوا۔ اس کے بعد یہ ہوا۔ اس کے بعد اس نے یہ رنگ اختیار کیا۔ یوں ہوا یوں ہوا۔ یوں ہوا اور اب تمھاری یہ حالت ہے"۔ وہ بے چارہ جی ہاں جی ہاں کہتا جاتا تھا اور یہ برابر حال بیان کئے جاتے تھے۔ اس کے بعد ان سے کہا کہ اب کیا علاج فرماتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ تمھارا علاج میرے پاس نہیں ہے کسی اور سے مشورہ کرو۔

تمھیں میرا امتحان لینا مقصود ہے لیا۔ اگر کسی تشخیص میں غلطی ہو جاتی تو میری تمام عمر کی کمائی ہوئی عزت خاک میں مل جاتی۔ وہ غریب بہت رویا۔ حکیم صاحب کے دوست بہت مصر ہوئے مگر حکیم صاحب یہ کہہ کر اٹھ گئے کہ جو شخص طالب امداد ہو کر معاملہ کو سلجھانے میں مدد کرنے والے کا ہاتھ نہ بٹائے اُس سے کنارہ ہی کرنا بہت اچھا ہے۔ آج کل کے زمانے میں اس قول پر عمل کرنے کی بڑی ضرورت ہے۔ حکیم عبدالمجید خاں مرحوم کے چھوٹے بھائی حکیم محمد اجمل خاں مرحوم تھے۔ کون ہوگا جو ان کے نام سے واقف نہ ہو۔ بڑے بھائی جتنے اپنے فن میں ماہر تھے۔ اتنے ہی یہ سیاسیات میں ماہر تھے۔ گاندھی جی ان کی حد سے زیادہ عزت کرتے تھے اور ان کی رائے سے کبھی اختلاف نہیں کرتے تھے۔ ایک مرتبہ کانگریس ورکنگ کمیٹی کا جلسہ حکیم صاحب کے گھر پر ہو رہا تھا۔ اور گاندھی جی یہ کہہ رہے تھے کہ میں نے حکیم جی جیسا ٹھنڈے دل کا آدمی نہیں دیکھا۔ ان کو کتنا ہی جوش دلاؤ۔ یہ جب رائے ظاہر کریں گے بڑی ٹھنڈے دل سے ظاہر کریں گے " یہاں یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ دلی کے کوئی ہزار بارہ سو آدمی حکیم صاحب کے مکان پر چڑھ آئے۔ وجہ یہ تھی کہ دہاں والوں کو یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ حکیم جی کانگریس والوں سے مل کر مسلمانوں کو نقصان پہنچا دیں۔ جب حکیم صاحب کو ان لوگوں کا آنا معلوم ہوا تو وہ بغیر کسی گھبراہٹ کے جلسہ سے اٹھے۔ لوگوں نے روکنا بھی چاہا مگر وہ نہ مانے اور وہ سیدھے اس مشتعل مجمع کے سامنے جا کھڑے ہوئے اور کہا۔ دیکھو بھائیو اگر تم سمجھتے ہو کہ میں تمھارا دشمن ہوں تو مجھے یہیں ختم کر دو۔ میں اپنا خون معاف کرتا ہوں۔ ورنہ مجھے میرا کام کرنے دو۔ اجمل خاں تمھیں کبھی دغا نہ دے گا۔ غرض انھوں نے کچھ اس طرح کی باتیں کہیں کہ تھوڑی دیر میں مجمع کا جوش ٹھنڈا ہو گیا اور وہ ان کو دعائیں دیتا ہوا منتشر ہو گیا۔ کیا حکیم صاحب کا یہ طرز عمل اُن لیڈروں کے لئے شمعِ ہدایت نہیں ہے جو لوگوں کو بھڑکا دیتے ہیں اور خود پیچھے ہٹ جاتے ہیں اور غریبوں کے لئے خون خرابے کرا دیتے ہیں۔ اب ایک ایسے شخص سے میرے ملنے کا حال سنیئے جو اپنے فرقے میں نبی سمجھا جاتا ہے۔ اور دوسرے فرقے والے خدا جانے اس کو کیا کچھ نہیں کہتے۔ یہ کون ہے جناب مرزا غلام احمد قادیانی بانیٔ فرقۂ احمدیہ۔ ان سے میرا یہ رشتہ ہے کہ میری خالہ زاد بہن ان سے منسوب تھیں۔ اس لئے یہ جب کبھی دلی آتے تو مجھے ضرور بلا بھیجتے۔ اور پانچ روپیہ دیتے۔ چنانچہ دو تین دفعہ ان سے میرا ملنا ہوا۔ مگر میں یقین دلاتا ہوں کہ انھوں نے کبھی مجھ سے ایسی گفتگو نہیں کی جس کو تبلیغ کہا جا سکے۔ میں اس زمانے میں ایف۔ اے میں پڑھتا تھا۔ زیادہ تر مسلمانوں کی تعلیم کا ذکر ہوتا تھا۔ اور اس پر وہ افسوس ظاہر کیا کرتے تھے کہ مسلمان اپنی مذہبی تعلیم سے بالکل بے خبر ہیں۔ اور جب تک مذہبی تعلیم عام نہ ہوگی اُس وقت تک مسلمان ترقی کی راہ سے ہمیشہ ہٹے رہیں گے۔ میرے ایک چچا تھے جن کا نام مرزا عنایت اللہ بیگ تھا۔ یہ بڑے فقیر دوست تھے۔ تمام ہندوستان کا سفر فقیروں سے ملنے کے لئے کیا۔ بڑی کڑی سخت ریاضتیں کیں۔ چنانچہ اس سے ان کی محنت کا اندازہ کر لیجئے کہ تقریباً چالیس سال تک یہ رات کو نہیں سوئے۔ صبح کی نماز پڑھ کر دو ڈھائی گھنٹہ کے لئے سو جاتے ورنہ سارا وقت یاد الٰہی میں گزارتے۔ ایک دن میں جو مرزا غلام احمد صاحب کے یہاں جانے لگا تو چچا صاحب قبلہ نے مجھ سے کہا "بیٹا میرا ایک کام ہے وہ کر دو اور وہ کام یہ ہے کہ جن صاحب سے تم ملنے جا رہے ہو ان کی آنکھوں کو دیکھو کہ کس رنگ کی ہیں۔ میں سمجھا بھی نہیں اس سے ان کا کیا مطلب ہے۔ مگر جب مرزا صاحب کے پاس گیا تو

ان کی آنکھوں میں سبز رنگ کا پانی گردش کرتا معلوم ہوتا ہے۔
بڑے غور سے ان کی آنکھیں کو دیکھتا رہا۔ میں نے دیکھا کہ
اسی سلسلہ میں میں نے بھی خود ان کو ذرا غور سے دیکھا۔ کیونکہ اس سے پہلے جو میں ان کے پاس جاتا تھا تو ہمیشہ نیچی آنکھیں
کر کے بیٹھتا تھا۔ اس دفعہ میں نے دیکھا اُن کا چہرہ بہت بارونق تھا۔ سر پر کوئی دو دو انگل کے بال ہیں، داڑھی خاصی
نیچی ہے۔ آنکھیں جھکی جھکی ہیں۔ بات کرتے ہیں تو بہت متانت سے کرتے ہیں مگر بعض وقت جھلا بھی جاتے ہیں۔ بہرحال
وہاں سے واپس آنے کے بعد میں نے چچا صاحب قبلہ سے تمام واقعات بیان کئے۔ فرحت دیکھو اس شخص کو بُرا کبھی نہ کہنا
فقیر ہے اور یہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عاشق ہیں۔ میں نے کہا۔ یہ آپ نے کیوں کر جانا۔ فرمایا کہ جو آں حضرت
صلی اللہ علیہ وسلم کے خیال میں ہر وقت غرق رہتا ہے اس کی آنکھوں میں سبزی آجاتی ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ سبز رنگ
کے پانی کی ایک لہر اُن میں دوڑ رہی ہے۔ میں نے اس وقت تو ان سے اس کی وجہ نہیں پوچھی مگر بعد میں معلوم ہوا کہ سب فقراء
اور اہل طریقت اس پر متفق ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا رنگ سبز ہے۔ اسی کا عکس آپ کے زیادہ خیال کرنے سے
آنکھوں میں جم جاتا ہے۔

بہرحال یہ ایک فقیر اور فقیر دوست کی رائے تھی جو میں نے عرض کر دی۔ اس کے صحیح ہونے یا نہ ہونے کا میں ذمہ دار
نہیں ہوں۔

دلی میں میری ملاقات دو بڑی شخصیتوں سے بہت رہی ہے۔ ایک مولوی نذیر احمد مرحوم دوسرے سی۔ ایف
اینڈریوز۔ مگر ان دونوں کے متعلق میں سب کچھ کہہ چکا ہوں اور اب یہاں اس کا دہرانا کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ البتہ
مولوی نذیر احمد مرحوم کی اس ایک گفتگو کو کہے دیتا ہوں جو ان کی کہانی کہتے وقت چھوٹ گئی تھی۔ ہوا یہ کہ ایک دن
یہ ذکر چھڑا کہ مولوی صاحب اب آپ نے لکچر دینے کیوں بند کر دئے ہیں۔ آپ کی یہ کنارہ کشی زبان اُردو پر ایک ظلم ہے۔
اس کا انھوں نے جو جواب دیا وہ انھیں کے الفاظ میں کہے دیتا ہوں کہنے لگے "میاں ہر کام ایک خاص وقت میں مزہ
دیتا ہے وقت گزر جانے کے بعد اس میں مزہ نہیں رہتا۔ ہمارا بھی کسی زمانہ میں ایک طائفہ تھا۔ مجلس گرم ہوتی۔ ہمارا
طائفہ جاتا۔ ایک صاحب روں روں، روں روں اپنی سارنگی بجاتے۔ جانتے ہو یہ کون تھے۔ یہ تھے حالی۔ دوسرے تن تن تن
مجیری بجاتے۔ یہ کون تھے۔ شبلی۔ ایک صاحب تا دن تا دن دنا دن طبلہ کھونکتے۔ یہ کون تھے نذیر احمد۔ اب رہیں گانے والی کہ وہ بھاؤ
بتاتیں ہاتھ پھیلاتیں اور کہتیں لاچندہ۔ لاچندہ۔ لاچندہ۔ یہ کون تھے سرسید احمد۔ ارے بھئی جب وہی نہیں جن کے لئے
یہ سارے جتن کئے جاتے تھے۔ تو طائفہ ٹوٹ کر ٹھکانے نہ لگ جاتا تو اور کیا ہوتا۔ قسم اللہ کی اب میرا کسی جگہ لکچر دینے کو جی
نہیں چاہتا لوگوں کی تھما تھمی سے تو چلا جاتا ہوں۔ مگر میرے آج کل کے لکچروں اور پہلے کے لکچروں میں زمین آسمان کا فرق
ہوتا ہے۔ میاں جب کسی کام کرنے کو دل ہی نہ چاہے تو وہ کام اچھا ہو تو کیسے ہو۔

اس سلسلے میں مولانا شبلی مرحوم کا ذکر آ گیا ہے تو لیجئے ایک واقعہ ان کا بھی سن لیجئے۔ مولانا شکل سے تو بالکل مولانا معلوم
ہوتے تھے۔ داڑھی بھی تھی۔ شملہ بھی تھا۔ کبھی کبھی جبہ بھی پہن لیتے تھے مگر خیالات بالکل دہریوں کے سے تھے۔ گھر میں

غلطی سے بھری ہوئی بندوق چلنے کی وجہ سے ایک ٹانگ ضائع ہوگئی تھی اس لئے لکڑی کی ٹانگ لگانی پڑی۔ تو صاحب ہوا یہ کہ ایک روز شام کے وقت کاچی گوڑہ میں ڈاکٹر حامد علی صاحب کے مکان پر محفل گرم تھی۔ مولانا شبلی بھی تھے۔ مسعود علی صاحب محوی اور چند حضرات تھے۔ میں بھی ڈاکٹر صاحب کے مکان کے قریب ہی رہتا تھا۔ کبھی کبھی ان کے ہاں چلا جاتا تھا اور اس روز بھی چلا گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ   سے کسی مذہبی معاملہ پر بحث ہو رہی ہے۔ لوگ حجتیں کر رہے ہیں اور مولانا شبلی اپنی منطق کے زور سے زچ کر دیتے ہیں۔ جب لوگ بحث کرتے کرتے تھک گئے تو مولوی مسعود علی محوی صاحب نے مولانا روم کا یہ شعر پڑھا ؎

پائے استدلالیاں چوبین بود   پائے چوبیں سخت بے تمکین بود

یعنی ان منطق بگھارنے والوں کا پاؤں لکڑی کا ہوتا ہے اور تم جانتے ہی ہو کہ لکڑی کا پاؤں کتنا کمزور ہوتا ہے۔ یہ سننا تھا کہ مولانا شبلی ہنس پڑے اور کہنے لگے کہ بھئی میں ہارا اور تم جیتے۔ ہمارا تمہارا تصفیہ مولانا روم نے کر دیا اور بتا دیا کہ جس کا پاؤں لکڑی کا ہے وہ کٹ حجتی کرتا ہے۔ مجھ سے پوچھو کہ لکڑی کا پاؤں کس قدر قابل بھروسہ ہوتا ہے۔ اس کے بعد انھوں نے گفتگو کا رُخ بدل دیا۔ اور دوستوں میں جو ذرا بے لطفی پیدا ہوگئی تھی۔ وہ رفع ہوگئی۔

پنڈت موتی لعل نہرو آنجہانی سے مل کر جیسا میرا دل خوش ہوا وہ بیان نہیں کر سکتا۔ ان کی تقریریں بھی دو دفعہ اسمبلی میں سن چکا تھا۔ اُن کے ہر فقرہ کا کوئی مقصد ہوتا تھا۔ اور ہر لفظ میں جان۔ اس کے بعد میرا ملنا اُن سے اس وقت ہوا۔ جب وہ حیدرآباد میں آکر نواب مرزا یار جنگ بہادر کے پاس ٹھہرے۔ وہ دو دفعہ ہائی کورٹ دیکھنے آئے۔ اُس وقت اُن سے ملنا ہوا۔ اور دو ایک دفعہ میں خود نواب صاحب کے مکان پر جاکر اُن سے ملا۔ بڑا بارونق سرخ و سفید چہرہ تھا۔ سفید مونچھیں تھیں۔ سفید لباس تھا۔ بڑی بڑی روشن آنکھیں تھیں۔ غرض ایسی اچھی شکل تھی کہ دیکھنے سے دل نہیں بھرتا تھا۔ اور اُردو تو ایسی بولتے تھے کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔ جب ہائی کورٹ کی لائبریری میں نے ان کو دکھائی تو کہنے لگے بھائی لائبریری تو خوب جمع کی ہے۔ یقین مانو کہ اس جیسی لائبریری ہندوستان کے کسی ہائیکورٹ میں نہیں ہے۔ مگر میں پوچھتا ہوں کہ ان کتابوں کو کوئی دیکھتا بھی ہے یا نہیں۔ بتائیے کہ میں اس کا کیا جواب دیتا۔ کیونکہ اللہ کے فضل سے ہمارے ہاں کے لوگوں کا ان کتابوں کا دیکھنا تو رہا ایک طرف کسی کو یہ بھی نہیں معلوم کہ اس کتب خانہ میں کیا کیا کتابیں ہیں۔ میں نے دو ایک دفعہ ان سے ہندوستان کی پالیٹکس پر بھی گفتگو کی اور انھوں نے بڑی خوبی سے ہر بات کو بیان کیا۔

جس طرح نوابوں کی طرح انھوں نے اپنی زندگی گزاری تھی اور جس طرح آخر زمانے میں انھوں نے یہ زندگی گزاری اس کو دیکھنے کے بعد صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ جب تک کوئی اتنا ایثار نہ کرے۔ لیڈر ہونے کا نام نہ لے۔

مرزا عصمت اللہ بیگ

مولوی عظمت اللہ خاں

مجھ سے فرمائش کی گئی ہے مولوی عظمت اللہ خاں صاحب مرحوم سے میں اپنی ملاقات کا حال بیان کروں مگر میں اس چکر میں ہوں کہ میں اپنی کون سی ملاقات کا بیان کروں اور کن کن باتوں کا ذکر کروں۔ ان کی شاعری کے متعلق لکھوں یا نثر نگاری کا ذکر کروں۔ ان کی ظرافت کا حال لکھوں یا ان کی مزاحیہ نگاری کی کیفیت ظاہر کروں، ان کے ملنے جلنے کے طریقوں کو بتاؤں یا ان کے سریلے بولوں کا ذکر کروں، وہ تو ایک آبشار کی طرح تھے جو خود بھی اپنی رَو میں بہے چلے جاتے تھے۔ ساحلوں کو بھی سیراب کرتے تھے اور گرد کے رقبوں کو بھی شاداب کرتے تھے۔ اور جو ان کی رَو میں آجاتا تھا۔ اس کو بھی اپنے ساتھ بہائے جاتے تھے۔ بیسیوں ان کی تحصیل سے ترقی پسند شاعر بنے۔ بیسیوں انوکھے انوکھے ادیب بنے، بیسیوں نے ان کے دم سے اپنے اپنے فن میں نام پیدا کیا اور بیسیوں ان کے مشورے سے آدمی بنے اور کام سے لگ گئے۔ کئی رسالے ان کے دم سے شائع ہوتے تھے اور کئی اخبار ان کے دم سے چلتے تھے۔

ان سے میری پہلی ملاقات کس طرح ہوئی وہ بھی سن لیجئے۔ بہت عرصے کی بات ہے کہ ایک صاحب عظمت خاں نامی ہندوستان کے ایک مشہور و معروف سینڈو حیدر آباد آئے تھے۔ جو نواب اکبر یار جنگ بہادر کے ہاں آکر ٹھہرے تھے۔ وہ ایک انقلابی پہلوان تھے اور جدید قسم کی سائنٹیفک ورزش کرتے تھے۔ چنانچہ ویٹ لفٹنگ یعنی وزن اٹھانے میں تو انھیں کمال حاصل تھا۔ بلا مبالغہ بغیر کسی دقت کے وہ دس دس اور بارہ بارہ من وزن اٹھا لیتے تھے۔ میں ان کا شاگرد ہو گیا اور ہندوستانی پرانی ورزشوں کو چھوڑ چھاڑ ویٹ لفٹنگ کی مشق کرنے لگا۔

ہمارے ملاقاتی یعنی عظمت اللہ خاں مرحوم بھی ورزش کے شوقین تھے، بھائی فخر الدین مجھے پکڑ کر ان کے پاس لے گئے بہت ممکن ہے کہ خاں صاحب نے بلایا ہو۔ یا خود یہ زبردستی ہمارے استاد کے واقعات سنانے کے لیے لے گئے ہوں۔ بہرحال میں وہاں پہنچا۔ بھائی فخر الدین نے مجھے ان سے ملایا۔ ان کے ڈنڈ بلے اور بنا ہوا جسم دیکھ کر مجھے خیال ہوا کہ یہ بھی کوئی پہلوان ہیں۔ وہ بڑے تپاک سے ملے۔ دیر تک عظمت اللہ خاں سینڈو کے حالات پوچھتے رہے۔ پھر خود بھی دہلی کے دو چار پہلوانوں

کے واقعات بیان کیے، کچھ یورپ کے پہلوانوں کے قصے سنائے، اس کے بعد کچھ داؤں پیچوں کا ذکر چھڑ گیا۔ تو انھوں نے اپنی مہربانی سے مجھے ایک جیبٹ سوز "(Jujitsu)" کی کتاب عنایت فرمائی جس میں جاپانی داؤں پیچ کے طریقے بتائے گئے تھے۔

اب سنئے، اس کے بعد انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ تم نے ہندوستانی ورزش میں کیا برائی دیکھی۔ جو اسے چھوڑ کر ویٹ لفٹنگ میں پڑ گئے۔ میں نے کہا کہ صاحب پہلے تو اس میں وقت بہت صرف ہوتا ہے۔ دوسرے کلائیاں اور پنڈلیاں پتلی اور گردن موٹی ہو جاتی ہے تیسرے آخر میں توند نکل آتی ہے اور جو تھے جتنا کس ویٹ لفٹنگ سے پیدا ہوتا ہے وہ ڈنڈ اور بیٹھک وغیرہ سے پیدا نہیں ہوتا۔ یہ نہایت سیدھی سادی اور صاف ستھری ورزش ہے۔ محنت کم اور نفع زیادہ، پوچھا کہ وہ کیسے؟ تو میں نے استاد داراب کا ورزشی پہاڑا سنایا، وہ آپ بھی سن لیجئے۔

سو مگدر کا ایک ڈنڈ۔ یعنی سو بار مگدر پھراؤ تو اس میں ایک ڈنڈ کی طاقت آتی ہے۔

پھر سنئے:۔ سو مگدر کا ایک ڈنڈ۔

سو ڈنڈ کی ایک ترن

سو ترن کی ایک لڑنتھ

سو لڑنتھ کی ایک گدرن۔ یعنی اکھاڑا گوڈنا۔

سو گدرن کی ایک اٹھان۔ یعنی ویٹ لفٹنگ۔

اور سو اٹھان کی ایک مرن۔

اس پہاڑے کو سن کر وہ بہت ہنسے۔ مگر اتنی بات ضرور ہوئی کہ اس روز سے انھوں نے بھی ویٹ لفٹنگ شروع کر دی اور چند ہی روز میں وہ اتنا وزن اٹھانے لگے کہ میں بھی ان سے ہار مان گیا اور ان کا مقابلہ کرنے میں بغلیں جھانکنے لگا۔

یہ تو آپ نے ان کی جسمانی ورزش اور پہلوانی کا ذکر سنا۔ اب ان کی دماغی ورزش اور ذہنی داؤں پیچ کا حال بھی سن لیجئے۔ سچ پوچھیے تو ان کا دماغ ان کے جسم سے بہت زیادہ طاقت ور تھا۔ اس میدان میں ان کی چلت پھرت اور داؤں پیچ اتنے صاف اور منجھے ہوئے تھے کہ ان کے دماغ نے ان کے جسم کو پچھاڑ دیا تھا، ان کا دماغ کیا تھا۔ ایک نمائش گاہ تھی جس میں ہر چیز قرینے سے رکھی ہوئی موجود تھی، جس کو جس چیز کی ضرورت ہوتی وہ اسے فوراً وہاں مل جاتی تھی، کتابوں کے تو وہ کیڑے تھے۔ چنانچہ ہر وقت وہ مطالعہ میں غرق رہتے تھے۔ پھر لطف یہ ہے کہ صبح سے لیکر شام تک لوگ انھیں گھیرے رہتے تھے۔ بعض بعض تو رات کو بھی ان کا پنڈ نہیں چھوڑتے تھے، خدا معلوم شعر لکھواتے تھے یا ان کی شرح کراتے تھے، اخباروں اور رسالوں کے لیے ایڈیٹوریل تیار کراتے تھے، بہرحال رات کے گیارہ بجے تک وہ برابر مصروف رہتے تھے۔ پھر کمال یہ تھا کہ کوئی تازہ اخبار یا میگزین شائع ہوتا تو اس میں ان کا کوئی نہ کوئی مضمون یا نظم ضرور ہوتی تھی۔

حیدرآباد میں تو شاید ہی کوئی شاعر یا انشا پرداز ایسا ہوگا جو کچھ لکھے اور انھیں آکر نہ سنائے۔ بیسیوں ان کے

شاگرد تھے، بیسیوں دوست تھے، بیسیوں گرویدہ تھے اور بیسیوں عاشق نادیدہ تھے۔ اب بھی کئی لوگ ان کا کلام گنگناتے رہتے ہیں اور کئی صرف ان کے نام ہی سے واقف ہیں اور آگے کچھ بھی نہیں جانتے۔ شاید اس قسم کے لوگوں کو ان کے رنگ روپ، حرکات و سکنات، نشست و برخاست، رنگ ڈھنگ، طرز تکلم اور ان کے ڈیل ڈول کا اندازہ نہیں ہوگا۔ اس لئے میں پہلے الفاظ کے ذریعے ان کا نقشہ کھینچ دیتا ہوں۔ تاکہ ان کی شکل و صورت کا اندازہ آپ کو بھی اچھی طرح سے ہو جائے اور ان کا ناک نقشہ آپ کی آنکھوں کے سامنے پھر جائے۔

خاں صاحب اچھے پورے اور اونچے ڈیل ڈول کے آدمی تھے۔ قد کوئی چھ فیٹ کے قریب کا تھا، کسرت کے شوقین تھے اس لیے جسم بنا ہوا اور سڈول تھا۔ بھویں کشادہ تھیں، غلافی آنکھیں، ستواں ناک، دہانہ چوڑا، سر پر ہلکے بال تھے۔ مونچھیں چھوٹی چھوٹی، داڑھی صفاچٹ، رنگ انار کے دانے کی طرح سرخ و سفید تھا اور چہرہ گلاب کے پھول کی طرح کھلا رہتا تھا۔ عام طور پر تنگ مہری کا پائجامہ اور ململ کا سفید کرتا پہنتے تھے (بس ایسا معلوم ہوتا تھا کہ چنبیلی کا ڈھیر پڑا مسکرا رہا ہے) ادھر ادھر ہر طرح کی کتابوں کا انبار رہتا تھا۔ تاریخ، معاشیات، عمرانیات، ارضیات، طبیعیات، حیاتیات غرض کہ ہر فن کی کتاب موجود تھی، جب کسی مسئلے پر بحث کرتے تو باتیں کرتے کرتے کتاب کو جاہتے آنکھیں بند کر کے نکال لیتے تھے۔ اور جو بات زیر بحث ہوتی وہ صفحہ الٹ کر پڑھنا شروع کر دیتے تھے۔

میں اکثر صبح کے وقت جاتا تھا تو انھیں کچھ نہ کچھ پڑھتے ہوئے پاتا تھا، دیکھتے ہی مسکراتے اور کتاب الٹ کر میز پر دھر دیتے تھے۔ خدا معلوم یہ کیا بات تھی، یار لوگ تاک لگائے کھڑے رہتے تھے یا پہلے سے کوئی پروگرام بنا لیتے تھے۔ جہاں ایک آدمی کرسی پر آکر ٹکا اور پھر بھیڑ یا چال شروع ہو گئی۔ لوگ ایک کے بعد ایک ٹپکنے شروع ہو جاتے۔ کسی کے ہاتھ میں کتابیں رہتیں تو کسی کے بغل میں بستہ، کسی کے پاس اخبار کا فائل ہوتا تو کسی کے ہاتھ میں سادے کاغذ۔ دیکھتے ہی دیکھتے پوری کرسیاں بھر جاتیں، خاں صاحب کے بازو میں ایک چھوٹی سی میز پڑی رہتی تھی۔ اس پر مرچینا تمباکو کا ڈبہ، سگریٹ بنانے کا کاغذ اور دیاسلائی کی ڈبیا رکھی رہتی تھی۔ باتیں کرتے جاتے اور ہاتھ سے سگریٹ بنا بنا کر خود بھی پیتے اور دوسروں کو بھی پلاتے۔ انھیں خوب معلوم تھا کہ آنے والوں میں کون کتنے پانی میں ہے؟ اور کون صاحب کس کام کے لئے تشریف لائے ہیں۔ چنانچہ ہر ایک سے نہایت خلوص و مروت سے پیش آتے اور ہر ایک کے مرتبے اور حیثیت کے مطابق برتاؤ کرتے تھے۔ بس یہ سمجھ لیجئے کہ ایک ادبی محفل تھی جو صبح سے لے کر شام تک جمی رہتی تھی۔ ان میں سے بعض لوگ تو پڑھنے آتے تھے، بعض صلاح و مشورہ لینے آتے تھے اور بعض کچھ لکھنے لکھانے اور سننے سنانے کے لئے آتے تھے۔ خاں صاحب شیکسپیئر کے عاشق تھے۔ اس کے ڈراموں کو وہ لہک لہک کر پڑھتے تھے کہ بس مزہ آجاتا تھا، پڑھاتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ بس ایک دریا بہہ رہا ہے۔ مشکل سے مشکل مقامات کو ایسی خوبی سے سمجھاتے تھے کہ گویا شربت کے گھونٹ ہیں جو حلق سے اترتے چلے جاتے تھے۔ کہتے تھے کہ شیکسپیئر ایک غیر فانی شاعر ہے۔ اس نے اپنے ڈراموں میں ایسے ایسے تخیلی پیکر پیدا کئے ہیں جس سے انسان کی چلتی پھرتی تصویریں ہماری نظروں میں پھرنے لگتی ہیں۔ ساتھ ہی یہ بھی کہتے تھے کہ اس نے کوئی طبع زاد خیال پیش نہیں کئے بلکہ تاریخ

اور ناولوں سے چند جوشیلے اور پھڑکتے ہوئے قصے چن لئے ہیں اور ان میں نئے کردار داخل کر کے ان کو اصل سے بہتر بنا دیا ہے۔ کہا کرتے تھے کہ اس کے ڈراموں میں ایک کمال یہ ہے کہ گرچہ اس نے اپنے زمانے کے لوگوں کی زندگی اور خیالات ظاہر کئے ہیں۔ مگر وہ آج سے (۲۰۰) سال گزر جانے پر بھی تمام دنیا کی دلچسپی کا موجب بنے ہوئے ہیں، یہ کیا بات ہے؟ بات یہ ہے کہ شیکسپیر نے اپنے ڈراموں میں صرف دلچسپ قصے، اچھی اچھی تقریریں اور مضحکہ خیز لطیفے ہی نہیں لکھے ہیں بلکہ اس نے وہ ذہنی کشمکش بھی ظاہر کی ہے جو دنیا کے ہر حصے اور ہر زمانے کی عورتوں اور مردوں میں پائی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ اس نے اپنے ڈراموں میں نظم کے ایسے ایسے بیش بہا جواہر ریزے رکھ دئے ہیں کہ کسی طرح دماغ سے محو نہیں کئے جا سکتے۔ چنانچہ اس زمانے سے اب تک مہذب ملک کے لوگ انھیں یاد کرتے ہیں اور موقع موقع سے دہراتے رہتے ہیں۔

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ ہم لوگ مرچنٹ آف وینس اسٹیج کر رہے تھے۔ ہمارے ڈرامیٹک کلب کے ممبروں نے کہا کہ مولوی عظمت اللہ خاں کو بھی اگر ریہرسل میں بلا لیں تو اچھا ہوگا۔ مگر انھیں یہاں لائیں کیسے؟ میں نے کہا کہ میں ابھی جاتا ہوں اور انھیں لانے کی کوشش کرتا ہوں، آپ یقین مانئے کہ دوپہر کا وقت تھا، ایک ہاتھ میں کتاب تھی، دوسرے ہاتھ میں حقے کا نیچوان۔ مزے لے لیکر کتاب پڑھ رہے تھے اور گڑ گڑ گڑ گڑ کر کے شانتی کا دم بھر رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی کتاب الٹ کر میز پر دھر دی اور کہنے لگے کہو! خیریت تو ہے؟ میں نے تمام واقعات دہرائے، کہنے لگے ضرور ضرور میں تمھارا ریہرسل ضرور دیکھوں گا۔ بس یہ کہہ کر اٹھے، فوراً بالوں والی ٹوپی سر پر اوڑھ شیروانی پہن اور اپنی لکڑی ہاتھ میں لئے میرے ساتھ ہو لئے۔ موقع پر پہنچے اور شروع سے آخر تک ریہرسل دیکھا۔ پھر وہاں پتہ چلا کہ ان کو شیکسپیر کے ڈراموں پر کس قدر عبور حاصل تھا۔ یعنی الف سے لے کر ی تک پورا ڈرامہ ان کی زبان پر تھا۔ کوئی اداکار اٹکتا تو وہ فوراً ہی ٹوکتا رہتا اور یہ لقمہ بھی دے دیتے۔ اس کے علاوہ انھوں نے ہر ایک کو اسٹیج پر داخل ہونے کا طریقہ، دوسرے سے بات چیت، خود کلامی اور کانا پھوسی کرنے کا سلیقہ، آنکھوں اور چہرے سے جذبات کے اظہار کرنے کے ڈھنگ اور آواز کا اتار چڑھاؤ کے مختلف رنگ بتائے۔ اور وہ وہ ہدایتیں دیں کہ ڈرامیٹک کلب کے پرانے اداکار جو ہم چو من دیگرے نیست کے پھنکارے مارا کرتے تھے وہ بھی لوہا مان گئے اور اس دن سے خاں صاحب کا دم بھرنے لگے۔ ریہرسل ختم ہونے کے بعد چلتے وقت ہمارے اسٹیج ڈائرکٹر نے انھیں اپنی وہ تقریر سنائی جو ڈرامے کے ختم ہونے کے بعد پڑھنے کے لئے لکھی گئی تھی۔ خاں صاحب نے فرمایا کہ بھئی اپنی تقریر کا رنگ بھی کچھ اسی زمانے کے رنگ سے ملتا جلتا رکھو، انھوں نے کہا کہ وہ تو بہت ٹیڑھی کھیر ہے۔ خاں صاحب نے کہا کہ کوئی بات نہیں، آپ لکھئے، اور وہیں کھڑے کھڑے دو تین صفحے کی تقریر بھی لکھوا دی، وہ تقریر اتنی دلچسپ پُر معنی اور ڈرامائی رنگ میں ڈوبی ہوئی تھی کہ دنوں تک اس کے چرچے رہے۔ مقرر صاحب کی ہر جگہ تعریفیں ہوتی رہیں، اور کسی نے خاں صاحب کا نام تک نہ لیا۔ بلکہ خود خاں صاحب کے آگے۔ لوگ اس ڈرامے اور اس تقریر کی تعریف کرتے تھے اور وہ بھی ان کی ہاں میں ہاں ملاتے تھے۔ مگر خدا کے بندے نے کبھی یہ زبان سے بھی نہیں نکالا کہ یہ سب کچھ میرا ہی کیا دھرا ہے۔

اس قسم کے آپ کو بیسیوں قصے، مضمون اور تقریریں ملیں گی، جنھیں شروع سے آخر تک خاں صاحب نے لکھا تھا۔ مگر

اب وہ مال یار دوستوں کا ہوگیا، وہ تو خدا بخشے بھائی فرحت نے بھانڈا پھوڑ دیا اور پھر لوگوں کو پتہ چلا کہ فلاں مضمون خاں صاحب کا لکھا ہوا ہے اور فلاں ہیڈیٹوریل نوٹ خان صاحب نے میرے سامنے اپنے قلم سے لکھا تھا۔

شعر و شاعری کے معاملے میں خان صاحب سب سے جدا تھے۔ وہ ایک انقلابی شاعر تھے۔ نیچرل شاعری اور نظم مسلسل پر جان دیتے تھے۔ غزل گوئی کے بالکل قائل نہیں تھے، کہتے تھے کہ غزل کا میدان نہایت تنگ ہے ایک طرف اس میں ردیف کا دم چھلا لگا رہتا ہے اور دوسری طرف خیالات کے گلے میں قافیے کا پھندا پڑا رہتا ہے۔ شروع سے لے کر آخر تک غزل دیکھ ڈالو اس بے ربطی کا مجموعہ اور منتشر الخیالی کا مرقع ہوتی ہے، ایک شعر میں جدائی کا رونا ہے، دوسرے میں وصل کی خوشی ہے تیسرے میں شراب ناب کے مزے ہیں۔ چوتھے میں شیخ جی پر پھبتیاں ہیں، پانچویں میں درد کا رونا ہے۔ چھٹے میں قسمت کا گلہ ہے، ساتویں میں فلک کج رفتار کا شکوہ ہے۔ نہ تو اس میں صداقت کی جھلک ہوتی ہے نہ واقعات کا سلسلہ قائم رہتا ہے نہ اس میں تخیلی پیکر پیدا کئے جا سکتے ہیں نہ اس میں مصورانہ شان دکھائی جا سکتی ہے جو کہ شاعری کی جان ہے۔

وہ ہمیشہ جدید طرز کی مسلسل نظمیں لکھتے تھے اور اپنے دوستوں کو مزے لے لے کر سناتے تھے۔ جن کے میٹھے اور سریلے بول ہندی بحروں میں ڈوبے ہوئے حیاتِ انسانی کی لہریں پیش کرتے تھے اور سننے والے کی زبان سے بے ساختہ آہ یا واہ نکل جاتی تھی۔ بطور نمونہ ایک دو بند آپ بھی ملاحظہ فرمائیے۔

نہ بھلے کی تھی نہ بُرے کی تھی   مجھے کچھ جہاں کی خبر نہ تھی
تمھیں عشق کا جو دھیان تھا   تمھیں میری چاہ اگر نہ تھی
مِرے حسن کے لئے کیوں مزے   نہیں لینے تھے تمھیں یوں مزے
بہت اپنی چاہ جتا جتا   مِرے دل کو موہ کے لے لیا
مِرے واسطے یہ بہشت تھی   تمھیں دل لگی تھی یہ کھیل تھا
مِرے حسن کے لئے کیوں مزے   نہیں لینے تھے تمھیں یوں مزے
مِرے دل سے ہوگا یہ کب بھلا   تمھیں دے سکوں کوئی بد دعا
وہ ہوا جو تھے یہ تھا لکھا   مِرے دل سے آئے گی یہ صدا
مِرے حسن کے لئے کیوں مزے   نہیں لینے تھے تمھیں یوں مزے

خاں صاحب میں ہمدردی، محبت اور خلوص کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا، پھر ان میں بڑی خوبی یہ تھی کہ جس میں جو صلاحیت دیکھتے تھے تو اسے اس طرح اُچھالتے تھے جس سے اس کا بھی فائدہ ہو، لوگوں کو بھی فائدہ پہنچے اور علم و عمل کی دنیا میں ایک نئے باب کا اضافہ ہو جائے، چنانچہ ایک صاحب کو لغت اور اصطلاحات ترتیب دینے پر لگایا۔ دوسرے صاحب کو نستعلیق ٹائپ میں پھنسایا تیسرے صاحب کو مزاحیہ نگاری پر آمادہ کیا اور جس حد تک ان لوگوں نے کامیابی حاصل کی وہ ان کی کوششوں سے ظاہر ہے۔

اب میری سُنئے۔ مجھے مصوّری سے کچھ لگاؤ تھا۔ ایک مرتبہ میں غالب کی تصویر بنا کر خاں صاحب کے پاس لے گیا کہنے لگے

ارے میاں! مہینے بھر سے تم غالب کی تصویر بنا رہے ہو۔ آج خدا خدا کرکے وہ ختم ہوئی، اب اسے میں دیکھوں گا۔ تم دیکھو گے اور تمھارے دو چار احباب دیکھ لیں گے اس کے بعد یہ کسی ڈرائنگ روم کی زینت بن کر رہ جائے گی۔ میں نے کہا اس سے زیادہ آپ کیا چاہتے ہیں۔ کہنے لگے کہ میں یہ چاہتا ہوں کہ اسے حیدرآباد ہی نہیں، ہندوستان بلکہ تمام دنیا دیکھے۔ میں نے کہا وہ کس طرح تو کہنے لگے کہ وہ اس طرح کہ تم اس تصویر کا ہاف ٹون یا رنگین بلاک بناؤ۔ پھر اس سے تم غالب کی ہزاروں تصویریں چھاپ سکتے ہو۔ اس سے تمھیں فائدہ بھی ہوگا اور غالب کی تصویر گھر گھر پہنچ جائے گی۔ میں نے کہا خاں صاحب! میں ہاف ٹون بلاک بنانا نہیں جانتا۔ کہنے لگے۔ ارے میاں وہ تو نہایت آسان چیز ہے یہ کہہ کر وہ اٹھے اور الماری میں سے ایک کتاب نکال لائے۔ اس پر لکھا تھا "ہاف ٹون بلاکس" خاں صاحب اس کتاب کے ورق اُلٹ اُلٹ کر تصویریں اور بلاک بنانے کی ترکیبیں بتاتے رہے، اور آخر میں وہ کتاب مجھے دے کر کہنے لگے۔ اسے تم لے لو اور ذرا کوشش کرکے ایک بلاک تو بنا لو۔ وہ کتاب اب تک میرے پاس ہے۔ میں نے ان کی ہدایتوں کے مطابق تصویر بنائی۔ اس کے بعد مجھے اس فن سے اتنی دلچسپی ہوگئی کہ بعد میں میں نے کوشش کرکے بلاک سازی کی تعلیم پائی اور اس کے بعد سے اب تک میں اسی پھیر میں پڑا ہوں۔

(مختصر یہ ہے کہ مولوی عظمت اللہ خاں مرحوم ایسی خوبیوں کے آدمی تھے اور ان کی دلچسپیاں اتنی وسیع تھیں اور ان کے معلومات ایسے ہمہ گیر تھے کہ جوان سے ملتا تھا، اس کے رجحانات، صلاحیت اور قابلیت کے لحاظ سے اسے ایسے راستے پر لگا دیتے تھے کہ وہ اپنی زندگی میں کامیابی کے راستے پر چل سکتا تھا ــ خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں)

نیاز فتحپوری

اکبر الہ آبادی

اکبر مرحوم میرے ہم وطن تو نہ تھے لیکن میرے ان کے خاندانی تعلقات ہم وطن لوگوں ہی کی طرح تھے کیونکہ ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد وہ اور میرے والد دونوں کان پور میں سالہا سال تک یکجا رہے تھے اور میرے والد ہی کے اصرار سے انھوں نے وکالت کا امتحان دیا تھا۔ اس لئے وہ مجھ پر خاص شفقت فرماتے تھے اور چونکہ فتحپور الہ آباد کا فاصلہ زیادہ نہیں۔ اس لئے جب وہ پنشن لے کر خانہ نشین ہو گئے تو انھوں نے بارہا مجھے یاد فرمایا اور بارہا میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ مجھے جو خصوصیت ان کی جناب میں حاصل تھی اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ وہ بہت مشکل سے کسی کو اپنا مہمان بناتے تھے اور اس باب میں وہ اتنے صاف گو تھے کہ اگر کوئی ان کے پاس باہر سے آنا چاہتا تو وہ صاف لکھ دیتے کہ آپ مہمان تو میرے رہیں گے لیکن کھانا آپ کہیں اور کھائیے گا۔ لیکن مجھے انھوں نے ہمیشہ یہی لکھا کہ تم کھانا بھی میرے ساتھ کھاؤ گے۔ ہر چند میں نے اس کی تکلیف انھیں ایک بار کے سوا کبھی نہیں دی۔

میں معمولاً بہت صبح ناشتے سے فارغ ہو کر ان کے پاس پہنچ جاتا اور پھر کھانے سے قبل ہی اپنی جائے قیام پر واپس آ جاتا۔ وہ مجھ سے کہتے کہ کھانا کھا کر جاؤ۔ لیکن میں کوئی نہ کوئی عذر پیش کر دیتا۔ اور وہ اسے فوراً مان لیتے۔ لیکن ایک بار میری حیلہ جوئی کامیاب نہ ہوئی۔ اور ان کے ساتھ کھانے میں شریک ہونا ہی پڑا۔

دس گیارہ بجے صبح کا وقت تھا اور انھیں کی شعر و شاعری موضوع گفتگو تھی۔ اور اس موضوع کے علاوہ وہ کسی اور بحث پر گفتگو پسند بھی نہ کرتے تھے۔ وہ خود ہی اپنی شاعری کے متعلق مختلف ارباب نظر کے خطوط و آرا کا ذکر کر رہے تھے کہ اس سلسلہ میں نظم طباطبائی کا ذکر آ گیا اور فرمانے لگے کہ انھوں نے میرے اس شعر کو بہت پسند کیا ؎

دنیا کی کیا حقیقت اور ہم سے کیا تعلق وہ کیا ہے اک جھلک ہے ہم کیا ہیں اک نظر ہیں

میں نے بھی اس شعر کی بہت داد دی۔ اس کے بعد انھوں نے فرمایا کہ تم کو میرا کون سا شعر پسند آیا۔ میں نے عرض کیا یوں تو مجھے آپ کے بہت سے شعر پسند ہیں اور میں ان سب کو بھلا سکتا ہوں لیکن ایک شعر ایسا ہے جس کو کوشش کے بعد بھی نہیں بھلا سکتا۔ اور وہ میرے دماغ کا ایک جزو ہو کر رہ گیا ہے۔ بے تاب ہو کر فرمایا۔ سناؤ، میں نے کہا۔ وہ شعر یہ ہے ؎

گفتگو ۵۵

آرزو دل میں ہے اک شخص سے ملنے کی بہت نام کیا لوں کوئی اللہ کا بندہ ہوگا

میں سمجھتا تھا کہ وہ میری رائے سن کر غالباً ہنس پڑیں گے لیکن شعر سننے کے بعد ان پر جو عالم طاری ہوا وہ بھی خاص چیز تھی۔ کامل پانچ منٹ تک سر جھکائے رہنے کے بعد فرمایا کہ میری زندگی میں تم پہلے شخص ہو جس نے اس شعر کی داد دی اور خدا معلوم کس عالم میں پہنچا دیا۔ یہی وہ دن تھا کہ میرا کوئی حیلہ کام نہ آیا اور چلتے وقت فرمایا کہ اگر فرصت ملے تو مجھے میرے کلام کے ذریعے سے ضرور کسی وقت پیش کرنا۔ عرصۂ دراز کے بعد آج اتفاق سے اس ارشاد کی تعمیل کا موقع ہاتھ آیا ہے۔

سترہ سال کا ایک نوجوان لڑکا دبلا پتلا، قد ذرا دبتا ہوا، رنگ کچھ کھلتا ہوا۔ مسیں بھیگی ہوئیں، پیشانی کی رگیں ابھری ہوئیں اپنے کمرے میں ٹہل رہا ہے اور یہ شعر گنگنا رہا ہے۔

چشمِ عاشق سے گریں لختِ دلِ بے تاب و اشک آپ یوں دیکھیں تماشا جان کر سیماب و اشک

معلوم نہیں یہ زمین خود اس نے پیدا کی تھی یا شاہ نصیر و ظفر کے کلام کو دیکھ کر اس کے ذہن میں آئی تھی۔ وہ بہت خوش تھا کہ ایسی مشکل زمین میں اس نے ایک شعر کہا اور لختِ دل کو سیماب کہہ کر اپنی بے چینی کا اظہار کس خوبی سے کیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے میز سے کاغذ اٹھایا اور پنسل سے دوسرا شعر لکھا ؎

اپنے دامن پر گراتے کیوں اُسے کرتے خراب جانتے یکساں اگر ہم گوہرِ نایاب و اشک

اب اُس کا چہرہ خوشی سے دمک اٹھا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ واقعی گوہرِ نایاب اس کے ہاتھ آگیا ہے۔ اس نوجوان کا نام اکبر حسین ہے۔ اور یہ اشعار اس کی فکر کا اوّلین ثمر ہیں۔ ہمیں نہیں معلوم کہ اس نوجوان کا اس وقت شاعری میں کوئی استاد تھا یا نہیں اور یہ اشعار اس کو دکھائے گئے یا نہیں۔ اور اگر ایسا ہوتا تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہ اپنے شاگرد کو جھڑکتا کہ یہ کیا مہمل گوئی ہے یا یہ فیصلہ کرتا کہ لڑکا ہونہار ہے۔ ذہین ہے۔ معنی آفرینی کی اہلیت رکھتا ہے اگر اس کی رہنمائی کی گئی تو اچھا شاعر بن جائے گا۔ اس کے بعد کچھ پتہ نہیں کہ یہ رہنمائی نوجوان کو میسر آئی یا نہیں اور فکرِ سخن جاری رہی یا نہیں لیکن چار سال بعد جبکہ اس کی عمر اکیس[21] برس کی ہے۔ پہلے پہل ایک مشاعرے میں شریک ہوتا ہے اور طویل غزل خاص والہانہ انداز سے سناتا ہے۔ جس کے بعض اشعار یہ ہیں۔

دکھلاتے ہیں بت جلوۂ مستانہ کسی کا یاں کعبۂ مقصود ہے بت خانہ کسی کا

نالاں ہے اگر وہ تو یہ ہے چاک گریباں بلبل کی طرح گل بھی ہے دیوانہ کسی کا

تاثیر جو کی صحبتِ عارض سے دمِ خواب خجلت دہِ آئینہ ہوا شانہ کسی کا

پہنچی جو نگہ عالمِ مستی میں فلک پر ہم سمجھے مہِ نو کو بھی پیمانہ کسی کا

تاثیرِ محبت سے جو ہو جاتے ہیں بے چین رو دیتے ہیں اب سن کے وہ افسانہ کسی کا

ہم جان سے بیزار رہا کرتے ہیں اکبر جب سے دلِ بے تاب ہے دیوانہ کسی کا

آپ نے دیکھا کہ اس چار سال کے اندر کتنا فرق ہوگیا۔ ہر چند اس زمانے کی غزل گوئی کا پامال انداز اس میں موجود ہے یعنی وہی

معمولی تشبیہیں، وہی گل و بلبل اور وہی کعبہ و بت خانہ جو غزل کے عناصر اور ضروری حصے ہیں۔ یہاں بھی پائے جاتے ہیں۔ لیکن سیماب و اشک والی بے معنی وقت پسندی کا کہیں پتہ نہیں۔ اور آخری دو شعر تو ان جذبات کا کچھ پتہ دیتے ہیں جنھیں ہم آسانی سے صحیح تغزل میں شامل کر سکتے ہیں۔ زمانہ گزرتا چلا گیا۔ اکبر شعر کہتے رہے۔ مشاعروں میں شریک ہوتے رہے۔ لیکن ماحول کے اثر سے مغلوب رواج سے متاثر اور زلف و سنبل کے جال میں بدستور گرفتار۔ تاہم وہ فطری صلاحیت جس کو آگے چل کر بالکل دوسری راہ اختیار کرنا تھی۔ کبھی منہ سے کچھ اور کہلوا دیتی اور وہ "کچھ اور" اس رنگ کا ہوتا تھا۔

ابھی سے خون رلاتی ہے مجھ کو فکرِ مآل   چمن میں بعد ترے اب بہار کیا ہو گا

گو بہت کچھ رنج یارانِ وطن سے تھا ہمیں   آنکھ میں آنسو مگر وقتِ سفر آ ہی گیا
بعد مدت کے نظر آئی جو صورت یار کی   سو طرح دل کو سنبھالا غش مگر آ ہی گیا

اکبر کے اس ابتدائی دور میں سوائے غزل کے ہمیں کچھ اور نہیں ملتا اور غزل بھی اسی رنگ کی جس میں قافیہ پیمائی اور رعایتِ لفظی سے کام لیا جاتا ہے۔ اکبر نے اس دورِ شاعری میں اساتذہ کی غزلوں کو سامنے رکھ کر ایک ایک زمین میں چار چار غزلیں کہیں اور خوب زورِ آزمائی کی۔ یہاں تک کہ خود شاید تھکن محسوس کرنے لگے اور جب اس رنگ کو چھوڑا ہے

بزمِ عشرت کہیں ہوتی ہے تو رو دیتا ہوں   کوئی گزری ہوئی صحبت مجھے یاد آتی ہے

اکبر کا یہ دورِ شاعری دس بارہ سال رہا۔ اور جب اُن کی عمر تیس سال کی ہوئی تو یہ رنگ بہت کچھ بدلا ہوا تھا۔ اب ان کے ہاں زیادہ زور لفظوں پر نہ تھا بلکہ واقعیت پر تھا اور ان کی غزلوں کا داخلی رنگ بھی بہت کچھ نکھر گیا تھا۔ ایک غزل ملاحظہ ہو ؂

کہوں کس سے قصۂ درد و غم کوئی ہم نشیں ہے نہ یار ہے   جو انیس ہے تری یاد ہے جو شفیق ہے دلِ زار ہے
یہ نوید اوروں کو جا سنا ہم اسیرِ دام ہیں اے صبا   ہمیں کیا چمن ہے جو رنگ پر ہمیں کیا جو فصلِ بہار ہے
تو ہزار کرتا لگاوٹیں میں کبھی نہ آتا فریب میں   مجھے پہلے اس کی خبر نہ تھی ترا اور ہی دن کا پیار ہے
وہ نظر جو مجھ سے ملا گئے یہ اور آفتیں ڈھا گئے   کہ حواس و ہوش و خرد ہے اب نہ شکیب و صبر و قرار ہے
مجھے رحم آتا ہے دیکھ کر ترا حال اکبر نوحہ گر   تجھے وہ بھی چاہے خدا کرے کہ تو جس کا عاشقِ زار ہے

آپ نے دیکھا کہ اکبر کے دوسرے دور کی غزل گوئی پہلے دور سے کتنی مختلف نظر آتی ہے۔ پہلے سوز و گداز مفقود تھا اور اب اس کی چاشنی ان کے اکثر اشعار میں پائی جانے لگی ہے۔ پہلے وہ صرف سطح پر رہ کر بال کی کھال نکالا کرتے تھے۔ اور اب دل کی گہرائیوں تک بھی ان کا ذہن پہنچنے لگا۔ پہلے ان کے کلام میں تکلف اور تصنع تھا اور اب اس میں بے ساختہ پن ہے۔ پہلے وہ صرف لفظوں سے کھیلا کرتے تھے۔ اور اب وہ معنویت کی طرف مائل ہو چکے ہیں۔ پہلے ان کی غزلوں میں اوچھا پن تھا۔ لیکن اب ان میں وزن پیدا ہو چلا ہے۔ پہلے ان کی شاعری روایتی قسم کی تھی لیکن اب وہ خود دلی جذبات کو نظم کرنے لگے تھے۔ ہر چند اکبر کے دوسرے

دور کی غزل گوئی میں بھی ہمیں اس رنگ کے اشعار کافی نظر آتے ہیں۔

اسی کے سایہ میں ہوتی ہے پرورش دل کی بسر ... خدا دراز کرے عمر زلفِ پیچاں کی
جھلک رہا ہے لبِ نازک پہ اُن کے رنگ اپنا ... یہ شوخیاں تو ذرا دیکھو سرخیٔ پاں کی

لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ اس کا بدرقہ ان اشعار سے بھی کر دیتے ہیں۔

غم نہیں اس کا جو شہرت ہوگئی ... ہوگئی اب تو محبت ہو گئی
اب کہاں اگلے سے وہ راز و نیاز ... مل گئے صاحب سلامت ہوگئی

یہ وہ زمانہ تھا جب اکبر وکیل ہو کر دنیا کا مطالعہ شروع کر چکے تھے اور دوسری طرف اودھ پنچ کی طنزیہ ظرافت نے ملک میں شوخی اور شوخ نگاری کا عام ذوق پیدا کر دیا تھا۔

چنانچہ اکبر جن کی قسمت میں ملک کا بہترین طنز نگار ہونا لکھا تھا۔ اس رنگ سے بہت متاثر ہوئے اور غزل گوئی کے ساتھ ساتھ انھوں نے مثنوی، قطعات اور رباعیات بھی لکھنا شروع کردیں۔ لیکن ان کا رنگ بالکل علیحدہ تھا اور ایسا ہونا چاہیے تھا کیونکہ اب یہ اودھ پنچ کے مستقل نامہ نگاروں میں شامل ہوئے تھے اور اس طرح ان کے انتقادی ذوق کو ابھرنے کا پورا موقع مل گیا تھا۔ اس وقت ملک میں انگریزی تعلیم کا چرچا تھا۔ مغربی تہذیب تیزی سے پھیلتی جا رہی تھی۔ اخلاق اور عادات میں آزادی پیدا ہو چلی تھی۔ قدیم معاشرت پر جدید معاشرت چھائی جا رہی تھی۔ اور سر سید نے کالج قائم کر کے ملک میں دو جماعتیں پیدا کر دی تھیں۔ ایک وہ جو انگریزی تعلیم اور سر سید کے حامی تھے اور دوسری وہ جو اسے مشتبہ نگاہوں سے دیکھتی تھی۔ اودھ پنچ اس دوسری جماعت کا آرگن تھا اور اکبر اسی آرگن کے نامہ نگار تھے۔ اس لئے وہ اس جماعت کے فرد تھے۔ چنانچہ ۱۸۷۷ء میں انھوں نے جو ایک منظوم خط اودھ پنچ کو لکھا وہ ثبوت ہے اس بات کا۔ اگر وہ بجائے غزل کے شروع ہی سے مثنوی کی طرف توجہ کرتے تو بہت زیادہ کامیاب ہوتے۔ بیانیہ شاعری کا چونکہ میدان وسیع ہوتا ہے اور انتقادی ذوق رکھنے والے شاعروں کو اس میں پھولنے پھلنے کا زیادہ موقع ملتا ہے اس لئے اکبر نے جب کبھی مثنوی کے رنگ میں لکھا بہت زیادہ کامیاب ہوئے۔ اور اس سلسلے میں ان کی وہ نظم جو (سودی [illegible]) کی مشہور نظم آثار لوڈر کے انداز پر لکھی گئی ہے۔ اور جنگ نامہ روم و روس جو غیر مطبوعہ ہے۔ اس بات کا مزید ثبوت ہیں کہ ان میں مثنوی نگاری کی بڑی زبردست قوت پائی جاتی تھی۔ افسوس ہے کہ ان کے کلیات کی ترتیب میں تاریخوں کا لحاظ نہیں رکھا گیا۔ اس لئے کچھ پتہ نہیں چلتا کہ غزلوں کے علاوہ قطعات وغیرہ کی صورت میں انھوں نے جو کچھ لکھا۔ اس میں تقدیم و تاخیر کے لحاظ سے کس نظم کو پہلے رکھنا چاہیے اور کسے بعد۔ لیکن چونکہ وہ ۱۸۸۵ء میں منصف ہوگئے تھے۔ اس لئے ۱۸۶۶ء سے لے کر ۱۸۸۵ء تک کا زمانہ وکالت جس میں اودھ پنچ کے ساتھ نامہ نگارانہ تعلق کے بھی چند سال شامل ہیں، ان کی نظم نگاری کا پہلا دور تھا۔

اس زمانہ کی نظموں میں ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ وہ نسبتاً زیادہ طویل ہیں اور ان کو کسی نہ کسی فارسی شعر پر تضمین کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ لیکن باوجود اس میلان کے غزل گوئی کا سلسلہ بھی برابر جاری تھا اور اس میں نیا وہ پاکیزگی

پیدا ہوتی جا رہی تھی۔ مثلاً ایک غزل ملاحظہ ہو۔

ہم کیوں یہ مبتلائے بے تابیٔ نظر ہیں — تسکینِ دل کی یارب وہ صورتیں کدھر ہیں
دنیا کی کیا حقیقت اور ہم سے کیا تعلق — وہ کیا ہے اک جھلک ہے ہم کیا ہیں اک نظر ہیں
پیدا کیے فلک نے نادیدنی مناظر — نیچی ہیں ان کی نظریں جو صاحبِ نظر ہیں
ہنگامہ خانۂ جہاں میں رقعت ہی کیا ہماری — اک ناشنیدہ اُف ہیں اک آہِ بے اثر ہیں
اکبر کے شعر سن کر کہتے ہیں اہلِ باطن — اب بھی خدا کے بندے کچھ صاحبِ اثر ہیں

آپ نے دیکھا کہ اس میں ایک خاص فلسفیانہ انداز ہے۔ ایک خاص معلمانہ کیفیت ہے جو مخاطب کو فطرت کی گہرائیوں کے مطالعہ کی طرف مائل کرتی ہے۔ ان کے تیسرے دور میں ان کی یہ معنی آفرینی برابر بڑھتی ہی رہی۔ اور اُن کی غزل میں ایک خاص وزن پیدا ہو گیا۔ ملاحظہ ہو، تین شعر کی ایک غزل سے

یہ جتنے جلوے جہانِ فانی کے اپنی شکلوں میں جلوہ گر ہیں — خدا کی ہستی کے سب ہیں شاہد اور اپنی ہستی سے بے خبر ہیں
تمیز اتنا کہ کم تعین، تعین اتنا کہ اپنی ہی دھن — کمال ایسا کہ سب ہیں حیراں جمال ایسا کہ سب نظر ہیں
جو اس کچھ نیک کام کر لیں کہ جیب و دامن کو اپنے بھر لیں — مرے معانی کی حد نہیں ہے اگرچہ الفاظ مختصر ہیں

ان اشعار کو پڑھیے اور ابتدا کے ان دو اشعار کو بھی پڑھیے جن میں "سیماب واشک" کا ذکر کیا گیا ہے۔ اور پھر غور کیجیے اکبر کے رنگ تغزل میں آخر میں کتنا تغیر پیدا ہو گیا تھا۔ اکبر جس حیثیت سے ملک میں مشہور ہیں وہ ایک طنز نگار نقاد کی حیثیت ہے جس میں ان کی ظرافت نے جان ڈال دی ہے۔ اکبر کو ادبی دنیا میں ایک سوشل نقاد کی حیثیت سے جتنی شہرت حاصل ہوئی اس کی مثال مشرق کے لٹریچر میں کوئی نہیں ملتی۔ اکبر نے اپنے زمانے کے ادبی، معاشرتی اور سیاسی رجحانات پر جو تنقید کی ہے وہ بالکل انفرادی حیثیت رکھتی ہے۔ ان کا نصب العین مشرق کو مغرب سے بچانا ہے۔ وہ نئی تہذیب اور تعلیم کے مخالف نہیں ہیں۔ لیکن اس سے مشرق کے اخلاق و روایات کو جو صدمہ پہنچتا ہے اس کی مخالفت ضرور کرتے ہیں۔ وہ یہ نہیں چاہتے کہ ملک کے نوجوان تقلید مغرب میں اپنی قومی خصوصیات اور مذہبی احساسات کو ترک کر دیں۔ اور ان ہی خیالات کو مختلف انداز میں ظاہر کیا ہے۔ ایک جگہ وہ صاف صاف اس کو اس طرح ظاہر کرتے ہیں۔

اک برگِ مضمحل نے یہ اسپیچ میں کہا — موسم کی کیا خبر نہیں اے ڈالیو تمہیں
اچھا جوابِ خشک یہ اک شاخ نے دیا — موسم سے باخبر ہوں تو کیا جڑ کو چھوڑ دیں

عورتوں کی تعلیم سے متعلق بھی ان کا فلسفہ یہی تھا۔ اگر مغربی تعلیم انھیں مشرق کی گھریلو زندگی سے ناآشنا کر دیتی ہے تو کسی کام کی نہیں۔ اس لیے وہ پردہ کے بھی حامی تھے۔ اور لڑکیوں کی بے جا آزادیوں کو پسند نہ کرتے تھے۔ اس موضوع پر انھوں نے بڑی دل چسپ باتیں کہی ہیں۔ گھر اور شوہر کی طرف سے عورت کی بے اعتنائی انھوں نے ایک شعر میں کس خوبی سے ظاہر کی ہے۔

ان سے بی بی نے فقط اسکول ہی کی بات کی — یہ نہ بتلایا کہاں رکھی ہے روٹی رات کی

اسی قسم کا ایک اور طنز ملاحظہ ہو۔ بنارس سے علی گڑھ کے اولڈ بوائز نے ایک رسالہ اولڈ بوائے کے نام سے نکالا تھا۔ اس پر اکبر فرماتے ہیں۔

نکلا بہ آب و تاب بنارس سے اولڈ بوائے — اللہ اس کو گولڈ بھی دے اور پرل بھی
خواہش ہے اب یہ بعض محبان قوم کی — نکلے کسی طرف سے یوں ہی اولڈ گرل بھی

پردہ کی حمایت میں انھوں نے بہت کچھ لکھا ہے اور بعض جگہ اس سلسلے میں ان کی طنز نگاری بہت سخت ہو گئی ہے۔

پردے کی وجہ سے یہ اجازت ہے چار کی — پردہ نہ ہو تو ایک کی بھی احتیاج کیا

پردہ اُٹھا ہے ترقی کے یہ سامان تو ہیں — حوریں کالج میں پہنچ جائیں گی غلمان تو ہیں

عورتوں کی آزادانہ تعلیم اور بے پردگی کا ذمہ دار وہ مرد کو قرار دیتے ہیں اور نہایت لطیف انداز میں اس کا اظہار کرتے ہیں۔

خدا کے فضل سے بی بی میاں دونوں مہذب ہیں — حجاب اس کو نہیں آتا انھیں غصہ نہیں آتا

بے پردگی کا جو نتیجہ ان کی نگاہ میں تھا اسے ایک شعر میں یوں ظاہر کیا ہے۔

کیا گزری جو اک پردے کے عدو رو رو کے پولیس سے کہتے ہیں — عزت بھی گئی، دولت بھی گئی، بیوی بھی گئی، زیور بھی گیا

اکبر قومی کانفرنس کی ہنگامہ آرائیوں سے بھی زیادہ خوش نہ تھے۔ اور سمجھتے تھے کہ یہ مرض کا حقیقی علاج نہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

مجرب ایسا ملا نسخہ قوم بازی کا — کہ قدر اُٹھ گئی دنیا سے عشق بازی کی

قوم کے لیڈروں اور ریفارمروں پر بھی انھوں نے خوب خوب طنز کئے ہیں۔ ایک شعر ملاحظہ ہو۔

قوم کے غم میں ڈنر کھاتے ہیں حکام کے ساتھ — رنج لیڈر کو بہت ہے مگر آرام کے ساتھ

وہ اصلاح قومی کے باب میں سب سے پہلے اقتصادی اصلاح چاہتے تھے۔ اور مسلمانوں کی ترقی کے باب میں وہ اس چیز کی کمی پاتے تھے۔ چنانچہ ایک جگہ فرماتے ہیں:

انگریز خوش ہے مالک ایروپلین ہے — ہندو مگن ہے اس کا بڑا لین دین ہے
بس اک ہمیں ہیں ڈھول میں پول اور خدا کا نام — بسکٹ کا صرف چور ہے غنڈہ کا بھیس ہے

تہذیب جدید کی کورانہ تقلید سے مسلمانوں کو جو فائدہ پہنچا اس کو اس انداز میں ظاہر کرتے ہیں۔

رہ گیا دل ہی میں شوقِ سایۂ الطافِ خاص — مجھ کو آنے کی اجازت دی نہیں ڈرروم میں
کھانے کے کمرے سے رخصت کر دیا بعد از ڈنر — تھیں فقط چھریاں ہی اور کانٹے مرے مقسوم میں

اکبر بہت مذہبی آدمی تھے اور جدید تعلیم سے جو بے دینی پھیل رہی تھی اس پر بہت دل کڑھایا کرتے تھے۔ بعض اشعار

[اس] خیال کے ملاحظہ ہوں:

نہ کتابوں سے نہ کالج کے ہے در سے پیدا
دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

[م]انا یہی ہے ہو نہیں سکتی فلاحِ قوم
ہرگز گزر سکیں گے نہ ان منزلوں سے آپ

مذہب ہے کم ترقیِ یورپ کے سامنے
معذور خاکسار بھی ہے اور جناب بھی

اکبر کا بڑا کمال بات میں بات پیدا کرنا تھا۔ اور اسی کے لئے ان کا مزاح وطنز زیادہ تر قافیوں کی تلاش ہی پر منحصر ہے۔ [ا]ن کے ایک دوست بیماری کے بعد لاہور کسی جلسے میں شرکت کے لیے جانے لگے۔ انھوں نے کہا ابھی موت نہیں ہے۔ آپ کیوں جاتے ہیں۔ وہ نہیں مانے۔ اکبر اس خاص واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

میں کہتا ہوں جاتے ہو لاہور بلا موت
وہ اس کو سمجھتے ہیں لا حول ولا قوۃ

[ا]یک اور شعر نہایت لطیف کنایہ لئے ملاحظہ ہو:

شیخ تثلیث کی تردید تو کچھ کرتے ہیں
گھر میں بیٹھے ہوئے والضّالّین پڑھا کرتے ہیں

لفظ تثلیث کے ساتھ ہی سورۂ والضّالّین کی طرف منتقل ہونا اکبر کی شوخ ذہانت کا زبردست ثبوت ہے۔ قافیہ [ک]ی تلاش کی چند مثالیں اور ملاحظہ ہوں:

یا ایجی ٹیشن کے صدقے جائیے دودھ اور کھانڈ لے
یا ایجی ٹیشن کے بدلے تو چلا جا مانڈلے

بفضلِ خدا سے عزت پائی آج ہوئے سی۔ ایس۔ آئی
شیخ نہ سمجھے لفظ انگریزی بھولے ہوئے ہیں یہ عیسائی

پنجاب کے ایک وکیل الف دین صاحب نے کوئی مذہبی کتاب لکھی تھی اُس پر اکبر کا یہ شعر ملاحظہ ہو:

الف دین نے خوب لکھی کتاب
کہ بے دین نے پائی راہِ صواب

اُردو میں اکبر ہی پہلا اور شاید آخری شاعر تھا جس نے نظم میں لطیفوں اور چٹکلوں کو پیش کیا ہے۔ اور سب سے [ب]ڑا کمال یہ تھا کہ اس سلسلے میں وہ اپنے اصل مقصد کو کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔ مغرب کی بے جا تقلید کا اثر دو شعروں میں اس طرح ظاہر کرتے ہیں:

تھے کیک کی فکر میں سو روٹی بھی گئی
چاہی تھی شے بڑی سو چھوٹی بھی گئی

واعظ کی نصیحتیں نہ مانیں آخر
پتلون کی تاک میں لنگوٹی بھی گئی

مغربی وضع کی عام مقبولیت کا اثر اس طرح ظاہر کرتے ہیں:

میرے منصوبے ترقی کے ہوئے سب پائمال
بیج مغرب نے جو بویا وہ اُگا اور پھل گیا

بُوٹ ڈاسن نے بنایا میں نے اک مضموں لکھا ملک میں مضموں نہ پھیلا اور جُوتا چل گیا

اکبر کا مطالعۂ فطرت بڑا زبردست تھا۔ اور اگر وہ خالص منظریہ شاعری کرتے تو بھی بہت کامیاب ہوتے۔ ایک نظم ملاحظہ ہو جو محاکات اور جزئیات نگاری کی بہترین مثال ہے۔

دو تیتریاں ہوا میں اُڑتی دیکھیں ۔ اک آن میں سو طرف مڑتی دیکھیں

بھولی، خوش رنگ، چست، نازک، پیاری پہنے ہوئے فطرتی منقش ساری

پھرتی ہے کہ برقِ طبیعت کا اُبھار تیزی ہے کہ آنکھ کو تعاقب دشوار

جو فاصلہ کر لیا ہے باہم قائم وہ کبھی ہے بلا زیادت و کم قائم

گو تابعِ جوشِ برق پردازی ہیں دونوں کے خطوطِ طیر متوازی ہیں

کیونکر میں کہوں کہ یہ نظر بندی ہے اللہ اللہ کیا ہنرمندی ہے

ان جانوروں میں گرل اسکول کہاں فطرت کے چمن میں صنعتی پھول کہاں

کس بزم سے ایسا ناچ سیکھ آئی ہیں پریاں اندر کی جن سے شرمائی ہیں

اِس سمت اگر خیالِ انساں بڑھ جائے
داماںِ نظر پہ رنگِ عرفاں چڑھ جائے

—

فراق گورکھپوری

غزل

بزمِ مہ جبیناں ہے، چوڑیاں کھنکتی ہیں
خیرہ کُن تبسّم کی بجلیاں لپکتی ہیں

پائے ناز اُٹھانے میں قامتوں کی جنبش ہے
یا کِھلے گلابوں کی ڈالیاں لچکتی ہیں

جیسے زیرِ عارض کچھ شمعیں جھلملاتی ہوں
بزم میں مری غزلیں اس طرح دمکتی ہیں

بوسہ زن مرا ہر لفظ، ابروؤں پہ ہے جیسے
چنپئی جبینوں پر بندیاں جھلکتی ہیں

یوں مرے ترانوں سے کشفِ راز ہوتا ہے
جیسے روئے ہستی سے چادریں سرکتی ہیں

مہر و ماہ و انجم بھی رقص میں شراروں کے
کائنات کی نبضیں آج یوں دہکتی ہیں

برق پاشِ پیشانی مجھ کو یاد آتی ہے
فکر کے فرازوں پر بجلیاں چمکتی ہیں

جیسے تیری پائل کی آ رہی ہوں آوازیں
میری شامہائے ہجر دم بدم کھنکتی ہیں

جس طرح مچلتی ہوں بطنِ شرق میں کرنیں
اُس نگاہ میں اِس طرح شوخیاں جھلکتی ہیں

جو اُلجھ رہی ہیں آج تیری زلف کا فر سے
وہ ہوائیں کس جانب دیکھئے سنکتی ہیں

برسرِ درِ مقصد ہم پہنچ ہی جائیں گے
گو اندھیری ہیں راہیں، منزلیں چمکتی ہیں

یادِ قدِ رعنا سے رُوح میں چراغاں ہے
مسکراتے اعضا کی یا لویں لپکتی ہیں

مسکراتی ہیں کلیاں آج شاخساروں پر
جیسے جسمِ رنگیں پر چولیاں مسکتی ہیں

شعلے تو وہ ہیں بھڑکیں اپنے آپ جو دن رات
ہیں وہی شرابیں جو رات دن چھلکتی ہیں

جلوہ گر ہے ہر دل میں یوں ضیائے مستقبل
جس طرح مسافت میں دوریاں جھلکتی ہیں

اس طرح جوانی کی چھپتی جاتی ہیں یادیں
تیسرے پہر دھوپیں جس طرح کھسکتی ہیں

یوں ہے ریزشِ شبنم، چہرۂ گلِ تر پر
رُخ پر اشک کی بوندیں جس طرح ڈھلکتی ہیں

وہ گزر گیا کب کا، پھر بھی رہ گزاروں میں
کشتِ خوش خرامی کی بالیاں لہکتی ہیں

بزمِ مہ جبیناں میں جگمگاتے ماتھوں سے
چادریں سرکتی ہیں، بجلیاں لپکتی ہیں

سن سکا نہ مدت سے گو کسی کی باتوں کو
اب بھی اُن صداؤں کی پتیاں مہکتی ہیں

ہیں فراقؔ ہر دل میں نغمہ زن مری غزلیں
جیسے شاخساروں پر بلبلیں چہکتی ہیں

فیض احمد فیض

رخصت

دردِ اتنا تھا کہ اُس رات دلِ وحشی نے
ہر رگِ جاں سے الجھنا چاہا
ہر بُنِ مو سے ٹپکنا چاہا
اور کہیں دور، ترے صحنِ چمن میں گویا
پتّا پتّا مرے افسردہ لہو میں دُھل کر
حُسنِ مہتاب سے آزردہ نظر آنے لگا
میرے ویرانۂ تن میں گویا
سارے دُکھتے ہوئے ریشوں کی طنابیں کھُل کر
سلسلہ وار پتہ دینے لگیں
رخصتِ قافلۂ شوق کی تیّاری کا
اور جب یاد کی بجھتی ہوئی شمعوں میں نظر آیا کہیں
ایک پل آخری لمحہ تری دل داری کا
درد اتنا تھا کہ اس سے بھی گزرنا چاہا
ہم نے چاہا بھی مگر دل نہ ٹھہرنا چاہا

آخرِ شب کے ہم سفر

ناول

چوتھی قسط

قرۃ العین حیدر

(۱۲)

آشاڑھ ۔ بھادرو ۔ ۱۳۴۸ء[1]

کال کے گھٹا ٹوپ اندھیارے میں مناظر غیر مرئی تصاویر کی طرح روشن رہیں گے ۔ کیونکہ ہر منظر جو معدوم ہوا، باقی ہے۔ ان سارے گھروں، روشن کمروں کا تصور کرو جو لمحہ گذرنے کے باوجود، وقت میں شامل، موجود ہیں۔ باتیں کرتے ہوئے لوگ، ٹیبلو گروپ ۔ ان کی آوازیں۔

چندر کنج اندھیرا اترا تھا؛ جب وہ تین اس کے پھاٹک میں داخل ہوئے ۔ وہ برآمدے میں آکر بیٹھک خانے کا دروازہ کھٹکھٹاتے ہیں ۔ برآمدے کے سرے پر چادر میں سر منھ لپیٹے ایک داڑھی والا بوڑھا بے خبر پڑا سوتا ہے۔ اب نو وارد برآمدے سے اتر کر گھاس میں سے گزرتے پچھواڑے ڈیوڑھی کی کنڈی بجا رہے ہیں ۔

رسوئی گھر کی کھڑکی کھلتی ہے ۔ گھاس پر روشنی کا راستہ سا بن گیا ۔ کھڑکی میں سے کسی نے جھانکا۔

دیپالی"

"ارے تم لوگ ۔" دیپالی ذرا خشکی سے کہتی ہے مگر فوراً باہر آکر ڈیوڑھی کا دروازہ کھولتی ہے ۔ وہ تینوں اس کے ساتھ پچھلے برآمدے میں آجاتے ہیں ۔ دیپالی بیٹھک خانے کا دروازہ کھولتی ہے، جس میں شدید حبس طاری ہے ۔

وہ تینوں برآمدے میں پڑے ہوئے تخت پر ٹک جاتے ہیں ۔ محمود الحق تالی بجا کر ایک مچھر مارتا ہے ۔ جیوتیرموئے دتا نے سگریٹ سلگانے کے بعد ماچس کی خالی ڈبیا نشانہ باندھ کر سامنے حوض میں پھینک دی ۔ روزی بنرجی تیوری پر بل ڈالے آنگن کے درختوں کو دیکھ رہی ہے ۔ تینوں خاموش ہیں ۔ دیپالی بھی خاموش ہے ۔

"ادھر آؤ ۔ دیپالی ۔" روزی اچانک ذرا درشتی سے کہتی ہے ۔ اور دیپالی کے آگے آگے چلتی اس کے کمرے میں داخل ہوتی ہے ۔

کمرے میں مچھر بھنبھنا رہے ہیں ۔ دیپالی نے روشنی جلائی ۔

"تمہارے بابا سو رہے ہیں ۔" ؟ روزی کا سوال ۔

"بابا اور شیشی ماں فرید پور گئے ہیں ۔ شیشی ماں کے دیور کی لڑکی کی شادی ہے ۔ اس میں بابا کی شرکت ضروری تھی ۔ رات کو عبد القادر برآمدے میں سوتے ہیں ۔ کل یا پرسوں میں بھی چلی جاؤں گی ۔ شادی اتوار کو ہے ۔ کھوکھو بیمار پڑ گیا تھا اس لیے میں بابا کے ساتھ نہ جا سکی ۔" وہ پلنگ پر ٹک جاتی ہے ۔ روزی دروازہ بھیڑ دیتی ہے ۔

باہر محمود الحق اور جیوتیرموئے دتا چپ چاپ بیٹھے ہیں ۔ اچانک اندر سے روزی کی گرجدار آواز آتی ہے ۔

---

[1] بنگالی سن مطابق ۱۹۴۲ء

"غدار ———"

محمود الحق تاسف سے سر ہلاتا ہے۔

اندر کمرے میں روزی بنرجی عین اسی جگہ کھڑی ہے جہاں آج سے ڈھائی سال قبل دیپالی نے اس سے حلف اٹھوایا تھا۔

"ٹوڈی" روزی کی دوسری گرج۔

"پارٹی ڈائریکٹو" دیپالی کا جوشیلا 'برافروختہ' توضیحی لہجہ۔

"برٹش ایجنٹ ———" روزی کی پھنکار۔

"فاشسٹ ———" دیپالی کا ترکی بہ ترکی جواب۔

جیوتیرموئے دتا اٹھ کر دروازے پر دستک دیتا ہے۔ آگ بگولہ روزی اور دیپالی باہر نکلتی ہیں۔ اچانک بارش شروع ہو جاتی ہے۔ ایک زوردار بوچھار نے سارا برآمدہ شرابور کر دیا۔ وہ چاروں بیٹھک خانے میں چلے جاتے ہیں۔ دیپالی بتی جلا کر کھڑکیاں کھولتی ہے۔ کرسیوں پر ٹک کر وہ چاروں زور شور کی بحث میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ مُن مَن کر کھوکھو اپنے کمرے سے آنکھیں ملتا چھینکتا سلیپر گھسیٹتا بیٹھک خانے میں آتا ہے۔ وہ اب بڑا ہو چکا ہے۔ اور کالج میں پڑھتا ہے۔ وہ بھی تندہی سے تکرار میں شامل ہو گیا۔ اب یہ لوگ دہشت پسند شہداء کا ذکر کر رہے ہیں۔

دیپالی جلدی سے اٹھ کر باہر چلی جاتی ہے۔ آسمان پر زور سے بجلی چمکی۔ وہ چند لمحوں تک چپ چاپ کھڑی اندر جھانک کر اپنے چچا کی تصویر کو دیکھتی رہتی ہے۔ کالی گھٹا ہرے بھرے آنگن پر اتنی نیچے جھک آئی ہے، لگتا ہے اگر ہاتھ بڑھاؤ تو گرفت میں آ جائیگی۔

"کنک لتا برُوا ——— کل شہید ہو گئی ———" اندر محمود الحق کہہ رہا ہے۔

"امپیریل ہوٹل میں ریحان دا اور اوما دی ———" جیوتیرموئے دتا کہہ رہا ہے۔ دیپالی چونکنی ہو گئی۔

"اوما دی جو کلچرل فرنٹ پر کام کر رہی ہیں — فاشزم کے خلاف ——— ہا ہا ہا ———" روزی کا زہرخند۔

"سر بیری تورش رائے کی صاحبزادی۔؟" محمود الحق کا تجاہل عارفانہ۔

"ڈیڈی کو ناٹ ہُڈ مل گئی ——؟ ہُرّے" جیوتیرموئے دتا کا نعرہ۔

اب ساری آوازیں گڈمڈ ہو جاتی ہیں۔

"ڈنر اڑاؤ —"

"چرخہ چلاؤ —"

"پمفلٹ وار میں مضمون لکھو ———"

"ہرتے ___ ہرتے ___"

"ہم جاتے ہیں دیپالی ___" روزی کی آواز۔ "تمھیں یاد رکھیں گے۔ بائی بائی۔ گڈ نائٹ۔"

"گڈ نائٹ دیپالی۔" محمود الحق اور جیوتیرموئے دتا کی آوازیں۔

وہ تینوں جھٹ سے کواڑ کھول کر سامنے کے برآمدے میں نکل جاتے ہیں۔ دیپالی پچھلے برآمدے میں دیوار سے لگی کھڑی ہے۔ اس کے پاؤں فرش پر جم سے گئے ہیں۔ وہ رنیش چندر سرکار کی تصویر پر نظر ڈال کر جلدی سے پلکیں جھکا لیتی ہے۔

رات کا اندھیرا اور بارش باہر ان تینوں کو نگل لیتی ہے۔

کھوکھو باہر کا دروازہ بند کر کے چھینکتا ہوا بیٹھک خانے میں واپس آتا ہے۔ کیا یہ بھی یہ تو اندولن میں شامل نہیں ہو گیا؟ وہ اُسے کبھی کچھ نہیں بتاتا۔ عجیب گھنا تلخ سا لڑکا بنتا جا رہا ہے۔ وہ خاموشی سے اپنے کمرے میں چلا جاتا ہے۔

باہر بارش کی پھوار سے عبدالقادر کا آدھا بستر بھیگ چکا ہے۔ وہ اس کے باوجود گہری نیند سو رہا ہے۔ جب بارش کا چھینٹا اس کے چہرے پر پڑتا ہے تو نیند میں بڑبڑاتے ہوئے وہ کروٹ بدل لیتا ہے۔

دُور سے بم پھٹنے کی آوازیں آ رہی ہیں۔ یہ منظر بھی وقت میں تحلیل نہیں ہو گا۔

(۱۳)

بجا درد کی موسلا دھار جھڑی کی وجہ سے روزی بنرجی نے اپنی سائیکل للی کاٹج کے ایک کونے میں مقفل کر کے کھڑی کر دی ہے۔ وہ گھوڑا گاڑی میں گھر واپس پہنچی ہے۔ گاڑی اُسے مشن کمپاؤنڈ کے سامنے اتار کر برگد تلے جا کھڑی ہوئی ہے۔ اس کے دونوں رنگے گھوڑے ہنہنا ہنہنا کر کیچڑ میں اپنے سُم پٹخ رہے ہیں۔

روزی بنرجی بی اے میں فرسٹ ڈویژن لانے کے بعد یونیورسٹی میں ایم اے کے لئے داخل ہو چکی ہے۔ ریورنڈ بنرجی اس سے بے حد خوش ہیں، تعلیم میں اسقدر منہمک دیکھ کر ان کو یقین ہے کہ وہ اپنی سیاسی حماقتیں ترک کر چکی ہے۔ وہ اس پر سخت نازاں ہیں۔ میری قابل، ہونہار، بے مثال بچی، وہ اسکی پچھلے سال کی حماقت اور بدتمیزی بھی معاف کر چکے ہیں۔ اور سوچتے ہیں ایک اعلیٰ خاندان عیسائی نوجوان کی تلاش از سر نو شروع کر دی جائے۔ اس مرتبہ وہ قطعی روزی کی پسند یا ناپسند کا خیال رکھیں گے۔ گو اس سلسلے میں وہ اس سے ابھی کچھ نہیں کہتے، یوں بھی وہ اس قدر مصروف ہے۔ پوسٹ گریجویٹ پڑھائی کی وجہ سے دیر تک اُسے یونیورسٹی لائبریری میں رہنا پڑتا ہے۔ شام کو وہ سگن بگیچے جا کر اپنا ٹیوشن کرتی ہے (اس کی شاگرد یاسمین بانی اسکول پاس کر کے اب ایف اے کے لئے اس سے انگریزی پڑھ رہی ہے۔) اس طرح روزی عموماً

صبح کی گئی گئی رات پڑے تلّی کالج واپس آتی ہے۔ یوں بھی اگر وہ دیر سے گھر لوٹتے تو پادری بنرجی باز پرس نہیں کرتے۔ وہ اب بڑی ہو چکی ہے اور انہیں اس پر مکمل اعتماد ہے۔ زمانہ تیزی سے بدل رہا ہے۔ جنگ نے پرانے معاشرے کی بہت سی فصیلیں ڈھا دیں۔ جنگ دقیانوسی اور پابند وضع ڈھاکے تک پر اثر انداز ہو چکی ہے۔ پادری بنرجی اپنے اتوار کے وعظوں میں کئی بار اس اخلاقی گراوٹ کی طرف بڑے دکھ سے اشارہ کر چکے ہیں، جو کلکتے جیسے گنہ گار شہر کی مانند شاید یہاں بھی عام ہو جائے۔

ٹھیکیداروں اور تاجروں کا نودولتا طبقہ تیزی سے اُبھر رہا ہے۔ لڑائی اس وقت بنگال کے عین پڑوس میں لڑی جا رہی ہے۔ کلکتے پر ہلکی سی بمباری ہو چکی ہے۔ جاپان نے مشرق میں برٹش ایمپائر کی بنیادیں ہلا دیں۔

۵ر فروری کو سقوطِ سنگاپور کے بعد ریورنڈ بنرجی نے گرجا میں رحم کی دعا کے لئے اسپیشل سروس منعقد کی؛ کوائر نے ROCK OF AGES ایسے جذبے سے گایا کہ بڑے بڑے شقی القلب قوم پرستوں کی (پادری بنرجی کے گلے میں اینٹی برٹش بھیڑوں کی اب کمی نہیں) آنکھوں میں آنسو آگئے۔

O' GOD OUR HELP IN AGES PAST
OUR HOPE IN YEARS TO COME
OUR SHELTER IN THE STORMY BLAST
AND OUR ETERNAL HOME.

روزی بچپن سے کوائر میں گاتی آئی ہے۔ مگر اس روز غائب تھی۔ خیر

A THOUSAND YEARS IN THY SIGHT
ARE LIKE AN EVENING GONE
SHORT AS THE WATCH OF NIGHT
BEFORE THE MORNING SUN.

لیکن مارچ میں جاپانی پورے سارے برما پر قابض ہو گئے۔ رنگون سے بھاگ کر پیدل بنگال تک پہنچنے والے پناہ گزینوں کے حالات سن سن کر پادری بنرجی کا دل لرز گیا۔ ڈھاکے آنے والے اینگلو برمن، ہندوستانی اور برمی عیسائی قافلوں کے لئے مشن کمپاؤنڈ میں خیمے لگائے گئے۔ پادری بنرجی دن رات مریضوں اور زخمیوں کی تیمارداری اور دلجوئی میں جٹے رہے۔

اب بنگال کی چھاؤنیوں میں برطانوی اور امریکن فوجیوں کی ریل پیل ہے، جو برما کے جنگلوں میں پہنچتے ہی موت کے گھاٹ اتر رہے ہیں۔ موت اور تباہ کاری کا بازار ساری دنیا میں گرم ہے۔

ریورنڈ بنرجی کو سوا چند امریکن مشنریوں کے، امریکنوں سے اب تک سابقہ نہیں پڑا تھا۔ مگر پچھلے دنوں انھوں نے اس اجنبی، بے تکی، انوکھی، ایکسپیوبرنٹ قوم کے عام افراد کو پہلی بار قریب سے دیکھا جب امریکن افسروں کی ٹولیاں جیپ گاڑیوں

میں لٹل کرشن کمپاؤنڈ آنے لگیں ۔ انھوں نے بیش قیمت تحائف عیسائی غربا میں بانٹے، اور پادری بنرجی سے بڑی بے تکلفی اور بھائی چارے سے باتیں کیں ۔ اس بھائی چارے کے ساتھ انگریزان کے ساتھ کبھی پیش نہیں آئے ۔

ملایا میں برطانوی شکست کے بعد بنگال کے فوجی ہسپتال زخمیوں سے بھر چکے ہیں ۔ ایک دن پادری بنرجی نے اسٹیٹسمین میں پڑھا کہ بہت سے ہندوستانی فوجیوں کو ملایا میں جاپانیوں نے جنگی قیدی بنا لیا ۔ سبھاش بابو کے متعلق بھی آئے دن خبریں چھپا کرتی ہیں ۔

لیکن پادری بنرجی نے کسی اخبار میں یہ نہیں پڑھا کہ بنگال کے 'انقلابی' پرانے پاپی' اندھیری راتوں میں نئی سازشیں کر رہے ہیں ۔

روزی پچھلے چند روز سے رات کو کافی دیر میں گھر آتی ہے ۔ کیونکہ لائبریری مشن کمپاؤنڈ سے بہت فاصلے پر ہے ۔

گھوڑا گاڑی سے اتر کر روزی سیدھی اپنے کمرے میں چلی گئی ۔ رات کے ساڑھے نو بج چکے تھے ۔ لیکن ریورنڈ اور مسز بنرجی حسبِ معمول کھانے کی میز پر صبر کے ساتھ اس کے منتظر تھے ۔ آج اس نے بہت ہی زیادہ دیر لگا دی ۔

اپنے کمرے میں جا کر بارش سے بھیگی ساری تبدیل کرنے کے بعد وہ جلدی سے آ کر میز پر بیٹھ گئی ۔ مسز بنرجی فوراً کچن سے گرما گرم لوچیاں لے کر آئیں ۔

ریورنڈ نے ماتھے پر انگلی رکھ کر گریس کی دعا کے لئے سر جھکایا ۔ ان کی بیوی نے بھی سر جھکا دیا ۔ روزی نے بھی ۔ مگر کن انکھیوں سے اپنی رسٹ واچ دیکھتی رہی ۔

"اے ہمارے آسمانی باپ ۔ تو جس نے اپنے فضل و کرم سے یہ نعمتیں ہمارے سامنے رکھیں ۔ تیری رحمت ہمیشہ اسی طرح اس میز پر اور اس گھر پر برستی رہے ۔ آمین" پادری بنرجی نے گریس پڑھ کر سر اٹھایا ۔ ایستھر بنرجی نے لوچیاں پیش کیں ۔ ریورنڈ نے لقمہ بناتے ہوئے روزی کو دیکھا جو کھانا شروع کرنے کے بجائے ذرا بے چینی کے ساتھ چمچے سے کھیل رہی تھی ۔

"کھانا کھاؤ بیٹی ۔"

"جی ہاں پاپا ۔"

اس نے جلدی جلدی کھانا شروع کیا اور پانچ چھ نوالے نگلنے کے بعد کرسی سے اٹھنے لگی تو پادری بنرجی نے اسے ٹوکا ۔

"کیا بات ہے؟"

"بھوک بالکل ہے ہی نہیں پاپا ۔ یونیورسٹی کینٹین میں بہت سے سموسے کھا لئے تھے ۔"

"سارے ملک میں ان بدمعاشوں نے آگ لگا رکھی ہے۔ ایسے پُرآشوب زمانے میں تم اتنی رات گئے گھر لوٹی ہو۔ جوزف ہی کو ساتھ لے جایا کرو۔"

"نہیں پاپا۔ گرودیو کا انتقال ہوگیا ہے نا بے چارے کا۔ تو یونیورسٹی میں ہم لوگ ان کی یاد میں ایک بڑا زبردست پروگرام کرنے والے ہیں۔ اس سلسلے میں میٹنگ تھی۔ میٹنگ کے بعد آپ جانیئے حسب معمول اڈہ شروع ہوگیا۔"

"آج کل اڈے کا زمانہ نہیں ہے۔ ہر طرف گولیاں برس رہی ہیں، احتیاط رکھو۔"

"بہت اچھا پاپا۔" وہ کرسی سے اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھی۔

اچانک ریورنڈ بنرجی کو ایک خیال آیا۔ یونیورسٹی تو اس بدبخت بغاوت کی وجہ سے بند ہو چکی ہے۔ یہ کیا مجھے دقیانوسی احمق بڈھا سمجھ کر بے وقوف تو نہیں بنا رہی؟

"روزی ادھر آؤ۔" انھوں نے کڑک کر کہا۔

وہ ٹھٹھک گئی

"بیٹھ جاؤ۔" انھوں نے حکم دیا۔

وہ اطمینان سے واپس آکر کرسی پر بیٹھ گئی۔

"تم پھر ان ——— ان غداروں سے جا ملی ہو؟"

اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"روزی!" ریورنڈ بنرجی نے اپنے دونوں ہاتھ میز پر رکھ کر ٹوٹی ہوئی آواز میں ایک بار پھر کہنا شروع کیا۔ "جس سرکار نے ہمیں جنگلی سے انسان بنایا۔ بت پرستی کے جہنمی راستے سے نکال کر ———"

"اوہ نو پاپا ——— نوٹ اگین ———" روزی نے یک لخت جھنجھلا کر میز پر مکّہ مارا۔ پانی کا گلاس چھلک گیا۔ ایستھر بنرجی نے جھاڑن اٹھا کر پھرتی سے میز صاف کرتے ہوئے اُسے ڈانٹا۔ "روزی"

"سوری ماما۔" پھر وہ اپنے پاپا کی طرف مڑی۔

"پاپا۔ سنیئے۔ سی ایف اینڈریوز تو نہ صرف پکّے عیسائی تھے بلکہ اصل نسل انگریز بھی تھے۔ اور آپ سے کہیں زیادہ بڑے پادری۔ آپ نے جا کر کبھی ان کو یہ سب کیوں نہ سمجھایا۔؟" اس نے نہایت ڈھٹائی سے مسکراتے ہوئے کہا۔

"گوڈ سیو انڈیا۔ گوڈ سیو انڈیا ———" پادری بنرجی طیش کے عالم میں کرسی سے اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگے۔ "احمق۔ گدھو۔ انگریز چلا گیا تو ہم پھر اسی بربریت، بے ایمانی اور بے انصافی کے دور کی طرف لوٹ جائینگے جس سے انھوں نے ہمیں نجات دی۔"

روزی نے دوبارہ ذرا پریشانی سے گھڑی پر نظر ڈالی۔ پادری بنرجی اب ایک کرسی کی پشت پہ ہاتھ ٹکا کر نہایت برافروختہ آواز میں اس سے مخاطب تھے۔ "گوئٹ انڈیا کی بچی، ہندوؤں اور مسلمانوں کی جھوٹی ڈینگیں پڑھ پڑھ کر پاگل ہوگئی۔ ہندوستان کی سنہری قدیم تہذیب! سنہری قدیم تہذیب یہ تھی کہ منتیں پوری کرنے کے لئے ہندو اپنے بچوں کو گھڑیالوں کے سامنے پھینک دیتے تھے۔ ہندو لڑکیوں کو مار ڈالا جاتا تھا۔ مسلمان ٹھگ مسافروں کا گلا گھونٹتے تھے۔ انڈین کلچر! انڈین کلچر! کتنے انگریز مشنریوں نے زندہ عورتوں کو چتا سے نکالا۔ اور جب وہ ان بدنصیبوں کو بچانے کی کوشش کرتے، عین وہیں شمشان گھاٹ پر فساد ہو جاتا تھا ——— خود میری پردادی کو ——— جانتی ہے احمق؟ میری اپنی پردادی کو ستی ہونا پڑا ہندو کلچر۔ ہندو کلچر ———"

روزی کو باپ کا اسقدر شدید غصہ دیکھ کر بے اختیار ہنسی آگئی۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ "مگر پاپا۔ آپ کے مہذب مسیحی یورپ میں بھی تو ہزاروں بے گناہ عورتوں کو جادوگری کے الزام میں صدیوں تک زندہ جلایا جاتا رہا۔ اور جس زمانے میں ہندوستان میں ہندو مسلمان مزے سے اکٹھے رہ رہے تھے اس وقت آپ کے چہیتے یورپ میں INQUISITION ہو رہا تھا۔ ہا ہا ہا ——— !"

"روزی۔ چپ۔" اسٹیفن بنرجی نے سہم کر باپ بیٹی کی تکرار ختم کرانی چاہی۔

"اور سنیئے پاپا" روزی مزے سے کہتی گئی۔ "یسوع کے پجاریوں نے سارے یہودیوں کو اٹھا کر GHETTOS میں ڈال دیا۔ (میری اور بے چارے پاپا کی ڈبیٹنگ سوسائٹی! اس نے دل میں سوچا) اور یہ جو پاپا آپ اچھوتوں کی بات کرتے ہیں تو کیا آپ کے انگلینڈ میں ایک جمنی سوئپ یا اُسے کیا کہتے ہیں ——— چار وومن ——— کسی لارڈ کی میز پر اس کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھا سکتے ہیں؟ ——— ہا ہا ہا ——— !"

"کج بحثی مت کرو روزی۔" پادری بنرجی نے ڈانٹا۔

روزی کو ایک اور نکتہ یاد آیا (گو اس بحثا بحثی میں آدھ گھنٹہ برباد جائے گا) "یہ جو آپ ہمیشہ ہندوستان کے پرانے مطلق العنان حکمرانوں کو برا بھلا کہتے رہتے ہیں ——— خصوصاً سراج الدولہ کو، جو میرا ہیرو ہے ——— تو کیا آپ کے الزبتھن انگلستان میں بات بے بات لوگوں کے سر قلم نہیں کر دیئے جاتے تھے؟ جسے دیکھو ٹاور آف لندن میں پڑا جھینک رہا ہے اور دوسرے روز کھٹ سے سر غائب۔ وہاں عام آدمی کے لئے کوئی انصاف تھا؟ صرف سو برس پہلے تک آپ کے انگلستان میں ایک بھیڑ کی چوری کی سزا موت تھی۔ اب یہ "لا اینڈ آرڈر" کا کس منہ سے ہم پر رعب ڈالتے ہیں یہ انگریز کے بچے کمینے ——— ہماری دولت لوٹ کر تو خود کو مہذب بنایا ان ظالموں نے"

پادری بنرجی عینک اتار کر اُسے صاف کرتے ہوئے پھر اپنی کرسی پر بیٹھ گئے۔ بدتمیز، گستاخ۔ زباں دراز، ذہین بچی۔

"اور بتاؤں آپ کو پاپا ——" روزی اب صریحاً بے رحمی پر اتر آئی تھی۔ "آپ کے وہ جو ایک کٹر رومن کیتھولک دوست ہیں۔ ڈاکٹر فرانسس باسکو۔ جب ان کی بڑی لڑکی نے ایک مسلمان سے شادی کی جو بے چارہ ایک بجید اعلیٰ خاندان بنگالی ہے تو انھوں نے فوراً بیٹی کو عاق کر دیا۔ اور آپ بھی کس قدر خفا ہوئے تھے۔ اوہ۔ اور ابھی پچھلے دنوں ان کی چھوٹی لڑکی نے ایک معمولی امریکن فوجی سپاہی سے بیاہ رچایا تو انکل باسکو فخر سے پھولے نہیں سماتے۔ حالانکہ —— حالانکہ وہ رومن کیتھولک تو کیا عیسائی ہی نہیں سرے سے۔ یہودی ہے۔ اور جناب آپ نے بھی فوراً فلومینا کو مبارکباد کا تار بھیجا۔ تو پاپا یہ تو غلامانہ ذہنیت اور گوری چمڑی کا رعب ——"

"بس کر روزی۔" ایستھر بنرجی نے سراسیمگی سے کہا اور چپکے سے اشارہ کیا کہ کمرے سے چلی جائے۔ وہ گہرا سانس لیکر کرسی سے اٹھی۔

"اچھا۔ اچھا۔ بیٹی۔" پادری بنرجی نے ملول آواز میں جواب دیا۔ "نکال دو انگریزوں کو ہندوستان سے پھر دیکھنا کیا حشر ہوتا ہے تم سب الٹرا نیشنلسٹوں کا۔ جوں ہی یہ ہٹنے تمہارے لاڈلے ہندو مسلمانوں میں وہ جوتا چلے گا وہ بھیانک خانہ جنگی ہوگی کہ دیکھ لینا۔ تب تمہیں اس جاہل بوڑھے پادری کی باتیں یاد آئیں گی۔" ان کی آواز بھرا گئی۔

روزی نے بڑی نرمی سے کہا۔ "پاپا۔ میں تو یونہی آپ سے تفریحاً بحث کر رہی تھی۔ آخر مجھے کالج کی ڈبیٹوں میں یونہی ٹرافیاں ملتی رہی ہیں، مفت! میں قوم پرست تو یقیناً ہوں پاپا مگر آج کل جو تباہ کاری مچ رہی ہے میں خود اس کے سخت خلاف ہوں۔"

"تم مانتی ہو بیٹی کہ ایسے نازک موقع پر جبکہ برطانیہ ہر محاذ پر ہار رہا ہے ——"

"ہمیں اسکی مدد کرنی چاہیے —— بالکل —— بالکل۔" روزی نے جوش سے ان کی بات پوری کی۔

"اچھا بس ہوگئی تم لوگوں کی ڈبیٹ۔ اب پاپا کو جا کر سونے دو روزی۔" ایستھر نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا۔

"یس ماما۔" روزی نے دروازے میں جا کر باہر جھانکا مینہ تھم چکا تھا۔ "اوہ کتنی گھپ اندھیاری رات ہے ماما۔ دیکھنا سبزی باڑی پر جگنو کیسے چمک رہے ہیں۔ پاپا۔" اس نے مڑ کر پادری بنرجی سے دوبارہ کہا۔ "کیا آپ واقعی خفا ہوگئے؟ میں تو آپ کو TEASE کر رہی تھی۔ سچ مچ پاپا ——" کرسی کے پیچھے آ کر اس نے بڑے لاڈ سے ان کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔ پادری بنرجی خوش ہوگئے۔ عینک اتار کر اسے رومال سے صاف کیا۔

"سچ مچ پاپا۔ یونیورسٹی تو بند ہو چکی ہے، مگر ہماری لٹریری سوسائٹی ٹیگور کا تعزیتی پروگرام کر رہی ہے۔ کل جلسہ ہوگا۔ بڑا زبردست۔"

"دیپالی اس جلسے میں شامل ہے؟ وہ بھی آئی تھی؟"

"جی نہیں ——— جی ہاں ——— پاپا۔ رابندر سنگیت کا پروگرام اس کے بغیر کیسے مکمل ہو سکتا ہے۔"

"ہوں۔" انھوں نے اطمینان کا سانس لیا۔

"گڈ نائٹ پاپا۔" اس نے جھک کر ریورنڈ بنرجی کا سر چوما۔

"گڈ نائٹ ماما۔"

"گڈ نائٹ۔ گوڈ بلیس یو مائی چائلڈ۔" والدین نے تقریباً یک زبان ہو کر کہا۔

روزی ایک لمحے کے لیے ٹھٹھکی۔ ان دونوں پر اچٹتی سی نظر ڈالی۔ اور تیزی سے اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

ریورنڈ بنرجی کرسی سے اٹھے، اور دوبارہ ٹہلنے لگے۔ سائیڈ بورڈ پر رکھے گلدان کو چھوا۔ "گوڈ بلیس آور ہوم" کے طغرے پر نظر ڈالی جس کے مقابل میں یسوع مسیح کے "آخری طعام" کا بڑا سا رنگین پرنٹ دوسری دیوار پر آویزاں تھا۔ وہ چند سکنڈ تک اس تصویر کو دیکھا کیے، پھر حسب عادت کمر کے پیچھے ہاتھ باندھے، سر جھکائے، مطمئن اور خداوند تعالیٰ کے شکر گزار اپنے کمرے کی طرف چلے گئے۔

کوئی پون گھنٹے بعد مسز بنرجی نے گھر کے سارے کام کاج سے فارغ ہونے کے بعد حسب معمول آوولٹین کی دو پیالیاں تیار کیں۔ ایک پیالی طشتری سے ڈھانپ کر سائیڈ بورڈ پر رکھی اور دوسری لے کر روزی کے کمرے میں گئیں۔ وہ کمرے میں نہیں تھی۔ انھوں نے پیالی میز پر رکھ دی۔ اور غسل خانے کی طرف مڑ کر آواز دی۔ "روزی بیٹا۔ صبح کو دھوبی آئے گا اپنے کپڑے نکال ———" وہ اپنا جملہ پورا نہ کر سکیں کیونکہ نجانے کیوں آپ سے آپ ان کا دل دھک سے رہ گیا۔ نجانے کیوں ان کو خیال آیا کہ روزی بھاگ گئی۔ وہ اپنی جگہ پر منجمد رہ گئیں۔ پھر انھوں نے نوٹس کیا کہ غسل خانہ اندھیرا پڑا ہے۔ اور تیز ہوا اندر آ رہی ہے۔ انھوں نے آگے بڑھ کر دیکھا۔ غسل خانے کا باہر کی رخ کا دروازہ کھلا پڑا تھا۔

شاید وہ جگنو پکڑنے سبزی باڑی میں اتر گئی ہو۔ مسز بنرجی نے دروازے میں جا کر آواز دی "روزی ——— روزی بیٹے ———" پھر وہ چھتری لگا کر اندھیرے اور کیچڑ میں باہر نکلیں۔ ڈیزی سر شام سے جا کر اپنے کوارٹر میں سو رہی تھی۔ اسے کیا معلوم ہوگا۔ انھوں نے پودے کیاری کا چکر لگایا۔ سامنے کوارٹروں میں سوتا پڑا تھا۔ گرجا کی برساتی میں روشن بلب پر پتنگے چکر کاٹ رہے تھے۔ سارے میں ہو کا عالم طاری تھا۔ بچی۔ ایسی بھیانک رات میں تو کہاں چلی گئی ——— یہ کیا ہوا۔ ؟

وہ گھر میں واپس آئیں۔ کیچڑ میں لت پت چپلیں پائیدان پر اتار کر آہستہ آہستہ چلتی سارے کمروں میں گئیں۔ دروازے بند کیے۔ بتیاں بجھائیں۔ اور پھر اپنے بیڈ روم میں داخل ہوئیں جہاں ان کے شوہر شب خوابی کا لباس پہنے

گفتگو ۵،

آدولنشین کے منتظر غنودگی کے عالم میں بید کی کرسی پر بیٹھے تھے۔ نیند میں ان کا سر سامنے کو جھک آیا تھا۔ بیوی کی آہٹ پر وہ چونکے اور ان کی طرف دیکھے بغیر عادت کے مطابق پیالی کے لئے ہاتھ بڑھایا۔

ایستھر بنرجی نے ان کے قریب جا کر آہستہ سے کہا ——— "ہاں ——— ہماری لڑکی گھر سے بھاگ گئی۔"

پادری بنرجی نے سر جھٹکا۔ پلکیں ملیں اور بیوی کو آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ ان کے صرف ہونٹ ہلے۔ منھ سے آواز نہیں نکلی۔

ایستھر گری بالا نے اقرار میں سر ہلایا۔ وہ ان کے قریب فرش پر دو زانو بیٹھ گئیں۔

باہر بجلی زور سے چمکی اور شکست خوردہ میاں بیوی کے ٹیبلو کو روشن کر گئی۔ (مناظر وقت میں معدوم نہیں ہوں گے۔)

پادری بنرجی چند منٹ تک بالکل چپ، ساکت، منجمد بیٹھے رہے۔ پھر انھوں نے لرزاں ہاتھوں سے عینک ٹٹولی۔ ایستھر نے میز پر رکھے سیاہ کیس میں سے عینک نکال کر ان کو دی۔ پادری بنرجی نے اپنے پلنگ کے سرہانے سے انجیل مقدس اٹھائی۔ ایستھر ان کے نزدیک دوسری کرسی پر بیٹھ گئیں۔ اور آنچل سے سر ڈھانپ لیا۔

"LET US PRAY" پادری بنرجی نے آہستہ سے کہا۔

اس ساری رات پادری بنرجی حضرت ایوبؑ کی گریہ وزاری کا باب پڑھتے رہے۔

اور دیکھو۔ کہ دنیا کے سارے مقدس صحیفوں کے یہ سارے ابواب کتنے ہزارہا برسوں سے کتنے ان گنت انسانوں کی مصیبت کے وقت میں پڑھے گئے ہیں۔ اور وہ چند الفاظ اسی طرح موجود ہیں۔

وقت اور الفاظ انسان کے شکاری ہیں۔

(۱۴)

ایک چیریر ذرا آگے کو جھکا ہوا نوجوان مضطرب سرگوشی میں کہہ رہا تھا ——— "میں نے روپوشی سے باہر آنے کے بعد تم کو اتنے خط لکھے۔ ہر تیسرے روز، ہر ہفتے، ہر پتے پر، اتنے تار دیے، اتنے سندیسے بھجوائے۔ تم نے ایک کا ——— حد ہے، ایک خط کا جواب نہ دیا۔ میری شدید پریشانی کا بھی نہیں خیال کیا۔ تم نے کبھی یہ تک نہ سوچا کہ تمہاری اس عجیب و غریب خاموشی نے مجھے کس قدر فکر مند کر رکھا ہے۔ مجھے طرح طرح کے اندیشوں نے بدحواس کر دیا تھا۔ شاید تم پکڑی گئی ہو۔ شاید نبوتے بابو نے تمہیں کہیں بھیج دیا ہو۔ شاید زبردستی تمہاری شادی ہی کر دی گئی

ہو، پھر مجھے اونیل کے ذریعے معلوم ہوا کہ تم خیریت سے ہو۔ اس کے بعد تمہارے چپ سادھ لینے کی وجہ بالکل سمجھ میں نہیں آئی۔

"ہماری عقل حیران ہے ــــــــ" چند لمحوں کے وقفہ کے بعد نوجوان نے پھر کہنا شروع کیا: "ہماری عقل حیران ہے کہ تم نے یہ رویّہ کیوں اختیار کیا۔ ناراض ہو تو صرف دو سطروں میں ناراضگی کی وجہ ہی تبلا دیتیں۔ ہم نے بار بار تمہیں لکھا۔ کسی وجہ سے خفا ہوگئی ہو تو تبلا دو۔ اور معاف کر دو۔ آخر یہ تم کو ہوا کیا۔ ؟"

نیم تاریک اور سنسان ڈیک کے سرے پر صرف سگریٹ کی روشنی چمکتی رہی۔ ڈیک کا فرش بھیگا ہوا تھا۔ کچھ دور پر ایک خلاصی ایک بنچ پر محو خواب تھا۔

"ہم شروع شروع میں تفصیل سے تمہیں کچھ نہیں لکھ سکتے تھے۔" سگریٹ ایک جھٹکے سے پدما میں جا گرا۔

"پچھلی جولائی سے ــــــــ کھُلنا کی اس اندھیری رات سے لیکر نومبر دسمبر تک ہم اِدھر اُدھر روپوش رہے۔ سندربن میں تم سے ملاقات کے اس خطرناک ایڈونچر کے بعد ہم بہت محتاط ہو گئے تھے۔ اس لئے تمہیں کوئی دو حرفی پیغام بھی نہ بھجوا سکے۔ اور اتنے معروف رہے کہ تم جاناں کے متعلق سوچنے کی مہلت ہی نہ ملی۔ دیولی والوں کو دسمبر میں رہائی حاصل ہوئی۔ اور ہم ــــــــ کدھر دیکھ رہی ہو کیا ہماری آواز بھی ناگوار ہے؟"

دیاسلائی کا مختصر سا شعلہ لپکا۔ دوسرا سگریٹ، زیادہ مضطرب، آزردہ لہجہ۔ "کیا تم اس لئے خفا تھیں کہ ہم دسمبر کے بعد تم سے ملنے بنگال نہ آسکے؟ ہمیں معلوم نہ تھا واللہ کہ تم اسقدر دیوانی لڑکی ہو ــــــــ"

دوسرا سگریٹ بھی تین چار کش کے بعد اندھیرے میں دریا میں جا گرا۔

"اگر ہمیں ایک ضروری کام سے اچانک یہاں نہ بھیجا گیا ہوتا تو شاید اب بھی نہ آسکتے، کیا تم ــــــــ تم دوسرے گروپ سے جا ملی ہو، اس وجہ سے مجھے بغیر "ٹرائل" کے "عاق" کر دیا۔ یہ کیا بچپنا ہے؟"

جہاز نرم روی سے آگے بڑھتا رہا۔

"جب سے میں تم کو خط بھیج رہا ہوں خاموشی بیٹھی ہو۔" غصے کی وجہ سے آواز ذرا اونچی ہوگئی۔ "کیا مجھے تم سے خفا نہیں ہونا چاہیئے؟ میرے ساتھ یہ رویّہ اختیار کرنے کی آخر ــــــــ اوہ ــــــــ ڈیم یُو ــــــــ"

تیسرے سگریٹ کے لئے ماچس جلانے کی کوشش، مگر ماچس سیلی ہوئی تھی۔

"کیا تم کو ــــــــ کسی اور سے ــــــــ کسی اور ــــــــ کوئی اور ــــــــ" ذرا کانپتے ہوئے ہاتھ۔ ماچس کی ڈبیا بھی دریا برد ہوئی۔

"شٹ اپ۔" دوسری ڈیک چیئر پر بیٹھی ہوئی لڑکی نے یکلخت تلملا کر جواب دیا۔

وہ اور آگے جھکا۔ لڑکی کی شکل دھیان سے دیکھی اور آہستہ سے مسکرایا۔ "شکر ہے۔"

گفتگو ۷۷

"کیا شکر ہے؟" وہ بلی کی طرح غرائی۔

دریا پر تیز ہوا چل رہی تھی۔ لڑکی نے سردی کی وجہ سے کندھے سکیڑ کر ساری کا آنچل جسم سے اچھی طرح لپیٹا۔ نوجوان نے کھادی ریشم کی چادر اوڑھ رکھی تھی۔ اس نے چادر اتار کر لڑکی کے کندھوں پر ڈالی۔ لمحے بھر کے توقف کے بعد بڑی نرمی اور احتیاط سے لپیٹ دی۔ لڑکی ذرا سا کپکپائی۔

بے چاری، بے وقوف، نالائق بچی

"آپ کو۔ آپ کو سردی لگ جائے گی۔" لڑکی نے دھیرے سے کہا۔

"تم سے مطلب؟ مر گئے تو شہید محبت کہلائیں گے، قسم خدا کی تین ساڑھے تین سال سے کیا تھیٹریکل عشق چل رہا ہے۔ لاحول ولا قوۃ۔"

کروک، چار سو بیس، دھوکے باز۔

"بی اے پاس کر لیا؟" نوجوان نے پھر بات کی۔

"کر لیا۔"

"فرسٹ ڈویژن؟"

"جی۔"

"ارے واہ شاباش۔ مبارک ہو۔ تو اب گویا تمہاری شادی کا اشتہار اخباروں میں دیا جا سکتا ہے۔" اس نے کھنکار کر کہا۔ "بی اے پاس، امور خانہ داری میں ماہر، رابندر سنگیت کی استاد، کائستھ کنیا ——— لڑکا برسر روزگار ہونا ضروری ہے۔ کم از کم پی سی ایس کو ترجیح دی جائے گی ———"

کمینہ، بے ہودہ، لوفر۔

"اُف۔ بے حد غصہ آ رہا ہے۔ چہرہ سرخ ہو گیا۔ اور مس صاحبہ ہم تم سے خفا نہیں ہونا چاہیئے؟ ——— ڈیم یو ———"

وہ اُٹھنے لگی، نوجوان نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے پھر کرسی پر بٹھا دیا۔ "آپ اب کہیں بھاگ کر نہیں جا سکتیں۔ اور یاد رکھو، ہم مرتے دم تک تمہارا تعاقب کریں گے۔"

"آپ کا دماغ خراب ہے۔" لڑکی نے آہستہ سے کہا۔ اور پھر اٹھنے لگی۔

"یہ تم بھاگی کہاں جا رہی ہو؟"

"عبدالقادر جالی کے ادھر چپ کنتے بیٹھے ہیں، اگر آپ کی اس ——— کیا کہنا چاہیے ——— بے تکلفی پر ان کی نظر پڑ گئی ———"

"پچھلے سال تک بھگ اسی موسم میں آپ کہاں تشریف رکھتی تھیں، غالباً یاد ہو۔ لیکن زیادہ شدید قسم کا

AMNESIA لاحق ہوگیا ہے تو ——"

"ایک مرتبہ حماقت کی تھی، اب دوبارہ نہیں ہوگی۔ گڈ گریشس —— خیال آتا ہے تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں ——"

"تم واقعی بدل گئی ہو۔"

"جی ہاں۔"

اب وہ خاموش ہوگیا۔

شاید قصہ واقعی ختم ہو چکا ہے۔ ایک سال بہت لمبا عرصہ ہوتا ہے۔ یا شاید محبت ختم ہونے کی کوئی منطقی وجہ نہیں ہوتی، میں بیکار اس لڑکی کا تعاقب کر رہا ہوں، یہ وہ لڑکی ہی نہیں ہے۔

کئی منٹ گزر گئے۔ اچانک وہ بولی۔ "آپ —— آپ کو کس طرح معلوم ہوا کہ —— آپ نے آخر اس جہاز پر مجھے کیسے پکڑ لیا ——"

وہ خوش ہوگیا۔ نہیں۔ یہ وہی لڑکی ہے۔ ابھی کچھ نہیں بدلا۔

"کس طرح پکڑ لیا ——؟" اس نے بشاش لہجے میں جواب دیا۔ "اس طرح کہ میں ڈھاکے میں سیدھا آپ کے گھر پہنچا۔ جو سنسان پڑا تھا۔ چکر کاٹ کر شاگرد پیشے کی طرف گیا۔ وہاں آپ کی ریاست کے منیجر مولوی عبدالقادر کی اہلیہ نے ضروری معلومات فراہم کیں۔ کہ بچے کوئی ستر آباد ہیں ان کے ہاں گئے ہوئے ہیں۔ آپ کسی خاندانی شادی کے لئے عبدالقادر کے ہمراہ فرید پور تشریف لے گئی ہیں۔ اور فلاں تاریخ کو عبدالقادر کے ساتھ ہی واپس آجائیں گی۔ کھوکھو کی بیماری کی وجہ سے چنانچہ میں نے فی الفور فرید پور کا ٹکٹ کٹایا۔ میں فرید پور —— فرید پور کے لوگوں سے واقف ہوں۔ آپ کی پیشی ماں کے گھر والوں کو بھی جانتا ہوں۔ یہاں چپکے سے پتہ لگانا بہت آسان تھا، کہ آپ کس روز، کس وقت نرائن گنج کے لئے روانہ ہو رہی ہیں۔ چنانچہ اسی جہاز کا ٹکٹ اس نابیرزنے بھی خرید لیا۔ باقی حالات آپ نے پردۂ سیمیں پر خود ملاحظہ فرمائے۔"

"آپ ڈھاکے میں میرا انتظار کر سکتے تھے۔"

"نہیں کر سکتے تھے، آپ کے سلسلے میں ہم منطقی نہیں ہیں۔"

دونوں دھندلے سائے ساکت بیٹھے رہے۔ چاروں طرف بادل اور دریا ایک ہو گئے تھے۔ ڈیک چیئرز سے کچھ دور لمبی سفید داڑھی والا مسلمان بوڑھا کپتان اپنے کھلے کیبن کے سامنے جنگلے پر جھکا کھڑا تھا، اس کے نزدیک لگی ہوئی بے حد طاقت ور سرچ لائٹ نے دریا کو حدِ نظر تک روشن کر رکھا تھا۔

"روزی کیسی ہے؟" کچھ دیر بعد نوجوان نے دریافت کیا۔

گفتگو ۹

"روزی ـــــ محمود دا ـــــ یہ سب لوگ ـــــ آپکو نہیں معلوم ـــــ؟"

"ہاں۔ سر تیندرنے ڈھاکے میں مجھے بتایا ـــــ ان لوگوں کو کچھ سمجھایا نہیں جاسکتا۔" اس نے گہری سانس لی۔ "اچھا کہیں سے ماچس لیکر آؤ۔"

کس مزے سے حکم چلاتے ہیں، میں کنیز ہوں ان کی۔ زر خرید۔ چرنوں کی داسی۔ کتنے ہی کامریڈ بن جائیں اصلیت میں رہیں گے وہی نخالص ہندوستانی لارڈ اینڈ ماسٹر ـــــ میں نہیں لاتی ماچس واچس۔

"اے بھائی ندا بھاگ کر ایک ماچس لے آؤ نا کہیں سے ـــــ عبدالقادر میاں سے مانگ لو۔ وہ ضرور بیڑی پیتے ہوں گے۔"

"میں ان سے جاکر کہوں کہ ذرا دیا سلائی دینا جو میرے ایک عزیز دوست کو چاہیے جو مجھے بھگالے جانے کا پروگرام بنا رہے ہیں۔"

"جب تم (عنقریب انشاء اللہ) بھاگو گی تو تو تے بابو لا محالہ یہی شبہ کریں گے کہ ان کے ذریعے ہی تم ایک میاں بھائی کے ساتھ اڑنچھو ہوئیں۔"

"اس خیال میں بھی نہ رہیے گا۔ عبدالقادر میاں میں انتہائی فیوڈل وفاداری ہے۔ وہ آپ کے مولوی ابوالہاشم نہیں ہیں ـــــ" دفعتاً وہ چپ ہوگئی۔

"وہ ـ وہ ہم نے ایک سہانا ـ ناقابلِ یقین خواب دیکھا تھا نا ـــــ"

"ہاں ـــــ" لڑکی نے آہستہ سے کہا

کچھ دور پر فوجیوں سے لدا نیم تاریک اسٹیمر گذر رہا تھا۔

"عجیب بات ہے۔" لڑکی نے پھر جلدی سے موضوع تبدیل کیا۔ "جب کامریڈ رند تھیوے کا بیان چھپا پہلی بار کہ یہ جنگ اب عوامی جنگ ہے ـــــ تو یہ قوم پرست اتنی شدت سے پارٹی کے خلاف کیوں ہوگئے۔ خصوصاً روزی ـــــ وہ تو بہت ہی اپیچور نکلی۔ میں نے اسے کئی بار ـــــ کئی بار سمجھایا کہ ـ آپ نے ایک بار لکھا تھا نا خط میں کہ کمیونسٹ انٹرنیشنل اس بے جگری سے نازیت اور فاشزم کا مقابلہ ـــــ"

"بہت خوب، آپ کا جواب نہیں۔ ہمارے عریضوں کے ذریعے آپ اپنے دوستوں کو ایجوکیٹ کرتی رہتی تھیں۔ دو سطریں لکھنے کی آپ نے زحمت گوارا نہ کی۔ اب بھائی ہمیں یقین ہوگیا کہ تمہارے دماغ کی ایک چول ضرور ڈھیلی ہے۔"

"کمال ہے ـــــ" لڑکی نے مزید گڑ بڑا کر بے حد سنجیدگی سے سیاسی گفتگو جاری رکھی۔ "ہر تاریخ کو کانگریس بھی سی، پی، آئی سے علیحدہ ہوگئی۔ حالانکہ ـــــ حالانکہ ـــــ" اس نے گلا صاف کیا۔

پنڈت نہرو ہی تھے جنھوں نے سب سے پہلے فاشزم کے خطرے کو پہچانا تھا ـــــ" لڑکی نے اس انداز میں بات ختم کی گویا اخبار کا ایڈیٹوریل پڑھ رہی تھی۔ پھر اس نے چہرہ پھیر کر بے نیازی سے دریا کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔

"جی ہاں۔ آپ بالکل صحیح فرماتی ہیں۔ میں دیکھتا ہوں کہ آپ کی سیاسی سوجھ بوجھ اور بالغ نظری ترقی پر ہے۔"

دریا کی متلاطم لہریں اسٹیمر سے ٹکرا رہی تھیں۔ کبھی کبھی پانی کی چھینٹیں اڑ کر اوپر آ جاتی تھیں۔ لڑکی کے بال بھیگ گئے۔ بات تیزی سے ختم ہو رہی تھی۔ نوجوان نے گھبرا کر گھڑی پر نظر ڈالی۔

دفعتاً لڑکی نے سوال کیا۔ "آپ یہاں کس کام سے آئے ہیں؟ یا۔ راز کی بات ہے؟"

"نہیں۔ کوئی راز کی بات نہیں ہے۔ ہمیں پروانشل مسلم لیگ کے لیڈروں سے بات چیت کرنے کے لئے بھیجا گیا ہے۔"

مسلم لیگ ـــــ نواب قمر الزماں چودھری ـــــ ارجم ـــــ جہاں آ ـــــ

جہاز دریا کی گدلی موجوں پر ڈولنے لگا۔ اس کے انجن کی آواز ایک دم اونچی ہو گئی۔ ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے ـــــ

"جیوتی دا، روزی، محمود دا، یہ سب بھی مجھ سے بے حد خفا تھے۔ روزی نے تو مجھے غدار اور ٹوڈی کہا ـــــ حد ہے ـــــ"

"تم نے ان کا ساتھ کیوں نہ دیا ـــــ؟ تم تو دنیش بابو کی بھتیجی ہو ـــــ"

"آپ نے جو اتنی سختی سے منع کر دیا تھا۔"

"کب؟"

"اپنے پچھلے خط میں۔"

"مائی گڈنس۔"

لڑکی نے اور زیادہ ہڑبڑا کر سر جھکا لیا۔ "حالانکہ مجھے اتنی شرمندگی سی تھی کہ میں کاکا کو Let Down کر رہی ہوں۔"

"مائی گڈنس ـــــ" نوجوان نے دہرایا۔ پھر اس نے آگے جھک کر پوچھا۔ "اب بتلاؤ ہم سے کیوں خفا تھیں۔ ہمارے خطوں کا جواب کیوں نہیں دیتی تھیں؟"

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ نوجوان بھی اٹھا۔ اور چاروں طرف نظر ڈالی۔ "اس پرسکون جہاز کو دیکھ کر کون

کہہ سکتا ہے کہ اس وقت سارے دیس میں آگ لگ رہی ہے " اس نے طول آواز میں کہا۔
لڑکی جاکر سرچ لائٹ کے نزدیک کھڑی ہوگئی۔ وہ بھی اس کے برابر آگیا۔
" شاید میں بزدل ہوگئی ہوں " لڑکی نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر کہا۔
وہ خاموش رہا۔ سرچ لائٹ دریا پہ روشنی کا ایک اور دریا بہا رہی تھی۔
" آپ کتنے دن رہیں گے ؟ "
" پتہ نہیں۔ جتنے دن بھی لگ جائیں۔ معاملات کافی گنجلک ہیں۔ مسلم لیگ ایک عوامی تحریک بن چکی ہے، اسکی نئی طاقت کو نظر انداز کرنا حماقت ہوگی "
بوڑھے ناخدا نے کان کھڑے کئے۔ اور ذرا نزدیک ہوکر دلچسپی سے بات سننے لگا۔ اور ایک دفعہ مڑکر نوجوان کو دیکھا۔ نوجوان نے مسکرا کر اُسے "سلام علیکم" کہا اور بات جاری رکھی۔ " بنگال مسلم اکثریت کا صوبہ ہے۔ یہاں کی مسلم جنتا پروگریسو لیڈرشپ کی منتظر ہے ـــــــ "
" نواب لوگ تو پروگریسو لیڈر نہیں ہیں "
" پروگریسو لیڈرشپ ہماری ہوگی۔ ہمیں لیگ کے قریب آنا ہوگا۔ یہ پیشین گوئی میں آج اگست ۱۹۴۲ء کی اس رات کر رہا ہوں۔ گرہ میں باندھ لو! "
نواب قمر الزماں ـــــــ یہ ارجمند منزل جائے گا۔ ارجمند منزل جائے گا ـــــــ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ وہ ریلنگ پر جھک کر نیچے لہروں کو تاکنے لگی۔ پچھلے سال جولائی کی اس رات، سری سدن میں جو وعدہ میں نے اپنے آپ سے کیا تھا اس پر قائم نہ رہی۔ اُسے چکر سا آگیا۔ اس نے جنگلہ مضبوطی سے پکڑ لیا۔ جنگلے کا لوہا بالکل سخ تھا۔ میں نے ساری رات اس سے باتیں کرنے میں گذار دی۔ اب نہیں۔ اب کچھ نہیں۔ اب آیندہ بالکل پہچان کر نہ دوں گی۔ آخر سال بھر تک کس مضبوطی اور بے جگری سے اپنے وعدے پر قائم رہی ہوں کہ نہیں۔ ایک سال گزر گیا۔ اس طرح باقی عمر بھی گذر جائے گی۔ اب نہیں۔ یہ آخری ملاقات ہے۔ دیکھ لینا۔
بوڑھا پہیئے پر جھک چکا تھا، اسٹیمر تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا۔
" ڈھاکے میں آپ کہاں ٹھہرے ہیں " لڑکی نے بالکل نارمل آواز میں دریافت کیا۔
" اُدھا کے ہاں ـ " وہ ہنسا۔ " ایک زمانہ تھا کہ دوڈلینڈ میں ہمارے فرشتے تک نہ پھٹک سکتے تھے ـــ نہیں خیر۔ ہمارا ایک فرشتہ تو پھٹکا تھا۔" اس نے پیار سے لڑکی کے بالوں کو چھوا۔ وہ جھنجھلا کر پرے سرک گئی۔
وہ کہتا رہا۔
" اب ہم قصبے سے عین سر پری توش رائے کے گیسٹ روم میں ڈٹے ہوئے ہیں۔! اُدما سے تم کب سے

نہیں لیں؟ "

"وہ تمیں ہو گئیں ۔"

"آنا ان سے ملنے۔ وہ دلی سے میرے ساتھ ہی آئی ہیں۔ آج کل ان کے والدین کلکتے گئے ہوئے ہیں۔ اس لئے سارے دوستوں کا اڈہ بے فکری سے وہیں ہوتا ہے ۔"

"دلی میں آپ امپیریل ہوٹل میں ٹھہرے تھے ؟ "

"ہم ــــ ؟ نہیں تو۔ اوما وہاں مقیم تھیں۔ ہم ایک دوست کے یہاں تھے' کیوں ؟ تم کو کیسے معلوم ہوا ؟ "

"آکاش بانی آئی تھی ــــ" لڑکی نے خشکی سے جواب دیا۔ نوجوان نے اُسے غور سے دیکھا۔

"تم واقعی بدل گئی ہو ــــ ایک سال میں بدل گئی ہو۔ تم میں تلخی آگئی ہے۔ تم اتنی معصوم' اتنی سیدھی' اتنی بھولی تھیں' تمہیں کیا ہو گیا۔ کون تمہاری اس تبدیلی کا ذمے دار ہے۔ ؟ ہمیں تو بتا دو ــــ" اس نے لجاجت سے کہا۔

ماں۔ مجھے مضبوط بنا۔ مجھے فولاد کی طرح مضبوط بنا۔ لڑکی آنکھیں میچ کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔ لیکن ہر سمت دریا کا دھندلکا طاری تھا۔

"تم دن بھر گھر پر رہتی ہو ؟ "

"جی ہاں ۔"

"میں کسی وقت تمہارے ہاں آ سکتا ہوں ؟ "

"کسی وقت نہیں ۔"

"کیوں ؟ "

"ایسے ہی۔ میری مرضی ۔"

"اچھا ۔"

اسٹیمر اب دریا کے موڑ سے گذر چکا تھا۔ ملاح نے پہیہ گھمانا ختم کر دیا۔ سامنے روشنی کا راستہ بے حد وسیع ہو گیا۔ وہ دونوں جنگلے پر جھکے۔ دریا کی متواتر لہروں کو تکتے رہے۔ گہرا متلاطم دریا۔ متموّج پانی' حد نظر تک روشن۔ چاروں کھونٹ پانی۔ ابتدا میں خلا تھا' اور تاریکی۔ اور خدا کی روح پانیوں پر ڈولتی تھی۔ یہ تخلیق کائنات کی رات تھی۔ اور خدا نے کہا روشنی اور روشنی ہو گئی۔ اور خدا نے دیکھا کہ روشنی اچھی ہے' اور خدا نے روشنی کو تاریکی سے جُدا کیا۔

اور آدم و حوا کو بنایا۔ اور ایک دوسرے کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ (آدم و حوا اسٹیمر کے جنگلے پر جھکے کھڑے ہیں'

استعارے کو اور آگے لے جاؤں تو یہ بزرگ کپتان حضرت نوح ہیں۔ جو ہم دونوں کو نہ جانے کون سے ارآرات کی سمت لئے جا رہے ہیں۔ نوجوان زیرلب مسکرایا۔)

روشنی اور تاریکی، موت و حیات، دکھ اور سکھ، فراق اور وصال، جنوں اور خرد ——— سنگم تو گوالندو گھاٹ سے پرے، بہت دور رہ گیا۔ گنگا اور برہم پتر کی لہروں سے بنا یہ دریا —— اس کے پانیوں میں گنگا کون سی ہے اور برہم پتر کون ہے ؟

لڑکی کو زور کی چھینک آئی ۔ وہ اسکی طرف مڑا۔ وہ سوں سوں کر رہی تھی ۔

" تمہیں سردی لگ جائے گی ۔ چلو اندر چلیں " نوجوان نے متفکر ہو کر کہا ۔

" نہیں ۔ میں تو یہیں کھڑی رہوں گی " لڑکی نے ضد سے جواب دیا ۔

وہ ہنس پڑا۔ " ایک بات بتاؤ " اس نے بشاشت سے پوچھا۔ " تمہارے خاندان میں کوئی پاگل تو نہیں گزرا ہے ۔ ؟ "

" نہیں تو ——— اوہ ———" وہ ایک دم کھل کھلا کر ہنسنے لگی ۔ پھر فوراً سنجیدہ ہو گئی ۔ وہ اُسے ہنستا دیکھ کر بےحد مسرور ہوا ۔ اور خود بھی قہقہہ لگا کر ہنسنے لگا ۔ پھر اس نے آہستہ سے ریلنگ پر رکھے ہوئے لڑکی کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا ۔

لڑکی نے ——— اپنا ہاتھ نہیں ہٹایا ۔

ساحلی بتیاں دھندلکے میں ٹمٹما کر گذر چکی تھیں ۔ نرائن گنج کی روشنیاں قریب آ گئیں ۔ اسٹیمر معروف بندرگاہ کے اجالے میں داخل ہوا ۔ نرائن گنج سامنے جگمگا رہا تھا ۔ نرائن گنج ——— اسکی گلیوں کی نہروں پر چلتی کشتیاں، جوٹ اسٹیشن، گہماگہمی، باہر اندھیرے میں چھپی کچی سڑکیں، نیم شکستہ مغل پل ۔ کھیت، طویل اندھیری شاہراہ جس کے سرے پر ڈھاکہ ہمیشہ کی طرح منتظر ملے گا ۔ شفیق، محفوظ، مامون شہر ۔

دنیا تنزل پذیر ہو چکی تھی، مگر شاید موجود تھی ۔ مسرت کا وجود بھی تھا ۔ ملنا ممکن تھا ۔ آخر دنیا میں ایسے لوگ بھی تو موجود ہوں گے جنھیں چین اور خوشی میسر ہے ؟ اور مسرت کے حصول میں خود غرضی گناہ ہے ؟

لڑکی نے ہوا سے بچنے کے لئے کھادی سلک کی دوہری چادر مضبوطی سے اپنے شانوں کے گرد لپیٹ لی ۔

(۱۵)

" نغمات ہند[1] از الف جیم

---

[1] LAYS OF IND by ALIPH CHEEM

پیارے بیٹے جم کے لئے۔ انیسویں سالگرہ پر

تمہارا ڈیڈ

مین سنگھ، ۱۸۸۳ء

چارلس بارلو نے بیرکا ٹمک تپائی پر رکھ کر سنہری مجلد کتاب کا احتیاط سے ورق الٹا، یہ بڑی نادر کتاب تھی۔ جو خود مصنف نے جو "الف، جیم" کے قلمی نام سے ہندوستان کی برطانوی سوسائٹی اور نیٹو لائف کے متعلق بے حد پرلطف اور طنزیہ نظمیں لکھتا تھا، گرینڈ ڈیڈ کو دی تھی۔ یہ اپنے زمانے کا مقبول "الف، جیم" دراصل ۱۸ احقار کا کیپٹن یلڈ میم تھا۔ گرینڈ ڈیڈ کا جگری دوست، گرینڈ ڈیڈ ان دنوں بنگال میں ڈویژنل کمشنر تھے۔ انھوں نے ڈیڈ کو یہ کتاب ان کی سالگرہ پر دی تھی۔ ڈیڈ آکسفورڈ سے چھٹیوں پہ اپنے والدین سے ملنے بنگال آئے ہوئے تھے۔ اور بہت جلد خود بھی اپنے والد کی مانند بنگال سویلین بننے والے تھے۔

اصلی کی وہ افسانوی ہستی ——— بنگال سویلین!

چارلس بارلو نے اداس زیرلب تبسم کے ساتھ پہلی نظم پر نظر ڈالی، اس مجموعے میں وہ سارے کردار موجود تھے جو ماضی کے بنگال سویلین کی زندگی کا لازمی جزو رہ چکے تھے۔

پہلی نظم ——— "ریورنڈ مک فرسن کا خیال تھا کہ "انڈین ناچ" شیطانی گورکھ دھندا ہے۔ ایک روز راجہ نے ساری چھاؤنی کو ناچ کے لئے مدعو کیا۔ باغ قمقموں سے سجایا گیا۔ میم صاحبوں کے لئے خیمے لگے۔ بڑھیا شرابیں، پلاؤ، عطر گلاب، سارا اسٹیشن مدعو تھا۔ "تماشا شاندہ بہت اچھا" تھا۔ راجہ جھک جھک کر صاحب لوگ کو سلام کرتا۔ عجیب عجیب زیورات میں پہنے ناچ گرلز آئیں۔ اور توم توم کی جنگلی تال پر تھرکیں۔ سازندوں کے وحشیانہ ساز چیخے۔ ان کے چوبدار عود دان اور مشعلیں سنبھالے پیچھے کھڑے تھے۔ چیف رقاصہ رام رام کہہ کر ناچنے لگی۔ ریورنڈ مک فرسن کو یہ معلوم نہ تھا کہ رام ایک دیوتا ہے۔ ورنہ انھیں تعجب ہوتا کہ شیطان کی چیلی ایک دیوتا کو پکارتی ہے۔ ان معاملات سے جو ان کے چرچ سے متعلق نہ تھے، ریورنڈ مک فرسن لاعلم تھے ———"

آج بھدرا لوگ کی لڑکیاں کلکتہ اور شانتی نکیتن کے اسٹیج پر ناچ رہی ہیں۔ بے چارے الف جیم! تم مجھے اپنے طیبر ڈوروم، جرٹ، لبمارک اور فرانکو جرمن وار کی باتیں کرنے والے فوجی افسروں، اپ کنٹری، مفصل، بینڈ اسٹینڈ، گزٹ، پانیر، ٹفن۔ اور چھوٹا حاضری کی حکایات سناتے جاؤ کر اس گمشدہ دنیا کے تذکرے سے ہی مجھے تقویت حاصل ہوتی ہے۔

دوسری نظم ——— "چاندنی رات، جب دور سے نیٹوز کے ٹوم ٹوم کی بھیانک آواز سنائی دیتی ہے، بازار کی مکھیوں ایسی بھنبھناہٹ۔ چوکرا سگار لاؤ۔ میں برآمدے میں آرام کرسی پر بیٹھا ہوں۔ باہر سرد

کے درختوں کے پیچھے سے چاند نکل رہا ہے۔ چوکرا شراب انڈیلتا ہے۔ اوہ انڈیا! سہانی شاموں کی سرزمین۔ تیری لرزاں تیری چاندنی، تیری واحد دیوانگی نہیں!"

چارلس بارلو نے پل کی پل کو آنکھیں بند کر لیں۔ پھر بیر کا مگ اٹھا کر ایک اور صفحہ پلٹا۔

میرا چالاک منشی محمد دین، روزانہ مجھے اردو پڑھانے آتا۔ گیتی۔ وہ انگریزی بولتا۔ "ٹو بات" بہت کم ہوتی۔ سرکنڈے کے قلم خرید کر لاتا اور روز چار آنے چرا لیتا۔ مجھے کتنی نفرت تھی اس درس و تدریس سے، منشی گپیں ہانکتا۔ اور میں چپ چاپ بیٹھا چرٹ پیا کرتا۔ مگر جب میں نے امتحان پاس کیا تو ایسی اردو بولی کہ کوئی سالار جنگ بھی کیا بولے گا۔

ایک اور نظم ——— "راجہ کرشنا ماڈوی ڈو" ——— ہند کے اس خطے میں جہاں تلیگو بولی جاتی ہے راجہ کرشنا ماڈوی ڈو رہتا تھا۔ جو اس سال افسوس کہ پرلوک سدھارا، راجہ ان نیٹوز میں سے تھا، اگر جن کا رنگ صاف ہوتا تو وہ سیدھے سیدھے انگریز بن جاتے۔ اسکی عادتیں صاف ستھری تھیں۔ نہ بھنگ پیتا تھا، نہ مرچیں کھاتا تھا نہ پان۔ تلیگو لہجے میں انگریزی خاصی بول لیتا تھا، "کالے پانی" پار ولایت ہو آیا تھا۔ بلیرڈ کھیلتا تھا، اور اپنے ساتھ ولایت سے تصویریں اور (نقلی) بالوں کے بنڈل لایا تھا، جو ان احمق عورتوں نے اُسے دیے تھے جو ایک دولت مند اور نیٹو کو دیکھ کر خواہ مخواہ جذباتی ہو جاتی ہیں۔ راجہ پولو کا ناچتا تھا۔ چپل کے بجائے بوٹ اور ٹوئیڈ کا سوٹ، اس کا راج بھی مثالی تھا۔ اپنی ریاست کو متمدن کر چکا تھا۔ ہیلتھ کمیشن، ڈیسی نیشن ایڈمنسٹریشن، ریلوے، زنانہ تعلیم، یہ اور وہ، اسکی ریاست اتنی عمدہ ہو گئی تھی کہ ہم نے اس سے کہا تھا کہ ہم کبھی اس کا الحاق نہ کریں گے۔ لارڈ وائسرائے نے اس سے کہا کہ وہ ہمارا بہترین فرزند دلبند ہے۔ اور الیکشن گنر گرلوں کی سلامی کا اُسے حقدار بنایا۔

"راجہ گو اتنا مغربی ہو چکا تھا، مگر دل سے اصلیت میں ایک دم بلیک نیٹو تھا۔ دھوم دھڑکے کا رسیا، ہزاروں خوشامدی، حوالی موالی، ناچ گرلز، سازشی مصاحب، بھکاری، پروہت، گھوڑے، ہاتھی اپنے ساتھ رکھتا تھا، گو فلیوٹ بجانا سیکھ چکا تھا مگر اپنے ملک کے وحشیانہ ڈھول اور بانسری کو ترجیح دیتا تھا۔ پلم پڈنگ کا دلدادہ تھا مگر کڑی اینڈ رائس پر مرتا تھا۔ ان خصائل سے اس کے کردار کی مضبوطی ظاہر ہوتی ہے کہ راجہ کرشنا ماڈوی ڈو دراصل مرتے دم تک اپنے وطن اور اپنے دستور کا وفادار رہا ———"

اتوار کی صبح تھی، چارلس بارلو نے گھڑی پر نظر ڈالی اور آرام کرسی پر دراز اطمینان سے اگلا صفحہ پلٹا۔ کتاب اسے بے حد دلچسپ معلوم ہو رہی تھی۔

ایک اور نظم ——— "اولڈ ٹائمر لکھتا ہے: فرانس کو معلوم ہونا چاہیے کہ مشرق اولڈ انگلینڈ کی ذمہ داری ہے۔ کہ فرانس کے لئے چندر نگر اور پانڈیچری ہی کافی ہیں۔ ناقابل یقین! کہ فرانس اور زیادہ کی لالچ کرے۔"

پانچ چھ صفحات کے بعد ایک لفظ نے چارلس بارلو کو متوجہ کیا ——— "صبح کی شہ سواری، جب گاؤں کے مُرغے بانگ دیتے اور گائیں ڈکراتیں۔ کاہل چرواہے سو رہے ہوتے، تب میں اور اسمتھ مونسون کی ہوا کی طرح جنگل میں سے گھوڑا دوڑاتے نکل جاتے، مندر، ناقوس پھونکتے برہمن، وحشیانہ جنگ و جدل کی یادگار، قلعوں کے کھنڈر، گارسی بانوں کے ہجوم، بیلوں کی گھنٹیاں، پگڈنڈی، کسی نیٹو رئیس کی گاڑی، لکڑہارے، برابر سے گزر جاتے، گھنٹی بجاتا ڈاک کا ہرکارہ چمڑے کے تھیلے میں ڈاک لئے پاس سے گزرتا تو معلوم ہو جاتا کہ اسٹیشن قریب آرہا ہے، صبح کی بندوقی دفتی، منڈی، نیٹو ہجوم، رنگین پردوں والی بہلی میں سے جھانکتی ناچ گرلز صاحب لوگوں کو دیکھ کر بیباک قہقہے لگاتیں پھر ایک صاحب اور اسکی لیڈی گھوڑوں پر گزرتے، دُور سے آبادی نظر آتی۔ ندی، مسجد کے مینار، گنجان نیٹو شہر۔ دھندلکا، حسین مناظر، اور اسمتھ جو اوفیشل معاملات میں جذباتی نہ تھا کہتا ——— یہ فلیظ نیٹو شہر تم کو حسین نظارہ معلوم ہوتا ہوگا، مجھے تو ———"

"صاحب ———" عبدالغفور نے اندر آکر کہا۔ چارلس بارلو نے کتاب پر سے سر اٹھایا۔ عبدالغفور نے تازہ اخباروں کا پلندہ قریب کی میز پر رکھا، اور واپس چلے گئے۔ چارلس بارلو نے آگے پڑھنا شروع کیا۔

"پولس و آلانزکا ڈنر ——— کلکٹر مک کال، جو نشر اس کا مغرور کیمبرج ایڈیشن والا سب، ٹوم کنینر سول اور سیشن جج نرم دل ڈاکٹر شارپ سول سرجن جس نے کالرا کے دنوں میں جب جیل کالرا والوں سے بھر گیا تھا، دن رات کام کیا۔ اب ڈنر کے بعد ذرا اونگھ رہا ہے۔ ریورنڈ مائیکل وائن اداس بیٹھے ہیں۔ یہ سب بڑے معقول لوگ ہیں۔ مگر پھر پولس والے کو سال میں دو دفعہ ان کی دعوت کرنا بڑا مشکل کام ہے۔ باتیں شروع ہوتی ہیں مونسون آنے والی ہے۔ جانے کب آئے گی۔ دھان کی فصل شاید اس بار بھی فیل ہو جائے، مک کال کہتا ہے۔ بارش آئے تو چیتے کا شکار شروع ہو۔ پھر شکار کے قصے، لیکن کیمبرج ایڈیشن والا شکار کے بجائے ذرا انٹلیکچول باتیں کرنا چاہتا ہے۔ شیری اور جنجر کے بعد خاموشی، بڑے بڑے چرٹ سلگائے گئے۔ تاش ہوا۔ ڈاکٹر اب خراٹے لے رہا تھا۔ برانڈی پانی کا دور چلا۔ پھر ہم سب "ڈسٹرکٹ گپ" سے بور ہو کر اپنے اپنے گھر چلے گئے ———"

"اجاڑ بنگلہ ——— سرنگاپٹم میں، کاویری کے کنارے ایک بنگلہ، جس سال ٹیپو گرا تب سے ویران پڑا ہے۔ باغ میں درخت آہیں بھرتے ہیں۔ لنگور شور مچاتے ہیں۔ الّو بولتے ہیں۔ دریا کے کنارے قلعہ کی فصیل ہے جو اولڈ انگلینڈ کی طاقت سے ٹکرا کر ٹوٹ پھوٹ گئی۔ آنے والی نسلوں کے لئے ایک سبق! وہ زمانہ جب ہمارے جری نوجوان سشیر کی کچھار تک پہنچ گئے تھے، اور اس بنگلہ کے نزدیک وہ معرکہ ہوا تھا محاصرے کے بعد اس بنگلے میں ایک کرنل اپنی بیوی بچوں کے ساتھ رہتا تھا۔ میں اب بھی تصوّر میں اس وقت کا نظارہ کر رہا ہوں، خوبصورت بنگلہ، بچوں کے قہقہے، صبح کی شہ سواری، جب کرنل اس جگہ سے گزرتے ہوئے اس پھاٹک کو تکتا ہوگا

جہاں ٹیپو گرا تھا۔ شہسواری کے بعد درختوں کے نیچے بریکفاسٹ، خس کی ٹٹیوں کے پیچھے دن گزارنے کے بعد ٹفن۔ اور گرینڈ پیانو کی آواز۔ اور پھر ایک شام کالرانے دروازہ کھٹ کھٹایا۔ اور ماں اور بیٹیاں اس کے ساتھ چلی گئیں۔ دل گرفتہ کرنل نے اس بنگلہ کو خیرباد کہا۔ اب ان کمروں میں کائی جمی ہے۔ اسّی برس سے وہ کمرے سنسان ہیں۔ پیانو اور قالین اور مسہریوں کے پردے گل چکے ۔کاویری کے کنارے ——— ! جہاں ٹیپو گرا تھا ———"

اور آگے ——— "آج کا اہم سوال ———"

"——— کیا روس کا اولڈ پیٹر ہم کو ہڑپ کرنا چاہتا ہے؟ کمزور خیوا فتح کرکے اتنا اکڑ گیا۔ اولڈ پیٹر؟ کیا وہ سمجھتا ہے کہ ہمارا سکھ فوجی خیبر پر ہم سے نمک حرامی کرے گا؟ کیا اس نے غدر کے حقائق سے کوئی سبق نہیں لیا؟ کیا اولڈ پیٹر سمجھتا ہے ہمارے راجگان اس سے جا ملیں گے؟ آنے دو ——— ذرا افغانستان سے گزر کر آنے دو۔ ہمارے سکھ کی تلوار خیوا کی تلوار سے زیادہ مضبوط ہے۔ ہم جو روس سے پہلے لڑ چکے ہیں، پھر اُسے شکست دیں گے جس قوم پر حکومت کرنا خدا نے ہمیں سونپا ہم اس خدائی امانت کے ساتھ بد دیانتی کرتے تو ہمیں ڈر تھا، اگر ہم اِس ملک پر روس کی مانند کوڑے سے حکومت کرتے اگر اِس ملک کو ہم نے روندا ہوتا، اسکی آبادی سے محبت نہ کی ہوتی۔ سیاہ و سفید میں عدل نہ قائم کیا ہوتا۔ قحط کے زمانوں میں اپنی محبت نہ لٹائی ہوتی۔ تب ہم دشمن سے ڈرتے، چالاک روس! اس سے قبل کہ تم ہمارے تاکستان تاکو خود اپنے ایشیائی قبائل کی حالت سدھارو۔ ان کو محسوس کرنے دو کہ ان پر حکومت کی جا رہی ہے۔ ظلم نہیں۔ اپنے اہلِ خیوا اور اہلِ بخارا پر ثابت کردو کہ تم طاقت ور ہونے کے ساتھ ساتھ انصاف پسند بھی ہو، وسط ایشیا کے ایسے نئے آقا ہو جو ماضی کے وحشی قبائلی ایشیائی سرداروں سے مختلف ہو۔ جو ان کو تہذیب سکھائے۔ اگر تمہاری اور ہماری فتوحات کا مقصد یہی ہو تو ہم مشرق میں تمہارے دوست ہیں ——— دونوں ترقی کے نقیب، دونوں خوابیدہ اقوام کو جگانے والے، لیکن اگر تمہارا مقصد کچھ اور ہے تو یاد رکھو، ہمارے ہاتھ میں شمشیر ہے۔ ہمیں خداوند تعالیٰ پر بھروسہ ہے۔ جو بہادروں اور منصفوں کے ساتھ ہے۔ اور جو تمہارے مغرور عقاب کو مٹی میں ملا سکتا ہے ———"

ایک اور نظم ——— "انگلینڈ ہو۔ !۔ بمبئی کی بندرگاہ پر سورج چمک رہا ہے۔ گیلنٹ ٹرو پر گھڑیال پر میری رجمنٹ واپس جا رہی ہے۔ گیارہ برس بعد! ہم چھ سو آئے تھے، تین سو واپس جا رہے ہیں۔ باقی وباؤں نے کھا لئے۔ مشرق پر حکومت کی قیمت ہم بیماری اور موت کے ذریعے ادا کرتے ہیں۔ ہندوستان نیلاہٹ میں ڈوب رہا ہے، جہاں میرے تین سو دوستوں کی قبریں ہیں۔ میں اپنا ٹوپ ہلاتا ہوں۔ ہُرّے۔ ہم گھر جا رہے ہیں، ہم ہند کو بھول جائیں گے، خدا حافظ دوستو، وباؤں نے تمہیں کھا لیا۔ انگلستان کی خاطر تم نے اپنی جانیں دیں۔ الوداع سورج کے دیس، ہماری جلاوطنی ختم ہوئی ———"

اگلی نظم ——— " اوٹی میں ٹہلتے ہوئے کونسل کا ممبر پیٹر اسٹریٹ جان کمڈ سے کہتا ہے — پیٹر ہم کو خدا نے یہ ملک اس لئے دیا تھا کہ ہم اسے متمدن بنائیں، اور جب ہمارا یہ ارفع مشن ختم ہو جائے تو واپس چلے جائیں۔ لیکن ہم کر کیا رہے ہیں؟ ہم نیٹوز کو کالج جانے کے لئے کہتے ہیں، اور پھر ان کو ایسی نوکریاں دیتے ہیں، جن کے لئے تعلیم کی ضرورت نہیں۔ ہم انھیں شراب نوشی کو منع کرتے ہیں، مگر افیون کی کاشت کرتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں تم نگر لوگ اپنی عورتوں کو آزادی دو، اور وہ پوچھتے ہیں کیوں؟ اور طنز سے ہماری خواتین کی آزادی کی طرف اشارہ کرتے ہیں — پیٹر اسٹریٹ جب ہم اپنی لڑکیوں کو ایماندار نیٹو جنٹلمین سے شادی کرنے کی اجازت دیں، جب با اثر بابوؤں کو معقول عہدے دیں، کونسل والوں کی تنخواہیں کم کریں تب ہی اس ذمہ داری کو نبھا سکیں گے، جو خدا نے ہمارے کندھوں پر ڈالی ہے ———

" تب پیٹر اسٹریٹ نے کہا :- تمہارا یہ پروگرام ممکن ہے بہت خوشگوار ہو، مگر مجھے تو یہ سب بکواس معلوم ہوتی ہے جواب نے فرمایا۔ آپ فرماتے ہیں ہم کچھ عرصے کے لئے اس ملک کے امین ہیں۔ مگر جناب عالی حقیقت یہ ہے کہ جب تک ممکن ہوگا ہم اسکو اپنے قبضے میں رکھیں گے ———"

" ہمیشہ آگے جاؤ ———

" ہپٹی ڈپٹی زرمنی چندر رتل برہمن زمانے کی ترقی سے نالاں اور متحیر تھا۔ کیا ویدوں اور شاستروں میں پہلے سے سارا علم موجود نہیں؟ مصلحین ماضی سے متنفر ہیں۔ اور ذات پات کے بندھن توڑنا چاہتے ہیں۔ فرنگی استادوں اور ان کی ایجوکیشن گرانٹس پر لعنت! انھیں کیا معلوم ہند کی ضروریات کیا ہیں؟ ان برہمو سماجیوں پر لعنت جو کہتے ہیں خدا کا میدان بہت وسیع ہے۔ کہ سب انسان بھائی بھائی ہیں۔ یہی سب لوگ کالج میں پڑھتے ہیں ——— یہی بات کیشب چندر سین کہتا ہے ———!

" بابو ہیل تبل بندر بھی ایک برہمن تھا۔ مگر ترقی کا جوشیلا حامی۔ وہ اور چندر شام کو دروازہ میں بیٹھ کر حقہ پیتے۔ اور باتیں کرتے۔ بازار کا بھاؤ، چاول کی قیمت، اور کبھی کبھی زیادہ سنجیدہ موضوع۔ ذات پات۔ دھرم وغیرہ۔ اور اپنے متضاد خیالات پر بحث کرتے کرتے جھگڑنے لگتے۔ ایک روز بندر نے کہا۔ " میں ایک ودھوا سے بیاہ کرنے والا ہوں "

" گھاس تو نہیں کھا گئے ہو؟ حقہ پانی بند کر دیا جائے گا " چندر نے کہا۔

" زمانہ بدل چکا ہے، اب تہذیب ہمیں نئے راستے دکھا رہی ہے۔ تمہیں معلوم نہیں اب ہندوستان کا نعرہ ہے ——— ہمیشہ آگے جاؤ " بندر بولا۔

" بکواس " چندر نے چادر سنبھال کر کہا۔ برہمن ہو تم؟ غدار! ودھوا سے بیاہ؟ لعنت ہو۔ اتنا کہہ کر اس نے بندر کی چٹپ پر ٹھوکر لگائی تو وہ نیچے بہتی گندی نالی میں جا گری۔ بندر نے چندر کی ناک دبوچ لی۔ دونوں چیخنے

چلاتے ایک دوسرے کو زدوکوب کرنے لگے۔ حتیٰ کہ ایک انگریز فوجی نے آن کران کو چھڑایا۔ اور چوکی لے گیا۔ اور ان کے احتجاج پر محض اتنا کہا۔ "آگے جاؤ "

چارلس بارلو بیساختہ ہنس پڑا۔ یہ بنگالی کی سچی تصویر تھی، لیکن "مسر علی بابا "نے بابو کے متعلق جو پیشن گوئی کی تھی وہ بھی آج لفظ بہ لفظ صحیح ثابت ہو رہی تھی۔ بابو مغربی علوم اور مغربی خیالات سے پیٹ بھر کے اب دولتی جھاڑ رہا تھا۔ چارلس بارلو نے کاہلی سے سر اٹھا کر الماریوں پر نظر ڈالی۔ لیکن اُسے یاد آیا کہ "مسر علی بابا کا سفرنامہ " مدتیں گذریں ڈیڈ نے نواب انوار الزماں کو تحفتہً دیدیا تھا۔

گرینڈ ڈیڈ۔ ڈیڈ۔ ما۔ دونوں چچا سڈنی اور کرسٹفر۔ پھر گریٹ آنٹ میبل۔ آنٹ ماڈ۔ آنٹ جیرلڈین۔ آنٹ منیلڈا۔ خالص وکٹورین نام۔ بھولی برخود غلط وکٹورین ہستیاں ــــــ پورا بارلو خاندان اسٹڈی کے آتش دان اور دیواروں پر اپنی اپنی تصویروں کے بیش قیمت چوکھٹوں کے اندر محفوظ و مامون موجود تھا۔

جبکہ باہر دور دور بم پھٹ رہے تھے۔

گرینڈ ڈیڈ اور ڈیڈ سلطنت کی اس تباہی پر اپنی اپنی قبروں میں کروٹیں بدل رہے ہوں گے۔ کلکتے اور کھلنا کے انگریزی قبرستان، بارش میں بھیگتے کتبے، قبروں کے کتبے، سارا ہندوستان انگریزوں کا وسیع و عریض قبرستان ہے۔ اپنی جانیں دیکر ہم نے اس ملک کو سنوارا۔

گرینڈ ڈیڈ ہیلی بری سے ٹریننگ لے کر اڑیسہ آئے تھے۔ انھوں نے ایڈمنسٹریشن میں ان بڈھوں سے ٹریننگ لی تھی، جن کی اپنی جوانی میں محمد رضا خاں اور شتاب رائے زندہ تھے۔ کلائیو، ہیسٹنگز، کارنوالس، ولیم بنٹنگ، میکالے ــــــ

کس جانفشانی اور محنت اور محبت سے گرینڈ ڈیڈ اور ان سے پہلے اور بعد کی پیڑھیوں کے سویلین نے اس ملک کی حکومت کو دنیا کی بہترین حکومت بنایا۔ جلتی دھوپ، لو، بارشوں، سیلابوں، وباؤں کی پروا کئے بغیر سینکڑوں میل کے فاصلے گھوڑوں، پالکیوں اور کشتیوں کے ذریعے طے کرکے یہ عظیم لوگ، آراضی کا بندوبست کرتے، مقدمے فیصل کرتے، درختوں کے نیچے بیٹھ کر کسانوں کی فریادیں سنتے، کسان ان کو مائی باپ کہتے، کمپنی کے اولین دور میں بے شک کرپشن تھا۔ مگر اس کے فوراً بعد ــــــ؟ اور کرپشن کیا اس ملک کی پرانی روایت نہیں تھی؟ نذرانہ اور رشوت؟ اب پہلی بار اہل ہند کو احساس ہوا ہے کہ مرکزی اور صوبجاتی حکومت قتل و غارت، لوٹ مار اور زبردستی کا نام نہیں، بلکہ یہ رعایا کی بھلائی اور حفاظت کے لئے قائم ہے، مغلوں کا ایڈمنسٹریشن ــــــ؟ اوکسفرڈ میں وہ مسعود علی سے بحث کیا کرتا تھا۔ اشوک، شیر شاہ، اکبر ــــــ ٹھیک ہے۔ مگر ان کے بعد؟ اور یہ لوگ بھی قانون کے تقدس سے ناآشنا تھے۔ سارا مشرق قانون کے تقدس سے ناآشنا ہے۔

سلطنت روم کی وارث مسیحی یوروپین تہذیب کے بہترین نمائندے برطانیہ نے پہلی بار اہل ہند کو قانون عطا کیا۔

اولڈ کارنوالس نے تھانوں اور پولس چوکیوں کا جال بچھا دیا۔ کلیولینڈ نے آدی باسیوں کو انسان بنایا۔ اٹھارویں صدی میں جیسور کا ایک کلکٹر بیکل اسقدر شفیق تھا کہ عوام نے اسکی مورتی بنا کر اسکی پوجا کی۔ نکلسن کو پنجاب کے کسان پیار سے نکل سائیں کہتے تھے۔ جوناتھن ڈنکن نے بنارس میں دختر کشی کے خلاف مہم شروع کی۔ جیمز گرانٹ نے دن رات کی انتھک محنت کے بعد ایک دیانت دار اور انصاف پسند ایڈمنسٹریشن قائم کیا۔ یہ دو سو سال کی قربانیاں، عرق ریزیاں، جانفشانیاں سب رائیگاں جائینگی ——— ؟ اس عظیم کارنامے، "برطانوی ہند" کو ہم لاقانونیت اور جذباتیت کے حوالے کر دیں گے ؟ گوڈ انڈیا ان ڈیڈ ——— !

انڈیا ہے کہاں ؟ نہرو کے شاعرانہ تخیل میں ! انڈیا کو ایک بار اشوک نے متحد کیا۔ ایک بار اکبر نے (کوشش کی مگر فیل ہو گیا) اور اب واقعی اُسے ہم نے متحد کیا ہے۔ پنجاب میں تعینات لیڈی ولسن نے آج سے نصف صدی قبل بالکل صحیح لکھا تھا کہ یہ ملک بکڑیوں کا ایک گٹھا ہے۔ ہر لکڑی چاہتی ہے کہ دوسری کو توڑ دے۔ ان سب کا بیرونی اتحاد محض برطانوی پرچم کے ذریعے قائم ہے۔

گرینڈ ڈیڈا اپنی اس تصویر میں جو شملہ کے ایک مشہور فوٹوگرافر نے ۱۸۶۱ء میں کھینچی تھی قلم ہاتھ میں لئے کچھ لکھ رہے ہیں۔ یہ تصویر آتشدان پر رکھی ہے۔ گرینڈ ڈیڈ ——— ایڈورڈ بارلو ، برطانوی سویلینز کی اس شاندار روایت کی ایک مثال تھے، جنھوں نے اپنی شدید معروف زندگی کے باوجود اس ملک کے بارے میں ہزارہا محققانہ اور عالمانہ کتابیں لکھیں۔ یہ ہندوستانی جو آج کل "انڈین کلچر" کا نعرہ لگا رہے ہیں، ان کی یہ "انڈین کلچر" ان ہی بے چارے وکٹورین بڈھوں نے دریافت کر کے دنیا کے سامنے پیش کی تھی۔ آج ہم ان وکٹورین بڈھوں کو بد دماغ، برخود غلط، سمجھتے ہیں، اور غالباً وہ ایسے تھے بھی۔ کیا قدیم رومن باقی دنیا کو وحشی نہیں سمجھتے تھے ؟ انیسویں صدی کے برطانیہ کا ایک فرد ہونا مذاق تھوڑا ہی رہا ہوگا۔ برٹش امپائر ——— ! پوری انسانی تاریخ میں اس سے زیادہ عظیم الشان، باجبروت سلطنت پہلے کہیں قائم نہ ہوئی تھی ! چنانچہ یہ بڈھے۔ گرینڈ ڈیڈ اور ڈیڈ اور ان کے ساتھی خر دماغ اور ذرا خبطی سے تھے۔ مگر کیا دولت اور طاقت کے بل بوتے پر امریکہ بد دماغ اور برخود غلط نہیں ہو گیا ؟ اور مزید ہوتا جائے گا ——— جب کہ اس کے پاس تہذیب بھی نہیں ہے ——— ؟

امریکہ ——— وائلٹ ——— وائلٹ اس وقت کیا کر رہی ہو گی۔ تمہاری صحت ڈارلنگ ——— چارلس بارلو نے مگ اٹھا کر چند گھونٹ بھرے۔ پھر ایڈورڈ بارلو کی تصویر کو دیکھا۔

گرینڈ ڈیڈا پر کا قلم ہاتھ میں لئے، سیاہ ریشمی ڈورے والی عینک لگائے شدت کی سنجیدگی سے کیا لکھ رہے

ہو ——— ؟

گرینڈ ڈیڈی نے بنگال کے کتنے اضلاع کے امپیریل گزیٹرز پر کام کیا تھا۔ شام کو تھکے ہارے عدالت سے لوٹ کر یونین کے چپڑ والے کسی بنگلے کے برآمدے میں بیٹھ کر لیمپ کی روشنی میں تم یہ سب لکھا کرتے ہوگے۔ چوکرا۔ سگار لاؤ۔ چاند نکلتا ہوگا مچھر بھنبھناتے ہوں گے۔ تم تنہا بنگلے میں بیٹھے امپیریل گزیٹر کی جلدوں میں ایک جلد ایک باب کا اضافہ کرنے میں جٹے رہتے ہوگے۔ اور "آسام کے ناگا قبائل" گرینڈ ڈیڈ کی مشہور کتاب تھی۔

برابر کی تصویر میں گرینڈ ما بیٹھی ہیں۔ اونچا سا جوڑا باندھے۔ درشت چہرہ۔ سیاہ گاؤن۔ ہندوستان میں برطانوی سوسائٹی کی ایک فراموش شدہ ستون۔ ان کے برابر میں گریٹ آنٹ تبل کی تصویر رکھی ہے۔ (بوڑھا وفادار عبدالغفور جو ولیم کینٹ ولی سے ترکے میں ملا ہے، کس احتیاط اور خیال سے روزانہ ان ساری تصویروں کی جھاڑ پونچھ کرتا ہے) گریٹ آنٹ تبل جو گرینڈ ڈیڈ کی بہن تھیں انھوں نے ساری زندگی "چرچ آف انگلینڈ کی زنانہ مشنری سوسائٹی" کا کام کرنے میں صرف کردی۔ جو ڈیڈ بتاتے تھے۔ ایک روز گوالندو گھاٹ سے تن تنہا اسٹیمر پر بیٹھیں اور دور دراز شمالی مغربی صوبجات کے ایک دور افتادہ ضلع میں مشن قائم کرنے کے لئے یسوع کا نام لیکر چل پڑیں۔ گوالندو سے مونگھیر۔ پٹنہ۔ بکسر۔ غازی پور۔ بنارس ——— (ہر نام کا اپنا نام رومان تھا) بنارس کے خوفناک صنم کدے سے وہ اودھ کے شہر سیتا پور پہنچیں۔ وہاں مشن کمپاؤنڈ میں اسکول اور ہسپتال قائم کیا۔ اور بیچاری جوانی کے عالم ہی میں وہاں ہیضے کا شکار ہوگئیں۔ آج کی یہ تعلیم یافتہ قوم پرست ہندوستانی لڑکیاں آنٹ تبل جیسی بہادر عورتوں کی شکر گزار ہیں جنھوں نے تعلیم کی روشنی ان تک پہنچائی؟

کوئٹ انڈیا۔ بلڈی فولز ———

اب چارلس بارلو کا سر بھاری سا ہو رہا تھا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔ تنہائی میں مجھ پر ماضی کی یاد کے دورے زیادہ پڑنے لگے ہیں۔ اور یہ اچھی بات نہیں۔

ڈیڈ کا آئل پورٹریٹ۔ جو لندن کے کسی دوسرے درجے کے مصور نے ۱۹۰۱ء میں بنایا تھا۔ ڈیڈ تھوڑے سے ڈینڈی تھے۔ ایلن ٹیری اور اوسکر وائلڈ اور آبری بیئرڈزلے کے دور کے فیشن ایبل نوجوان۔ جو جب فرلو پر لندن جاتے تو اپنا سارا وقت تھیٹر اور اوپیرا اور بیلے میں گزارتے۔ "GAY NINETIES" کے ہنگاموں کے رسیا۔ واپس آتے اور بنگال اور اڑیسہ کے غیر دلچسپ پس ماندہ اضلاع میں اپنے فرائض منصبی میں جٹ جاتے مگر اپنے لندن کے انٹلکچول دوستوں سے خط وکتابت جاری رکھتے۔ کتنے برطانوی مصنفوں، صحافیوں اور شاعروں سے ان کے ذاتی مراسم تھے۔ ڈیڈ کو علم نباتات کا شوق تھا۔ انھوں نے بھی گرینڈ ڈیڈ کی مانند ہندوستان کے متعلق لکھنے پڑھنے کا شغل جاری رکھا۔ آسام کے آرکنڈز کی ان گنت اقسام کی فہرستیں بنائیں اور بنگال اڑیسہ اور آسام کے پودوں اور پھولوں اور درختوں پر ایک مستند اور

ضخیم کتاب لکھ ڈالی۔

ڈیڈ کتاب لکھتے تھے اور مما جنھوں نے اپنی شادی سے قبل کچھ عرصہ تک پیرس میں مصوری سیکھی تھی، ان پھولوں اور پتوں کے انتہائی سبک اور نفیس اسکیچ بناتیں۔

مما کی تصویر۔ صوفے پر بیٹھی ہیں۔ ڈیڈ پیچھے کھڑے مسکرا رہے ہیں، اس تصویر میں ڈیڈ کی کرزن فیشن کی مونچھیں ہیں۔ مما پیرس کے تازہ ترین فیشن کے گاؤن میں ملبوس ہیں۔

یہ لوگ سب مر گئے۔

گرینڈ ڈیڈ نے اپنے ہندو بنگالی منشی سے فارسی پڑھی تھی، اور بنگلہ جانتے تھے۔ ڈیڈ بھی بنگلہ سے واقف تھے۔ ریٹائر ہونے کے بعد ان کا ارادہ تھا کہ وہ اپنا زیادہ وقت لندن میں انڈیا آفس لائبریری میں صرف کریں گے، مگر لندن جانے سے پہلے ہی وہ سندربن میں شیر کا نوالہ بن گئے۔

ان سے گاؤں والوں نے درخواست کی تھی کہ اس آدم خور شیر سے بچائیں جو بہت سارے لکڑہاروں کا شکار کر چکا تھا۔ ڈیڈ بے خوفی سے بندوق سنبھال کر اُسے مارنے کے لئے اندھیرے جنگل میں گھسے اور زندہ واپس نہ آئے۔

انھوں نے اپنی قیمتی جان دی تاکہ یہ نیم وحشی لکڑہارے زندہ رہیں۔

گرینڈ ڈیڈ کا انتقال ۱۹۰۷ء میں ہوا۔ جب بنگال میں قتل و غارت شروع ہو چکا تھا۔ انھوں نے بہت لمبی عمر پائی۔ نوجوان وکٹوریہ کی تخت نشینی، کمپنی کی ملازمت، غدر، وکٹوریہ کی موت اور آخر میں خودی رام باسو، سب ہی کچھ دیکھ لیا۔ ان کو پنشن لیتے کافی عرصہ گزر چکا تھا، وہ ریٹائر ہونے کے بعد وطن نہیں لوٹے، انھوں نے دارجلنگ اور کلکتے میں بیحد خوب صورت کوٹھیاں بنوائی تھیں، اور اپنا وقت علمی مصروفیات میں صرف کرتے تھے۔ کلکتہ یونیورسٹی کی سینٹ۔ رائل ایشیاٹک سوسائٹی۔ یہ اور وہ۔ چند برہمو تعلیم یافتہ بھی ان کے دوست تھے۔ گو یہ واقعہ ہے کہ وہ نیٹوز سے برابری کی سطح پر کبھی نہ ملے، اور حاکم و محکوم کی شعوری دیوار قائم رکھی۔ کہ ایمپائر کی سلامتی اسی میں مضمر تھی۔

گرینڈ ڈیڈ کے چار بیٹے اور تین بیٹیاں تھیں۔ وکٹورین دستور کے مطابق بہت بڑا کنبہ تھا۔ مگر صرف یہ سات بچے ہندوستان کے ملیریا اور دوسری بیماریوں سے زندہ بچے تھے۔ اور دستور کے مطابق (تاکہ ہندوستانیوں کی بُری خصلتیں نہ سیکھ لیں) چھ چھ سال کی عمر میں انھیں تعلیم و تربیت کے لئے انگلستان بھیج دیا گیا تھا۔ بڑے ہو کر ڈیڈ کے سب سے بڑے بھائی فوجی افسر بن کر ہندوستان لوٹے، لیکن کابل کے مارچ میں کھیت رہے۔ منجھلے بھائی نے لنکا میں چائے کی کاشت شروع کی۔ اور وہاں کے متمول پلانٹر بنے۔ ڈیڈ جو ان دونوں سے زیادہ ذہین تھے، انڈین سول سروس کے مقابلے میں آگئے۔ اور اس کے فوراً بعد ہی مما کو بیاہ کر ہندوستان لوٹے۔

آنٹ ماڈ کی تصویر۔ روکھی پھیکی شخصیت، سفید گاؤن۔ ہاتھ میں بائبل۔

آنٹ جیرلڈین کی تصویر ـــــ خوش شکل، متبسم، شربتی آنکھیں، فیشن ایبل گاؤن، گلے میں موتیوں کا ہار، گود میں کتا، ہاتھ میں پنکھا، ـــــ

آنٹ مٹیلڈا کی تصویر ـــــ متبسم بھولی صورت، یہ تینوں تصویریں ایک ایک بک شلف پر رکھی ہیں۔ یہ تینوں وکٹورین خواتین ڈیڈ کی بہنیں تھیں۔ تینوں اڑیسہ کے مختلف اضلاع میں پیدا ہوئیں۔ آنٹ ماڈ سب سے بڑی۔ شادی نہیں کی۔ اپنی پھوپھی میبل بارلو کی مانند اہل مشرق کی روحیں بچانے میں جُٹی رہیں۔ گریٹ آنٹ میبل نے اس سلسلے میں صرف گوالندو گھاٹ سے بیتاپور تک کا سفر کیا تھا۔ آنٹ ماڈ نے چینیوں کی روحانی نجات کی خاطر گن بوٹ سیاست اور مشرقی ایشیا کی کولونیل جنگوں کے پُرخطر زمانے میں تہا کینٹن تک کا سفر کیا۔ برسوں وہاں رہیں اور باکسر بغاوت کے زمانے میں جب باغیوں نے ان کے مشن کپاؤنڈ پر حملہ کیا۔ وہ چند برطانوی، بلجین اور امریکن مشنری خواتین سمیت جیزس کی خاطر شہید ہوئیں۔ سرزمین چین میں ان کی قبر بنی۔

آنٹ جیرلڈین ـــــ خوبصورت اور فلرٹ۔ لندن میں ایک بیرسٹر سے شادی کرلی۔ آنٹ مٹیلڈا بھی خوبصورت اور بہت پیاری سی تھیں۔ ڈیڈ کی پسندیدہ بہن۔ دارجلنگ میں ایک فوجی افسر (بنگال لانسرز) ان پر عاشق ہوا۔ مگر منگنی کے بعد ان کو دغا دے کر بھاگ گیا۔ دل شکستہ آنٹ مٹیلڈا بھی مذہب کی طرف راغب ہوئیں۔ گارو ہلز میں نیا مشن کھولا، گرینڈ ڈیڈ کو ناگا قبائل سے بہت محبت تھی، انھوں نے آنٹ مٹیلڈا کی ہمت افزائی کی۔ آنٹ مٹیلڈا اب بوڑھی ہوچکی ہیں۔ اور لندن میں آبائی مکان میں رہتی ہیں۔

ڈیڈ اور مما کے ہاں تین بچے زندہ رہے۔ ایلس۔ چارلس، اور رچرڈ۔ وہ تینوں بھی بچپن میں انگلستان بھیج دیے گئے۔

ایلس بارلو۔ عجیب بات ہے۔ وکٹورین انگلستان مذہبی نہیں تھا۔ انگریز زیادہ مذہب پرست کبھی نہیں رہا۔ مگر مشرق میں آکر سب پر مذہب کا جوش سوار ہوجاتا تھا۔ غالباً یہاں کے عجیب و غریب لیکن دلچسپ مذاہب سے غیر شعوری مدافعت۔ ایلس کو مشنری بننے کی قطعاً ضرورت نہ تھی۔ ایلس جدید زمانے کی لڑکی تھی۔ کوئی اور پیشہ اختیار کرسکتی تھی۔ اُسے گریٹ آنٹ میبل اور آنٹ ماڈ اور آنٹ مٹیلڈا کی روایات سے متاثر ہونے کی کیا ضرورت تھی؟ یہ میری سمجھ میں کبھی نہ آیا۔ غریب ایلس شادی کرسکتی تھی۔ بہت ہی معمولی شکل تھی پھر بھی یقیناً اسکی شادی ہوسکتی تھی۔ وہ پچھلے بیس برس سے گارو کی پہاڑیوں میں آنٹ مٹیلڈا کا قائم کیا ہوا مشن چلا رہی ہے۔ ناگا قبائل ہی اسکی ساری کائنات ہیں۔

مشنری عورتوں کو اس ایثار اور قربانی کا صلہ کیا ملتا ہے؟ افریقہ کے جنگل، ایشیا کے جنگل، مصائب، پریشانیاں اور آخر میں تنہائی اور بڑھاپا۔ یا کسی وحشی کے ہاتھوں موت ـــ کیوں؟ ایسا یہ لوگ کیوں کرتی ہیں؟ کیا ان کو واقعی یقین ہے کہ آسمانی بادشاہت ملے گی؟

بارلو خواتین کا تو بہرحال سینٹ پیٹر[1] استقبال کرتے کرتے تھک جائیں گے۔ میبل۔ ماڈ۔ مٹیلڈا۔ ایلس۔

---
[1] جنت کے دربان

چارلس بارلو کمرے کا چکر لگا کر پھر اپنی آرام کرسی پر آ کر بیٹھ گیا۔ وہ اتنی دیر سے اپنے خاندانی تصاویر کا مطالعہ کر رہا تھا' مگر ایک گروپ فوٹو جو اس کے ساگوان کے ڈیسک پر رکھا تھا اس کی طرف سے اس نے نظریں چرا لیں۔ وہ تینوں مجھے زور زور سے پکار رہے تھے۔ اسکی بیوی وائلٹ۔ اس کے بچے ٹام اور کیرل۔ وہ تینوں اس وقت ڈھاکے سے ہزاروں میں دور جنگ کے مہیب شعلوں میں گھرے انگلستان میں موجود تھے۔

بوڑھی اور بہادر آنٹ ٹیلڈا بھی جو ۱۹۴۰ء کی بلٹز کے زمانے میں اطمینان سے اپنے پلنگ پر سویا کرتی تھیں (وائلٹ نے لکھا تھا)۔

آبائی مکان کی تصویر۔ ۱۴۱ اینڈ ریوز کریسنٹ ——— (یہ تصویر بہت چھوٹی سی ہے۔ اور ٹام نے اپنے بے بی براؤنی سے کھینچ کر اسے بھیجی تھی۔ آنٹ ٹیلڈا پورچ کی سیڑھیوں پر بلّی گود میں لئے کھڑی ہیں۔ کیرل قریب ہی کتے سے کھیل رہی ہے۔ وائلٹ تصویر میں نہیں ہے) یہ تصویر لکھنے کی میز پر بلاٹنگ پیڈ کے کونے میں اڑسی ہوئی دو سال سے اسی طرح رکھی ہے' اس دو سال میں لندن پر کیا قیامت گزر گئی۔

آبائی مکان۔ ریجنسی طرز کا یہ مکان گرینڈ ڈیڈ کے والد نے جو ہستی میں سولسٹر تھے ۱۸۱۲ء میں خریدا تھا۔

مکانوں کی زندگی۔ انسانوں کی زندگی۔

اب میں پھر ماضی کی طرف واپس لوٹتا ہوں۔ چارلس بارلو نے لمبا سانس بھر کر "نغماتِ ہند" دوبارہ اٹھائی۔ کتاب کے پیلے ورقوں میں سے جو پرانی مہک آ رہی تھی وہ اسے بہت اطمینان بخش معلوم ہوئی۔ ماضی محفوظ ہے۔

یورپین اور امریکن ہمیشہ متعجب رہتے ہیں کہ انگریز اتنا غیر جذباتی ہوتے ہوئے بھی اتنا ماضی پرست کیوں ہے۔ ان لوگوں کو کیا معلوم کہ ہم کتنے جذباتی ہیں اور دوسری بات یہ ——— اس نے بوتل سے مگ میں مزید بیئر انڈیلا ——— کہ ہمارا ایسا ماضی اور کسی قوم کا ہے ہی نہیں۔ لاجواب' بے مثال' درخشاں۔

ایسا درخشاں بھی نہیں۔ ذرا ہندوستانیوں سے پوچھو۔

واٹ دی ہل۔

اب سارے طرح یاد آ رہی ہیں۔ ان کے بنائے ہوئے واٹر کلر ڈرائنگ روم میں سجے ہیں۔ بنگال کے دو مناظر ——— سنہری پاٹ سے لدی ہوئی کشتی' دور دھندلکے میں مسجد کا مینار' اور برگد تلے کھڑا کالا بجنگ کسان۔ سامنے الماری میں ان کے واٹر کلرز کا البم رکھا ہے اور اسکیچ بک ——— دارجلنگ کے چیتھڑوں میں ملبوس پہاڑی بچے۔ اور کنڈ کا ایک گچھا۔ فرن کے پتے۔ کرشن چوڑا کی شاخ۔ اپنے وفادار نیٹو ملازموں کے اسکیچ۔ اپنے تینوں بچوں کی تصویریں۔ ایلس عمر سترہ سال' چارلی عمر گیارہ سال۔ ڈک۔ عمر دو سال۔

ڈِک ——— ونگ کمانڈر رچرڈ بارلو۔ ڈیشنگ۔ بشاش۔ خوب صورت سنہری آر۔ اے، ایف مونچھیں، یونیفارم پر تمغوں کی قطار، یہ ایک اور تصویر ہے جو سامنے میز پر رکھی ہے۔ جسے میں نہیں دیکھنا چاہتا۔

ونگ کمانڈر رچرڈ بارلو —"پرانے بنگال سویلین ایڈورڈ بارلو مرحوم کا پوتا۔ جیمز بارلو مرحوم کا چھوٹا بیٹا۔ مسٹر چارلس بارلو، ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ مرشد آباد کا چھوٹا بھائی۔ عمر اٹھائیس سال۔ جرمنی پر بمبار طیاروں کی قیادت کرنے کے لئے گیا اور زندہ واپس نہ آیا۔" پچھلے سال اسٹیٹسمین میں شائع ہوا تھا۔

ماضی کی طرف لوٹو چارلی۔ ماضی محفوظ ہے۔ پُر امن۔ پُر سکون۔ چارلس بارلو سر ہلا کر تلخی سے ہنس پڑا۔ سامنے کے شیلف میں پچھلی جنگوں کے متعلق سنہری مجلّد کتابیں ایک قطار میں رکھی تھیں ——— فرسٹ اینگلو فرنچ وار ۱۷۴۶-۴۸ء، کرناٹک وارز، پلاسی، فتح مسولی پٹم، بکسر، فرسٹ میسور وار، روہیلہ وار، فرسٹ اینگلو مرہٹہ وار، سکنڈ میسور وار، تھرڈ میسور وار، فورتھ میسور وار، سکنڈ اینگلو مرہٹہ وار، اینگلو گورکھا وار، پنڈاری وار، تھرڈ اینگلو مرہٹہ وار، فرسٹ برمیز وار، فرسٹ افغان وار، فرسٹ اینگلو سکھ وار، سکنڈ اینگلو سکھ وار، سکنڈ اینگلو برمیز وار، سنتھال بغاوت، سپاہی میوٹنی، معرکہ انبالہ، بھوٹان وار، سکنڈ اینگلو افغان وار، تھرڈ اینگلو برمیز وار، منی پوری بغاوت، سرحدی بغاوت ———

یہ تو صرف پچھلے دو سو سال میں برطانیہ کی مشرقی فتوحات تھیں۔ ہزاروں، لاکھوں کرسٹفر اور رچرڈ بارلو ان معرکوں میں کھیت رہے۔ یورپ کی جنگوں میں کتنے رچرڈ ———

"عبدالغفور!" چارلس نے دفعتہً گرج کر آواز دی۔

عبدالغفور چند سکنڈ میں نمودار ہوئے۔

"گوسل کا پانی لگاؤ۔"

"جی صاحب۔" عبدالغفور غائب ہو گئے۔

بہت خون بہایا میرے آبا نے۔ چارلس نے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ پرانے رومنوں کی مانند، مگر پرانے رومنوں کی مانند انھوں نے علم و فن کو بھی مالا مال کر دیا۔

مارس اور منروا کبھی ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے۔

اس نے کمرے میں نظر دوڑائی۔ پرانی کتابیں اور پرانی تصویریں، یادوں کا قبرستان۔

اڑتیس سال کی عمر میں بوڑھا ہو چکا ہوں۔ کیونکہ میری عمر اڑتیس سال نہیں ہے۔ میرے عقیدے کی عمر انیس سو بیالیس سال ہے۔ ذہنی اعتبار سے ڈھائی ہزار سال، تاریخی اعتبار سے ڈیڑھ ہزار سال اور نسلی یادداشت کی عمر کتنے ہزار سال ———؟ ہر سوچنے والے یوروپین انسان کی یہ سب عمریں ہیں، ہر ہندوستانی کی عمر کتنی ہے؟ غالباً لا محدود۔

پھر ہم اپنے نام رکھتے ہیں۔ ایڈورڈ، جیمز، چارلس، ٹامس، خاندانی نام بارلو۔ جو ہیں ایک پرانے دھندلکے سے

جاتا ہے۔ اور جس کی وجہ سے ہمیں مستقبل میں بھی اپنے پاؤں جمائے رہنے کی خوشگوار امید ہے۔ یہودیوں اور عربوں کا دستور ہے —— فلاں ابن فلاں ابن فلاں۔ کیا خود پسندی ہے۔

سچے گیانی میں اتنی خودی بھی نہیں کہ وہ اپنا نام تک لکھے۔ کسی اپنشد میں ہے؟

ڈیڈی بتاتے تھے کہ سونیر ولیمز نے کسی گاؤں کے برہمنوں سے دستخط کرنے کے لئے کہا، انھوں نے جواب میں صرف انگوٹھے لگائے اور اوم لکھ دیا ——

"صاحب پانی تیار ہے" عبدالغفور نے اطلاع دی، اور غائب ہو گئے۔

چارلس سر جھکائے بیٹھا رہا۔

آخر میں سب مر جاتے ہیں۔

ڈیڈی کو ہندوستان کے متعلق انگریزوں کی لکھی ہوئی کتابوں کے پہلے ایڈیشن جمع کرنے کا شوق تھا۔ ان الماریوں میں وہ ساری کتابیں موجود ہیں۔ گرینڈ ڈیڈی اور ڈیڈی کا کتب خانہ۔ ان کتابوں کے مصنف —— جان کمپنی کے افسر، انڈین سول سروس کے افسر، فوجی، مشنری، ماہرین تعلیم، پلانٹر، ان کے بھوت پھوس کی چھتوں والے بنگلوں میں اب بھی منڈلا رہے ہوں گے ——

یہ کتابیں —— زراعت اور جنگلات۔ آرکیالوجی، رسل و رسائل اور سول انجینرنگ، تعلیم، اتھنولوجی، اور ریکولوجی (آسام کے ناگا قبائل از ایڈورڈ بارلو آئی سی ایس۔" چارلس نے فخر سے سوچا۔ نام۔ مستقبل کے گرد آلود کونوں کھدروں میں بہرحال محفوظ رہے گا۔ کتاب کی جلد پر لکھا ہوا نام، اور قبر کا کتبہ۔ نام) قانون، ایڈمنسٹریشن، طب، فلسفہ، نیچرل ہسٹری، سفرنامے، جغرافیہ ——

کلکتے کا جیمز پرنسپ جس نے خروشتی میں یونانی نام دریافت کئے اور اشوک کے کتبوں کی عبارت پڑھی۔ کننگھم۔ جان مارشل جیمز فرگسن، ہیول، گرانٹ ڈف، کرنل ٹاڈ، ونسنٹ اسمتھ۔ مورلینڈ، جیمز مل، وارن ہیسٹنگز، ولیم جونز، گرھم بیلی، چارلس ایلیٹ، ولسن گرفتھ، جارج سیل —— آرٹ ہسٹری، لسانیات، مذاہب۔

اور یہ دلچسپ ناول۔ جواب مضحکہ خیز لگتے ہیں، اور جدید ہندوستانیوں کے ہاتھ میں پڑ جائیں تو وہ ان کو نذر آتش کردیں —— جیسے ہندوستانی کردار "نیٹو اور نگر" کے لقب سے یاد کئے جاتے تھے۔ ہنسی (رگڈ اولڈ ہنی)، میرین کرافرڈ، ماڈ ڈائیور کرنل میڈوز ٹائیلر کے ناول —— "ایک ٹھگ کے اعترافات"، "سیتا"، "تارا"، "ٹیپو سلطان"! فلورا اینی اسٹیل۔ الف ڈبلیو بین —— ہر اسٹیشن کے کلب کی لائبریری میں یہ ناول موجود ہوتے تھے ——

اور بچوں کے لئے کتابیں جو ہم سب نے بچپن میں پڑھیں "لٹل آرتھر اور اس کا بیرہ"، "لٹل آرتھر کی ہسٹری"

"لٹل آرتھر ـــــ"

غدر کے متعلق کتابوں کا انبار، اور پھر کپلنگ ـــــ!

لاہور اور پشاور کی پُراسرار گلیاں، چندر وفائے، گنگا داس اور سدّھو، اور ولی داد اور لالن طوائف ـــ لاہور کی لالن طوائف غالباً کپلنگ کا علامتی کردار تھی ـــــ مغرب کے لئے علامتی کردار ـــــ ایک خطرناک پُرکشش بے ایمان عورت ـــــ ہندوستان۔ جو انگریز اس جادوگرنی کے ہلاکت خیز سحر کا شکار ہوا وہ بہت جلد اپنا کردار کھو بیٹھا۔ پیچھے ہوگیا۔ اس لئے ہمیشہ الگ تھلگ رہو۔ اس تاریک اور بھیانک جنگل میں ایمپائر کے اسٹینڈرڈ قائم رکھو۔ (اسی وجہ سے گریٹڈ ڈیڈ اور گریٹڈ ماڈیڈ اور مائرسیہ اور آسام کے ویران ڈاک بنگلوں میں شام کو باقاعدہ اس طرح کپڑے بدلتے تھے گویا لندن کے سوائے میں ڈنر کھانے جارہے ہوں)

چارلس بارلو اٹھ کر دریچے میں جا کھڑا ہوا۔ یہ ڈپٹی ایمز ہاؤس، اس کے ملازم، اس کا باغ، یہ سب چیزیں اسی مستحکم نظام اور روایات کا ایک جزو ہیں۔ یہ سحر انگیز اینگلو انڈین دنیا جو دو سو سال سے اس ملک میں آباد ہے ـــــ اس کے جانے بوجھے کردار اور جزویات، کلکتہ، شملہ، ہل اسٹیشن، مفصل، اضلاع، صوبے، ہر صوبے کا سویلین خود کو اس صوبے سے مماثل کرتا تھا۔ پنجاب سویلین، سندھ سویلین، بنگال سویلین، سندھ کلب، بنگال کلب۔

یہ منضبط اور مستحکم اینگلو انڈین[ل] معاشرہ۔ کسی لفٹ ننگ ہندوستانی انٹلکچوئیل نے سچ کہا ہے کہ انگریز ہندوستان کو کنٹری اسکوائر یا زمیندار کی نظر سے دیکھتا ہے۔ ہندوستانی صوبے گویا ان انگریز حاکموں کی ذاتی زمینداریاں تھیں جس میں ہم پلّہ لوگ یا انسان دوسرے یوروپین تھے۔ اہل برطانیہ ہندوستان میں ملازمت کرنے والے اپنے ہم وطنوں کو "انڈین" "انڈین سویلین" یا "انڈین پاکس والا" یا "انڈین آفیسر" کہتے تھے۔ ہندوستانی محض نیٹو تھا، اور اس قابل نہ تھا کہ اس کا تذکرہ کسی مہذب سیاق و سباق میں کیا جائے ـــــ

"پنجاب کا اولڈ جارج کل مجھے جم خانہ میں ملا تھا ـــــ" بالکل جس طرح ڈیوک اپنی ریاستوں سے مماثل کئے جاتے ہیں۔ اور جس طرح انگلستان کا کنٹری اسکوائر اپنی رعیت کا خیال رکھتا تھا۔ اسی شفقت اور خیال سے ہم لوگ اپنی رعیت سے یہاں پیش آئے۔ زیادہ دلسوزی اور محبت سے کیونکہ یہ رعایا بچوں کی طرح احمق اور جانوروں کی طرح جنگلی تھی۔ نسلاً بعد نسلٍ ان سب سویلینز کا یہ عقیدہ تھا کہ خدا نے ایک بڑی عظیم اخلاقی اور روحانی ذمہ داری ان کو سونپی ہے ـــــ برطانوی ہند کی حکومت! (غدر کے متعلق ہربرٹ ایڈورڈ نے کہا تھا کہ یہ خدا نے ہم کو اس غفلت کی سزا دی ہے کہ ہم نے عوام کو

ل انیسویں صدی میں ہندوستان میں رہنے والے یا یہاں ملازمتیں کرنے والے انگریزوں کو اینگلو انڈین کہا جاتا تھا، مخلوط نسل والا طبقہ "ہاف کاسٹ" یا یوریشین کہلاتا تھا۔

عیسائیت کے اصولوں سے آشنا نہیں کیا) اور خدا کی قسم ہم نے اس ذمے داری کو بہت خوب نبھایا۔ ہم تاریخ سے شرمندہ نہیں ہیں)

کورٹ انڈیا ——— !

اسی اخلاقی برتری اور دیانت داری کے بل بوتے پر ہم مٹھی بھر انگریز چالیس کروڑ ہندوستانیوں پر اطمینان سے حکومت کرتے رہے ہیں۔

گو کبھی کبھی ہماری ماؤں کو رات کے وقت ہمیں برآمدوں میں مچھر دانیوں کے اندر سلاتے ہوئے یک لخت یہ دہشت آ دبوچتی تھی کہ اندھیرے میں سے نمودار ہو کر ٹوم ٹوم بجاتے نیٹو حملہ نہ کر دیں۔ ۱۸۵۷ء کی طرح۔ یہ واقعہ ہے کہ غدر کی یاد ہمیں ہمیشہ HAUNT کرتی رہی ہے۔

اور گو یہ حقیقت تھی کہ اہلِ ہند برٹش راج کی برکتوں کے معترف تھے اور ایک عام ہندوستانی عدالت میں ایک ہندوستانی جج کے فیصلے کے مقابلہ میں انگریز جج کے انصاف کو ترجیح دیتا تھا۔ مگر یہ بھی واقعہ تھا کہ غدر کے بعد ہنری لارنس نے کہا تھا کہ ہندوستانی اپنے پرانے بادشاہوں کے زیرِ حکومت خوش تھے۔ اصول پرست کمشنروں کے زیرِ نگین خوش نہیں۔

کورٹ انڈیا۔

یقیناً ہم نے بھی غلطیاں کی ہیں، شاید۔ امپیریلزم بذاتِ خود سب سے بڑا جرم ہے، مگر ہماری جیسی بابرکت امپیریلزم ——؟ فرانس اور ہالینڈ اور بلجیم کی کولونیوں کی کیا ناگفتہ بہ حالت ہے؟ ناقابلِ یقین۔

بہر حال "الف جیم" والا زمانہ تو مدتیں ہوئیں پچھلی جنگِ عظیم سے پہلے ہی ختم ہو گیا۔

غدر سے پہلے اضلاع میں سوشل زندگی کے مرکز یورپین چرچ اور اسمبلی رومز تھے۔ یوریشین طبقہ اپنی اچھوت حیثیت پہچانتا تھا۔ اور الگ رہتا تھا۔ پھر یہ اسمبلی رومز "کلب" میں تبدیل ہوئے۔ ڈانس، بلیرڈ، شوقیہ ڈرامے، گرینڈ ڈیڈ کا ہندوستان۔ ڈاک گاڑیاں، کتے گاڑیاں، بگھیاں۔ پالکیاں (پالکی بردار PALANQUIN BEARER بیرو بن گیا) کلکتہ کا ایڈن گارڈن جہاں شام کو بینڈ بجتا تھا۔ پارسیوں کی دکانیں۔

اسٹیشن کے چند افسر ایک دوسرے سے ہی ملتے رہتے۔ بیبیں دن بھر ایک دوسرے کو چٹیں بھیجا کرتیں۔ پھر ٹینس، پولو، شکار، انیسویں صدی کے اواخر میں ہندوستان اتنا دلچسپ ہو چکا تھا کہ ولایت سے اکثر لوگ چھٹیاں گزارنے یہاں آتے، گو ہندوستان سے ان کی مراد یہاں کی برطانوی سوسائٹی تھی۔

جاڑوں میں گرینڈ ڈیڈ دورے پر جاتے۔ جب گرینڈ ڈیڈ اور دوسرے صوبوں میں ان کے ساتھی افسر دورے پر نکلتے تو عہدِ رفتہ کے مغل صوبے داروں کے لاؤ لشکر کا گمان ہو سکتا تھا۔ (یہ واقعہ ہے کہ ہم نے مغلوں سے حکومت چھین کر تزک و احتشام میں ان کی نقل کرنے کی پوری کوشش کی۔ وائسرائے کی شان و شوکت ——— !) بنگال میں کشتیوں اور اسٹیمروں پر اور

دوسرے صوبوں میں بیل گاڑیوں اور اونٹوں پر لدکر سارا ساز و سامان کیمپ میں ساتھ جاتا۔ بھاری فرنیچر، تصویریں، چاندی کے ظروف ہر چیز۔ تاکہ سلطنت کے نمائندے کا دبدبہ اور رعب جنگل اور دیہات میں بھی قائم رہے۔ لشکر میں کتے، گائیں، بکریاں، مرغیاں، سواری کے گھوڑے کیا کچھ شامل نہ ہوتا۔ بڑے صاحب کے خیمے قالین تصویروں اور گلدانوں سے سجائے جاتے۔ خورونوش کی اشیا ٹین کے ڈبوں میں بمبئی کے آرمی اینڈ نیوی اسٹورز سے آتیں۔ کچھ فاصلے پر نیٹو افسروں کے خیمے لگتے، اور گاؤں والے آکر وہاں اپنا بازار لگاتے۔

سال نو پر ڈپٹی کمشنر کا دربار لگتا۔ دربار میں زمیندار نذریں پیش کرتے جن کو صاحب ہاتھ لگا کر واپس کر دیتا۔ بڑے صاحب کے دربار میں کرسی ملنا نیٹو جنٹلمین کے لئے بے حد عزت کی بات تھی۔

کلکتے اور شملے میں قیصر کی جرمن ایمپائر کے سفیر رہتے۔ جرمنی اور برطانیہ کی تجارتی جنگ شروع ہو چکی تھی۔ جرمن مصنوعات کی ہندوستانی بازاروں میں ریل پیل تھی۔ لیکن نوآبادیوں سے فائدہ اٹھانے کی اس ریس کا نتیجہ ۱۹۱۴ء کی جنگ کی صورت میں رونما ہونے میں ابھی بہت عرصہ باقی تھا۔

نیٹو سوسائٹی سے علیحدگی کی ایک فصیل اینگلو انڈیا نے اپنے گرد کھڑی کر رکھی تھی، مگر خود اس فصیل کے اندر برطانیہ جیسی شدید کلاس سسٹم نہیں تھی۔ انڈیا ایک آؤٹ پوسٹ تھا اور یہاں سب کو ایک دوسرے کے ساتھ مرنا جینا تھا۔ زندگی زیادہ بے تکلف تھی۔ برطانیہ اپنے بہترین نوجوان یہاں حکومت کرنے کے لئے بھیجتا۔ مگر وہاں کے بدترین نمونوں کو یہاں قسمت آزمانے کے لئے بھیج دیا جاتا۔ عموماً اونچے خاندانوں کے یہ ناخلف لڑکے، زیادہ ایڈونچرس ہوتے۔ ملک میں امن و امان، ترقی و خوش حالی کا دور دورہ تھا اور ایک عام جاہل ہندو "ملکہ وکٹوریہ" کو دیوی ماتا سمجھنے لگا تھا۔ (مرنے سے پہلے وکٹوریہ نے لارڈ کرزن سے کہا تھا۔

(BE KIND TO MY POOR INDIANS

اس ملک کی قدیم روایت تھی کہ بادشاہ پرجا کو درشن دیتا تھا، اور پرجا اس سے فریادی ہوتی تھی۔ اسی وجہ سے اکثر ہندوستانی امراء اپنا سارا اثاثہ فروخت کرکے، صعوبتیں اٹھا کر، اپنے مقدموں کی اپیل کے لئے لندن جاتے تاکہ ملکہ سے خود فریادی ہوں۔ زیادہ تر نامراد لوٹتے یا غریب الوطنی کے عالم میں مرجاتے۔ حاکم کے حکم کی اطاعت اور صاحبان اقتدار کا خوف اس ملک کے عوام کی سرشت میں داخل ہے۔ لہٰذا کیا تعجب ہے کہ اہل ہند ہماری اطاعت گزار رعایا بن گئے اور ملکہ کو اپنی ماں سمجھنے لگے!

غدر کے بعد انڈین سول سروس قائم ہوئی اور "کمپٹیشن والا" اینگلو انڈین منظر پر نمودار ہوا۔ مغرور، خود پسند، ہیلی بری کے بجائے اوکسبرج کا تعلیم یافتہ، جو "باکس والا" یعنی اپنے ہم قوم تاجر کو بھی ذرا حقیر سمجھتا تھا۔ یہ نیا سویلین خالص امپیریلسٹ تھا۔ غدر سے پہلے کی زیادہ روادار برطانوی روایات اور ہندوستان کی اس دلکش نیٹو تہذیب سے بالکل ناواقف جو غدر کے بعد ہمیشہ کے لئے مٹ گئی۔ ڈیڈیہ نئے سویلین تھے۔ اور ہندوستان کی برطانوی سوسائٹی

کی نئی اور شدید کشش کا سسٹم کے ایک فرد۔ دنیا کی سب سے بڑی سلطنت کے نمایندے اور دنیا کی ارفع ترین ملازمت کے رکن، مغرور، خود دماغ۔ لیکن جو حقیر لکڑ ہاروں کی جانیں بچانے کے لئے اطمینان سے لقمۂ اجل بن گئے۔ انسانی فطرت کے۔ برطانوی کردار کے یہ تضاد ——— !

چارلس بارلو دریچے سے ہٹ آیا۔ بارش شروع ہو چکی تھی۔

شملہ برطانوی دیوتاؤں کا مسکن تھا۔ اضلاع کے کلکٹر اور کمشنر عموماً اپنے اپنے صوبوں کے پہاڑوں پر جاتے تھے، دارجلنگ میں ہماری دلفریب کوٹھی، پہاڑ ہمیں اپنے وطن کے مناظر اپنے وطن کی خوشگوار سردی کی یاد دلاتے تھے۔ ہمارے حسین ہل اسٹیشن، ہمارا پیارا ہندوستان۔

یہ واقعہ ہے کہ ہم سب، ہماری ساری قوم اس ملک کے سحر سے نہیں بچ سکی۔ اس کی گرمی، غلاظت اور گندگی کے باوجود۔

ہماری یہ مخصوص دنیا۔ وطن واپس جا کر بھی جس کی یاد ہمیں ستاتی رہتی ہے۔ یہ مخصوص زبان، جو ہم نیٹوز کے ساتھ استعمال کرتے ہیں، بندوبست، شاباش۔ سب برابر۔ کوب ماکوم ہائے۔ کیپر دار ریوسور۔ شاندہ بوٹ اچا۔ بڑا کھانا۔ بڑا تماشا۔ ایڈورڈ لیئر کی نظمیں ———

بیک وقت نفرت و محبت کا یہ عجیب و غریب رشتہ۔ لارڈ میکالے نے صحیح کہا تھا۔ میں مغربی ہوں، مشرقی نہیں۔ میں بہت زیادہ مشرقیت کبھی اختیار نہیں کر سکتا۔

یہ بھی واقعہ تھا کہ عموماً انگریز سول جول میں مسلمانوں کو ترجیح دیتے تھے، کیونکہ مسلمان ہندوؤں کے مقابلے میں بہت زیادہ مہذب تھا۔ ہندوؤں کو ہمارا یہ ترجیحی سلوک قدرتی بات ہے کہ بہت برا معلوم ہوا۔

اوکسفرڈ میں مسعود علی اور راما ناتھن سے ہندو مسلم سوال پر کتنی لمبی لمبی بحثیں ہوا کرتی تھیں۔

صبح سے تازہ اخبار آئے رکھے ہیں۔ میں نے ابھی تک کچھ نہیں پڑھا۔ سرخیاں دیکھتے ہوئے آج ڈر سا لگ رہا ہے۔ برطانوی ہمت اور بہادری۔

وہ دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔ پائپ جلایا، اب غسل کے لئے جانا چاہیے۔

مسعود آج کل پنجاب میں کلکٹر ہے۔ راما ناتھن مراٹھا کنٹری میں کہیں تعینات ہے۔ دونوں اپنی گفتگوؤں میں ظاہر کرتے تھے کہ برطانوی حکومت سے متنفر ہیں۔ اور دونوں کی شدید تمنا تھی کہ آئی سی ایس میں لے لئے جائیں۔ دونوں اس وقت اس برطانوی حکومت کے ارفع ترین ملازمت کے اراکین ہیں۔ اپنے ہم وطنوں کو خاطر میں نہیں لاتے۔ اور زمین پر قدم نہیں دھرتے۔

آہ ——— ہندوستانی کردار ——— ! ہندوستانی کردار !

مگر وہ انقلابی جو اس حکومت کی بیخ کنی کے درپے رہے ہیں، مجھے وہ بھی مضحکہ خیز لگتے ہیں۔
اصلیت غالباً یہ ہے کہ مجھے صرف اپنے نوکر، بھشتی اور خدمت گار، ریشتے سلام کرتے، مائی باپ، غریب پرور کہتے، کسان اور جاہل اور قابلِ رحم ہندوستانی اچھے لگتے ہیں۔ پچھلے دو تین سو سال میں مراکش سے چین تک اہلِ مشرق کی پسماندگی اور جہالت کا بھرپور تجربہ کر چکنے کے بعد ہم انہیں اپنے جیسا انسان سمجھنے کے لئے غالباً ابھی تیار نہیں۔
جب چارلس بارلو سول سروس میں شامل ہوا اس وقت دہشت پسند تحریک ایک بار پھر زور پکڑ چکی تھی۔ پچھلی صدی کے لبرل مصلحین کے مقابلے میں سامنے آنے والے جوشیلے قوم پرستوں کی "عوامی جدوجہد" کی اپیل نچلے متوسط طبقے، اور بیکار نوجوانوں میں پہنچ چکی تھی۔ سوال یہ ہے کہ ہم نے یہ یونیورسٹیاں کیوں قائم کیں؟ چارلس نے پائپ سلگایا اور پھر دریچے میں جا کھڑا ہوا۔ دہشت پسند قوم پرست اور امن پسند قوم پرست اور یہ اور وہ۔ اس جوالا مکھی پر قابو پاکر اسی سکون کے ساتھ اس برصغیر کا نظم و نسق چلائے جانا سول سروس کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔
اوکسفرڈ سے تازہ تازہ آیا ہوا نوجوان چارلس بارلو انقلابیوں کے پرانے گڑھ باریسال میں جوائنٹ مجسٹریٹ تھا۔
یہ ان لوگوں کا بنگال ہے۔ یہ میرا بنگال بھی تو ہے۔ گرینڈ ڈیڈ اور گرینڈما، ڈیڈ اور مما، آنٹ میبل اور آنٹ ماڈ کا بنگال، مجھے اس سے کتنی محبت ہے، میں اسے تباہ ہونے دوں گا؟ وہ باریسال کلب کے برآمدے میں وہسکی پیتے ہوئے BROOD کرتا۔
اس نے دہشت پسند تحریک کا مطالعہ کیا۔ انقلابیوں کے حالات سے تفصیلی واقفیت حاصل کی۔ ان کی لکھی ہوئی درناکیولر کتابوں کے اہم اقتباسات ترجمہ کروا کے پڑھے۔ (مثلاً سبل شاہجہانپوری کی سوانح حیات جو انہوں نے پھانسی پانے سے تین روز قبل لکھ کر ختم کی تھی) اس نے ذہیش چندر سرکار کی کتاب کا بغور مطالعہ کیا، کہ اوکسفرڈ میں اقتصادیات ہی اس کا مضمون تھا۔ مگر اسقدر مفسدانہ، بالشویک خیالات ان انقلابیوں کے حضور شاذ ہیش چندر سرکار کے تھے، اس نے ہندوستانی نفسیات پر عموماً اور بنگالی نفسیات پر خصوصیت کے ساتھ غور کیا کہ بنگالیوں کی شکتی پوجا کا ان کی تخریب پسندی سے کتنا گہرا نفسیاتی تعلق ہے۔ دراوڑوں، منگولوں اور آریوں سے قبل کے قدیم ترین وحشی قبائل کا خون ان کی رگوں میں جوش مارتا ہے، تو کس آسانی سے مار دھاڑ پر اتر آتے ہیں۔ آدی واسی قبائل کی دیوی ماں کا عقیدہ اب تک ان کے دلوں میں راسخ ہے۔ اسے ان کے بنکم بابو نے کس چالاکی سے "مدر انڈیا" سے مماثل کردیا۔ بندے ماترم — ہا ہا ہا — ماتا خون کی قربانی چاہتی ہے۔ مسلمان کا خون، انگریز کا خون، —— ارے ان چالاک بابوؤں کی سائیکولوجی سے تو ہم واقف ہیں۔ ان کے فلسفی اپنی "روحانیت" اور "اساطیری علامات" کے متعلق ہمیں کیا سمجھا جائیں گے۔
مگر ہماری قوم میں بھی احمقوں کی کمی نہیں۔ وہ اینی بیسنٹ جیسی خبطی ایک مارگریٹ نوبل آئی تھیں، وہ کالی کی پرستار بن گئیں۔ ان کو سسٹر نودیتا بنا کر ان ہندوستانیوں نے جھنڈے پر چڑھا دیا۔ عورتوں کی دراصل صحیح عمر میں شادی ہو جانی چاہیئے۔
ولیکا تشدد سنا ہے بے حد وجیہہ تھا۔ سب یورپین اور امریکن عورتیں اسکی مقناطیسی آنکھوں پر

عاشق ہوتی تھیں۔

اہل ہندوستان (شہر تو) اور اپنی قسمت کے کیا کیا گن نہیں گاتے کہ دیکھو تمہارے جیسے سفید فام بھی ہماری روحانی عظمت کے قائل ہوگئے ـــــ ! ـــــ بے چاروں کا احساس کمتری۔

اس احساس کمتری میں ہم ہی نے انھیں مبتلا کیا۔ بڑھیا سے بڑھیا ہندوستانی انگریز سے دو باتیں کرلینا فخر سمجھتا ہے۔ ہائے کس قدر قابل رحم قوم ہے۔ کس فخر سے کوٹھیوں میں رہتے ہیں۔ چھری کانٹے سے کھاتے ہیں۔ انگریزی بولتے ہیں۔ دنیا کا عظیم ترین، شاہی، کونونیل سماج !

اور پھر پچھلی صدی کے ترہم موسخرے۔ ان کے ہارمونیم اور پیانو۔ ان کی خواتین کی گاؤن نما ساریاں۔ اونچی ایڑی کے جوتے اور موزے۔ ان کے انگلستان کے سفر، ان عورتوں نے پردہ ترک کرکے زنانہ اور پالکی اور حرم کے رومان کا بھی خاتمہ کردیا۔

بے چارہ الف جیم۔

ٹیگور بھی ہماری نقال تہذیب کی پیداوار ہے۔ ہم نہ آئے ہوتے تو نہ رام موہن پیدا ہوتے نہ رابندر ناتھ اسی طرح آپس کے کشت وخون میں اور کئی صدیاں نکل جاتیں۔ آخر دیکھو افغانستان وغیرہ کی کیا حالت ہے۔

بے چارہ اوپری طبقہ کا ہندو۔ پہلے مسلمان حکمرانوں کی نقالی میں لگا رہا۔ اب ہماری تقلید میں جٹا ہے۔

اور دوسری بات یہ ہے کہ سارے ہندوستانی ریاکار ہیں۔ شانتی شانتی رٹتے ہیں مگر تشدد اور بیرحمی ان کی گھٹی میں پڑی ہے۔ مذہبی جنون اور ملکی سیاست کا اس ملک میں ہمیشہ سے گہرا تعلق ہے۔ مسلمانوں سے پہلے شیووں، شاکتوں، برہمنوں، بودھوں، جینیوں میں جنگیں ہوا کیں، جس عہد کا جو راج دھرم تھا اس کے حکمرانوں نے دوسرے فرقوں پر ظلم توڑے۔ اب مسلم پیریڈ پر آیئے۔

"عبدالغفور ـــــ"

ایک منٹ میں عبدالغفور دروازے پر نمودار ہوئے۔

"صاحب"

"کچھ نہیں جاؤ"

عبدالغفور واپس چلے گئے۔

مسلم دور ـــــ ساری مسلم پیریڈ کی تاریخ اس حقیقت کی گواہ ہے کہ سارے مسلمان بادشاہ خود کو فخریہ غازی کہتے تھے۔ اور بت شکن۔ کافروں کو مارو۔ ان گنت مندر گرا کر مسجدیں بنا دیں۔

برطانوی دور کو لیجئے ـــــ سنیاسیوں اور مولویوں کی بغاوتیں، جہاد کے فتوے۔ اور حال میں

رام کرشن مٹھ کے سوامی وویکا نند کے ساتھی اور چیلے جانشے جو بنگال کے اولین دہشت پسندوں میں شامل تھے، انقلابیوں کو اپنے مٹھوں میں پناہ دیتے، خود انڈر گراؤنڈ میں کام کرتے۔ اٹھارویں صدی کے سنیاسیوں کی معنوی اولاد —— تاریخ کس طرح اس ہلاکت خیز ملک میں متواتر اپنے آپ کو دہراتی رہتی ہے۔

اور جو ہندوستانی بم نہیں پھینکتے انھیں تقریریں کرنے کا مرض ہے۔ ساری قوم اس عارضے میں مبتلا ہے۔ کپلنگ کو ۱۸۸۸ء میں پانیر نے الہ آباد سے غلاظت اور تعفن اور بھیانک راتوں کے شہر کلکتے بھیجا۔ وہاں بابو لوگ جنھیں ہم نے لوکل سیلف گورنمنٹ سونپ دی تھی۔ اپنے شہر کی صفائی کے بجائے تقریریں کر رہے تھے۔ میونسپل بورڈ اور بنگال لیجسلیٹو کونسل کے نیٹو ممبرس دھواں دھار تقریریں کر رہے تھے۔ نظریات کے بجائے ان حضرات کو کدال اور پھاوڑے سنبھالنے چاہئیں کپلنگ نے انتہائی نفرت سے کہا تھا۔ یہ بات آج تک صحیح ہے۔

تقریریں کرتے ہیں۔ اور بے حد ذہین ہیں، اس لئے دماغ قانونی موشگافیوں میں بھی خوب چلتا ہے۔ کاکوری ڈکیتی۔ صرف دس نوجوانوں نے چلتی ٹرین روک کر سرکاری خزانہ لوٹ لیا۔ کمال ہے۔ اس کے ملزمین کے دفاع میں موتی لال نہرو کی جرح میں نے خود سنی تھی۔ پٹنہ اور الہ آباد کے یہ سارے طباع قانون داں جو لندن سے قانون پڑھ کر آئے تھے، اور اوکس برج کے تعلیم یافتہ لیڈروں کے مقدمے لڑ رہے تھے۔ یہ ہماری بابرکت امپیریلزم کا نتیجہ ہوا۔

انقلابیوں کے گیت —— "بسے گا ہند پیچھے کو بسے گا انڈمان آگے" نذر الاسلام کے طوفانی گانے، ڈرامے، عوامی ناٹک، گرینڈ ڈیڈ اور اڈورڈ بارلو کا بنگال ان آتشیں آوازوں سے گونج رہا ہے۔

یہ انقلابی واقعی بڑے جری لوگ تھے۔ اپنی تحریک کے قانون کے مطابق صرف تین چھٹانک چاول اور دو چھٹانک چنا ان کو روزانہ پیٹ بھرنے کے لئے ملتا تھا۔ اور حیرت انگیز صعوبتیں اٹھا کر یہ ہم سے لڑ رہے تھے۔ اور یہ بھی واقعہ ہے کہ یہ لوگ انتہائی مذہبی ہونے کے باوجود کمیونل نہیں تھے۔ اشلوک رٹتے اور نمازیں پڑھتے ہوئے دار پر چڑھتے تھے مگر کمیونل بالکل نہیں تھے۔

سوال یہ ہے۔ چارلس بارلو نے پائپ کا گہرا کش لگا کر سر پیچھے ٹکایا کہ آئرش باغیوں نے بھی تو ہمارا ناک میں دم کر دیا تھا۔ ان کو ہم اتنا مجرم نہیں سمجھتے، محض اس لئے کہ وہ گورے تھے؟

ستمبر ۳۹ء میں ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ نافذ کیا گیا کہ یورپ میں ہم ہٹلر کے مقابلے میں بالکل تنہا تھے اور ہندوستان میں بھی باغیوں اور مفسدوں کا مقابلہ کرنا تھا۔ گرینڈ ڈیڈ اور ڈیڈ ضرور خوش ہوں گے کہ میں نے اپنی بساط بھر اس قومی کرائسس کے موقع پر اپنے فرائض ادا کئے —— اپنی حد تک میں نے اپنے اضلاع میں کمیونسٹوں کا قلع قمع کرنے کی کوشش کی۔ بے چارہ پل کینٹ ویل ان کے ایک لیڈر ریحان احمد کو نہ پکڑ سکا اور اسکی

سزا میں اُسے دُور دراز رنگاماٹی تبدیل کر دیا گیا۔
سامراجی رجحان کو میں بھی کبھی نہ پکڑ سکا۔ میں خوش ہوں کہ اب حالات بدل چکے ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ مجھے ان لوگوں کو مجرموں کی
طرح پکڑنا اچھا نہیں لگتا۔ مگر فرض فرض ہے۔
خدا کرے ایلس خیریت سے ہو۔ گاروہلز میں ہمیشہ سے مشنریوں کا اثر ہے۔ مگر کمیونسٹ وہاں بھی زور پکڑ چکے ہیں۔
اور وہاں کے جنگلی کمیونسٹ اور سوشلسٹ کے باریک فرق کو نہ سمجھ سکیں گے۔
بلیا میں باغیوں نے آزاد سرکار قائم کر لی۔ یو۔ پی کی سڑکوں پر لڑکے "ہمارا بادشاہ کون — ؟ ابو الکلام آزاد!" کے
نعرے لگاتے پھر رہے ہیں۔ آسام میں گولیوں کی بارش ہو رہی ہے۔ سبھاش چندر بوس نے رنگون میں بہادر شاہ ظفر کے مزار
پر جا کر قسم کھائی ہے کہ وہ ہندوستان کو آزاد کرا کر دم لیں گے۔

جیزس کرائسٹ!

چارلس بارلو نے زور سے انگڑائی لی۔ بہت جلد کیا میں بھی کرنل بلمپ کی طرح، ایک کردار، ایک "ٹائپ" میں تبدیل
ہو جاؤں گا؟

اوکسفرڈ میں ایسے ہی ایک اتوار کی خاموش صبح دریا کے کنارے ٹہلتے ہوئے حسب معمول انڈو بگر بحث ہو رہی
ہے۔ میں توری نوجوان ہوں، فریڈی کارٹر بالشویک ہے۔ مسعود علی اور راما ناتھن ہندوستانی قوم پرست۔

"ہماری قدیم تہذیب —" راما ناتھن گرج رہا ہے۔
"سر — ؟ آپ کی قدیم تہذیب؟ وہ بھی حکمراں طبقے اور پروہتوں تک محدود تھی۔ اور اشوک کے عہد کی کلچر یا شاہجہاں کے
عہد کی کلچر کی طرح آج کی برٹش یا مغربی کلچر بھی آپ کے مٹھی بھر طبقے تک ہی محدود ہے۔" میں جواب دیتا ہوں۔
"یورپ میں تعلیم عام ہوئی۔ کیونکہ وہ آزاد تھا۔ ہم غلام تھے۔ اس لئے جاہل اور پس ماندہ رہ گئے۔" مسعود علی کہتا ہے۔
"خوب! آپ کا مغل دور تو آزادی کا دور تھا۔ اس وقت اسکول اور یونیورسٹیاں تھیں۔ —؟ ڈیڈ بتاتے تھے کہ جب
گرینڈ ڈیڈ انڈیا پہلی بار گئے اس وقت وہاں ایک چھپی ہوئی کتاب موجود نہیں تھی۔ فریڈی۔ غور سے سنو۔ سارے صوبے میں ایک
چھپی ہوئی کاغذ کی کتاب موجود نہ تھی۔ پروہت لوگ تاڑ کے پتوں پر کچھ لکھ لکھا لیا کرتے تھے۔"
"یہ جہالت فیوڈلزم کی کارستانی تھی۔" بالشویک فریڈی جواب دیتا ہے۔
"بکواس۔" میں بات جاری رکھتا ہوں۔" اور سنو۔ جب کلکتے میں ہم نے کتابیں چھاپنا شروع کیں تو اسٹیمروں پر
لدے ہوئے ہندو طلبہ چلا چلا کر ان کتابوں کا مطالعہ کرتے تھے۔ میکالے نے کہا تھا کہ یورپ کی کسی لائبریری کا ایک شیلف
ہند اور عربستان کے سارے نیٹو لٹریچر پر حاوی ہے۔"
میری کسی ان سنی کر کے راما ناتھن اپنا وظیفہ شروع کر دیتا ہے۔ "انیسویں صدی کے پہلے نصف میں سات فیصد

جس میں پندرہ لاکھ لوگ مرے۔ دوسرے نصف میں چوبیں قحط پڑے، جن میں ایک کروڑ انسان مرے۔" پھر سیاہ فام راما ناتھن بڑی شیرینی سے مسکرا کر مجھ سے پوچھتا ہے۔" ہاں۔ وہ ہندوستان کی یونیورسٹیوں کا کیا ذکر تھا۔؟
کبھی نالندہ اور ٹکسلا کا نام سنا ہے؟" اور اس کے سفید دانت جھلملاتے ہیں۔ گویا بازی جیت لی۔
ہم تینوں ناؤ میں جا بیٹھتے ہیں۔ مسعود علی پتوار سنبھالتا ہے۔
اب راما ناتھن کہہ رہا ہے" اگر تم لوگ نہ آئے ہوتے تب بھی ہندوستان مغربی علوم سے بہرہ ور ہو جاتا۔ ٹیپو سلطان شہید اور راجہ رام موہن رائے دونوں فرانس کے مدّاح تھے۔"
" گاڈ ہل مائٹی۔ ٹیپو صاحب تو سخت انٹی ہندو تھا۔ اب ہمارے مقابلے پر ایک ہیرو کی ضرورت محسوس ہوئی، تم چالاک لوگوں نے اُسے اور سراج الدولہ کو ہیرو بنا لیا۔ دونوں انٹی ہندو تھے۔ معاف کرنا مسعود۔ اولڈ چیپ۔"
" ہماری تاریخ تم لوگوں نے مسخ کی ہے۔" راما ناتھن غراتا ہے۔" ہم نے تمہیں انگریزی زبان کے ذریعے متحد کیا۔" میں جواب دیتا ہوں۔" تم اور مسعود ہمیشہ ایک دوسرے سے انگریزی میں بات کیوں کرتے ہو۔" کنارے پر کھڑی ایک حسین لڑکی ہاتھ ہلاتی ہے۔ وائلٹ! ہم کشتی کھیتے، ہنستے بولتے، کشتی کا رُخ اسکی طرف موڑ لیتے ہیں ــــ وائلٹ جواب میری بیوی ہے ــ
خدا کرے وائلٹ خیریت سے ہو۔
وہ اب آہستہ سے اٹھ کر میز تک گیا۔ اور تصویر دیکھنے لگا۔ ڈارلنگ۔ تم اس وقت نیم تاریک لندن کے کس پب میں کس فوجی کے ساتھ بیٹھی ہوگی۔ بیر کا مگ تمہارے ہاتھ میں بھی ہوگا۔ مگر کس کی معیّت میں؟
یہ حسین عورت مجھ سے تین بار بے وفائی کر چکی ہے۔ آوٹی میں، فلورنس میں، ہرٹ فیلڈ میں۔ دائلیٹ مائی لو تم یہ بھی جانتی ہو میں نے تم سے کتنی بار بے وفائی کی۔
ماڈرن میرج
اور یہ جنگ کا زمانہ ہے۔ اور جنگ میں سب کچھ روا ہے۔ اس محفوظ دامون ہماری زندگی میں اچانک کیسا زلزلہ آگیا۔ جنگ، بغاوت، تباہی۔
ٹام ــ ٹام نو سال کا ہو گیا۔ میرا پیارا بیٹا۔ کیا میں تم سب کو زندہ دیکھ سکوں گا؟
امریکن بہت دلکش ہوتے ہیں۔ برطانوی عورتوں کے لئے۔ وائلٹ تم ہمیشہ سے فلرٹ رہی ہو۔ بلیس یور لٹِل ہارٹ WAC کے یونیفارم میں کتنی بھلی معلوم ہوتی ہے۔ میری بیوی، این شیریڈن کی طرح دلفریب۔
اس وقت کیا کر رہی ہو، ڈارلنگ؟ سینٹ جانسن ووڈ کا کوئی میوز؟ کوئی کنٹری اِن۔ــ یا ہمارے اپنے گھر کا ــ ۱۴۱ اینڈریوز کریسنٹ کا بیڈ روم ــ؟

یہ سب جانتے ہوئے بھی تم پر عاشق ہوں، جانِ من۔ اور تم بھی میری اس کمزوری سے واقف ہو۔
اس نے برگانگ زور سے میز پر پٹخ دیا۔ باہر بارش کا زور بڑھ چکا تھا۔
بنگال کی برسات۔ ملیریا۔ مچھر۔ کیچڑ۔ تعفن۔ طوفان، سانپ، مینڈک۔ اس برسات کے لئے ٹیگور اور سارے بنگالی شاعری کرتے کرتے مرے جاتے ہیں۔
اس وقت میں بے حد اپنے اندر ہو رہا ہوں۔
وائلیٹ۔
لاچار غصے سے پھر میرا خون کھول رہا ہے۔ مجھے اس سے اتنی نفرت ہے۔ اتنا عشق ہے۔ یہ آج تک معلوم نہ تھا۔
کمبخت خط بھی نہیں لکھتی۔ شاید میں اس کے لئے مر چکا ہوں۔ شاید وہ یہ سمجھتی ہے کہ باغیوں نے مجھے بھی قتل کر دیا ہوگا۔
مما۔ آنٹ میٹی
اس نے آنٹ شیلڈا کی تصویر پھر اپنے سامنے رکھی اور سر ہلانے لگا۔
آنٹ میٹی تم نے بھی اتنے دنوں سے خط نہیں لکھا۔ مگر ان کے ہاتھ میں رعشہ ہے۔ ٹھیک سے قلم نہیں پکڑ سکتیں۔
آنٹ میٹی تم ایک زمانے میں کتنی خوبصورت تھیں۔ اپنی یہ پرانی تصویر دیکھو۔
وائلیٹ۔ ایک دن تم بھی بوڑھی ہو جاؤ گی۔ یہ نہ بھولو۔ تم نے آنٹ میٹی کو کسی ہوم میں ڈال دیا۔ تاکہ آزادی سے عیش کرو۔ میں تمہیں کبھی معاف نہ کروں گا۔ میں ہندوستانی ہوں۔ میں سخت دل انگریزوں کی طرح کبھی بوڑھے ماں باپ اور رشتے داروں کو گھر سے نکال کر کسی ہوم میں پھینکنا برداشت نہیں کر سکتا۔
اب اس کے آنسو بہنے شروع ہوئے۔ اب تک وہ کتنی شراب چڑھا چکا تھا۔
خداوندا۔ اگر تو واقعی کہیں موجود ہے، وائلیٹ کو، مام اور کیرل کو، آنٹ میٹی کو، ایلس کو، ان سب کو اپنی حفاظت میں رکھو۔

اولڈ پیپلز ہوم
کسی دن شاید میں بھی، مجھے بھی مام اور اسکی بیوی گھر سے نکال کر اولڈ پیپلز ہوم میں ڈال دیں گے۔ بیچارہ بڈھا جو ہر وقت ہندوستان کے متعلق بڑبڑاتا اور آہیں بھرتا ہے۔ (نرسیں آپس میں کہیں گی)
تم آنٹ میٹی کی طرح مفلوج اور بوڑھی ہو جاؤ گی۔ اور تمہاری بہو تمہیں ہوم میں پھینک دے گی۔
اسی برسات میں، میں نے وائلٹ کے ساتھ اپنی لانچ پر پدما کے کیسے رومانی سفر کئے ہیں۔ اسٹیمر پہ

گفتگو ۱۰۷

ہم ہنی مون کے لئے سندربن گئے تھے۔ اسٹیمر کا کیا نام تھا — ؟ کنگ فشر۔

آج ہماری شادی کو پورے گیارہ سال ہو گئے۔ پارک شائر کی تازہ وارد لڑکی، شروع شروع میں کیسی حیرت سے یہاں کی ہر چیز کو دیکھتی تھی۔

سنہ ۱۹۳۱ء ہماری شادی کا پہلا سال، بارلیسال میں، جہاں میں نے دنیش چندر سرکار کو پکڑوایا۔

میں نے دنیش چندر سرکار کو پکڑوایا۔

میں نے دنیش چندر سرکار کو پکڑوایا۔

میری سروس کا سب سے نمایاں کارنامہ۔

سیاہ آنکھوں والا دلکش، میرا ہم عمر نوجوان، میرے سامنے کٹہرے میں کھڑا تھا۔ ممکن تھا کہ وہ اوکسفرڈ میں میرا ہم جماعت ہوتا، کشتی کھیتے ہوئے مجھ سے بحثیں کرتا۔ مگر وہ کال کوٹھری میں جانے سے قبل میرے سامنے کھڑا تھا۔ مجھے معلوم تھا وہ بڑا جید انٹلیکچول ہے۔ میں اس سے کچھ نہ کہہ سکتا تھا۔

جس روز اسکی اپیل ہائی کورٹ سے مسترد ہوئی مجھے بے حد — کتنا — بیحد دکھ ہوا تھا۔ کیوں؟ وہ بالآخر میری قوم کا جانی دشمن تھا۔ اگر میں نے اسے نہ پکڑا ہوتا تو اس نے مجھے ہلاک کر دیا ہوتا — مجھے اسکی اپیل مسترد ہونے کا بڑا رنج ہوا تھا۔

جس روز علی پور جیل میں اسے پھانسی ہوئی، اسی روز ہمارے یہاں ٹام پیدا ہوا تھا۔

مجھو آیا۔ وائلیٹ کی منہ چڑھی اس سے کہنے لگی۔ میم صاحب۔ ہم ہندو لوگ آواگون میں بلیو کرتا ہے شکر ہے کہ دنیش بابو کی پھانسی کے دو گھنٹے پہلے ٹام بابا پیدا ہوا۔ اگر تھوڑا منٹ بعد پیدا ہوتا تو بہت سا ہندو لوگ بولتا کہ دنیش بابو نے بدلہ لینے کے لئے آپ کے گھر جنم لیا ہے۔

واٹ اے ہورِبل تھوٹ — بیچاری وائلیٹ نے ذرا سا کانپ کر کہا تھا۔

اور یہ واقعہ ہے کہ آیا کی اس عجیب غریب بات کے بعد لاشعوری طور پر میں نے اطمینان کا سانس لیا تھا کہ ٹام دنیش سرکار کی پھانسی سے دو گھنٹے قبل پیدا ہوا — گرائسٹ۔ اس دیوانے دیسی ملک میں رہ کر انسان خود دیوانہ ہو جاتا ہے۔

میں نے دنیش چندر سرکار کو —

اور ایک اور بھیانک خیال۔

جف لنگ کی تباہی ہوئی خبر تازہ ترین خبر ہے۔ وہ تو کل ہی لندن سے یہاں پہنچا ہے۔ اس نے اس انگریز افسر سے ملاقات بھی کی ہے۔

نمبر ۱۴ انڈر ریونڈ کریسنٹ میں ایک امریکن کرنل BILLETED کر دیا گیا ہے۔ اس میں وائلیٹ کا کیا قصور؟

اس امریکن کا نام کرنل ڈونلڈ جوئیل ہے۔ بہت خوبصورت طرحدار جوان ہے۔ میں طرحدار کہاں ہوں، موٹا بھدا اتنی موٹی ناک، وائلیٹ میری جان، میں ہرگز تمہارا مستحق نہیں تھا۔ مگر تم نے بھی تو میرے عہدے سے شادی کی تھی۔

مارچ ۱۹۳۹ء۔ اس پرامن دنیا میں ہم آخر بار برطانیہ گئے تھے۔ کاش وہ بچوں کا داخلہ کرانے کے بعد میرے ساتھ ہی واپس آگئی ہوتی۔

ا۔ ب میں پھر الف جیم کی تلاوت کرتا ہوں۔

وہ آرام کرسی پر لیٹ گیا۔ صدمے، رنج، پچھتاوے، بہت کم ایسا ہوتا ہے جب انسان کو اتنی مہلت ملے کہ وہ یکسوئی سے اپنی ساری زندگی کا جائزہ لے، اپنے اندر جھانکے۔

اب اُسے نیند سی آرہی تھی۔ ماضی محفوظ ہے۔ یادوں کا قبرستان محفوظ ہے۔ اس نے کاہلی سے نغماتِ ہند اٹھائی اور اس کے صفحے پلٹتا رہا۔ نیم وا آنکھیں، ذرا سی کھول کر اونگھتے اونگھتے کتاب کے آخر میں دوسری کتب کے اشتہاروں پر نظر ڈالی۔ ایک شفیق تبسم اس کے ہونٹوں پر بکھرنے لگا۔

"نیل کی کاشت —— ایک پلانٹر کی زندگی کا دلچسپ مرقع۔"

"پُرانے کلکتے کی آوازِ بازگشت" از ڈاکٹر بسٹیڈ۔ سرورق پر بلیک ہول کی تصویر۔

فہرست مضامین:۔ فلپ فرانسس کا دور، نن کومار، فرانسس اور ہیسٹنگز کا ڈوئیل۔ وغیرہ وغیرہ۔

"انگلش ایٹی کیٹ فار انڈین جنٹلمین۔ سوشل اینڈ او فیشل" از:۔ ڈبلو ٹریگو دیب —— بنگال ایجوکیشن ڈپارٹمنٹ۔

"بہار کی پرانی یادیں" ایک پُرانے پلانٹر کے قلم سے۔

"جسٹس اونکول چندر مکرجی آنجہانی" از ایم مکرجی۔ انڈین انگلش یا بابو انگلش کا بے حد مزیدار نمونہ — قارئین سے درخواست ہے کہ اس جنٹلمین کی سوانح حیات جو ان کے بھتیجے نے لکھی ہے، ضرور پڑھ کر تفریح حاصل کریں۔

"آسام میں ایک ٹی پلانٹر کی زندگی" از جارج بارکر۔

"انڈین ریسنگ کی چند یادیں"

"گھوڑے، آدمی اور اسپورٹس"

"سیونی" ست پڑہ پہاڑیوں میں کیمپ لائف۔

"بنگلے کے پیچھے" از "ایہا" مزاحیہ کتاب۔

ابواب :۔ بوائے کو ملازم رکھنا، ڈوگ بوائز۔ مشعلچی، حمال، ہری تدزی، ٹیلر۔"

عبدالغفور ـــــــ ابھی بنگلے کے پیچھے پیرا ٹیلر عبدل زندہ ہے۔ میں محفوظ ہوں، چارلس بارلو نے اونگھنا شروع کر دیا۔ اور پھر کرسی کے ہتھے پر سر رکھ کر سو گیا۔

خاصی بوسیدہ چھتری لگائے، بارش میں بھیگتے ہوئے اس باختہ ریورنڈ بنرجی دُور پھاٹک میں داخل ہو رہے تھے۔ اس وقت دوپہر کا ایک بج چکا تھا۔ اور ڈی ایمز ہاؤس کے برآمدے کے ایک در میں کھڑے عبدالغفور ہیڈ چپراسی سے آہستہ آہستہ کہہ رہے تھے۔

" صاحب چھوٹا حاضری کے بعد سے دروازے بند کئے اسٹڈی میں بیٹھا ہے۔ بیرا بیرا پیٹے چلا جا رہا ہے، اللہ جانے کیا معاملہ ہے۔ شاید ولایت سے میم صاحب کی کوئی خیر خبر نہیں آئی۔"

چپراسی نے متانت سے سر ہلایا، اتنے میں اس کی نظر پادری صاحب پر پڑی جو برساتی میں پہنچ چکے تھے۔

پادری بنرجی نے سیڑھیاں چڑھ کر جلدی جلدی پائیدان پر جوتے رگڑے، اور برآمدے میں آئے، چھتری بند کی تو اس میں سے پانی کی بوندیں فرش پر گریں۔ شفاف فرش خراب ہو گیا۔ اور وہ اور زیادہ گھبرائے۔ اور دہشت زدہ نظروں سے چاروں طرف دیکھا۔ عبدالغفور نے لپک کر چھتری ان کے ہاتھ سے لی، ہیٹ ریک کے کونے میں لٹکا دی اور سلام کیا۔

" صاحب کہاں ہے؟" پادری بنرجی نے ہیبت زدہ آواز میں دریافت کیا۔ عبدالغفور ان کی اس حالت پر متعجب ہوئے۔

" صاحب کتاب والے کمرے میں ہے پادری صاحب۔"

" صاحب کو بولو، مہربانی ہوگی، ایکدم ضروری بات کرنا ہے۔ مہربانی ہوگی۔"

عبدالغفور نے سر ہلایا اور اندر گئے، لائبریری کا دروازہ دھیرے سے کھٹ کھٹایا اور کواڑ آہستہ سے کھول کر کمرے میں داخل ہوئے۔ آرام کرسی کے پاس جا کر ذرا سا کھنکارے۔

چارلس بارلو نے آنکھیں کھولیں۔

" صاحب۔ کالا پادری آیا ہے؟"

"کون؟" چارلس نے ذرا چونک کر آنکھیں ملتے ہوئے پوچھا۔

" کالا پادری۔ بنرجی بابو۔"

"اوہ ـــ کیا کام ہے؟"

" صاحب۔ وہ ایک دم ضروری بات کرنا مانگتا ہے۔ گول کمرے میں بٹھا دوں؟ بے چارہ بہت گھبرایا ہوا دکھتا ہے ـــ"

چارلس نے سر اونچا کیا۔ " ایں — ؟ کیا — ؟ نہیں، ادھر ہی بھیج دو۔"

" ادھر صاحب ؟ " لائبریری صاحب کا بجد ذاتی کمرہ تھا۔

" یس یس، یو ایڈیٹ " چارلس نے گرج کر کہا۔ عبدالغفور کان دبا کر غائب ہو گئے۔ چارلس نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔ سر میں درد، خیالات میں انتشار، دل میں دکھ، کیا کروں، اب اس کالے پادری کی فریادیں سنوں۔ میں کہ ہندوستانیوں کا مائی باپ ہوں، مائی باپ، غریب پرور!

جب اس نے آہٹ پر آنکھیں کھولیں، پادری بنرجی سولا ہیٹ دونوں ہاتھوں میں لئے مسکینی سے کمرے میں داخل ہو رہے تھے —

وہ اٹھ کھڑا ہوا اور خوش خلقی سے مسکرایا اور مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔

"گڈ آفٹر نون مسٹر بارلو۔"

" ہلو۔ پادرے — گڈ آفٹر نون — گڈ ہیونز۔ کیا دوپہر ہو گئی ؟"

پادری بنرجی لجاحت سے مسکرائے، مگر مسکراہٹ نے فوراً ساتھ چھوڑ دیا۔ اب وہ پھر ہیبت زدہ نظر آ رہے تھے —

" کیا بات ہے پادرے آپ پریشان معلوم ہوتے ہیں۔ ڈو ہیو لے ڈرنک، اوہ یو ڈونٹ ڈرنک، ڈو سٹ ڈاؤن پادرے "

" نو، یس، مسٹر بارلو " پادری بنرجی ہکلائے، اور ایک کرسی پر ٹک گئے۔ ہیٹ گود میں رکھ لی۔ کمرے میں چاروں طرف نظر دوڑائی۔ چارلس نے مگ میں بیرانڈیلی۔ مگ اٹھا کر کہا " ٹو ڈکنری — "

پادری بنرجی نے اسی بھونچکے انداز میں سر ہلایا۔ چارلس پھر آرام کرسی پر بیٹھ گیا۔ اب ساری چیزیں دھندلی دھندلی سی معلوم ہو رہی تھیں۔ آئی ایم ڈرنک، میرے سامنے کالا پادری بیٹھا تھا۔ مجھے ہمیشہ یہ حیرت رہی ہے کہ انسان اپنا آبائی مذہب کیسے بدل لیتا ہے۔ اپنی کھال اتار کر دوسری کھال کیسے منڈھ لیتا ہے (مثال کے طور پر اگر میں مسلمان ہو جاؤں۔ ہا ہا ہا) سیاہ سوٹ پہنے، سفید کالر لگائے پال میتھوز بنرجی بھی مضحکہ خیز ہے۔ جس طرح ایڈورڈ بارلو مضحکہ خیز تھے۔ ریحان الدین احمد مضحکہ خیز ہے۔ ہم مضحکہ خیز ہیں، سارا ہندوستان، ساری دنیا، ساری انسانیت، ساری زندگی اتنی مضحکہ خیز ہے کہ اس پر آنسو بہانے چاہئیں۔

" مسٹر بارلو —"

وہ چونکا۔ میں اپنے فرض میں کوتاہی کر رہا ہوں۔ نیٹو پادرے، فریاد لے کر آیا ہے۔ عدل چاہتا ہے۔ ہا ہا ہا

" مسٹر بارلو ؟"

" اوہ جسٹ ون منٹ پادرے " اس نے گھڑی پر نظر ڈالی، اور اٹھ کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا، بھاری بھاری، اونچا

اونچا، جھکا جھکا سا کمرہ عبور کر کے ریڈیو کے پاس گیا اور دھم سے صوفے پر بیٹھ گیا۔ ریڈیو کی سوئی گھمانے لگا۔

"دس از بی، بی، سی لندن" ایک دم آواز گونجی۔

پادری بنرجی چونک پڑے۔

ہزاروں میل پرے۔ ڈوبتی کشتیوں سے معمور سمندروں، گرم صحراؤں میں پھٹتے بموں، جلتے ہوئے یورپ کے اس پار، جلتی ہوئی اوکسفرڈ ڈاسٹرکٹ کے ایک تہہ خانے میں بیٹھا ہوا اناؤنسر ٹایٹ اپ کے ساتھ اپنے ہم قوم چارلس بارلو سے مخاطب تھا۔

دس منٹ تک وہ چارلس بارلو کو بتاتا رہا کہ اتحادی کہاں کہاں فتحمند رہے ہیں۔ اور برطانیہ میں کہاں کہاں بمباری ہوئی ہے۔ پھر ونسٹن چرچل کے تازہ ہمت افزا بیان کے اقتباس کے بعد خبریں ختم ہوئیں۔ گوڈ سیو دی کنگ بجا۔ چارلس بارلو فوراً اٹینشن کھڑا ہو گیا۔ پادری بنرجی بھی کھڑے ہو گئے۔

ریڈیو بند کر کے دائیں ہاتھ کی انگلی پلکوں پر پھیرتے ہوئے چارلس بارلو واپس اپنی کرسی پر آن بیٹھا۔

اب جا کر پادری بنرجی نے کانپتے ہاتھوں سے اخبار جیب سے نکالا۔ اخبار بھی بارش میں بھیگ چکا تھا۔ انھوں نے اُسے ذرا احتیاط سے مسٹر بارلو کے سامنے پیش کیا۔ ایک خبر پر سُرخ نشان لگا تھا۔

چارلس بارلو نے جھک کر خبر پڑھی، تیوری پر بل ڈالا۔ پادری کو دیکھا۔ ہونٹ کاٹے۔

"مجھے بڑا افسوس ہے، پادرے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ کی لڑکی بھی —"

"میں بالکل مجبور اور لاعلم تھا مسٹر بارلو —"

"آپ مجھ سے کیا توقع رکھتے ہیں؟"

"میری بچی —— میری بچی —— گمراہ ہے۔ مسٹر بارلو۔ اُسے بچا لیجئے" پادری نے اس کے سامنے ہاتھ پھیلا دیے۔

وہ جھنجھلا گیا۔ اب اس کا سارا نشہ ہرن ہو گیا تھا، وہ اپنی ذاتی اندرونی دنیا سے واپس آ کر اپنے فرض منصبی پر مستعد ہو چکا تھا۔ "آپ کی لڑکی بالغ اور سمجھ دار ہے، جان بوجھ کر اس غنڈہ گردی میں شامل ہوئی ہے۔ بہت جلد اس رومان پرستی سے اس کا جی بھر جائے گا۔ یا ممکن ہے وہ ساری عمر اسی میں لگی رہے۔ آئیڈیلزم، خدمت قوم، اور خدمت خدا کا جنون انسان کو عجیب غریب طریقوں سے اپنی زندگی تج دینے اور تباہ کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ میری بہن ——" اب اس نے ہاتھ پھیلائے۔ "میری بہن ایلس پچیس سال سے ناگا جنگلوں کی خاک چھانتی پھر رہی ہے۔ اور غالباً بہت مسرور ہے۔ آپ کی بیٹی بھی جیل میں خوش رہے گی۔ اور خود کو مجاہد سمجھے گی۔"

"مسٹر بارلو ——"

"پادرے ـــــ" چارلس نے دفعتہً بیدچڑ کر کہا۔ "اگر یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ رنڈی کے ہتھ گولے نے کسی کی جان لی ہے تو اسے عمر قید ہو گی۔ میں کچھ نہیں کر سکتا۔"

پادری بنرجی کی آنکھوں میں بڑے بڑے آنسو ڈبڈبانے لگے۔ چارلس دوسری طرف دیکھنے لگا۔ یہ شائستہ اشارہ تھا کہ اب ملاقات کا وقت ختم ہوا۔ مگر پادری بنرجی ڈٹے رہے، ایک آخری کوشش اور۔

"مسٹر بارلو۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ مس بارلو آج کل کسی کام سے پٹنہ میں آئی ہوئی ہیں۔ اگر آپ ان کو ٹرنک کال کر دیں، کہ ـــــ کہ وہ جیل کے ہسپتال میں رنڈی کو جا کر دیکھ لیں۔ اور۔ اور ـــ میں نے یہ خط بھی ان کو" انھوں نے جیب سے ایک پرچہ نکال کر چارلس کو تھما دیا، اور ملتجی اور پُر امید نگاہوں سے اُسے دیکھنے لگے۔

چارلس نے پڑھنا شروع کیا۔

"ڈیر سسٹر ان کرائسٹ۔

اس مصیبت کے وقت میں ـــــ"

چپراسی کمرے میں داخل ہوا۔

"یس۔؟" بارلو نے پرچہ پڑھتے پڑھتے سر اٹھا کر پوچھا۔ سنہری اور سُرخ وردی والے چپراسی کے ہاتھ میں چاندی کی پلیٹ تھی۔ جس میں ایک پیلا لفافہ رکھا تھا۔

ہندوستان کے اہلکاروں، چپراسیوں اور سائیسوں کی وردیاں، پگڑیاں اور ٹوپیاں برطانوی حکومت نے پچھلی صدی میں قدیم ہندوستانی امراء و شرفا کی ملبوسات کے نمونے کی بنوائی تھیں۔ گویا کہتے ہوں، دیکھو، جو تمہارا لباس ہے، وہ ہم اپنے نوکروں کو پہنائیں گے۔

چپراسی نے پلیٹ چارلس بارلو کو پیش کی۔ چارلس نے کیبل گرام کھولا۔ اُسے پڑھا۔ اس کا رنگ سفید پڑ گیا۔ ہونٹ ذرا سے لرزے۔ وہ چند لمحوں تک بالکل ساکت بیٹھا رہا۔ پھر کندھے سیدھے کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔ کیبل گرام جیب میں رکھا، اَبرو کے اشارے سے چپراسی سے کہا کہ اُسکی ضرورت نہیں۔ پھر وہ لمبا، گہرا سانس لے کر کھوکھلی لیکن مضبوط آواز میں پادری سے مخاطب ہوا۔ "ایکسکیوز می پادرے۔ میں ابھی آتا ہوں" اور جلدی سے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

پادری بنرجی حیران پریشان بیٹھے رہے۔ مس ایلس بارلو کے نام خط قالین پر گر پڑا تھا۔ اُسے اٹھا کر دوبارہ جیب میں رکھا اور صبر سے چپکے بیٹھ گئے۔

پندرہ منٹ، آدھ گھنٹہ، پینتالیس منٹ، ایک گھنٹہ۔

پورا ایک گھنٹہ گزر گیا، تب پادری بنرجی لائبریری سے باہر نکلے۔ کوٹھی پر ایک دم ہُو کا عالم طاری تھا۔ وہ سیڑھیاں اتر کر شاگرد پیشے کی طرف روانہ ہو گئے۔ جس کے نزدیک سارے ملازم ایک ہجوم کی صورت میں جمع آپس میں کھسر پھسر کر رہے

تھے، عبدالغفور ان کی طرف آئے۔

"کیا بات ہے عبدل۔؟"

"صاحب!" عبدالغفور نے دعیرے سے کہا۔ اور ان کو ساتھ لے کر باغ کی روش پر آ گئے۔ خوبصورت ڈک پونڈ میں بطخیں بڑے سکون سے تیر رہی تھیں۔ دُور مرغی خانے میں ایک مرغی کٹ کٹاتے جا رہی تھی۔ باورچی خانے کی چمنی میں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔

"صاحب" عبدالغفور نے کہا۔ "میم صاحب گزر گئیں"

"گوڈ ہیو مرسی۔ کیسے عبدل؟"

"صاحب بیڈ روم میں بُت بنا بیٹھا ہے۔ ابھی اس نے مجھے آواز دی تھی۔ میں اندر گیا تو آہستہ سے بولا۔ عبدل۔ ہمارا میم صاحب گزر گیا۔ ولایت سے تار آیا ہے۔ جرمن والا بم گرا رہا تھا۔ راکٹ بولتے ہیں، کیا بولتے ہیں"

"وی ٹو راکٹ"

"جی پادری صاحب، وہ بدھ کی رات کو صاحب کے مکان پر گرا۔ مکان جل کے راکھ ہو گیا۔ میم صاحب اندر سو رہی تھی، وہ بھی ——"

"مگر ادھر تو عبدل ایر رئیڈ کا بھونپو بجتا ہے۔ سب لوگ تہ خانوں میں چلا جاتا ہے"

"معلوم نہیں، صاحب نے اتنا ہی بولا۔ اور بولا کہ بابا لوگ لندن سے باہر اسکول کے بورڈنگ میں ہے، اس وجہ سے وہ بچ گیا۔ اور مِسّی مس صاحب بھی بچ گئی۔ اسکو میم صاحب نے بڈھا لوگ کے ہوم میں ڈال دیا تھا۔"

"شکر ہے"

"صاحب نے بولا ہے پادری صاحب سے کہو ہم ابھی آتے ہیں"

"اچھا۔ تھینک یو عبدل"

عبدالغفور واپس چلے گئے۔ پادری بنرجی واپس آ کر لائبریری کے سامنے والے برآمدے میں ٹہلنے لگے۔ بُوٹ کی چاپ سنائی دی۔ چارلس بارلو برآمدے میں نمودار ہوا۔ پادری بنرجی اسکی طرف بڑھے۔

"مسٹر بارلو"

"پادرے بدھ کی رات کو مسز بارلو کا ایر رئیڈ میں انتقال ہو گیا۔"

"اسکی مرضی پوری ہو"

"آئیے بیٹھیے" اُس نے پھول دار گدیوں والی بید کی ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا اور خود دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔

چند منٹ تک خاموشی چھائی رہی۔ باغ میں چڑیاں چہچہا رہی تھیں۔ فطرت اکلاپے بے نیازی سے زندہ رہتی ہے۔

"فرض کیجئے مسٹر بارلو، مسز بارلو ایک بہت بہتر جگہ چلی گئیں؟"

"بہتر جگہ ——— ؟ آپ کو کیسے معلوم۔ اس وثوق سے کس طرح کہتے ہیں؟" چارلس نے جھنجھلا کر کہا "بہتر جگہ صرف یہ دنیا ہے۔ باقی آپ لوگوں کی خام خیالی اور خوش فہمی ہے۔"

پادری ہنرچی خاموش رہے۔

چارلس بارلو تلخی سے ہنسا۔ "ہاہاہا THE LORD IN HIS INFINITE MERCY"

پادری ہنرچی نے آہستہ سے کہا "خدا واقعی بڑا رحیم و کریم ہے۔ میرے بیٹے۔"

"ہاہاہا۔ اس رحیم و کریم نے میرے جوان اور نیک دل باپ کو آدم خور شیر کا نوالہ بنا دیا۔ میری جوان اور معصوم بچی کو چینیوں سے RAPE کروا کے قتل کرا دیا۔ اس رحیم و کریم نے میرے جوان بھائی کے جرمنی کے اندھیرے آسمانوں پر پرخچے اڑا دیے۔ وہ رحیم و کریم اس وقت ساری دنیا کے لاکھوں بے گناہ انسانوں کو طرح طرح کی موت مار رہا ہے۔ وہ رحیم و کریم اسی بنگال میں ہر سال ان گنت بے گناہ اور مصیبت زدہ انسانوں کو طوفانوں اور سیلابوں اور وباؤں کی نذر کرتا ہے۔ اور یاد رہے تمہارا وہ رحیم و کریم خدا ننھے بچوں کو اپاہج اور اندھا کر دیتا ہے۔" وہ ایک دم چپ ہو گیا "سوری پادرے۔"

پادری ہنرچی ذاتی گرانس کے مواقع پر اسرار ربانی سے لاعلم فانی انسانوں کے منہ سے اس قسم کے کلمات کفر سننے کے عادی تھے۔ انھوں نے جیب سے بائیبل نکالی۔ اور تیئسواں لحن پڑھنا شروع کیا کہ تیئسواں لحن جادو کا اثر رکھتا ہے۔

خداوند خدا میرا گڈریا ہے، مجھے کوئی ڈر نہیں وہ مجھے

ہری چراگاہوں میں آرام کرواتا ہے، وہ مجھے خاموش

پانیوں کے کنارے لے جاتا ہے۔

پادری ہنرچی نے کتاب گود میں رکھی اور پڑھنا شروع کیا۔

اور گو میں موت کے سائے کی وادی میں چل رہا ہوں ———

لیکن ان کے ساتھ ساتھ لحن کی تلاوت کرنے کے بجائے چارلس تیوری پر بل ڈالے سر جھکائے جا رہا تھا۔ اور اس کا ذہن کہیں اور تھا۔ پادری ہنرچی نے لحن ختم کر کے بائیبل کے ورق گردانی شروع کی تاکہ کوئی اور سکون بخش حصہ پڑھ کر سنائیں۔ مگر عجیب بات تھی کہ ہر صفحے پر ان کی نظریں بڑی پریشان کن سطروں پر ہی جا پڑتی تھیں۔

اے یعقوب! تم اپنی ان مصیبتوں پر جو آنے والی ہیں روؤ اور واویلا کرو، تمہارا مال بگڑ گیا، تمہاری پوشاکوں کو کیڑا کھا گیا، دیکھو! جن مزدوروں نے تمہارے کھیت کاٹے ان

کی وہ مزدوری جو تم نے دغا کر کے ضبط کر لی تھی چلاتی ہے۔ اور فصل کاٹنے والوں کی فریاد
رب الافواج کے کانوں تک پہنچ گئی۔ دیکھو منصف دروازے پر کھڑا ہے۔

پادری نبرجی نے گردن آگے بڑھا کر ورق پلٹے۔ یوحنا کا مکاشفہ ——

خدا کا بیٹا جسکی آنکھیں آگ کے شعلے کے مانند اور پاؤں
خالص پیتل کے مانند ہیں فرماتا ہے کہ تیرے کاموں اور محنت
اور ایمان اور خدمت اور صبر کو تو جانتا ہوں اور یہ بھی ——

اور آگے ——

اور جب اس نے چھٹی مہر کھولی تو میں نے دیکھا کہ سورج کمبل کی مانند کالا اور سارا چاند خون سا ہو گیا اور تارے انجیر کے درختوں
کے کچے پھلوں کی طرح گر پڑے۔ آسمان اس طرح سرک گیا جس طرح مکتوب لپٹنے سے سرک جاتا ہے۔

پھر آسمانوں پر لڑائی ہوئی اور ——

پھر میں نے شیشے کا سا ایک سمندر دیکھا۔ جس میں آگ ملی ہوئی تھی ——

شہر بابل گر پڑا۔ زمین کے بادشاہ جب اس کے جلنے کا دھواں دیکھیں گے تو اس کے لئے روئیں گے اور دنیا کے سوداگر
اس کے لئے ماتم کریں گے۔ اور سب ناخدا اور مسافر اور ملاح دور کھڑے اپنے سروں پر خاک ڈالیں گے کہ افسوس افسوس وہ بڑا شہر
جسکی دولت سے سمندر کے سب جہاز والے دولت مند ہوئے ——

پھر میں نے آسمان کو کھلا ہوا دیکھا، اور کیا دیکھتا ہوں ایک سفید گھوڑا ہے اور اس پر ایک سوار ہے، وہ خون آلود پوشاک پہنے ہے اور
قوموں کے مارنے کے لئے اس کے منہ سے ایک تیز تلوار نکلتی ہے —— اور ——

پھر میں نے ایک فرشتے کو آفتاب پر کھڑا دیکھا اور اس نے بڑی آواز میں چلا کر آسمان میں اڑنے والے سب پرندوں سے
کہا اور خدا کی بڑی ضیافت میں شریک ہونے کے لئے جمع ہو جاؤ تاکہ تم بادشاہوں کا گوشت اور فوجی سرداروں کا گوشت اور گھوڑوں اور ان کے
سواروں کا گوشت کھاؤ ——

پھر میں نے ایک نئے آسمان اور نئی زمین کو دیکھا، کیونکہ پہلا آسمان اور پہلی زمین جاتی رہی تھی۔ اور سمندر بھی نہ رہا۔
اور روح اور دلہن کہتی ہیں آ، اور سننے والا بھی کہے آ، اور جو پیاسا ہو وہ آئے اور آب حیات لے ——"

پادری نبرجی نے گہرا سانس لے کر نیا عہد نامہ بند کر دیا۔ اور سوچ میں ڈوب گئے۔

تب چارلس کی بھاری آواز نے انہیں چونکایا۔

"پادرے۔ مجھے ایوب کی گریہ وزاری سناؤ"

"بہت اچھا۔ اور آپ بھی صبر ایوب سے سبق لیجئے۔ مسٹر بارلو"

"سبق میں بعد میں لوں گا۔ تم مجھے پہلے اس عبرانی بڈھے کی گریہ وزاری ——"

"خاموش مسٹر بارلو" پادری نے دفعتہً ڈانٹ کر کہا —— "بہت بے ادبی کر لی۔ اب خاموش"

"سوری پادرے"

پادری نے دوبارہ عینک کا کیس کھولا، عینک تبدیل کی، اور جیب سے مداری کی طرح پرانا عہد نامہ نکالا۔

"جستہ جستہ پڑھ کر سناؤں گا، بہت طویل باب ہے ——"

"گو اہیڈ پادرے"

"اور پھر ایوب راکھ میں بیٹھ گیا۔ اور اس کے تین دوست پرسے کو آئے، اور انھوں نے خاک سروں پر ڈالی۔ اور اس کے ساتھ زمین پر بیٹھ رہے۔ اور سات دن اور سات رات زمین پر بیٹھے رہے۔ اور ایوب نے کہا لعنت ہو اس دن پر جب میں پیدا ہوا تھا۔ میرے جسم پر کیڑے رینگ رہے ہیں، میری کھال اکھڑ گئی، میرے دن جلاہے کی ٹکلیوں کی مانند تیز رفتار ہیں۔ میری زندگی ہوا بن گئی۔

"خدا بے گناہوں کے مصائب پر ہنستا ہے اس نے زمین کو ظالموں کے حوالے کر دیا۔ منصفوں کے چہرے چھپا دیئے، میری زندگی تیز رفتار جہاز کی مانند گزر رہی ہے۔ مجھے اپنے غموں سے ڈر لگتا ہے۔

"میں خدا سے کہوں گا کہ تجھے زیب دیتا ہے خداوندا کہ اپنے بندے سے متنفر ہو اور ظالموں کا ساتھ دے؟ کیا تو بھی انسان ہے؟ ڈاکو عیش کر رہے ہیں اور وہ ان کو بڑھاوا دیتا ہے۔ وہ قوموں کو ترقی دیتا ہے اور تباہ کرتا ہے اور پھر ترقی دیتا ہے۔ میری آنکھوں نے یہ سب کچھ دیکھا۔ کانوں نے سنا، اور عقل نے سمجھا۔ اور اب میں خدا سے ذرا منطقی جرح کرنا چاہتا ہوں ——

"ابن حوا کی مختصر زندگی کلفتوں سے پر ہے۔ وہ پھول کی طرح کھلتا ہے اور کٹ کر گر جاتا ہے۔ سائے کی طرح غائب ہو جاتا ہے۔ پانی کی خوشبو کٹے درخت کو از سر نو زندگی بخشتی ہے۔ مگر ابن آدم ایک مرتبہ لیٹ جائے پھر نہیں اٹھتا۔ اے کہ تو، جب تک تیرا طیش زائل نہ ہو، مجھے قبر میں چھپائے گا۔ میں اپنے وقت کا منتظر ہوں۔

"پانی پتھروں کو بہائے جاتا ہے، تو انسان کی امیدوں پر پانی پھیرتا ہے۔ تو اسکی شکل بدل دیتا ہے۔ تو نے مجھے ہلکان، پاش پاش کر دیا۔ میرے چہرے پر جھریاں ڈال دیں۔ مجھے جابروں کے حوالے کر دیا۔ میری باگیں توڑ ڈالیں۔ میرا چہرہ روتے روتے بد ہیبت ہو چکا ہے۔ میری پلکوں پر موت کا سایہ لرزاں ہے۔ اے زمین میرا خون نہ چھپا۔ میری شنوائی نہ کر، میری قبریں میرے لئے تیار ہیں۔ میری آنکھیں وفور غم سے دھندلا گئیں۔ مجھے تم سب میں ایک دانشمند نظر نہیں آتا۔ میرے مقاصد کا خاتمہ ہوا۔ میرے خیالات تک ٹوٹ کر بکھر گئے۔ قبر میرا مکان ہے۔ میں نے اپنا بستر اندھیرے میں بچھایا ہے۔ میں نے جسم کی گلن سے کہا تم میرے باپ ہو، کیڑوں سے کہا تم میری ماں اور بہنیں ——

"جانو کہ خدا نے مجھے اپنے جال میں گرفتار کیا۔ میری راہ میں روڑے اٹکائے، اور اندھیرا پھیلایا۔ اس کے لشکر نے میرے معبد کو گھیر لیا۔ میرے بھائی اور میرے عزیز اور میرے دوست مجھے بھول گئے۔ میں اپنی بی بی کے لئے اجنبی ہوں، دوستو

مجھ پر ترس کھاؤ کہ میں تہار و جبار کے ہاتھ نے مجھے چھو لیا ہے۔

"میں انسان کا ساکن نہیں۔ لیکن اشقیا بربط اور ارغنون بجاتے ہیں جبکہ میں آگے بڑھتا ہوں تو مجھے خدا نہیں ملتا پیچھے دیکھتا ہوں تو بھی نظر نہیں آتا۔ میں اس حاضر و ناظر کی موجودگی سے مضطرب ہوں، مجھے اس سے ڈر لگ رہا ہے۔ اس نے میرا دل گداز کر دیا ہے۔

"اہل ثروت حاجت مندوں کو اپنے راستے سے ہٹا دیتے ہیں۔ مفلس سردی میں ٹھٹھرتے ہیں۔ کوہستانی بارش میں کانپ رہے ہیں۔ چٹانوں میں پناہ گزیں ہیں۔ امراء ان بھوکوں کا اناج چھینتے ہیں، جنھوں نے ان کے لئے کولہو چلائے، جوان کے لئے شراب کشید کرکے خود پیاسے رہتے ہیں۔ جو شہر پناہ سے باہر کراہتے ہیں۔

"میں نے خیر کی آرزو کی اور مجھے شر ملا۔ روشنی کا منتظر رہا اور تاریکی پائی۔

"جب وہ رب کریم میرے شامل حال تھا اور میری اولاد میرے ساتھ تھی، جب میں اپنی سیڑھیاں مکھن سے دھوتا تھا۔ میں شہر میں نکلتا تھا۔ تو نوجوان مجھے دیکھ کر چھپ جاتے۔ بوڑھے تعظیماً اٹھ کھڑے ہوتے تھے، شہزادے بات کرتے کرتے خاموش ہو جاتے تھے کیونکہ میں غرباء کا حامی و نگہبان تھا۔ میری جڑیں ندی کنارے پھیلی تھیں۔ میری شاخ پر شبنم گرتی تھی، میری عظمت و شوکت تر و تازہ تھی لیکن اب نوجوان جن کے باپوں کو میں اپنے گلے کے کتوں کے ساتھ بھی نہ بٹھاتا، میری تضحیک کرتے ہیں۔ اور آندھی کی مانند مجھ پر حملہ آور ہیں۔ اور تب میں نے اٹھ کر مجمع سے کہا۔ میں اژدھے کا بھائی اور اُلّو کا ساتھی ہوں۔ میری کھال جل گئی، میرا بربط رو رہا ہے۔ کیا خدا میری حالت نہیں دیکھتا۔ کاش وہ میری فریاد سنے، کاش میرے دشمن ایک کتاب لکھیں جسے میں اپنے کندھوں پر رکھوں اور تاج کی طرح پہنوں۔ اگر میری زمین میری وجہ سے نالہ کناں ہیں، تو کاش گیہوں کے بجائے گوکھرو اور جَو کے بجائے گھاس پھونس ان پر اگیں ——

ایوبؑ کے الفاظ ختم ہوئے۔

"تب بگولے میں سے خداوند عالم نے ایوبؑ کو جواب دیا ——"

پادری نے بائبل بند کر دی، چارلس کرسی کی پشت سے سر ٹکائے آنکھیں بند کئے بیٹھا تھا۔ اس نے چونک کر پادری کو دیکھا ——

"ان تینوں دانش مند دوستوں کے نام کیا تھے جو ایوبؑ کو سمجھانے آئے تھے؟"

"الی فو۔ بل داد، اور ایلی فاز۔" پادری نے جواب دیا۔

"الی فو، بل داد اور ایلی فاز" چارلس نے ذرا اکتائی ہوئی آواز میں دہرایا۔ اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔ اس کا ذہن کہیں اور بھٹک رہا تھا۔ کیونکہ وہ بہت دیر سے سوچ رہا تھا —— کرنل جوئیل جو مکان میں مقیم تھا وہ بھی اسی رات ان شعلوں میں بھسم ہوا، تم بھی اس کے ساتھ جل کر کوئلہ ہوئیں۔ تمہارا خوب صورت جسم کوئلہ بنا۔ تم مرتے وقت بھی مجھ سے بے وفا تھیں۔ افسوس افسوس، افسوس ——

اس نے میز پر سے نیا عہد نامہ اٹھایا اور صفحے الٹنے لگا۔ اُسے بھی "یوحنا کے مکاشفے" نے متوجہ کیا۔ اور سب سے پہلے اسکی نظر پڑی — "اور پھر جب میں نے نگاہ کی تو آسمان کے بیچ میں ایک عقاب کو اڑتے دیکھا۔ اور بڑی آواز سے کہتے سنا کہ ان تین فرشتوں کے نرسنگوں کی آوازوں کے سبب سے جن کا پھونکنا ابھی باقی ہے زمین کے رہنے والوں پر افسوس افسوس' افسوس —

"اور ان سات فرشتوں میں سے جن کے پاس سات پیالے تھے' ایک نے مجھ سے کہا آ میں تجھے اس بڑی کسبی کی سزا دکھاؤں جو بہت سے پانیوں پر بیٹھی ہے —"

چارلس بارلو نے زور سے کتاب بند کر لی۔ یہ سطور بابل کے متعلق ہیں۔ لندن کے متعلق نہیں — دائلیٹ بارلو — مرحومہ — کے متعلق بھی نہیں۔ بابل — بابل — بابل — اب میں بیمار پڑ جاؤں گا۔ اب مجھے حاضری کھانا چاہیے۔ اب مجھے —

کاویری کے کنارے اجاڑ بنگلہ — پمپا کے کنارے اجاڑ بنگلہ — اجاڑ — "عبدل" اس نے زور سے آواز دی۔

عبدالغفور اچانک سامنے آن موجود ہوئے۔ وہ بے حد ملول اور پریشان نظر آرہے تھے۔ "صاحب چل کر تھوڑا سا حاضری کھا لیجئے۔ اب تین بج رہا ہے۔"

چارلس بارلو نے انتہائی تشکر نگاہوں سے اولڈ عبدل کو دیکھا۔ "اچھا۔ تھینک یو عبدل — پادرے میرے ساتھ لنچ کھا کر جاؤ۔"

"تھینک یو' مسٹر بارلو۔"

وہ دونوں کھانے کے کمرے میں گئے۔ میز پر بیٹھ کر پادری نے گریس پڑھی۔ سوپ کے بعد عبدالغفور نے باقی کورس خاموشی سے سرو کئے۔ اسی خاموشی سے کھانا ختم کر کے چارلس اور پادری باہر نکلے۔

"پادرے۔ میں ایلس کو آج ہی پہنچہ ٹرنک کال کر دوں گا کہ وہ روزی کی خیریت معلوم کر لیں، مگر افسوس ہے کہ میں رہائی کی کوشش نہیں کر سکتا۔ ہاں اگر وہ معافی مانگ لے۔"

"وہ معافی نہیں مانگے گی۔"

"تو پھر میں بھی کچھ نہیں کر سکتا' پادرے۔" چارلس نے پادری کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "خدا حافظ پادرے۔"

"خدا حافظ' گوڈ بلیس یو' مسٹر بارلو۔"

چارلس بارلو اندر چلا گیا۔ پادری بنرجی نے ہیٹ ریک میں سے چھتری اٹھائی۔ اب ان کے قدم من من بھر کے ہو چکے تھے۔ اب ان کو معلوم تھا کہ روزی کی قسمت میں بہت طویل قید ہے — عمر قید —

وہ سر جھکائے جوں کی چال چلتے برساتی سے باہر نکلے اور پھاٹک تک اس طرح پہنچے جیسے کسی جنازے کے ساتھ جا رہے ہوں — پھاٹک پر کھڑے ہو کر انھوں نے آسمان کو دیکھا۔ پھر سوچا اب کدھر جاؤں۔ بارش بہت دیر سے تھمی ہوئی تھی۔ وہ پھاٹک سے باہر آ کر ایک طرف کو چند قدم چلے' پھر تذبذب کے عالم میں ٹھٹھک گئے' پھر چلنے لگے۔

(مسلسل) ______________

۱۵ اگست ۱۹۶۸ء

خاندانی منصوبہ بندی کے تحت رعایتیں ختم

۱۔ ایسے خاندان جن کے تین یا تین سے زائد بچے بقید حیات ہیں، اگر ان کے ہاں ۱۵ اگست ۱۹۶۸ء کے بعد ایک اور بچہ پیدا ہوا تو ان کو سرکار سے ملنے والی رعایتیں اور فوائد تاریخ مذکور سے مسدود ہو جائیں گے۔

اپنے خاندان کے ارکان کی تعداد محدود کرنے کے لئے قریب میں واقع خاندانی منصوبہ بندی کلینک سے رجوع کریں۔

براہ کرم دیر نہ کیجئے

۲۔ چھوٹا خاندان کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے خاندان کو زیادہ سہولتیں میسر ہوں۔ بڑا خاندان آپ کے لئے اور قوم کے لئے ایک بوجھ ہے۔

براہ کرم اپنے خاندان کی منصوبہ بندی کر کے آپ اپنی اور مادر وطن کی مدد کیجئے۔

اگر آپ کے تین یا تین سے زائد بچے زندہ ہیں تو خاندانی منصوبہ بندی کے لئے مانع حمل آپریشن (اسٹرلائزیشن) ایک واحد اور بہترین طریقہ ہے۔

چھوٹا خاندان

ا۔ آپ کی غربت کم کر کے آپ کو خوش حال بنائے گا۔

ب۔ آپ کے خاندان کو ہر طرح سے راحت و سکون دے گا۔

ج۔ ماں کو کئی فکروں سے نجات دے گا۔

د۔ تینوں بچوں کو صحت مند رکھے گا اور ان کا مستقبل بہتر بنائے گا

اس لئے آپ مزید آج ہی سے چھوٹے خاندان کا نصب العین اختیار کر کے قوم کی خدمت کیجئے۔

دو بچے
یقیناً تین بچوں سے بہتر ہیں

ڈائرکٹر آف پبلسٹی
حکومت مہاراشٹر، بمبئی

تین نظمیں

ابن مریم

● —— کیفی اعظمی

التجائے شجر

● —— حسن نعیم

شہرِ ہوس

● —— وحید اختر

کیفی اعظمی

ابنِ مریم

تم خدا ہو، خدا کے بیٹے ہو
یا فقط امن کے پیمبر ہو
یا کسی کا حسیں تخیّل ہو
جو بھی ہو مجھ کو اچھے لگتے ہو
— مجھ کو سچے لگتے ہو

اس ستارے میں جس میں صدیوں کے
جھوٹ اور کذب کا اندھیرا ہے
اس ستارے میں جسکو ہر رخ سے
رینگتی سرحدوں نے گھیرا ہے
اس ستارے میں جس کی آبادی
امن بوتی ہے جنگ کاٹتی ہے
رات پیتی ہے نور مکھڑوں کا
صبح سینوں کا خون چاٹتی ہے
تم نہ ہوتے تو جانے کیا ہوتا

تم نہ ہوتے تو اس ستارے میں
دیوتا، راکھشس، غلام امام
پارسا، رند، راہبر، رہزن
برہمن، شیخ، پادری، بھکشو
ناتواں، سُورما، امیر، غریب
سبھی ہوتے، مگر ہمارے لئے
کون چڑھتا خوشی سے سُولی پر

جھونپڑوں میں گھرا یہ ویرانہ
مچھلیاں دن کو سوکھتی ہیں جہاں
بلیاں دُور بیٹھی رہتی ہیں
اور خارش زدہ سے کچھ کتے
لیٹے رہتے ہیں بے نیازانہ
دُم مڑورے کہ کوئی سر کچلے
کاٹنا کیا، وہ بھونکتے بھی نہیں

اور جب وہ دہکتا انگارہ
چھن سے ساگر میں ڈوب جاتا ہے
تیرگی اوڑھ لیتی ہے دُنیا
کشتیاں کچھ کنارے آتی ہیں
بھنگ، گانجہ، چرس، شراب، افیون

جو بھی لائیں، جہاں سے بھی لائیں
دوڑتے ہیں اِدھر سے کچھ سائے
اور سب کچھ اُتار لاتے ہیں
گاڑی جاتی ہے عدل کی میزان
جس کا حصّہ، اُسی کو ملتا ہے
یہاں خطرہ نہیں خیانت کا
تم یہاں کیوں کھڑے ہو مدّت سے

یہ تمھاری تھکی تھکی بھیڑیں
رات جنکو زمیں کے سینے پر
صبح ہوتے اُنڈیل دیتی ہے
منڈیوں، دفتروں، ملوں کی طرف
ہانک دیتی، دھکیل دیتی ہے
راستے میں یہ رُک نہیں سکتیں
سامنے آ کے جھک نہیں سکتیں
اِن سے تم کیا توقع رکھتے ہو
بھیڑیا اِن کے ساتھ چلتا ہے
تکتے رہتے ہو اُس سڑک کی طرف
دفن جس میں کئی کہانیاں ہیں
دفن جس میں کئی جوانیاں ہیں
جس پہ اک ساتھ بھاگی پھرتی ہیں

خالی جیبیں بھی، اور تجوریاں بھی
جانے کس کا ہے انتظار تمھیں

مجھ کو دیکھو کہ میں وہی تو ہوں
جس کو کوڑوں کی چھاؤں میں دُنیا
بیچتی بھی، خریدتی بھی تھی

مجھ کو دیکھو کہ میں وہی تو ہوں
جس کو کھیتوں سے ایسے باندھا تھا
جیسے میں اُن کا ایک حصّہ تھا
کھیت بکتے، تو میں بھی بِکتا تھا

مجھ کو دیکھو کہ میں وہی تو ہوں
کچھ مشینیں بنائیں جب میں نے
اِن مشینوں کے مالکوں نے مجھے
بے جھجک اُن میں ایسے جھونک دیا
جیسے میں کچھ نہیں ہوں، ایندھن ہوں

مجھ کو دیکھو کہ میں تھکا ہارا
پھر رہا ہوں یُگوں سے آوارہ
تم یہاں سے ہٹو تو آج کی رات

سو رہوں میں اسی چبوترے پر
تم یہاں سے ہٹو، خدا کے لئے
جاؤ وہ ویت نام کے جنگل
اُس کے مصلوب شہر، زخمی گاؤں
جن کو انجیل پڑھنے والوں نے
رَوند ڈالا ہے، پھونک ڈالا ہے

جاؤ اک بار پھر ہمارے لئے
تم کو چڑھنا پڑے گا سُولی پر

حسن نعیم

التجائے شہر

ہر طرف بے تاب موجیں دجبر کی پیغام بر
اپنے حلقے میں لئے ہیں خطۂ معصوم کو
آستانِ جستجو کو،
کعبۂ طوفان کو
ساحلوں پر یوں کھڑے ہیں ہاتھ باندھے کچھ شجر
جیسے وہ محوِ دعا ہوں
صاحبانِ التجا ہوں
"اے خدائے عزّ وجل!
کم سے کم دو گز زمیں تو نرغۂ آفات سے محفوظ ہو
جن صحیفوں میں تری آیاتِ حق اُتری ہیں اُن کو
اس جزیرے کی حدوں سے دور رکھ
ہم کو بحرِ پیسیفک میں،
یونہی تنہا زیست کرنے کی اجازت دے،
طلب دے
آدمی تو اشرف المخلوق ہے
اِس جہانِ آب و گِل کا والی و مخدوم ہے
اِس کے ہر فردِ عمل سے تیری قدرت آشکار
اِس کے سارے جرم تیری رحمتوں کے باب ہیں
اس کی زد میں بحر و بر کیا؟ مہر و مہ کیا!
تیری ساری مملکت ہے،
عرش ہے،
جن رسولوں نے دیا پیغام تیرا کو بہ کو
جن ولیوں، پادریوں نے کیا معروف تجھ کو چار سُو

جن شہنشاہوں نے اپنے زورِ بازو سے تجھے غالب کیا
جن فقیروں، صوفیوں، رشیوں نے تجھ کو بادشاہِ دل کیا
جن شہیدوں، غازیوں نے خوں کا نذرانہ دیا۔
ان سبھوں کو روح دے کر، جمع کر کے
ایشیا کے ایک ویرانے میں چل
دیکھ انساں نے
درختوں، آبشاروں، کشت زاروں، کوہساروں سے کیا ہے کیا سلوک ؟
کس خطا میں لُٹ گیا ہے سارے جنگل کا سہاگ
کتنی شاخیں سرنگوں ہیں
کتنے پتے بے زباں
کتنی کلیاں بے نوا ہیں
کتنے طائر بے وطن،
آبشاروں میں وہ سرخی ہے
کہ گم ہیں اُن کے سارے آئینے،
دفن ہیں کھیتوں میں لاشیں
سو رہی ہیں خاک و خوں میں دھان کی سب بالیاں،
گلستاں کے پھول پھل
سوختہ دل وادیاں ہیں
سر برہنہ کوہسار

آدمی تو اشرف المخلوق ہے
جو بھی اس کے جی میں آئے سو کرے
ہم نہایت پست ہیں
مجبور ہیں
پھر بھی حق کی بات کہنے میں تامل کیا،
جھجک کیا!
اپنے آب و جد ہزاروں سال سے صحرا نشیں ہیں،
مونسِ کوہ و دمن ہیں
جنگلوں کی آبرو ہیں،
زینتِ صحنِ چمن ہیں،

ہم یہ جو بستی ہو لیکن آدمی کے دوست ہیں،
پوچھتے ہیں ہم کہ رب العالمین
کیا کبھی ایسا ہوا کہ ایک خطّے کے درندوں نے
(پیے تسخیر و زعم فضل میں)
تجربوں سے مشوروں سے لیس ہو کر
اپنے ہی ہم نسل پر باضابطہ حملہ کیا؟
اپنے جنگل کی روایت کا علم اونچا کیا؟
کیا کبھی ایسا ہوا کہ شرق کی مرغابیوں نے
غرب کی مرغابیوں پر ناروا شب خوں کیا،
اپنے ہم نسلوں کے خوں سے اپنا دامن تر کیا؟
تجھ کو جس تخلیق پر ہے ناز اس نے
اپنے اپنے خاکداں کے فلسفوں کی آڑ میں
تیرے سب پیغام کو جھوٹا کیا،
ننگا کیا،

آدمی تو اشرف المخلوق ہے
ہم نہایت پست ہیں
تخلیق کا حرفِ زبوں ہیں،
ہیچ ہیں،
پھر بھی تیری مملکت کے فرد ہیں
ہم کو انساں سے بچا،
اس کے تو ہم سے بچا
کم سے کم دو گز زمیں تو اس بلائے ارض سے محفوظ ہو،
کیا پتہ ہے کل یہیں آئیں مہاجر بن کے حضرت جبرئیل،
کیا پتہ ہے کل تجھی کو جان کے لالے پڑیں
اے خدائے عزّ و جل — عالم پناہ"

نیویارک۔ جنوری ۱۹۶۸ء

وحید اختر

شہرِ ہوس کی شہید صدائیں

(۱)

حصارِ شہرِ ہوس زمیں میں گڑے ہوئے پنجے گڑا ہوا ہے
یہ اپنے باہر سے تو شکستہ پرانی اینٹوں کا سلسلہ ہے
جو دیکھو اندر کی سمت سے تو چمکتی دھاتوں کا قلعہ سا ہے
سیہ، روپہلی، سنہری دھاتوں کی تہہ پہ تہہ جگمگا رہی ہے
فصیل انمول پتھروں کے چمکتے دنداں دکھا دکھا کر لبھا رہی ہے
کہیں تو یاقوتی ہونٹ چھلکا ہوا تبسم چھپا رہے ہیں
کہیں نگاہیں ہنسی کا پگھلا ہوا ترنم لٹا رہی ہیں
ہزار شیوہ حسین بن کر ہر ایک ذرّہ بلا رہا ہے
ادا و غمزہ کے تیر سونے کے ترکشوں سے نکل رہے ہیں
دماغ مسحور ہو رہا ہے، نظر پہ جادو سے چل رہے ہیں

حصارِ کہنہ کے ساتھ آؤ
جدھر چلے یہ، اُدھر چلیں ہم
جہاں مُڑے یہ، وہاں مُڑیں ہم

زمیں سے کہہ دو طناب کھینچے
فصیل کو حکم دو، وہ دوڑے
مکان اپنی حدود توڑے
زمانہ پیچھے کی سمت بھاگے
حصارِ شہرِ ہوس کی تاریخ اپنے سینے کے راز کھولے
شکستہ اینٹیں، پرانا گارا، زر و جواہر کا یہ ملمع اتار پھینکے

●

یہاں یہ شق ہے حصارِ کہنہ کا سرد سینہ
ملمع اترا ہوا پڑا ہے
شکستہ اینٹوں، پرانے گارے کا بخیہ بخیہ ادھڑ گیا ہے
زمیں کی پرتیں الٹ گئی ہیں
تہیں زمانے کی کٹ گئی ہیں
فصیل کی تہہ میں ہیں فصیلیں
پرانی اینٹوں کے نیچے اُن سے پرانی اینٹیں جمی ہوئی ہیں
قدیم شہروں کا سلسلہ ہے کہ جن کو سیلِ زماں کبھی کا الٹ چکا تھا
حوادثِ دہر کا بیمانہ ہاتھ جن کو پلٹ چکا تھا
تغیراتِ ہوائے دوراں
زمیں کے بے رحم اندرونی جھٹکے
پگھلتا آتش فشاں کا لاوا
سمندروں کی تباہ کار و بلند موجیں
گرجتے طوفانِ برق و باراں
سبھوں نے مل کر پرانے شہروں پہ یورشیں کیں
جلو میں ان کے ہوس پرست آدمی کا سیلاب بے اماں بھی چلا کیا ہے
کروڑوں قدموں سے چل کے شہروں کے روندنے کو بڑھا کیا ہے
نئے ہوس راں قدیم اہلِ ہوس پہ بھاری ہوا کئے ہیں

●

ہوس نے اک اقلیم کو جب بھی اُجاڑ ڈالا
تڑاٹے کی قوتِ نمو نے ہوس کا تازہ نگر بسایا
ہوس کے شعلے فرس سواروں کے دل سے بھڑکے تو شہر جل کر کھنڈر ہوئے ہیں
ہوس کے شعلے بجھے تو جبر و ستم نے پھر اک نیا حصارِ ہوس بنایا۔

●

غلام بھوک شکم کی بیٹری پہن کے آئے
خود اپنی سانسوں کے طوق گردن میں ڈال کر سر جھکائے آئے
طلب نے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈال دی لپک کر
ضرورتوں کی اٹوٹ زنجیرِ آہنی نے جھپٹ کے باندھا
اور ان کے ہونٹوں پہ فاتحوں کی ہوس نے مُہرِ دوام کردی
جبین کو داغا
نظر کی سیدھی کڑی کمان کو مروڑ ڈالا
اور ان کی رُوحوں کو زہرِ احساسِ بے بسی میں ڈبوئے رکھا
دلوں سے دھڑکن کے گیت چھینے
دماغ میں جو شرارِ افکار بچ رہے تھے، اُنھیں بجھایا

غُلام یونان و مصر و ایراں کی مملکت کے حصار و سقف و ستوں کی اینٹیں بنے ہوئے ہیں
غلام کاندھوں پہ ہند و روما کی سلطنت کے عظیم ایوان لدے ہوئے ہیں
غُلام کا ہے نہ کوئی مذہب، نہ کوئی ملت، نہ کوئی نسل اور نہ کوئی رنگت
غُلام کو قول و فعل و رُوح و ضمیر کچھ بھی نہیں میتسر
غلام عضلات و استخواں کی مشین رقصاں
غُلام اعصابِ آہنی سے بنی ہوئی دھات کا ہے پیکر
غُلام دُرّوں کی تیغ کانٹے بھری زباں کے کڑے اشاروں پہ ناچتا ہے
غلام شمشیر و سنگ و آتش کے اندھے فرمان مانتا ہے
غُلام طاقت کے آگے جھکتا ہے، زر کے سکّوں کو پوجتا ہے
غُلام ایوان و تخت و منبر کے حکم ہی کو خدا کا پیغام جانتا ہے

یہ سارے شہرِ ہوس غلاموں سے بس چکے ہیں
حصارِ شہرِ ہوس کی خندق انہی غلاموں کے خون سے اب بھی چھلک رہی ہے
فصیل کی یہ پرانی اینٹیں انہی غلاموں کی ہڈیاں ہیں
پرانا گارا انہی غلاموں کے جسم و عضلات سے بنا ہے
فصیل کے روزنوں میں اب بھی انہی غلاموں کی سرد آنکھیں چمک رہی ہیں
انہی غلاموں کے شوقِ زر سے طلائی برجیں دمک رہی ہیں۔

●

حصارِ شہرِ ہوس کی تہہ میں دبے پڑے ہیں تمدّنِ زرگرانِ کہنہ
موہنجوداڑو، اسیریا، نینوا، عکاد و کریٹ و بابل دبے پڑے ہیں
فراعنہ پتھروں کے روضوں میں اپنا سارا زر و جواہر لئے گڑے ہیں
زماں کے ساحر نے سحر پھونکا کچھ اس طرح سے
کہ قاہروں کے تمام لشکر نئی فصیلوں کے نیچے دھنستے چلے گئے ہیں
تمام قاروں خزانہ اپنا اٹھائے سر پہ زمیں کی تاریکیوں کے اندر اتر گئے ہیں
وہ فوج در فوج امڈتے انساں زمین جن کے قدم کے نیچے لرز رہی تھی
زمیں کا فضلہ بنے ہوئے ہیں
زمانِ رقصاں، زمینِ گرداں کے دونوں پاٹوں میں پس کے سُرمہ بنے ہوئے ہیں
حوادثِ دہرِ بے اماں کے دہن کا لقمہ بنے ہوئے ہیں

●

حصارِ شہرِ ہوس کی برجیں
ہزاروں صدیوں سے بطنِ نسیاں میں سو رہی تھیں
جہاں سے شق ہے فصیلِ کہنہ
وہاں کی مٹی میں اپنا سونا سمو رہی تھیں
ہوس کے تیشوں نے بھولے بسرے ہوئے زمانوں کو پھر جگایا
ہزاروں انساں فصیلِ ماضی کی تہہ میں تیشے چلا رہے ہیں
زر و جواہر میں غرق لاشوں کے سرد تابوت اٹھا رہے ہیں
[illegible] کے سب دفینے

موئنجو داڑو، اسیریا، نینوا و بابل کے سرد سینوں کے سب خزینے
زمیں پھر سے اُگل رہی ہے
زمانِ رفتہ کے لعل و گوہر زمانِ موجود کی دکانوں میں سج رہے ہیں
ہوس کے قیدی تو سنگ و آہن میں ڈھل چکے ہیں
ہوس ہے زندہ

۲

ہمالیہ کی ترائی سے اک نگاہِ حق بیں نے صاف دیکھا
حصارِ شہرِ ہوس کے اندر
نقابِ عشرت میں غم کا چہرہ چھپا ہوا ہے
زر و گہر کے خزینہ داروں کے دل میں دہشت کا ناگ بیٹھا ہے پھن اُٹھائے
نہالِ عمرِ رواں کے برگ و گل و ثمر میں ہزاروں امراض کا دفینہ
ضعیف کاندھوں پہ حاملِ زندگی کا بارِ گراں دھرا ہے
حصارِ شہرِ ہوس کی خوشیاں ہیں غم چشیدہ
حریر و دیبا و تخت والوں کی نعمتیں ہیں ستم چشیدہ

وہ عقلِ انساں ضمیرِ انسانیت تھا، بولا
"کہ سب سے پہلی اٹل صداقت یہ حرفِ غم ہے
بنائے شہرِ ہوس بھی غم ہے، حصار بھی غم، مآل بھی غم
جو غم سے دکھ سے نجات چاہے، ہوس کو سینے سے نوچ پھینکے
ہوس سے آزاد ہے جو سینہ، وہی مسرت کا ہے خزینہ
پروہتوں کی کرشمہ سازی صداقتوں کی امیں بن کر لہو صداقت کا پی رہی ہے
نقابِ عرفان و علم پہنے غرورِ جہل و سیاہ کاری پنپ رہا ہے
جفا و ظلم و دغا کے ہاتھوں میں عدل کی ہے سنہری میزان
حصارِ زر نے غلام و آقا میں بانٹ رکھا ہے آدمی کو
غلام کا ہے وجود شر سے
بلند ذاتوں کا ظلم و جہل و ریا بنائے فسادِ عالم
زمان تغیر سے ہے عبارت
جہان تغیر کی تازہ کاری

گفتگو ۱۳۵

برودھتوں کے تصوراتِ کہن ہیں ناقابلِ تغیر
برودھتوں کی بنائے عرفاں جمودِ مطلق
جمودِ مطلق کے بطن ہی میں توہم و جہل کا ہے مسکن
تغیراتِ زماں کے دھارے کے ساتھ دوڑو
تغیرِ تازہ کارِ انساں کی زندگی ہے
تغیراتِ زماں ہیں نورِ شعورِ انساں
نہ حق ہے جامد نہ علم جامد نہ خیر جامد نہ عدل جامد
جمود شر کی بنا ہے، شر ہے فسادِ عالم
اگر دکھوں سے نجات پانا ہے آدمی کو
جمود کے قلعۂ کہن کو تباہ کردو
بنائے تفریقِ ذات و رنگت مٹا کے رکھ دو
بلندی و برتری کے دعوے جہالتوں کے اندھیرے سینے سے پھوٹتے ہیں
توہم و جہل کے اندھیرے چھٹیں تو عرفاں کا نور چمکے
جہاں میں اک فرد بھی اگر ہے غریب و جاہل، دکھی، ستم کش

تو مجھ کو نرواں نہ مل سکے گا
کسی کو نرواں نہ مل سکے گا

ہر آدمی کی نجات سے ہے نجاتِ انسانیت عبارت "

●

نجات کا راستہ دکھا کر وہ پیکرِ عقل و علم گوتم جہاں سے گزرا
ہوس سے آزاد بدھ کے پیرو گدا کا کاسہ اٹھائے در در بھٹک رہے ہیں
ہوس کا پس خوردہ چن رہے ہیں
انھوں نے گوتم کو سنگ دل مورتوں میں ڈھالا
انھوں نے گوتم کو بھی بنایا جمودِ مطلق
ہوس سے آزاد بدھ کے پیرو جمودِ مطلق کو پوجتے ہیں
ہے اب بھی نرواں سر بہ زانو، تہی سبو
خوابِ چشمِ حیراں

●

۳

میں آکے شہرِ ہوس میں دَر دَر بھٹک رہا ہوں
مری وہ بچھڑی ہوئی صدا جو مرے ہی ساتھ آرہی ہے اب بھی
بھٹک رہی ہے زبان و معنی کی جستجو میں
کوئی تو اُسکی بھی بات سُن لے، بھٹک رہی ہے اس آرزو میں

●

مرے قدم اِک وسیع میداں میں آکے ٹھیرے
جہاں زمیں میں گڑی ہوئی اِک صلیب ہے میری اپنی آواز نے پکارا
مری صدا نے صلیب کو پھر زباں عطا کی

وہ مجھ سے بولی
"سُن اے بساطِ ہوس کے نو واردِ پریشاں
میں بیتی صدیوں سے دیکھتی ہوں کہ خوں سرا رائیگاں گیا ہے"
مسیحِ دوراں فلک سے اُترا حصارِ شہرِ ہوس میں آکر
تو اس نے دیکھا کلیم کی اُمتِ پریشاں اسیرِ دامِ ہوس ہوئی تھی
غُلام گرِ رُوم کے شہنشہ نے اُن سے نطقِ کلیم چھینا

ہوس نے سینوں کو اُن کے لعل و زر و گہر کی طلب کا آتشکدہ بنایا
وہ جلوۂ حق کلیم نے جس کے نُورِ رقصاں سے اپنا سینہ کیا تھا روشن
ہوس کے سرد و سیاہ دامن میں چھُپ گیا تھا
یہ طُور جل جل کے بجھ چکا تھا

●

مسیح نے زر پرست اُمت کے سُود خواروں کو قہر کا تازیانہ مارا
مسیح نے صاحبانِ دولت کو یوں ڈرایا
تمہاری خیرات ذخیرِ دھوکا
تمہاری نیکی سراب آسا
عبادتیں ہیں تمہاری مکر و ریا کا پردا
خُدا کو بھی تم سمجھ رہے ہو ہوس کا بندا
ہے یہ تو ممکن کہ چشمِ سوزن سے اونٹ گزرے

مگر یہ ممکن نہیں ہے بابِ ارم سے سرمایہ دار گزرے

•

مسیح نے گھر نہیں بنایا
کہ سقف و دیوار و در بھی خدمت گزارِ زر ہیں
مسیح نے دولتِ جہاں سے لیا نہ اک حبّۂ سیہ بھی
وہ پا برہنہ پرانے کمبل کے پیرہن میں یتیم و مسکیں کے ساتھ گھوما
غریب فاقہ زدہ ہجوموں کی گلّہ بانی میں مطمئن تھا
غلام گر روم کی شہنشہ کہ اک غلامِ سیاہ باطن کہ لعل و گوہر پرست لب نے دیا ہوس کی زباں سے فتویٰ
کہ اس کا پیغام ہے بغاوت
یہ مردِ حق ہیں غلام زادوں کی حریت کا پیامبر ہے
یہ مردِ آزاد اپنے کاندھے پہ حق کی بھاری صلیب اٹھائے
صلیب اس کے لہو کی برسوں سے منتظر ہے
صلیب بھی اسکی سرفرازی
صلیب پر کھنچ کے بھی رہا وہ ہوس کے ہاتھوں سے ناشناسا، بلند و بالا

•

مقدّس و محترم کلیسا کے قابلِ احترام والی
صلیب کو پوجتے ہیں جنت کے عیش و دولت کی آرزو میں
تمام اُمت یہ چاہتی ہے
کہ سارے آیندہ و گزشتہ گناہ گاروں کا بوجھ اٹھائے صلیب تنہا
صلیب کی آنکھ دیکھتی ہے
کہ اسکی آواز سننے والا نہیں ہے کوئی

•

مسیح کا خوں صلیب کو اب بھی زرد دیتا ہے رنگ اپنا
ہوس بناتی ہے اس لہو سے شرابِ عشرت
صلیب بھی بن گئی ہے اہلِ ستم کی دولت

۴

ہے یاد شہرِ ہوس کو اب تک

کہ ریگ زارِ عرب سے اٹھی تھی اک صدا ئے امین و صادق
کہا تھا جس نے کہ فقر ہے آدمی کا زیور
کہا تھا جس نے کہ میری دنیا غریب و مسکیں کی بے نوائی
کہا تھا جس نے کہ حشر میرا غریب و مسکیں کے ساتھ ہوگا

●

بتانِ دولت کے معبدوں سے پجاریوں کی ہوس نے دامِ فریب پھینکا
امین و صادق، غریب و مسکیں صدا سے پوچھا
کہ ہم تجھے دولتِ زمان و مکاں پہ کُل اختیار دیں گے
جو تو کہے تو تری ہتھیلی پہ چاند سورج اتار دیں گے
جو تو کہے تو عرب کی شاہی بھی تیرے قدموں میں ڈال دیں گے
زر و جواہر کے سارے ارماں نکال دیں گے
مگر وہ آواز امینِ حق تھی
صدائے صادق تھی، اُن سے بولی
کہ چاند سورج، زماں کی دولت، عرب کی شاہی، زر و جواہر
نگاہِ میزانِ حق میں ادنیٰ سی اک صداقت سے بھی سُبک ہیں

●

پیامِ حق سے حصارِ شہرِ ہوس کی بنیا دہل گئی تھی
برہنہ پائی حجاز و یثرب کے ریگ زاروں میں نقشِ پا کے دِیے جلاتی گذر رہی تھی
غلام آزاد ہو رہے تھے
غریب خانہ بدوش شہروں میں آ کے آباد ہو رہے تھے
ستم رسیدہ یتیم و مسکیں نے دستِ غاصب مروڑ پھینکا
نگاہِ رحمت نے تیغِ ظالم کو توڑ پھینکا
غلام آقا، ہم سا بقیں پہ ہوئے جو حاکم تو کعبۂ دل سے زر کے لات و منات نکلے
بتانِ شہرِ ہوس جو ٹوٹے تو کارِ بعثت ہوا مکمل

●

پھٹے پرانے حقیر کپڑوں میں بے نیازی کی شان لے کر
غریب مکہ، شہِ مدینہ کے فقر و غیرت کا تاج پہنے

ہوس سے نا آشنا نگاہوں کی تیغ گردوں شکار تھی سے
محمد مصطفیٰ کے قاصد حصارِ شہرِ ہوس کا در کھٹکھٹا رہے تھے
لرز رہا تھا جلالِ مغفور و تختِ قیصر، غرورِ فرعون و تاجِ کسریٰ
ہوس کے آتش کدے جو صدیوں سے زر کے سینوں میں جل رہے تھے
غبارِ فقرِ غیور کے دامنِ ارم آفریں میں چہرہ چھپائے سر و دخموش و ویراں پڑے ہوئے تھے
محمد مصطفیٰ کا پیراہنِ دریدہ قبائے سلطاں پہ ہنس رہا تھا۔

●

نہ ہے شہرِ ہوس کو شاہد ہے بابِ خیبر کہ دستِ محنت کا زور کیا ہے
زمین شیرب کی جانتی ہے کہ کس کی محنت جبیں سے ٹپکی پسینہ بنکر تو پھول مہکے
عراق کی ریگِ تشنہ خوں کو ہے خبر بو تراب ہے کون
زمیں سے رشتہ ہے کس کا گہرا
زمین ہے کس کے دستِ محنت سے ہمسرِ عرش و خُلد ساماں
وہ جس کے گھر سے گئے ہیں فاقے یتیم و مسکیں کا پیٹ بھر کر
کیا ہے کارِ حکومت آغاز دستِ محنت کی شمع بنکر
وہ جس نے پہلی ہی شام شمعِ ہوس بجھا دی دلوں کے اندر
امیر ہو کر بھی جس کے کام و دہن نے نانِ جویں سے رشتہ کبھی نہ توڑا
امارت ایسی کہ جس کی غربت کی اہلِ زر کو خبر نہیں ہے
وہ دردِ انساں کہ دل بھی اشکوں کے ساتھ ٹپکا تو چشمِ تر کو خبر نہیں ہے
وہ جس کا مکتوب عدل ہیں اب بھی چشمِ تاریخ کی ضیا ہے

"قبول کرنا نہ دعوتِ اہلِ جاہ و دولت
کہ اُن کے خوانِ کرم کا ہر ایک لقمۂ تر
لہو میں ڈوبا ہوا ہے، فاقہ کشوں کے اشکوں کا خوں بہا ہے
امیر سے انکسار دولت کے آگے جھکنے سے ہے عبارت
امیر کا تحفۂ گراں ہے، نگاہِ حق کو ہوس کی رشوت
غریب کے حق کی پاسداری ہے اہلِ قلب و نظر کی دولت"

●

خلیفۃ المسلمین کا پیراہنِ دریدہ قبائے سلطاں پہ ہنس رہا ہے
عراق کی ریگِ تشنہ خوں کی آستیں میں ہوس کا خنجر چھپا ہوا ہے

ہوس کی شمشیرِ خوں فشاں بزدلی کا حربہ بنی ہوئی ہے
زر و جواہر کی مُہر والی نگاہ پردہ بنی ہوئی ہے
علی کا نقشِ غیور اپنے ہی سر کے خوں میں نہا چکا ہے
اک آفتابِ صدائے حق خوں کے تُند دریا میں ڈوبتا ہے
ہوس کا ہاتھ اک نیا حصارِ زر و جواہر بنا رہا ہے
محمد مصطفیٰ کا پیغام اپنے لفظوں سے پوچھتا ہے
تمہارے معنی، تمہاری قوت کہاں گئی ہے؟
کلیم و عیسیٰ، محمد مصطفیٰ کی اُمت ہوس کی اُمت بنی ہوئی ہے

۵

عراق کی ریگِ تشنہ خوں کی پیاس اب تک بجھی نہیں ہے
فرات اک جوئے تشنگی ہے
زمینِ کوفہ کی دعوتوں میں سراب آسا لہو کا دریا چمک رہا ہے
سناں کے جنگل اُگے ہوئے ہیں
ہوائیں تیروں کی سنسناہٹ سے لے کے رفتار چل رہی ہیں
دمکتے زہراب خوردہ خنجر عطش کے دریا کی موجِ خوں ہیں
چمکتے پھل نیزہ و تبر کے لدے ہوئے ہیں نہالِ دولت کی ٹہنیوں پر
اُمڈتی تیغوں کے بادلوں سے لہو کی برسات ہو رہی ہے
حسین دشتِ بلا میں تنہا کھڑے ہوئے ہیں

جفا کی تپتی سلگتی ریتی پہ سر کٹائے وفا کے پیکر پڑے ہوئے ہیں
عزیز و اقارب، رفیق و انصار و خویش و یارِ نہا کے خوں میں بچھڑ چکے ہیں
عساکرِ قہرماں کے ناوک کی زد پہ خیموں میں ننھے بچے تڑپ رہے ہیں
ہے خشک ماؤں کا دودھ، آنکھیں ہیں تر، زباں میں عطش سے کانٹے پڑے ہوئے ہیں
حسین دشتِ بلا میں تنہا کھڑے ہوئے ہیں
ستم کی بیعت نہ کی، غریب الوطن ہوئے، دربدر پھرے، جاں لبوں پر آئی
خود اپنے قدموں سے اپنے مقتل کی سمت آئے، خدا کے گھر میں اماں نہ پائی

جو عمر بھر کی کمائی تھی، وہ لٹائی، لیکن ہوس کے در پر نہ کی گدائی
ہر اک قدم پر شہید ہو کر جوان بھائی، جوان بیٹے کی لاش اٹھائی

فرات آنکھوں کے سامنے ہے، خیامِ عصمت کی سمت سے العطش کی آواز آ رہی ہے
بدن پہ زخموں کا پیرہن، سر پہ تاج تیروں کا، تیغ سایہ کئے کھڑی ہے
لرزتے ہاتھوں پہ چھ مہینے کا طفل بن کر اک آیتِ حق دھری ہوئی ہے
نہالِ غم کٹ چکا ہے دستِ خزاں سے لیکن یہ شاخِ نازک ابھی ہری ہے
حسین دشتِ بلا میں تنہا کھڑے ہوئے ہیں
حصارِ شہرِ ہوس کی بنیاد ہل رہی ہے، حسین فریاد کر رہے ہیں
زمین چپ، آسمان چپ ہے، فضا ہے ساکت، سکوت کے لب کھلے ہوئے ہیں
سیاہی دل کی چمک اٹھی ہے، ہوس کے پردے نظر کے آگے سے ہٹ گئے ہیں
عطش سے سوکھی زبانِ اصغر کے تیر سینوں کے سخت پتھر میں کھب چکے ہیں
نگاہبانِ فصیلِ زر نے سیاہ دل حرملہ کی سنگیں نظر سے دیکھا
کلامِ خاموشی قطع کرنے کو طمعِ زر کی کماں نے تیرِ ستم کو چھوڑا
گلوئے معصومیت نے ہونٹوں سے تشنگی کے ہوس کے پیکاں کا زہر چوسا
قرآنِ ناطق نے خون اگلا، محمد مصطفٰے کا پیغام خوں میں ڈوبا
حسین دشتِ بلا میں تنہا کھڑے ہوئے ہیں

لرزتے ہاتھوں پہ لاشِ اصغر دھری ہوئی ہے
حیاتِ جاوید ہاتھ باندھے کھڑی ہوئی ہے
امڈ رہے ہیں سنان و شمشیر و تیر و خنجر
دہک رہی ہے زمیں، برستی ہے آگ سر پر
سگانِ اربابِ اقتدار و غلامِ دولت
دیارِ شامِ ہوس کے پروردگانِ ذلت
بھرے ہوئے جھولیوں میں پتھر جھپٹ رہے ہیں
دلوں کے خونیں سیاہ بادل سمٹ رہے ہیں
ثباتِ پیشہ حسین ظلم آزما ہوا ہے

یزید کے تخت و تاج و ایواں میں زلزلہ ہے

سنو کہ اب ہونٹ حق میں جنبش ہوئی ہے پیدا

ہوس شکن آگہی میں صداقت کا نور چمکا
شہید ہوتی ہوئی صدا نے لیا سنبھالا
ہوس کی ظلمت میں نطق نے پھر کیا اجالا
" یہ صاف سن لے یزید کی امت پریشاں
قسم زماں کی کہ ہے خسارے میں آج انساں
ہوس نے جو کچھ کیا ہے تم سے سراب سا ہے
جو خواب زر نے تمہیں دکھایا حباب سا ہے
تم اپنے قلب و ضمیر ناحق گنوا رہے ہو
تم اپنے ہاتھوں سے اپنی میت اٹھا رہے ہو
ملوکیت تم کو اپنے پیروں سے روند دے گی
تمہاری تیرہ نگاہی اک دن تمہیں ڈسے گی
تمہاری گردن پہ خوں تمہارا سدا رہے گا
تمہارا ہر ظلم تم سے کل انتقام لے گا
مجھے خود اپنی تباہیوں کا الم نہیں ہے
مری صداقت کو اپنے لٹنے کا غم نہیں ہے
مگر یہ غم ہے کہ لوٹ کر مجھکو تم لٹو گے
مجھے مٹا کر خود اپنی نظروں میں خوار ہو گے
تمہارا اپنا وجود تم پر کرے گا لعنت
تمہاری اپنی ہوس بنے گی تمہاری تربت
میں تم کو دل دے رہا ہوں واپس، قبول کر لو
یہ ذہن لوٹا رہا ہوں تم کو، وصول کر لو
میں تم کو بینائی دے رہا ہوں، نظر سے پوچھو
تم اپنی بکھری صدا کو میری زباں میں ڈھونڈو

نہیں ہے ہاتھوں پہ میرے لاشا، تمہارا دل ہے
لہو میں ڈوبا ہوا یہ پیکر، تمہارا دل ہے

پیامِ حق پتھروں سے سر پھوڑتا ہے اپنا
نگاہبانِ فصیلِ زر مستعد کھڑا ہے
گلوئے حق کاٹنے کو شمر آرہا ہے خنجر بکف، ہراساں
حسین کا قلب مطمئن ہے سعیٔ ظلم و جفا پہ خنداں
اُمڈتے لشکر سے دشت و میداں چھلک رہے ہیں
سین دشتِ بلا میں تنہا کھڑے ہوئے ہیں

حسین دشتِ بلا میں تنہا کھڑے رہیں گے
صدائے حق پتھروں سے سر پھوڑتی رہے گی

رضیہ سلطانہ

ایک تاریخی داستان

آخری قسط

رفیق زکریا

ستائیسواں باب
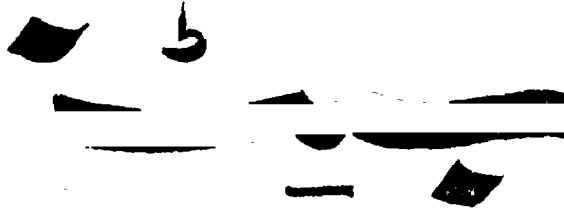
اپنے گرد طاقت اور اقتدار کا حصار کھینچ لینے کے بعد رضیہ نے بندگان چہل گانی میں سے چند زیادہ قابل اعتبار اور وفادار امراء کو منتخب کیا اور انھیں اپنی شاہانہ نوازشوں سے خوش کرنے کا فیصلہ کیا۔ آیاز اور التونیہ کی خدمات کا اعتراف پہلے کیا جا چکا تھا، لیکن اب وہ ان امراء کو بھی اپنے حلقۂ اثر میں لینا چاہتی تھی جو اس سے اتنے قریب نہیں تھے، لیکن شرط یہ تھی کہ وہ ملکہ کے اشاروں پر چلیں گے۔ وہ اپنے اقتدار کے خلاف ذرا سی سرکشی بھی برداشت کرنے کو تیار نہیں تھی۔ گزشتہ چند ماہ کی آزمائشوں کی آگ میں تپ کر ایک پختہ اور آزمودہ کار شخصیت ابھری تھی جو اب اپنی مرضی کے مطابق حکومت کرنا چاہتی تھی۔ اسکو بہت تلخ تجربات ہو چکے تھے، اور وہ اس نتیجہ پر پہنچ گئی تھی کہ امراء کی اکثریت اس قابل نہیں ہے کہ ان پر ذرا سا بھی بھروسہ کیا جائے۔ اور وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اگر ذرا سا بھی موقع مل گیا تو وہ غداری کرنے سے کبھی نہیں چوکیں گے۔ اس لئے تیز و طرار امراء کے ساتھ نرمی اور فیاضی میں تھوڑی سی احتیاط کی ضرورت تھی۔ بیوفائی کی سزا ضرور ہونی چاہیئے لیکن اپنے حسنِ تدبیر سے بیوفائی کے امکانات ختم کر دینے چاہئیں۔ اور خلوص و وفاداری کے جذبہ کو انعام و اکرام سے بڑھانا چاہیئے۔

رضیہ نے اپنے مشیروں اور وزیروں کا نیا تقرر اسی نقطۂ نگاہ سے کیا۔ اس نے سب سے پہلے خواجہ مہذب الدین کو نظام الملک کا منصب عطا کیا۔ وہ ایک گمنام سا امیر تھا اور رضیہ نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ وہ یہ بلند عہدہ پا کر اتنا خوش ہوگا کہ ملکہ کے خلاف کسی سازش میں مبتلا نہ ہو سکے گا۔ سپہ سالاری کے لئے اس نے سیف الدین ایبک کا انتخاب کیا۔ جو بیک وقت بہت سی خوبیوں اور مردانہ صفات کا مالک تھا۔ ایک اور امیر تھا اختیار الدین اتیگن ——— خوب صورت اور خوش تدبیر، با وقار اور سربلند لیکن اسی کے ساتھ مغرور، بدخو، خبطی اور ضدی۔ رضیہ نے انتظام خانہ داری اس کے سپرد کیا اور اُسے اپنا امیر حاجب مقرر کیا۔ رضیہ نے دوسرے امیروں کی بھی عزت افزائی کی۔ ان ہی میں حوصلہ مند اور جاہ طلب ملبن بھی تھا۔ لیکن اُسے کمتر درجے کا عہدہ ملا۔ وہ شاہی اصطبل کی نگرانی کے لئے امیر آخور بنا دیا گیا۔ یہ جگہ دراصل حبشی غلام جمال الدین یاقوت نے خالی کی تھی۔ جس کو رضیہ نے امیر الامراء کا جلیل القدر منصب عطا کر کے تمام بندگانِ چہل گانی کو سراسیمہ اور مبہوت کر دیا تھا۔ اس سے پہلے یہ منصب نہایت اعلیٰ خاندان ترکوں کے سوا اور کسی کو نہیں مل سکتا تھا۔

اسی طرح رضیہ نے صوبہ داریوں میں بھی تبدیلیاں کیں۔ آیاز اور التونیہ اپنا اپنا عہدہ سنبھال چکے تھے۔ حالانکہ صرف خاص کے سابق میر ساماں طغرل طغران خاں نے جو ایک نیک سرشت اور فیاض امیر تھا۔ گزشتہ بغاوت کے دبانے میں رضیہ کی مدد نہیں کی تھی، لیکن صرف اس صلے میں کہ اس نے باغیوں کا ساتھ نہیں دیا تھا، لکھنوتی میں اس کی صوبہ داری کو مزید اختیارات کے ساتھ بحال کر دیا گیا۔ اُچھ کا صوبہ ہندو خاں کے سپرد کیا گیا۔ یہ عجیب و غریب نام ہتر مبارک کا تھا جن کا زہد و اتقا مشہور تھا۔ دوسرے امراء بھی شاہی نوازشوں سے محروم نہیں رہے۔ جو جتنا زیادہ وفادار تھا اسکو اتنا ہی بڑا منصب ملا۔ اس عہد کے ایک مورخ کے الفاظ میں جو خود شاہی دربار سے وابستہ تھا ———

دہلی سے لکھنوتی تک تمام ملک اور امیر اپنی وفاداری اور
جاں نثاری کا مظاہرہ اور سر تسلیم خم کر رہے تھے۔

اس طرح رضیہ نے اپنی فراست، دانش مندی اور حسن تدبیر سے ساری سلطنت میں امن و امان قائم کر دیا۔ صرف گوالیار میں تھوڑا سا فتنہ باقی تھا، جس کی وجہ وہاں کے قلعہ دار رشید الدین علی کی موت تھی۔ بزرگی کے اعتبار سے یہ عہدہ ضیاء الدین علی کو ملنا چاہیے تھا جو فراری باغی نظام الملک کا عزیز ہوتا تھا۔ اس لئے رضیہ کی طرف معاندانہ رویہ رکھتا تھا۔ لیکن جیسے ہی اس نے سرکشی کا انداز اختیار کیا رضیہ نے قریب کے ایک صوبیدار بیرن کو اس کے خلاف فوج کشی کرنے کا حکم دے دیا۔ ضیاء الدین نے تیغ آزمائی کے بغیر ہی میدان چھوڑ دیا۔ اسے گوالیار سے نکل جانے اور دہلی میں حاضر ہونے کا حکم دیا گیا۔ لیکن اس میں ملکہ کے روبرو آنے کا حوصلہ نہیں تھا۔ اس لئے اس نے بھی اپنے بدنام عزیز کی طرح راہ فرار اختیار کی۔

اس دوران میں چوہان کی بڑھتی ہوئی طاقت سلطنت کے لئے ایک خطرہ بن گئی۔ خود درباری مورخوں نے زور کے حکمران کو "ہندوستان کے راجاؤں میں سب سے بڑا راجہ" تسلیم کیا ہے۔ جب اس نے بغاوت کا علم بلند کیا تو صورت حال تشویشناک ہو گئی۔ اُسے کسی حد تک روک تو دیا گیا لیکن اسکی باغیانہ سرشت کو کچلنا تقریباً ناممکن تھا۔ ایسی صورت میں رضیہ نے ہندوؤں کی طرف جو رواداری کا رویہ اختیار کیا تھا، اس کے پیش نظر گوالیار کا قلعہ خالی کر دینے کا حکم دیا گیا۔ صوبیدار نے اس حکم کی تعمیل کی اور اپنی فوجوں کو لے کر قلعے اور شہر سے باہر نکل گیا۔

اس واقعہ سے بندگانِ چہل گانی میں تہلکہ مچ گیا۔ انھوں نے اسکو بزدلی پر محمول کیا، حالانکہ درحقیقت ان حالات میں یہ بہترین حکمت عملی تھی، کیونکہ گوالیار میں شاہی لشکر کی حالت غیر مستحکم تھی۔ لیکن امراء کو یقین تھا کہ رضیہ نے غلطی کی ہے۔ اس کے علاوہ انھیں یہ تشویش بھی تھی کہ اگر اس نے آئندہ بھی ایسی ہی کمزوری دکھائی تو سلطنت کا خدا ہی حافظ ہے۔

لیکن رضیہ نے ہمت نہیں ہاری اور نہایت مستقل مزاجی سے سلطنت کی تنظیم نئے انداز سے کرتی رہی۔ اپنی رعایا کی تکلیفوں کو دُور کرنے کے لئے وہ سب سے زیادہ وقت صرف کرتی اور بڑی محنت اور جانفشانی سے ان کی فلاح و بہبود کے لئے نئی تدابیر اختیار کرتی۔ وہ اکثر دہلی کے مضافات کی سیر کو نکل جاتی اور گاؤں کے غریب کسانوں کی حالت اپنی آنکھوں سے دیکھتی اور ان کی شکایتوں اور تکلیفوں کو دُور کرنے کے لئے وہیں کھڑے کھڑے احکام جاری کر دیتی۔ رعایا پر اس کا بہت اچھا اثر پڑا۔ اور وہ ملکہ کی عمر کی درازی اور سلطنت کے اقبال کے لئے دست بدعا رہتے۔

ملکہ نے تعلیم کی طرف بھی خاص توجہ کی اور دہلی کے باشندوں کو جن میں وہ بہت ہر دلعزیز تھی، معقول تربیت کی اہمیت کا احساس دلایا جس میں مذہبی تعلیم اور فوجی امور دونوں شامل تھے، اس نے اس عہد کے عظیم المرتبت عالم منہاج السراج کو گوالیار سے واپس بلا لیا۔ جنہوں نے بعد میں اپنی کتاب طبقات ناصری میں رضیہ کے عہد حکومت کے حالات قلم بند کئے ——— اور درسگاہ ناصری کا انتظام ان کے سپرد کیا ——— یہ درسگاہ التمش کی قائم کی ہوئی تھی، لیکن رضیہ نے اس کو نئی زندگی دی، اس نے اور مدرسے بھی قائم کئے۔

جہاں درس دینے کے لئے اچھے اچھے عالم مقرر کئے گئے، اس نے علم و دانش کی طرح شعر و ادب پر بھی توجہ کی۔ اور اہل علم کی خدمات حاصل کرلیں۔ دربار میں ان کی عزت افزائی کی جاتی اور ملکہ خود بڑے ادب اور احترام کے ساتھ پیش آتی تھی۔ مغنیوں اور مصوروں کے ساتھ بھی وہ بڑی فراخ دلی سے فیاضی کا سلوک کرتی تھی۔ اس کا یہ انداز سرپرستی بعض اوقات امراء کو ناگوار گزرتا تھا۔ کہتے ہیں کہ اس عہد کی ایک تصویر ہے جس میں مصور نے رضیہ کو اس کے محبوب گھوڑے پر سوار دکھایا ہے، رضیہ کو یہ تصویر پسند آئی اور اس نے مصور کو انعام و اکرام سے مالا مال کر دیا اس کے دور حکومت میں یہ تصویر اس کے دربار کی زینت تھی۔ اس حساس اور روشن خیال ملکہ نے فن اور فن کاروں سے اپنی دلچسپی کو کبھی پوشیدہ نہیں رکھا۔ وہ اہل دانش کی محبت پسند کرتی تھی۔ اور ان کے تخلیقی کاموں کے لئے مواقع فراہم کرتی رہتی تھی۔

وہ ایسی موسیقی کی بہت دلدادہ تھی جو جلوس اور فوجی مظاہروں میں کام آسکے، دربار میں فوجی باجوں کو بڑی اہمیت حاصل تھی، ہر امیر کے پاس اس کے منصب کے مطابق اس کے اپنے فوجی باجے تھے۔ بعض تنگ نظر علماء کو رضیہ کی موسیقی سے دلچسپی ناگوار تھی لیکن اس عہد میں تصوف کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ اور صوفی سماع کو صرف جائز ہی نہیں سمجھتے تھے بلکہ اُسے روحانی بالیدگی کا ذریعہ سمجھتے تھے، جس سے روح میں وجد پیدا ہوتا ہے، اپنے نقادوں کو رضیہ نے عظیم مسلم فلسفی امام غزالی کے الفاظ میں جواب دیا کہ عالم وجد سماع کی آواز ہی سننے سے پیدا ہوتا ہے۔

رضیہ صرف اہل علم کی سرپرست نہیں تھی جن سے اس کا دربار جگمگا رہا تھا، بلکہ خود علم کے ہر شعبے میں دلچسپی رکھتی تھی۔ اس نے اپنی وسیع سلطنت میں رہنے والی مختلف قوموں اور نسلوں کی ذہنی اور علمی ترقی کا سامان فراہم کیا۔ مدرسوں اور خانقاہوں کے علاوہ اس نے عام کتب خانے بھی کھولے جن میں قرآن اور حدیث کے علاوہ اس عہد تک کے بڑے بڑے عالموں اور فلسفیوں کی کتابوں کا مطالعہ کیا جا سکتا تھا۔

اس عہد میں عربی نثر کے بعض شاہکار ظہور میں آئے۔ وہ الغزالی کی خود نوشت سرگزشت سے، ابن طفیل کے رومانی انداز تحریر سے، اور ابن جبیر کے سفرنامے سے خاص طور سے متاثر تھی، کیوں کہ اس نئے رجحان میں عربی ادب کی تازہ کاری تھی۔

لیکن سلطنت پر سب سے زیادہ اثر ایرانی تہذیب کی نشاۃ ثانیہ سے پڑا۔ دلی کے دانش کدے گویا باغ تھے جو فارسی نثر و نظم کے پھولوں سے مہک رہے تھے، اور ترکی امراء ان سے مسحور ہو رہے تھے۔ سعدی کی حکایات، عمر خیام کی رباعیاں، فردوسی کا شاہنامہ اور نظامی گنجوی کی مثنویاں، زبان زد تھیں۔ اور ان کی سحر کاری نے سب کے دل جیت لئے تھے۔

رضیہ کی سرپرستی میں یونانی علوم اور فلسفے بھی عام ہوئے اور ارسطو، افلاطون، اور دوسرے بزرگوں کی تحریریں آنکھوں کا سُرمہ بن گئیں۔ ہندو علوم کی طرف بھی بہت زیادہ توجہ دی گئی۔ اور ہندوستان کی قدیم سائنس، فلسفے، نجوم، اور ادب کو نصاب تعلیم میں خاص طور سے شامل کیا گیا۔ چند تنگ نظر مسلم علماء اس کے خلاف تھے، لیکن رضیہ کو یہ اصرار تھا کہ علم اور صداقت کا ہر سرچشمہ مقدس ہے اور اس کا فیض عام ہے۔ یہاں مذہب اور عقیدے کی تخصیص بے معنی ہے۔

ملکہ کی علم نوازی ایک وسیع المشرب انسان دوستی کی وجہ تھی۔ وہ ایران کے فلسفی حکیم بوعلی سینا اور ہسپانیہ کے مسلم فلسفی

ابن رشد کی کتابیں پڑھیں جن میں ہندیوں کے علم و دانش کا نچوڑ تھا اور ہم عصر انسانی مسائل پر منطقی استدلال اور خیالات کا خزانہ تھا اپنے عہد کے مفسرین کی تفسیریں بڑے شوق اور انہماک سے سنتی تھی۔ وہ سب سے زیادہ متاثر ابن سینا سے تھی جس نے نہایت حقارت سے تنگ نظر علماء کی تکفیر اور ارتداد کے الزامات کو یہ کہہ کر ٹھکرا دیا تھا کہ:۔

"مجھ پر کفر اور ارتداد کا الزام لگانا آسان نہیں ہے، میرا ایمان ہر ایمان
سے زیادہ مضبوط ہے تمہاری دنیا میں مجھ جیسا ایک ہی ہے اور اگر وہ بھی کافر
اور مرتد ہے تو پھر اس دنیا میں کوئی صاحبِ ایمان نہیں ہے۔"

رضیہ نے اپنے دربار میں علم و حکمت، فلسفہ و دانش، کے جو ستارے جمع کرلئے تھے، ان کے ہالۂ نور سے اس کے عہدِ حکومت کو نئی آب و تاب ملی۔

بارھواں باب

اپنی روشن خیالی اور وسیع المشربی سے رضیہ نے اپنی سلطنت کو ایک نیا مزاج دے دیا، جس کی وجہ سے فرسودہ خیال اُمراء اپنے آپ کو اس ماحول میں اجنبی محسوس کرنے لگے۔ رضیہ سے پہلے کے حکمرانوں کا عہد ان کی ذہنیت کے لئے اتنا غیر مانوس نہیں تھا۔ یہاں تو فضا ہی بدلی ہوئی تھی۔ اُمراء سے زیادہ اہلِ علم کی قدر ہوتی تھی۔ سپاہیوں سے زیادہ سرپرستی طالب علموں کو حاصل تھی۔ اور جو بات سب سے زیادہ ناگوار گزر رہی تھی وہ یہ تھی کہ ہندو رعایا کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا جارہا تھا۔ اُسے بھی سلطنت کا ایک حصہ سمجھا جاتا تھا۔

نئے نظم و نسق میں مذہب اور نسل کی قید باقی نہیں تھی۔ ساری رعایا کو یکساں حقوق حاصل تھے، ہر تفریق مٹادی گئی تھی۔ تعزیری قوانین سب کے لئے برابر تھے، جرائم کا ثبوت شہادت اور گواہی سے فراہم کیا جاتا تھا۔ اور مقدموں کا فیصلہ کرنے کے لئے جسمانی اذیت اور آزمائش ختم کردی گئی تھی، دیوانی قوانین کے لئے جنس، منصب، دولت بے معنی تھے، رضیہ کے عہد میں سفر محفوظ ہوگیا تھا۔ اور راہ داری آسان، اس نے شہری ترقی کی طرف بھی خاص توجہ کی۔ دستکاروں اور مزدوروں کے لئے شہروں کے دروازے کھول دیے گئے۔ امیر اور غریب ایک ہی علاقے میں رہتے تھے، اسکی وجہ سے ترقی کی رفتار تیز ہوگئی۔ اس طرح سماجی تفریق کسی حد تک کم ہوگئی۔ اور شہر کی سرحدیں معاشی اور سماجی فصیلوں کے بجائے حفاظتی حصار میں تبدیل ہوگئیں۔ اس انتظام کے زیر اثر بسنے والے نئے شہروں میں کام کی افراط ہوگئی اور بدحالوں کی حالت سدھرنے لگی۔ تجارت کو دس گنا فروغ ہوا، اور اقتدارِ حکومت کی مرکزیت کی وجہ سے سکوں کی قدر و قیمت مقرر ہوئی اور ذرائع آمد و رفت اور رسل و رسائل کو ترقی ہوئی۔ جنگ کے طریقے میں بھی تبدیلی ہوئی۔ ہر تندرست آدمی فوج میں شامل ہوسکتا تھا۔ اور اسکی وجہ سے فوج کی تنظیم اور کردار میں تبدیلی رونما ہوئی، پیادہ سپاہیوں سے زیادہ رضیہ نے گھوڑ سواروں کے رسالے قائم کئے۔ اس نے ایک مضبوط مستقل فوج بنائی جس کا انتظام اور تنخواہ مرکز کے ہاتھ میں تھا۔

ان انتظامات کو امرا نے پسند نہیں کیا۔ کیونکہ ان کا جاگیرداری اقتدار خطرے میں تھا۔ اور اس طرح انکی انفرادی گرفت کمزور ہوتی جا رہی تھی۔ بعض انتظامات کے خلاف وہ زبان نہیں کھول سکتے تھے، کیوں کہ وہ سلطنت کے لئے بہت مفید تھے، لیکن ان انتظامات کے خلاف وہ اپنے غم و غصے کا اظہار برملا کرتے تھے جن سے عوام کو فائدہ پہنچ رہا تھا۔ امرا نے ان اصلاحات کی مخالفت اسلام کے نام پر کی۔ حالانکہ شریعت کے معاملے میں ان کا علم صفر کے برابر تھا، در اصل وہ سب کے سب نام کے مسلم تھے، جو اسلامی اخوت اور مساوات سے بے نیاز اپنے قبائلی تعصبات اور روایات کو سب سے زیادہ اہمیت دیتے تھے۔

وہ اپنے ذاتی فائدے کے لئے مذہبی جذبات برانگیختہ کرتے تھے اور رضیہ کے لئے نئے نئے مسائل پیدا کر دیتے تھے، وہ ہندوؤں کو کافر اور بُت پرست کہتے تھے اور یہ چاہتے تھے کہ رضیہ ان کے ساتھ اچھا برتاؤ نہ کرے کیونکہ ان کے نزدیک یہ فراخدلی اسلام کے مفاد کے خلاف تھی۔

ایک روز ان کا امتحان لینے کے لئے رضیہ نے ایک نو مسلم ہندوستانی امام الدین ریحان کو وکیل در کا عہدہ عطا کر دیا جو اس سے پہلے صرف ترک امیر کو مل سکتا تھا۔ بندگانِ چہل گانی میں تہلکہ مچ گیا۔ پہلے ایک حبشی کی عزت افزائی ہوئی تھی اور اب ایک ہندوستانی کی۔ یہ ناقابل برداشت بات تھی۔ انھوں نے خفیہ طور سے مشورہ کیا اور ملکہ کے سامنے احتجاج کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

اس وفد کی رہنمائی بلبن نے کی۔ رضیہ امرا کی صورت دیکھتے ہی چوکنی ہو گئی۔

"ہماری گستاخی معاف" بلبن نے لجاجت سے کہا۔ "ہم یہ عرض کرنے آئے ہیں کہ آپ کے امرا پریشان ہیں۔ انھیں یہ اندیشہ ہے کہ آپ ان پر اعتماد نہیں کرتیں"

"یہ لغویات ہے بلبن" ملکہ نے جواب دیا۔ "میری حکومت میں ان امرا سے زیادہ وفادار کون ہو سکتا ہے۔ ان کی حمایت کے بغیر میں کہاں جاؤں گی۔ وہ سلطنت کی پشت پناہ ہیں۔ مجھے ان پر پورا اعتماد ہے۔ ممکن ہے کہ میرے بعض اقدامات ان کو پسند نہ آئیں لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ میں ان پر اعتماد نہیں کرتی"

"ہم آپ کے حسنِ تدبر اور خلوص نیت کا احترام کرتے ہیں، ہم آپ کے دل میں اصلاحات کا جو جذبہ ہے اسکی بھی قدر کرتے ہیں۔ ہمیں اس کا بھی احساس ہے کہ آپ اپنی رعایا کی حالت سدھارنے کے لئے بے چین رہتی ہیں، لیکن جو چیز ہماری تشویش کا باعث ہے وہ یہ ہے کہ آپ نے ایک ہندوستانی کو وکیل در کے عہدے پر فائز کر دیا ہے۔ کیا اس عہدے کے لائق آپ کے امرا میں کوئی ترک امیر نہیں تھا"

"یقیناً بہت سے امرا ہیں جو اس جلیل القدر عہدے کو بڑی خوش اسلوبی سے سنبھال سکتے ہیں۔ لیکن میں نے یہ محسوس کیا کہ ریحان بھی مستعد اور کارداں ہے اور ہمارے اعتماد کا مستحق ہے۔ اس نے سلطنت کی بہت خدمت کی ہے اور اس کی کارگزاریوں کا اعتراف کرنا چاہیئے"

"لیکن ملکۂ معظمہ وہ ایک ہندوستانی ہے۔ جو یہاں کی زمین سے پیدا ہوا ہے، اسکی رگوں میں ترک خون نہیں ہے"

"اس سے کیا فرق پیدا ہوتا ہے، وہ بھی مسلمان ہے۔ تمام مسلمان بھائی بھائی ہیں۔ یہ قرآن شریف کی تعلیم ہے، جو میرے اُمرا مجھے بار بار یاد دلاتے رہتے ہیں۔"

"بیشک۔ لیکن اس کا اطلاق امورِ سلطنت پر نہیں ہو سکتا۔ اعلیٰ عہدے سنبھالنا صرف ہمارا حق ہے۔ ایسے عہدے ہندوستانیوں کو نہیں دیئے جا سکتے۔"

"اس کا یہ مطلب ہے کہ اپنے مفاد کی خاطر امرا قرآنی احکامات آسانی سے بھول جاتے ہیں۔ اب تک آپ حضرات کو ہندوؤں کے ساتھ میرا سلوک پسند نہیں آتا تھا، کیونکہ وہ مسلمان نہیں ہیں۔ اب یہ نیا شگوفہ کھلا ہے کہ جو مسلمان تُرک نہیں ہے، ان کا بھی اعتبار نہ کیا جائے ــــــ"

ہم مانتے ہیں کہ تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں، لیکن ملکۂ معظمہ نے کلامِ پاک میں یہ کہاں سے تلاش کر لیا کہ وہ سب برابر ہیں ــــــ؟"

"میں سمجھتی ہوں کہ اسلام کی بنیاد ہی اخوت اور مساوات ہے۔"

"پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ عرب میں خاندانِ قریش کو، جس میں رسول کریم پیدا ہوئے، افضلیت حاصل تھی؟"

"وہ اسلام کے آنے سے پہلے کی بات ہے، رسول کریم نے اس تفریق کو مٹا دیا۔"

"لیکن آنحضرت کی وفات کے بعد اس خاندان کی فضیلت پھر واپس آگئی۔ آخر یہ انسانی فطرت ہے۔ ملکۂ معظمہ سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں ہے کہ اہلبیت جو بعد میں سیّد کہلائے عربوں کی نگاہوں میں بہت معزز تھے۔"

"اپنی روحانی بزرگی کی وجہ سے، لیکن ریحان کے عہدے پر آپ کا اعتراض خالص قبائلی عصبیت اور دنیاوی مصلحت کی وجہ سے ہے۔"

"ہم پھر عرض کرنا چاہتے ہیں کہ سلطنت کا پشت پناہ ہمارا قبیلہ ہی ہے۔"

"تو کیا ایک ہندوستانی مسلمان کا تقرر اس سلطنت کی بنیادیں ہلا دے گا؟"

"ممکن ہے کہ یہ نوبت نہ آئے، لیکن اگر ایک بار ہمارے متحدہ قلعے میں رخنہ پڑ گیا تو انتشار پیدا ہونا لازمی ہے، اسی لئے ہمیں تشویش ہے۔"

"بہتر ہے لبین۔ تمہاری درخواست قبول کی جاتی ہے، میں اس معاملہ میں امرا کو ناخوش نہیں کرنا چاہتی۔ عصبیت بہت دیر میں ختم ہوتی ہے اور یہ خود کچھ بھی دور تک نہیں دیکھنے دیتی۔ پھر میں یہ بھی سوچتی ہوں کہ ریحان کو امرا کے ساتھ مل کر کام کرنا ہے اور امرا کو اس کا نیا عہدہ پسند نہیں ہے، اس لئے اسکو منسوخ کر دینا خود ریحان کے حق میں بہتر ہوگا۔"

لبین اور دوسرے امرا سلام کر کے رخصت ہو گئے۔ انھیں کامیابی ضرور ہوئی تھی لیکن وہ اپنے دل میں یہ بات جانتے تھے کہ ملکہ خوش نہیں ہے اور ان کے خلاف اس کے دل میں شک پیدا ہو گیا ہے۔ اس سوال کچھ اور ہی تھا۔ یعنی کون حکومت کرے گا؟ ملکہ کی روشن خیالی، اور

فرمانروائی یا امراء کی اقتدار کی ہوس؟ محل سے باہر نکلتے ہی بلبن نے انھیں آگاہ کیا کہ اگر انھوں نے اپنے حقوق کی حفاظت نہ کی تو ساری طاقت ہاتھوں سے نکل جائے گی۔ رضیہ کوئی معمولی حکمراں نہیں ہے۔ بلکہ بہت ہوشیار مدبر ہے اور طوفانوں کا مقابلہ کر سکتی ہے۔ وہ تختِ حکومت پر جتنے زیادہ عرصے تک متمکن رہے گی۔ اسکی طاقت اتنی ہی بڑھتی جائے گی۔ وہ آج بعض معمولی باتوں میں امراء کو ان کی راہ پر چلنے دے گی۔ لیکن دراصل وہ کچھ اور ہی خواب دیکھ رہی ہے۔ مکمل اقتدار کا خواب جس کے سامنے کوئی نگاہ نہ اٹھا سکے۔

لیکن رضیہ کو اس سے باز کیسے رکھا جائے؟ یہی سب سے بڑا مسئلہ تھا۔ سلطنت مضبوط ہو گئی تھی، نظم و نسق بہتر ہو گیا تھا۔ حفاظت کے انتظامات مکمل تھے، اور ہر طرف امن و امان تھا اور عام لوگ اسکی حکومت سے خوش تھے، تخت نشینی کے وقت رضیہ نے وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ اپنی حکومت میں مردوں سے بہتر ثابت نہ ہو تو وہ تخت و تاج سے دست بردار ہو جائے گی۔ لیکن بلبن جیسا کاردار اور چالاک امیر بھی یہ ثابت نہیں کر سکتا تھا کہ رضیہ اپنے وعدے پر پوری نہیں اتری۔ خوبیوں میں کوئی اس کا ہمسر نہیں تھا۔ ہر دلعزیزی اور مقبولیت میں کوئی برابری نہیں کر سکتا تھا۔ اور انتظام سلطنت میں تو وہ لاثانی تھی۔

پھر بھی بلبن کے نقطۂ نگاہ سے رضیہ میں ایک کمزوری تھی، حبشی غلام جمال الدین یاقوت کی طرف اس کا التفات زیادہ تھا، جو امیر آخور بننے کے بعد روز بروز زیادہ طاقت ور ہوتا جا رہا تھا۔ اور یہ بات امراء کو ناگوار تھی۔ دونوں کی باہمی قربت سب پر ظاہر تھی۔ لیکن بلبن کو کچھ اور ہی شبہ تھا۔ دونوں صبح کی شہسواری ساتھ ساتھ کرتے تھے، اور دن میں کئی کئی بار محل کے اندر ملاقات ہوتی تھی، اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ ملکہ ہر وقت یاقوت پر اپنی مہربانیوں کی بارش کرتی رہتی تھی۔ بلبن اسکو محض دوستی کا نام دینے کو تیار نہیں تھا۔ اس کے نزدیک یہ رفاقت گناہ سے آلودہ تھی۔ لیکن اتنا سنگین الزام ثابت کیسے کیا جائے؟ اس معاملہ پر بلبن جتنا سوچتا تھا اتنا ہی پریشان ہوتا تھا۔ افواہیں پھیلا کر ملکہ کو رسوا کرنے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ صرف سلطنت کو نقصان پہنچے گا۔ لیکن خاموش رہنے میں اس سے بھی بڑا نقصان تھا۔ کیونکہ حکومت پر قبضہ کرنے کا اس سے بہتر موقع بلبن کو نہیں مل سکتا تھا۔ اس وجہ سے بلبن ایک خوفناک تذبذب میں مبتلا تھا۔ ہر قسم کے خطرات کے باوجود وہ ان کا سامنا کرنا چاہتا تھا، اُسے معلوم تھا کہ اگر وہ الزام ثابت نہ کر سکا تو اُسے اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ اور سیدگان چہل گانی کا وقار خطرے میں پڑ جائے گا۔ بلبن بہت ہوشیار اور محتاط مدبر تھا۔ اور حکومت کی ہوس اس کی فراست پر شب خون مار رہی تھی۔ وہ بے چین تھا۔

اس زمانے میں ملک ایتگین سے اسکی مفاہمت بڑھ گئی تھی۔ بہت سے معاملات میں دونوں ہم خیال تھے، اس لئے بلبن نے ایتگین کا اعتماد حاصل کرنا چاہا۔ پہلے اشاروں اور کنایوں میں اور پھر برہنہ الفاظ میں اس نے اپنے شبہ کا اظہار کر دیا۔ بلبن کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ ایتگین اس معاملہ میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی لے رہا ہے۔ وہ زیادہ سے زیادہ تفصیلات معلوم کرنا چاہتا تھا۔ دونوں بڑی دیر تک باتیں کرتے رہے اور اس نتیجے پر پہنچے کہ ملکہ اور یاقوت کے ناجائز تعلقات کی خبر اوروں تک بھی پہنچائی جائے۔ لیکن اس انداز سے کہ اپنی ذات پر حرف نہ آئے۔ سب سے پہلے ملکہ کے دشمنوں کا اعتماد حاصل کیا جائے، پھر دوسرے بااثر لوگوں کا۔ اس طرح ملکہ کی رسوائی ہر طرف ہو جائے گی۔ اور ہر شخص یہ خبر سُن لے گا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ملکہ کی ہر دلعزیزی اپنے شباب پر تھی۔ لوگ اسکی پرستش

کرتے تھے، اس کے نام پر ذرا سا بھی دبدبہ انھیں اتنا برافروختہ کر سکتا تھا کہ بدگوئی کرنے والوں کے لئے جان بچانا مشکل ہو جائے۔ ان عواقب کے علم نے بلبن اور اتیگین کو محتاط بنا دیا تھا۔ وہ نہایت ہوشیاری سے حالات کا جائزہ لے رہے تھے اور اس لمحے کا انتظار کر رہے تھے جس سے وہ واقعی فائدہ اٹھا سکیں۔

تیرھواں باب

اس دوران میں رضیہ اپنے منصوبوں کو عملی جامہ پہناتی رہی۔ اس کے اور نئے نظام الملک کے درمیان اچھی مفاہمت پیدا ہوگئی۔ ملکہ اس کا احترام اور لحاظ کرتی تھی، اور نظام الملک، اطاعت اور فرمانبرداری کرتا تھا۔ وہ بندگان چہل گانی سے بھی ملتی تھی۔ اور ہر موقع پر ان کا مشورہ حاصل کرتی تھی۔ لیکن وہ ان کے ساتھ مفاہمت کی فضا پیدا کرنے میں کامیاب نہیں ہوئی۔ بلکہ اس کے برعکس غیریت بڑھتی گئی۔ امراء عام آدمیوں کی بہبود میں دلچسپی نہیں رکھتے تھے، اور رضیہ نے اسکو اپنا نصب العین بنا رکھا تھا۔ امراء اپنے اثر و اقتدار کو برقرار رکھنے میں دلچسپی رکھتے تھے اور رضیہ حاکم و محکوم کے درمیان بہتر رشتے پیدا کرنا چاہتی تھی۔ تضاد یہ تھا کہ امراء قبائلی فرقہ بندی میں مبتلا تھے، جبکہ رضیہ فراخ دل، اور انسان دوست تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے اور امراء کے درمیان مفاہمت کی کوئی بنیاد ہی نہیں تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو طوعاً و کرہاً برداشت کر رہے تھے۔

ایک دن نظام الملک نے رضیہ کو یہ اطلاع دی کہ بندگان چہل گانی کو اہل علم اور اہل دانش سے ملکہ کا ملنا جلنا ناپسند ہے اور وہ دربار میں ان لوگوں کے بڑھتے ہوئے اثر سے ناخوش ہیں۔ رضیہ نے اُسے یاد دلایا کہ حکمرانوں میں جو خوبیاں ہونی چاہئیں ان میں علم دوستی کو فوقیت حاصل ہے۔ اس نے حدیث کی شہادت بھی پیش کی جس میں کہا گیا ہے کہ

"علم حاصل کرنا چاہیئے تاکہ انسان نیک و بد میں تمیز کر سکے اور دوسروں کو نیک راستہ دکھا سکے۔"

"لیکن امراء یہ چاہتے ہیں کہ انھیں اہل علم و دانش پر ترجیح دی جائے۔" نظام الملک نے عرض کیا۔

"کیوں؟ ۔ امراء اہل علم کی برابری نہیں کر سکتے، خود قرآن کا ارشاد ہے کہ نابینا اور بینا برابر نہیں ہیں۔ تاریکی اور روشنی، ٹھنڈا سایہ اور گرم ہوا بھی برابر نہیں ہیں۔"

رضیہ اپنی گرفت روز بروز مضبوط کرتی جا رہی تھی، اور اس کی شخصیت کے اثرات ہر شعبے میں نمایاں تھے۔ بلبن۔ اتیگین اور دوسرے سربرآوردہ امراء اب یہ محسوس کرنے لگے تھے کہ رضیہ کی طاقت کو کم کرنا ضروری ہے۔ اگر یہ ضدی شاخ جھک نہیں سکتی تو ٹوٹ جانی چاہیئے۔

حالانکہ رضیہ بہت چالاک اور ہوشیار تھی لیکن ان نئے شاطروں سے قطعاً بے خبر تھی، اسکو گمان بھی نہیں تھا کہ بندگان چہل گانی ایک بغاوت کے بعد دوسری بغاوت کی تیاری خود شروع کر دیں گے، بس ایک ایاز کو وہ شک اور شبہ کی نگاہوں سے دیکھتی تھی، جو

واہمہ کا خود سر اور جاہ طلب صوبہ دار تھا۔ اس پر کڑی نگرانی تھی، لیکن باقی امراء اُسے بے ضرر نظر آتے تھے، اس کے نزدیک ان کی خود غرضی نے ان کو محتاط بنا دیا تھا۔ وہ کوئی ایسا اقدام نہیں کریں گے جس کی سزا بھگتنے کا اندیشہ ہو۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ بلبن کو نہ سمجھ سکی۔ اس کی صاف گوئی کو رضیہ نے اسکی راست کرداری پر محمول کیا۔ اس کے علاوہ رضیہ اسکی خوبیوں کی بھی قدر کرتی تھی۔ جس کی وجہ سے وہ اس کے درباری اعزاز میں اضافہ کرتی رہی۔ اس کے فرشتوں کو بھی یہ خبر نہیں تھی کہ ایک دن یہی بلبن اس کی بربادی کا باعث بنے گا۔

رضیہ اچھی طرح سمجھتی تھی کہ حبشی النسل جمال الدین یاقوت کی وجہ سے امراء رشک و حسد کی آگ میں جل رہے ہیں۔ لیکن وہ کیا کر سکتی تھی، آخر وہ بھی انسان تھی۔ سرکاری کاموں سے تھک کر چُور ہو جانے کے بعد سے تھوڑے سے سکون اور آرام کی ضرورت تھی، اس ضرورت کو کوئی ایسا ساتھی پورا کر سکتا تھا جس کو وہ اپنے جذبات اور خیالات میں شریک کر سکے، ورنہ اسکی تنہائی خوفناک تھی، جب التونیہ دہلی میں موجود تھا تو بات اور تھی۔ لیکن اب وہ بھٹنڈے کا صوبہ دار تھا۔ اس لئے رضیہ یاقوت کی صحبت کی عادی ہو گئی تھی۔ ان دونوں کی دوستی پرانی تھی، اس بات سے سب واقف تھے، لیکن اب اس میں نئی گہرائی پیدا ہو چلی تھی۔

ایک دن رضیہ نے یاقوت سے کہا کہ "میں تمہیں روز بروز اپنے دل سے زیادہ قریب محسوس کرتی ہوں یاقوت!"

"اس لئے مجھے خدا کا شکر ادا کرنا چاہئیے۔ لیکن اس مرحمت کا باعث کیا ہے؟" یاقوت نے دریافت کیا۔

"میرا خیال ہے امراء خوش نہیں ہیں، وہ ہمارے تعلقات کو مشکوک نگاہوں سے دیکھتے ہیں"

"وہ کس بات سے مشکوک ہیں؟" یاقوت نے معصومیت سے پوچھا۔

"معلوم نہیں، لیکن مرد زیادہ شکی ہوتے ہیں۔ میں نے تمہیں جو اعزاز دیا ہے وہ امراء کے لئے قابل قبول نہیں ہے۔ وہ اسے میری دوستی اور رفاقت پر محمول کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ میں تمہاری گرفت میں ہوں۔"

"مجھے تو معلوم نہیں۔ یہ کیسی گرفت ہے لیکن میں یہ ضرور جانتا ہوں کہ میری زندگی آپ کے اشاروں کی پابند ہے۔" یاقوت نے بڑے خلوص سے اعتراف کیا۔

"ہم ایک عرصے سے ایک دوسرے کے قریب ہیں یاقوت، اتنے قریب کہ میرے اور تمہارے درمیان کچھ ایسا عجیب اور نازک رشتہ پیدا ہو گیا ہے، جسے کوئی نہیں توڑ سکتا، میں انکار کرنا چاہوں بھی تو نہیں کر سکتی۔"

"آپ میرے لئے سب کچھ ہیں خاتون محترم۔ جب میں آپ کے سامنے حاضر ہوتا ہوں تو میرے پاؤں زمین پر نہیں پڑتے، مجھے معلوم نہیں، محبت کیا چیز ہے۔ لیکن میری دنیا میں کوئی کمی نہیں ہے۔"

"مجھے اس کا احساس ہے یاقوت اور میں دل سے تمہاری شکر گزار ہوں، تمہاری شخصیت میں نہ جانے کیا جادو ہے جس سے میں اتنی متاثر ہوئی ہوں، کبھی کبھی جب تم میری طرف دیکھتے ہو تو میرے دل میں عجیب کیفیات پیدا ہوتی ہیں اور میں سوچنے لگتی ہوں کہ کاش میں ملکہ نہ ہوتی۔"

"لیکن ملکہ بھی تو آخر انسان ہوتی ہے۔"

"لیکن اپنی ذاتی مسرت کے معاملے میں بہت بے بس۔"

"ملکہ اور بے بس؟"

"ہاں۔ اگر اُسے اپنی رعایا کی فلاح و بہبود کا خیال ہو۔"

"لیکن آپ اپنے دل پر اتنا ظلم کب تک کریں گی؟ یہ اُمراء ہیں کون؟ وہ ایک اشارے میں نیست و نابود کئے جاسکتے ہیں۔ سپاہی ہمارے ساتھ ہیں۔ رعایا ہمارے ساتھ ہے۔"

"لیکن امراء سردار ہیں، اُن کے بغیر کام نہیں چلتا۔"

"واقعی! اسی قسم کے سرداروں کے بارے میں متنبی نے کہا ہے کہ:-

"ہمارے عہد کے لوگ عقلت سے محروم ہیں

"حالاں کہ طاقت ان کے ہاتھ میں ہے۔

"وہ خرگوشوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے

"لیکن اپنے آپ کو بادشاہ سمجھتے ہیں۔"

"شاعر نے بڑی اچھی بات کہی ہے، لیکن میری پریشانی یہ ہے کہ امراء کہیں رعایا کو ورغلانے میں کامیاب نہ ہو جائیں، اس لئے احتیاط ضروری ہے۔"

"لیکن یقین کیجئے ملکہ معظمہ آپ کی رعایا آپ پر جان چھڑکتی ہے۔ وہ لوگ ہمیشہ آپ کا ساتھ دیں گے۔"

"مجھے یقین نہیں ہے یاقوت، جب انہیں یہ معلوم ہوگا کہ ان کی ملکہ ایک حبشی سے محبت کرتی ہے تو وہ منحرف ہو جائیں گے۔"

"میری گستاخی معاف۔ کیا رضیہ کے دل میں بھی بزدلی کی گنجائش ہے؟"

"یاقوت پُرانے تعصبات کے سامنے ہمت و شجاعت بھی بیکار ہو جاتی ہے۔"

"تو ہمیں دوسروں کی مرضی کا پابند ہونا پڑے گا۔"

"ملکہ کو ایسی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے یاقوت۔"

"اسکی وجہ التونیہ تو نہیں ہے؟"

"تم نے التونیہ کا نام لیا ہے یاقوت تو میں تمہیں بتا دینا چاہتی ہوں کہ میرے دل میں جتنی بے لوث محبت تمہارے لئے ہے اتنی بے لوث محبت اس کے لئے ہے۔ میں نے اور التونیہ نے ہمیشہ ایک دوسرے کو اپنا سمجھا ہے۔ اُمراء بھی یہ جانتے ہیں کہ میں ایک دن التونیہ سے شادی کرلوں گی۔ التونیہ حوصلہ مند اور جاہ طلب ہے۔ لیکن اس کے بعد بھی میرے دل میں اس کے لئے بہت جگہ ہے ایک ایسا اعتماد جو آسانی سے متزلزل نہیں ہو سکتا۔"

"لیکن آپ اس سے محبت تو نہیں کرتیں؟"

"خبر نہیں، میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا، سچی بات یہ ہے کہ میں اس پر بھی اتنی ہی فریفتہ ہوں جتنی تم پر، لیکن تم دونوں کے انداز الگ الگ ہیں۔ میں نہ تمہیں چھوڑ پاتی ہوں نہ اُسے۔"

"لیکن آپ ایک ساتھ دو آدمیوں سے کیسے محبت کر سکتی ہیں؟"

"مجھے معلوم نہیں کہ اخلاقی اعتبار سے میرے جذبات کیسے ہیں، شاید تم صحیح کہتے ہو کہ مجھے ایک ہی کی ہو کر رہنا چاہئیے۔"

"لیکن یاقوت میری کچھ میں کچھ نہیں آتا، تمھیں بتاؤ کیا میں کوئی بہت بڑا گناہ کر رہی ہوں؟"

"اپنے آپ کو ملامت نہ کیجئے۔ آپ تو لاکھوں میں ایک ہیں۔ آپ کی پاک بازی پر کون انگلی اٹھا سکتا ہے؟"

"تمہاری بے پناہ کشش کے باوجود یاقوت۔ میں تمہیں اپنا دل دیتے ہوئے ڈرتی ہوں۔ عشق میں مصلحت اندیشی ممکن نہیں ہے۔"

"میں آپ کی طبیعت سے واقف ہوں۔ لیکن آپ التونیہ سے شادی کا ارادہ تو نہیں رکھتیں؟"

"میں کہہ نہیں سکتی۔ لیکن التونیہ سے شادی کرنے میں کم پیچیدگیاں ہیں۔ کچھ امرا کو رشک آئے گا، کچھ حسد میں مبتلا ہوں گے، لیکن آخر میں اس شادی کو قبول کر لیں گے۔ کیونکہ التونیہ کی رگوں میں بھی سرخ قبائلی خون ہے۔"

"اس لئے آپ مجھ سے شادی نہیں کریں گی۔"

"تم زیادتی کر رہے ہو یاقوت، میں اپنی نہیں امیروں کی بات کر رہی ہوں۔" پھر اُسکی آنکھوں میں ایک چمک پیدا ہوئی اور رضیہ نے کہا "تمہیں معلوم ہے سیاہ رنگ کے مردوں پر عورتیں کیسی فریفتہ ہوتی ہیں؟"

یاقوت مسکرا دیا۔ "لیکن امیر مجھ سے نفرت کرتے ہیں اور آپ چاہتی ہیں کہ ہم امیروں کی اس نفرت کا احترام کریں۔ اس کے سامنے جھک جائیں۔"

تھوڑی دیر بعد یاقوت رخصت ہو گیا۔ اور رضیہ اپنی خواب گاہ میں چلی گئی۔ وہ بڑی دیر تک اپنے بستر پر کروٹیں بدلتی رہی اور سوچتی رہی کہ آخر وہ کس قسم کی عورت ہے۔ التونیہ اور یاقوت دونوں میں بے پناہ کشش ہے اور وہ کسی کو اپنا دل نہیں دے پاتی، کہیں کوئی کمی رہ جاتی ہے۔ عجیب بات ہے کہ وہ دونوں پر بیک وقت فریفتہ ہے۔ یاقوت کے ساتھ وہ چڑیوں کی طرح آزاد رہ سکتی تھی۔ لیکن التونیہ اور اس کے درمیان انتہائی قربت کے باوجود ایک دیوار سی حائل رہتی تھی۔ یہ ایک قسم کے صبر و ضبط کا احساس تھا جس سے روحانی بالیدگی پیدا ہوتی تھی۔ وہ اس دیوار کو کبھی نہیں توڑ سکے گی۔ وہ جانتی تھی کہ التونیہ دوسرے ہی سانچے میں ڈھلا ہے اور شاید یاقوت سے بہتر شوہر ثابت ہوگا، لیکن یاقوت کی شخصیت بہت دل آویز تھی۔ جس نے اس کے وجود کے ہر گوشے کو منور کر رکھا تھا۔

ملکہ اس تذبذب سے نجات نہ حاصل کر سکی۔ وہ اس مسئلہ پر جتنا سوچتی تھی، اتنی ہی الجھتی جاتی تھی۔ اپنی ساری دانائی اور تدبر کے باوجود وہ اپنے ذاتی مسائل کے سامنے بالکل بے بس تھی۔ اس سے اسکی اُداسی اور تنہائی میں اضافہ ہوگیا۔ اس نے اپنے

دکھوں کو سلطنت کے کاموں میں ڈبو دینے کی کوشش کی۔ وہ اپنے آپ کو صبح سے شام تک مصروف رکھتی تھی۔ اور یہ مصروفیت اسکی تسکین کا باعث تھی۔ جب وہ کام سے الگ جاتی تھی تو یاقوت کی صحبت میں دل بہلاتی تھی۔ کبھی دونوں شہسواری کرتے کرتے شہر کے مضافات میں نکل جاتے۔ اور کبھی محل میں بیٹھ کر جلال الدین رومی کے اشعار گنگناتے یہ نیا شاعر اسلامی تصوف کے افق پر جگمگانے والا نیا ستارہ تھا، جس کا نور رضیہ اور التونیہ کے دلوں کو بھی روشن کر رہا تھا ؎

اے یارِ من' اے یارِ من' اے یارِ بے زنہار من

اے بحرِ تو دلسوزِ من' اے لطفِ تو غمخوارِ من

خورشید سروی در جانِ من' چون سیکنی درمانِ من

اے دینِ من' اے جانِ من' اے بحرِ گوہربارِ من

اے جانِ من' اے جانِ من' سلطانِ من سلطانِ من

دریائے بے پایانِ من' بالا تر از پندار من

اور جب یاقوت رضیہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس قسم کے اشعار پڑھتا ؎

بد چشم از دو چشمش' چہ بلا ہاست ہر دم

کہ در چشم از دو چشمش خوش و پُر خمار بادا

تو ان لمحوں میں رضیہ کسی دوسری دنیا میں پہنچ جاتی تھی۔ اور اس کے گرد و پیش ہر چیز ناچ اٹھتی تھی۔ بدلتے ہوئے موسم، زمین، آسمان، درخت، پھول، پہاڑ، میدان، سب اس کے دل میں ایک پُراسرار کیفیت پیدا کرنے لگتے تھے۔ رضیہ اپنی خوفناک تنہائی کو ڈبونے کے لئے ان لمحوں کو تلاش کرتی رہتی تھی، لیکن اسکی محتاط طبیعت کی وجہ سے یہ لمحے زیادہ سے زیادہ اس کے لئے حقیقت سے فرار کی صورت اختیار کر لیتے تھے۔

لیکن حقیقت سے فرار مشکلات کا حل نہیں ہے۔ وہ روحانی انبساط کی اس منزل تک کبھی نہیں پہونچ سکی۔

چون من خراب و مست را در خانۂ خود رہ دہی

پس می نہ دانی این قدر این بشکنم آن بشکنم

خوان کرم گستردہ ای' مہمان خویشم کردہ ای

گوشم چرا مالی اگر' من گوشہ سر نان بشکنم

نی نی منم بر خوان تو' سرخیل مہمانان تو

جامی دو با مہمان خورم' تا شرم مہمان بشکنم

ذہنی اور قلبی سکون حاصل کرنے کے لئے وہ زیادہ سے زیادہ روحانی فضا کی تلاش میں رہتی تھی۔ وہ زمانہ صوفیوں اور درویشوں

کا زمانہ تھا اور رضیہ درگاہوں اور خانقاہوں میں گھومتی رہتی تھی۔ اور وہاں کے بزرگوں کی باتیں کان کھول کر سنتی تھی۔ ایک بار اظہارِ عقیدت کے طور پر اس نے ایک بزرگ صوفی کی خدمت میں کچھ اشرفیاں بھیج دیں۔ وہ فقیرانہ زندگی گزارنے کا عادی تھا۔ اور اپنی ذات پر چاندی کا صرف ایک سکہ صرف کرتے تھے۔ ملکہ کی بھیجی ہوئی اشرفیاں دیکھ کر وہ آگ بگولہ ہو گئے۔ انھیں محسوس ہوا کہ ملکہ نے یہ دنیاوی سکے ان کے سامنے ڈال کر ان کی توہین کی ہے۔ انھوں نے اپنا عصا اٹھایا اور شاہی سفیر کو ڈنڈے مار مار کر بھگا دیا۔ جب رضیہ کو یہ واقعہ معلوم ہوا تو اس نے ان بزرگ کی روحانی طاقت کا اندازہ کیا اور اس کے مقابلے میں اپنی کمزوری اور بیچارگی پر افسردہ ہوئی۔ اس بے چینی کے عالم میں وہ اپنے دل سے باتیں کرتی تھی اور گھنٹوں خاموش بیٹھی رہتی تھی۔

چوتھا باب

حالاں کہ وہ عہد چال بازی اور جرأت آزمائی کا عہد تھا، اور حوصلہ مند رضیہ کی جوانی اپنی بہار پر تھی، لیکن اس کی طبیعت میں ایک اعتدال تھا، اُسے ناعاقبت اندیش جلد بازی ناپسند تھی، کوئی قدم اٹھانے سے پہلے وہ اس کے عواقب پر ٹھنڈے دل سے غور کرتی تھی، بعض اوقات اُمراء اس کی وجہ سے برانگیختہ ہو جاتے تھے، لیکن اکثر و بیشتر رضیہ کی دُور اندیشی کی شہادت دیتے تھے، وہ کمزوری کم ہی دکھاتی تھی، وہ ہمیشہ ثابت قدم رہتی تھی اور ضرورت کے وقت سخت گیر بھی ہو جاتی تھی۔

بہت دن تک اس نے لاہور کے صوبیدار ملک عزالدین ایاز کی باغیانہ حرکتوں کو نظر انداز کیا۔ لیکن جب رضیہ نے یہ محسوس کیا کہ صوبیدار کی سرکشی سلطنت کے استحکام کے لئے خطرے کی صورت اختیار کر رہی ہے تو وہ اس کے خلاف اتنی بے جگری سے لڑی کہ اُمراء بھی بھچکے رہ گئے۔ رضیہ نے باغی صوبیدار کا تعاقب اس شدت سے کیا کہ اُسے سرحد کی طرف راہِ فرار اختیار کرنی پڑی۔ شاہی لشکر کی کمان خود رضیہ کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے جس انداز سے حملہ کیا وہ اسکی فوجی فراست کا ثبوت تھا۔ شکست خوردہ اور پریشان حال ملک ایاز جس طرف بھاگنا چاہتا تھا، اسی طرف اسکی راہ مسدود کر دی جاتی تھی۔ صرف چناب کی سرحد کھلی چھوڑ دی گئی تھی، وہ اس طرف بھاگا لیکن اس نے جیسے ہی سرحد پار کی اس کو منگولوں سے دو چار ہونا پڑا۔ آخر تھکے ہارے صوبیدار نے سپر ڈال دی اور اپنے آپ کو شاہی لشکر کے حوالے کر دیا۔ وہ ملکہ کے سامنے ایک فراری باغی کی طرح پیش کیا گیا۔

"ایاز تم ہی بتاؤ میں تمہارے ساتھ کیا سلوک کروں؟" رضیہ نے پوچھا

"میں رضیہ سے رحم و کرم کی درخواست کرتا ہوں۔" ایاز نے زیر لب ہو کر عرض کیا

"کیا تم رحم و کرم کے مستحق ہو؟ میں تمہیں کتنی بار معاف کر چکی ہوں۔ تم نے مرحوم سلطان کی وصیت کے خلاف مجھے تخت و تاج سے محروم کرنے کی سازش کی۔ لیکن ملکہ ہو جانے کے بعد میں نے تمہیں معاف کر دیا۔ اس کے بعد تم نے دارالحکومت میں میرے خلاف بغاوت منظم کرنے کی کوشش کی۔ میں نے تمہیں پھر معاف کر دیا اور تمہارے نئے اظہارِ وفاداری کے صلہ میں تمہیں سلطنت کے سب سے اہم صوبے لاہور کا صوبیدار بنا دیا۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ تمہاری خودکامی اور ہوسناکی میں کوئی کمی نہیں آ سکتی

اب تم نے میری مہربانیوں کا شکر یہ دوبارہ بغاوت کا علم بلند کر کے ادا کیا ہے "۔

"میں موت کی سزا کا مستحق ہوں ملکۂ معظمہ۔ لیکن آپ رحم دل اور مہربان ہیں۔ ایک بار اور میری خطاؤں سے درگزر کیجئے "۔

"بہتر ہے۔ تمہاری خطا معاف کی جاتی ہے۔ ایاز۔ ویسے تو تمہارے سدھرنے کی کوئی امید نظر نہیں آتی۔ کیونکہ تمہاری دولت اور طاقت کی ہوس تمہیں چین نہیں لینے دیتی۔ لیکن شاید اس معافی کے بعد تم دل میں شرمندہ ہو کر اپنے فرض کو پہچان سکو اور یہ محسوس کر سکو کہ بغاوت سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ تمہاری ہر سرکشی کچل دی جائے گی "۔

"میں خدائے پاک کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں ہمیشہ ملکہ کا وفادار رہوں گا "۔

"تمہاری طرح کے لوگوں کا کوئی دین ایمان نہیں ہے، ان کی قسم کا کیا اعتبار۔ انھیں پشیمان ہونا آتا ہی نہیں۔ پھر بھی میں تمہارے خون سے اپنے ہاتھ رنگنا نہیں چاہتی۔ مجھے تمہاری حالت پر ترس آتا ہے "۔

رضیہ نے ایاز کی رہائی کا حکم دے دیا لیکن اس کو صوبیداری کے منصب سے برطرف کر دیا۔ رضیہ کے طرف داروں کو یہ حکم پسند نہیں آیا۔ ان کے نزدیک سخت سے سخت سزا ہی سبق آموز ہو سکتی تھی۔ لیکن رضیہ کا مزاج کچھ اور تھا۔ حکمرانوں کی ساری خصوصیات کے باوجود اس کے پہلو میں ایک عورت کا دل تھا۔ اس لئے وہ سفاک نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ جس فراخدلی سے اپنے دشمنوں کو معاف کر دیتی تھی، وہ قرون وسطیٰ میں حیرتناک تھی۔ اس کے دل میں کسی کی طرف سے کینہ نہیں تھا۔ وہ یہ دیکھ کر خوش ہوتی تھی کہ اس کی نرم دلی اور مہربانی کی وجہ سے لوگوں کے دلوں میں جذبات عقیدت پیدا ہوتے تھے، اسکو یقین تھا کہ مطمئن اور خوش و خرم رعایا حکومت کا سب سے بڑا ستون ہے۔

سیاسی حکمت عملی کے فن میں بھی رضیہ کا ثانی مشکل سے مل سکتا تھا۔ اس کے عظیم اور مدبر باپ التونش نے اسکو سارے نشیب و فراز سکھا دیے تھے، بیٹی باپ سے کم ذہین ثابت نہیں ہوئی۔

یکایک ایک دن بغیر کسی اطلاع کے غزنی کا سابق خوارزمی صوبیدار حسن ترلوغ منگولوں کے خلاف، جنھوں نے اس کی مملکت پر قبضہ کر لیا تھا، ملکہ سے امداد حاصل کرنے کی غرض سے دہلی میں حاضر ہوا۔ وہ التونش کا دوست تھا، اور کسی وقت التونش کی سلطنت کی سرحدوں کو منگولوں کی یلغار سے بچانے میں مدد کر چکا تھا۔ اس لئے اُسے رضیہ کے تعاون کا پورا یقین تھا۔

"ملکۂ معظمہ کو اس کا علم ہوگا کہ آپ کے والد بزرگوار اور میری رفاقت نے ہندوستان کو اور آپ کی سلطنت کو منگولوں کی یلغار سے محفوظ رکھا تھا "۔ اس نے یاد دلایا۔

"مجھے اس کا علم ہے جناب والا " ملکہ نے جواب دیا۔ " اور اس کے لئے ہمارا پورا خاندان آپ کا شکر گزار ہے "۔

"اب مجھے آپ کی امداد کی ضرورت ہے۔ متحد ہو کر ہم منگولوں کی طاقت کو شکست دے سکتے ہیں، اب وہ اتنے مضبوط اور طاقتور نہیں ہیں جتنے آپ کے والد محترم کے زمانے میں تھے "۔

"مجھے یہ معلوم کر کے افسوس ہوا کہ ان وحشیوں نے آپ کے ساتھ بدسلوکی کی ہے۔ حالانکہ آپ نے ان کا اقتدار تسلیم

کر لیا تھا، انھیں آپ کے ساتھ بہتر سلوک کرنا چاہیے تھا" ملکہ نے اظہار ہمدردی کیا۔

"میں خوارزمی ہوں جو منگولوں کے پرانے دشمن ہیں۔ اس لئے منگول میرا اعتبار نہیں کر سکتے۔ اس معاملے میں انھیں قابلِ الزام نہیں سمجھتا۔ اس لئے اب مصیبت کے وقت میں ایک دوست کی طرف ہاتھ بڑھا رہا ہوں۔"

رضیہ نے اس سے ہمدردی کی اور امداد کا یقین بھی دلایا۔ لیکن ابھی بندگانِ چہل گانی سے مشورہ کرنا باقی تھا۔ حسن قرلوغ نے درخواست کی کہ اس میں تاخیر نہیں ہونی چاہیے۔ ملکہ نے اُسے اپنا ذاتی مہمان بنایا۔ اس کے اعزاز میں شاہی دعوتوں اور فوجی سلامی کا انتظام کیا گیا اور ہر طرح اس کا استقبال پر تکلف طریقے سے کیا گیا۔

اسکی درخواست پر غور کرنے کے لئے رضیہ نے بندگانِ چہل گانی کو دربار میں طلب کیا۔ اور ان کو صورت حال سے آگاہ کیا لیکن وہ منگولوں کا نام سنتے ہی خوف زدہ ہو گئے۔ منگول ناقابل شکست تھے، اور ان کے خلاف کسی قسم کے اتحاد میں شریک ہونا دانش مندی کا تقاضا نہیں تھا، رضیہ کو اس ردعمل کا پہلے سے اندازہ تھا۔ وہ جانتی تھی کہ دہلی میں عیش و آرام کی زندگی بسر کرنے والے اُمرا ایسی جان جوکھوں کی ذمہ داری لینے کو تیار نہ ہوں گے۔

"منگول بہت مضبوط اور سفاک ہیں، وہ آخر دم تک جنگ کرنے کے قائل ہیں۔ ان کو مشتعل کرنا کہاں کی عقل مندی ہے" شاہی محل کے حاجب اتیگن نے سوال کیا۔

اور بلبن نے کہا کہ "میرے نزدیک اس قسم کی امداد کی درخواست پر غور کرنا بھی دیوانگی ہے۔ منگول ہم پر حملہ نہیں کر رہے ہیں، پھر ہم انھیں حملہ کرنے کی دعوت کیوں دیں؟"

"ایک دوست کی مدد کرنے کے لئے" رضیہ نے جواب دیا۔

"یہ بہت بڑی خواہش ہے" نائب لشکر سیف الدین ایبک نے کہا۔

"کیا ہماری سپاہ کے سالار کا یہ رویّہ کچھ عجیب نہیں ہے؟" رضیہ نے دریافت کیا۔

"میں معذرت چاہتا ہوں ملکۂ معظم، میں صرف حقیقت کا اظہار کر رہا ہوں۔ آپ کے والد بزرگوار نے بھی کبھی منگولوں کو اشتعال نہیں دلایا۔ خوارزم شاہی خاندان نے سلطان کو اس آویزش میں شریک کرنا چاہا لیکن وہ نہایت دانش مندی سے کنارہ کش ہو گئے، اور اس طرح اپنی سرحدوں کو منگولوں کی یلغار سے محفوظ رکھا۔"

دربار ختم ہو گیا اور ملکہ نے اپنے چالیس اُمرا کا ردِعمل حسن قرلوغ کے سامنے پیش کر دیا۔ وہ بہت مایوس ہوا۔ اس نے رضیہ کو ایک بار پھر آمادہ کرنے کی کوشش کی لیکن ملکہ واقعی بے بس تھی۔ قرلوغ نے اُسے یہ مشورہ بھی دیا کہ وہ اپنے امرا کے مشورے کو نظر انداز کر کے اس کا ساتھ دے۔ لیکن رضیہ نے کہا کہ ایسی امداد بے سود ثابت ہو گی۔ جب تک اس کے امرا اسکی حمایت نہ کریں وہ منگولوں کے مقابلے پر صف آرا نہیں ہو سکتی۔ ایسے مضبوط اور ناقابل شکست غنیم کے مقابلے پر ایک بے دلی سے لڑنے والا لشکر زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتا۔ پھر رضیہ نے اسکو یہ بھی سمجھایا کہ "میں ایسے دشمن کو اشتعال دلانے یا ایک دم سے اس پر حملہ کرنے

کے حق میں نہیں ہوں۔"

"بات یہ نہیں ہے ملکۂ معظمہ۔ دراصل ہمیں حملہ کرنے میں پہل کرنی چاہیئے۔"

"یہ آپ کے خوارزم شاہ کر چکے ہیں اور کیا نتیجہ نکلا؟ ان کا خیال یہ تھا کہ چنگیز خاں کے سفیر کو قتل کرکے وہ اس بوڑھے جنگجو کو خوفزدہ کر دیں گے۔ لیکن اس کے برعکس ہوا کہ خوارزم شاہی سلطنت کی اینٹ سے اینٹ بج گئی اور ان کی بنائی ہوئی ایک دلکشن خیال سلطنت نیست و نابود ہوکر رہ گئی۔"

"شاید شاہ کو زیادہ محتاط ہونا چاہئیے تھا۔ لیکن کیا آپ یہ محسوس کرتی ہیں کہ جنگ سے احتراز ممکن تھا؟"

"اگر جلد بازی سے کام نہ لیا جاتا تو کم سے کم شاہ کی جنگی تیاریاں بہتر ہوتیں۔"

"چنگیز خاں بہت ہوشیار جنگجو تھا ملکۂ معظمہ۔ حالانکہ ہمارے شاہ نے میدان جنگ میں شجاعت کی داد دی، خود منگولوں نے یہ اعتراف کیا کہ "بیٹا ہو تو ایسا ہو" پھر وہ چنگیز خاں کو شکست نہیں دے سکتے تھے، لیکن اس وقت اس عظیم الشان فاتح کے بیٹے آپس میں لڑ رہے ہیں۔ حملہ کرکے ان کو ختم کر دینے کا یہی وقت ہے۔"

"مجھے یقین نہیں ہے جناب والا۔ چنگیز خاں جو سلطنت بنا گیا ہے وہ اتنی آسانی سے منتشر نہیں ہوسکتی۔ اس کی بنیادوں میں تاتاری قبائل کا خون اور پسینہ صرف ہوا ہے۔ ان کے قد چھوٹے ہیں لیکن بازو قوی ہیں، وہ بہادر اور سورما ہیں۔ اور اپنے سالار کے ایک اشارے پر آگ میں کود نے کو تیار رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی تربیت بہتر ہوتی ہے۔ ان کے اسلحہ بہتر ہیں۔ میں اس وقت ان سے جنگ مول لینا مناسب نہیں سمجھتی۔ یہ میری مخلصانہ رائے ہے۔"

رضیہ کی اس پرخلوص صاف گوئی کا حسن قرلوغ پر بہت اثر ہوا۔ اس نے محسوس کیا کہ منگولوں سے انتقام لینے کی کوشش شاید زیادہ بڑے پیمانے پر موت اور غارت گری کا باعث ہو۔ وہ ملکہ کے پاس غصہ اور نفرت کی آگ میں جلتا ہوا آیا تھا۔ لیکن زیادہ ہوشمند بنکر واپس گیا۔ اور یہ تسلیم کر لیا کہ اس وقت احتیاط ہی سب سے بڑی شجاعت ہے۔ اسکو رخصت کرتے وقت رضیہ نے اس سے اپنی دوستی کا اظہار اس طرح کیا کہ بازم کے محاصل اس کے خرچ کے لئے دے دیئے۔

پندرھواں باب

رضیہ کی تخت نشینی کو تین سال گزر چکے تھے۔ یہ تین سال مصیبتوں اور آزمائشوں کے تھے، جن میں اس کے اقتدار کو ہر طرح کی رکاوٹوں اور چنوتیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن اس نے اپنی خوش انتظامی اور تدبر اور خود اعتمادی سے اپنی ذات اور حکومت کو اور زیادہ مضبوط کر لیا۔ اپنی ساری نسوانی نزاکتوں اور کمزوریوں کے باوجود وہ ایک غیر معمولی حکمراں ثابت ہوئی۔

میدان جنگ سے حکومت کے نظم و نسق تک، اور حکومت کے انتظام سے سماجی اور معاشرتی اصلاحوں تک ہر جگہ اور ہر مقام پر وہ اپنی عظمت کی مہر ثبت کرتی رہی۔ وہ بلند نگاہ اور دور اندیش تھی۔ فیصلہ کرنے میں بے جھجک اور انھیں عمل جامہ

پہنانے میں بیباک تھی ۔ نظرتاً خوش مزاج اور خوش اخلاق تھی، لیکن سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ دوسروں کا دل جیت لینے کا سلیقہ رکھتی
تھی، تاریخ کے اوراق میں ایک سے ایک اچھی ملکہ کا ذکر ہے، لیکن رضیہ سلطانہ آپ اپنی مثال تھی ۔ اس میں ایک حکمراں کی ساری خصوصیات
تھیں ۔ خاص طور سے اس کے دل میں اپنی رعایا کے لئے بڑی جگہ تھی ۔ اور جس تن دہن کے ساتھ اس نے اپنے آپ کو رعایا کے لئے
وقف کر دیا تھا وہ صرف ایک عورت ہی کر سکتی تھی ۔
ایک بحرانی لمحے میں انھوں نے یہ سوچے بغیر اسکی تخت نشینی کی حمایت کردی تھی کہ اس
اُمرا ایسی ملکہ کے لئے تیار نہیں تھے،
دل و دماغ کی ملکہ ان کے رجعت پرست، جاگیردارانہ انداز کے لئے ایک خطرہ بن جائے گی ۔ ایک ایسے پُرخلوص انداز سے جس نے
دوست اور دشمن دونوں کو چونکادیا، رضیہ نے رفتہ رفتہ سلطنت کی شکل بدل دینے کی کوشش کی ۔ اب وہ اپنی طاقت کے لئے بندگان
چہل گانی کی محتاج نہیں تھی ۔ اس کی سب سے بڑی طاقت وہ محبت اور عقیدت تھی جو ہندو اور مسلم، اعلیٰ اور ادنیٰ ہر ایک کے دل میں اس نے
پیدا کردی تھی ۔ ان کی نظروں میں ملکہ محض الفاظ میں نہیں بلکہ حقیقت میں "زمین پر خدا کا سایہ" بن گئی تھی ۔ انتظام سلطنت،
اصلاحات، عدالتی انصاف، غرض ہر شعبہ میں ملکہ ان کی توقعات پر پوری اتری ۔ گویا ان کی امیدیں اور آرزوئیں اس کی شکل میں
مجسّم ہوگئی تھیں ۔

ایسی ہر دل عزیز ملکہ کو تخت سے اتارنا آسان کام نہیں تھا ۔ اس سے انقلاب برپا ہو سکتا تھا ۔ پھر بھی بندگان چہل گانی اپنی
ضد پر قائم رہے ۔ بلبن اور ایتگین انھیں یہ یقین دلانے میں کامیاب ہوگئے تھے کہ اگر وہ اپنی طاقت اور اقتدار کو باقی رکھنا چاہتے ہیں تو راہ سے
اس ملکہ کے روڑے کو ہٹادینے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے ۔ اس لئے اپنے منصوبے کو کامیاب بنانے کے لئے انھوں نے ایک سازش
کی اور اسکی رضیہ کو کانوں کان خبر نہ ہوئی ۔

اس سے زیادہ کمینہ پن کی سازش ممکن نہیں تھی ۔ اس کا مقصد التونیہ کو بغاوت پر آمادہ کرنا تھا، جو سیاسی اعتبار سے رضیہ سے
سب سے زیادہ قریب تھا، اور اس کے عشق میں مبتلا تھا ۔ طریقہ یہ اختیار کیا گیا کہ رضیہ اور یاقوت کے ناجائز تعلقات کی افواہوں سے التونیہ کے
دل میں زہر گھول دیا جائے ۔ شروع شروع میں تو بھٹنڈے کے صوبہ دار نے اس بے ہودہ افواہ کا یقین نہیں کیا لیکن جب اس کے جگری
دوست ایتگین نے بھی اس کی تصدیق کردی تو التونیہ کے دل میں شبہات پیدا ہوگئے ۔ ان شبہات کو رشک و حسد کی آگ میں تبدیل
کرنے کے لئے ملکہ اور یاقوت کی روزانہ ملاقاتوں کی خبریں التونیہ ہی کے آدمیوں کے ذریعے سے التونیہ تک پہونچائی جانے لگیں
جو مزے لے لے کر ان ملاقاتوں کی تفصیلات بیان کرتے تھے کہ دونوں کہاں ملے، کب ملے اور کتنی دیر تک ساتھ رہے، ان خبروں
کا اثر خاطر خواہ ہوا اور التونیہ کے دل میں حسد کی آگ بھڑک اٹھی جو نفرت، غصّے اور انتقام کا شعلہ بن کر التونیہ کو جلانے لگی ۔ اُسے یہ بھی
احساس ہوا کہ اس کے ساتھ بے وفائی کی گئی ہے ۔ اور اس طرح رضیہ نے اُسے ذلیل کیا ہے ۔ اس ذلت کا بدلہ لینے کے لئے وہ رضیہ کو
تخت سے اتارنے کے لئے بلبن اور ایتگین کے ساتھ مل گیا ۔

اس منصوبے کے مطابق التونیہ نے بھٹنڈے میں علم بغاوت بلند کرکے دہلی کی سلطنت سے الگ اپنی خودمختاری کا اعلان

کردیا ــــــــ

اس خبر سے رضیہ پر بجلی گر پڑی۔ جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے۔ آخر التونیہ اس کے ساتھ ایسی بدسلوکی کس طرح کر سکتا ہے۔ کیا یہ وہی شخص نہیں ہے جو ہمیشہ اپنی محبت اور وفاداری کا اعلان کرتا رہتا تھا اور خون کے آخری قطرے تک رضیہ کا ساتھ دینے کی قسمیں کھاتا رہتا تھا؟ کیا مرد اتنے کم ظرف ہو سکتے ہیں؟ کیا ان میں ایک کا بھی اعتبار نہیں کیا جا سکتا؟ عورت کو اس لئے حقارت سے دیکھا جاتا ہے کہ وہ کمزور دل اور غیر مستقل مزاج ہوتی ہے۔ لیکن کیا بدترین عورت بھی اس پستی تک جا سکتی ہے؟ انتہائی مایوسی کے عالم میں رضیہ نے التونیہ کی بغاوت کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ ابھی لاہور کے سفر سے تھکی ماندی واپس آئی تھی جہاں اس نے ایاز کو شکست دی تھی۔ لیکن وہ التونیہ سے جنگ کرنے پر آمادہ ہو گئی۔ وہ ۱۵ر مارچ سنہ ۱۲۴۰ء کو دہلی میں فاتح اور کامران داخل ہوئی تھی، اور اب ۳ر اپریل کو اسے پھر دارالسلطنت سے باہر جانا پڑ رہا تھا۔ اس نے شاہی لشکر کی کمان پھر خود سنبھال لی اور یاقوت کو اپنی معیت میں لے کر بھٹنڈے کی طرف کوچ کر گئی۔

یہ رمضان کا مہینہ اور گرمیوں کا موسم تھا۔ اور دہلی سے بھٹنڈے کا سفر دشوار گزار تھا۔ لیکن رضیہ التونیہ کی بغاوت سے اتنی پریشان ہو گئی تھی کہ وہ اپنا کوچ ایک دن کے لئے بھی ملتوی نہیں کر سکتی تھی۔ پہلی بار اس نے اپنا ذہنی توازن کھو دیا۔ اس کے دل کو اتنا شدید صدمہ پہنچا تھا کہ اس میں سیاسی تدبر بھی باقی نہیں رہ گیا۔

دہلی سے نکلتے وقت سپاہیوں کے حوصلے بلند تھے۔ لیکن بہت جلد روزوں کی صعوبت، راستہ کی مشکلات نے انھیں پست کر دیا۔ انھوں نے اپنے جوش و خروش کو قائم رکھنے کی کوشش کی، لیکن جسم جو روح سے زیادہ کمزور ہوتا ہے، ٹوٹنے لگا۔ میدان جنگ میں پہنچتے پہنچتے وہ تھک کر چور ہو چکے تھے۔

اس دوران میں بلبن اور اتگین نے دارالسلطنت میں اپنی تیاریاں جاری رکھیں۔ آخری وار کرنے کے لئے انھیں التونیہ کے اشارہ کا انتظار تھا۔ رضیہ کی شکست کی خبر آتے ہی وہ اس کے بھائی بہرام کو تخت پر بٹھا دیں گے۔ اتگین اور بلبن کے وفادار سپاہی مسلح تھے اور ہر طرف ناکہ بندی ہو گئی تھی۔ رضیہ کے ساتھ وفاداری کا ہر مظاہرہ کچل دیا جائے گا۔ بلبن کے انتظامات مکمل تھے۔ اتفاقات اور حادثات اس کے منصوبوں میں خلل انداز نہیں ہو سکتے تھے۔ اس کا دوست اتگین جو اس بغاوت کا اصل سرغنہ تھا کچھ مضطرب اور خوف زدہ تھا۔ اس میں بلبن کی سی خود اعتمادی نہیں تھی۔ اس لئے وہ سانس تھامے ہوئے فیصلہ کن لمحے کا انتظار کر رہا تھا۔

بھٹنڈا پہنچتے ہی رضیہ کے لشکر کو التونیہ کے لشکر کا مقابلہ کرنا پڑا۔ التونیہ کے سپاہی تازہ دم تھے اور رضیہ کے سپاہی لمبے اور دشوار سفر کی تھکان سے چور۔ دن بھی بہت گرم تھا اور رضیہ کے سپاہی پوری طرح داد شجاعت نہ دے سکے۔ حالاں کہ وہ بڑی ہمت سے لڑے، لیکن التونیہ کے سپاہی تازہ دم ہونے کے علاوہ بہتر طریقے سے منظم تھے اور ان کا پلہ بھاری رہا۔ پھر ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے رضیہ کی رہی سہی آس کو بھی ختم کر دیا۔ التونیہ کے سپاہیوں نے یاقوت کو گھیر لیا۔ اور اس کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے۔ گویا اس طرح انھوں نے اس شخص سے انتقام لے لیا جس نے ان کے مالک اور آقا التونیہ کی پیٹھ میں خنجر بھونکنے کی کوشش کی تھی۔

اس خبر نے رضیہ کے سپاہیوں کے حوصلے بالکل ہی پست کر دیے۔ ابتری پھیل گئی۔ ملکہ نے اپنے لشکر کو سنبھالنے کی

بہت کوشش کی لیکن ناکام رہی۔ سب نے ہتھیار ڈال دیئے۔ صرف وہ سپاہی آخر وقت تک بہادری سے لڑتے رہے جو براہ راست رضیہ کے زیر کمان تھے۔ لیکن جنگ کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ آخر رضیہ گرفتار کر لی گئی۔ یہ اس بہادر عورت کی پہلی شکست تھی اور ایک ایسے آدمی کے ہاتھوں جو ہمیشہ اس کے عشق کا دم بھرتا رہتا تھا۔

التونیہ ملکہ سے بہت عزت و احترام کے ساتھ پیش آیا اور رضیہ کو ایک محل میں قید کر دیا گیا، جہاں ہر طرح کے آرام و آسائش کا انتظام تھا۔ لیکن رضیہ کی آزاد اور بیتاب روح گوشۂ قفس میں آرام نہیں کر سکتی تھی۔

یاقوت کی موت کا زخم اس کے دل پر اتنا گہرا تھا کہ وہ آسانی سے نہیں بھر سکتا تھا۔ وہ بہت ضبط کرتی تھی۔ لیکن کبھی کبھی صبر کا پیمانہ لبریز ہو جاتا تھا اور آنکھوں سے آنسو چھلک پڑتے تھے۔

وہ جتنا سوچتی تھی اسکی اُداسی اتنی ہی بڑھتی تھی۔ آخر التونیہ نے یہ کیا کیا۔ اس سے تو ایسی توقع نہ تھی۔ سوالات کا ایک طومار تھا جو اس کے دل و دماغ میں موجیں مار رہا تھا۔ اور کسی سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس کا ذہن ماؤف ہو گیا ہے۔ اُسے بارہا بے وفائیوں اور غداریوں سے سابقہ پڑا تھا، لیکن التونیہ کی بے وفائی نے اس کے سارے وجود کو جھنجھوڑ ڈالا۔ کسی بڑی سازش، کسی بڑی باغیانہ تنظیم کا اُسے علم نہ تھا۔ اور نہ وہ اس سازش کے سرغنے سے واقف تھی۔ کبھی وہ اپنے آپ کو لعنت ملامت کرتی کہ اس نے ایسے بے وفا دوستوں پر بھروسہ کیا اور کبھی یہ سوچ کر خود کو تسکین دیتی کہ اگر دوست بے وفا نکل جائیں تو ایک ملکہ بھی کیا کر سکتی ہے۔ ہر طرف مایوسی کا اندھیرا تھا۔ اور اس اندھیرے میں اگر امید کی کوئی کرن تھی تو یہ کہ شاید بندگان چہل گانی میں پھوٹ پڑ جائے۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ منصب اور عہدوں کی تقسیم کے سوال پر ان چالیس امرا کا اتحاد پاش پاش ہو سکتا ہے۔ وہ آپس میں لڑیں گے تو رشک و حسد پیدا ہو گا اور نئے نئے رفقائے کار کی تلاش ہوگی۔ نئی سازشیں، نئی ٹولیاں، بنیں گی۔ اس انتشار کے عالم میں رضیہ اپنا اقتدار حکومت پھر حاصل کر سکتی تھی۔

لیکن اس وقت تو وہ التونیہ کی قیدی تھی، اور بالکل بے دست و پا تھی۔ اُس کے اور باہر کی دنیا کے درمیان زنداں کی دیواریں حائل تھیں۔ اُسے کچھ خبر نہیں تھی کہ دہلی میں کیا ہو رہا ہے۔ ہر طرف مایوسی کا اندھیرا تھا۔ اور وہ اس اندھیرے میں بھٹک رہی تھی۔ پھر بھی ایک آس تھی کہ کچھ نہ کچھ ضرور ہو رہا ہے گا۔ اور وہ اس قعرِ ذلت سے باہر نکل آئے گی۔ اس کی رعایا اُٹھ کھڑی ہوگی، اس کے حامی اور طرفدار بغاوت کر دیں گے، بھلا اتنی عظیم الشان ملکہ کو کوئی اس طرح قید کر سکتا ہے۔ رضیہ کو کبھی ماضی یاد آتا کبھی وہ اپنے مستقبل سے پریشان ہونے لگتی۔ وہ بڑی بے چینی سے اُمید کی کسی نئی کرن کے پھوٹنے کا انتظار کر رہی تھی، لیکن بے سود، معلوم ہوتا تھا کہ اس کی دنیا ختم ہو گئی ہے۔

یکایک دہلی میں ایک غیر متوقع صورتِ حال پیدا ہوئی۔ اپنے فیصلہ کے مطابق بندگان چہل گانی نے رضیہ کی گرفتاری کی خبر سنتے ہی اس کے چھوٹے بھائی بہرام کو تخت پر بٹھا سلطان بنا کر بٹھا دیا۔ سازش کے سرغنے کی حیثیت سے اتگین نائب مملکت بنا اور سارے اختیارات اپنے ہاتھوں میں لے لئے۔ تاجپوشی کے موقع پر بلبن سمیت دوسرے اُمرا کو بھی بڑے بڑے

عہدے اور اہم منصب عطا ہوئے۔ وہ لوگ جن پر رضیہ سے وفاداری کا ذرا سا بھی شبہ تھا یا تو تہہ تیغ کر دیئے گئے یا دولت اور اقتدار سے محروم کر دیئے گئے۔ اس طرح انتقامی کارروائی مکمل ہو چکی تھی۔

لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا گیا اتیگن کی بڑھتی ہوئی طاقت کی وجہ سے اُمرا کی رقابت بڑھتی چلی گئی، حد یہ ہے کہ بلبن اور اتیگن کی دوستی بھی سرد مہری میں تبدیل ہو گئی۔ رضیہ کے خلاف سازش کے وقت تو دونوں متحد ہو سکتے تھے، لیکن اقتدار کی ہوس انھیں متحد نہ رکھ سکی دونوں میں سے ایک ہی حکومت کر سکتا تھا، ایک میان میں دو تلواریں ناممکن تھیں۔ اس وقت بلبن زیادہ چالاک ثابت ہوا۔ اس نے اتیگن کے خلاف نئے سلطان کے کان بھرنا شروع کئے۔ سلطان بھی اتیگن کی بڑھتی ہوئی طاقت سے خوفزدہ ہو گیا۔ اتیگن کے محل میں نوبت بجنے لگی تھی اور دروازے پر ہاتھی جھوم رہا تھا۔ یہ صرف سلطان کا حق تھا جسے اتیگن نے اپنے لئے حاصل کر لیا تھا۔

اُس نے سلطان کی ایک مطلقہ بہن سے شادی بھی کر لی۔ غرض ایک شبہ کے بعد دوسرا شبہ بڑھتا گیا اور غلط فہمی بے اعتباری میں تبدیل ہو گئی۔ اس وقت بلبن نے سلطان سے مل کر اتیگن کو قتل کرنے کی سازش کی۔ ایک دن دو لحیم شحیم مضبوط بازوؤں کے ترک اس کام کے لئے مقرر کئے گئے کہ جب نائب مملکت محرم کی مجلس کے بعد قصر کی بالائی منزل سے نیچے اترے تو اُسے موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔ اس ہولناک قتل نے امرا کے دل دہلا دیئے لیکن چونکہ وہ خود اتیگن کی بڑھتی ہوئی طاقت کو حاسدانہ نظروں سے دیکھتے تھے اس لئے انھوں نے کسی قسم کے ردِّ عمل کا اظہار نہیں کیا۔ لیکن پھر بھی بلبن مقتول نائب کی مسند پر قابض نہ ہو سکا ابھی اُسے برسوں انتظار کرنا تھا۔ اس کی جگہ نئے سلطان نے امیر بدرالدین رومی کو نائب مملکت مقرر کیا۔

التونیہ بھی نئے سلطان سے انعام و اکرام کی آس لگائے ہوئے تھا کیونکہ اس نے تن تنہا رضیہ کو زیر کیا تھا۔ لیکن اسکی آس بے سود ثابت ہوئی۔ دہلی میں امرا نے تمام عہدے اور منصب آپس ہی میں بانٹ لئے، انھیں اپنی پڑی ہوئی تھی۔ اتنے دُور بیٹھے ہوئے التونیہ کی کسے فکر تھی۔ اتیگن جس نے التونیہ کو بہت کچھ دینے کا وعدہ کیا تھا خود مارا جا چکا تھا۔ اس لئے نئے سلطان اور دہلی کے اُمرا کی طرف سے مایوس ہو کر التونیہ نے وقت ضائع کئے بغیر دوسرا راستہ اختیار کیا۔

اس نے قید خانہ میں جا کر رضیہ کی دلجوئی شروع کی۔ نہ جانے کیوں رضیہ کو یہ پیش قدمی ناگوار نہیں گزری۔ التونیہ کا حوصلہ اور بڑھا اور اس نے عاشقانہ انداز اختیار کر لیا۔ اسکی فراخدلی، شجاعت اور دلجوئی کے انداز نے رضیہ کو جیت لیا اور دونوں کے درمیان ایک نازک اور خوبصورت رشتہ قائم ہو گیا۔ اب وہ دونوں روز ملتے تھے، شروع شروع میں ان کی گفتگو محتاط تھی، لیکن آہستہ آہستہ بند ٹوٹنے لگے اور بہت جلد دونوں یہ محسوس کرنے لگے کہ ان میں مخالف حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے نیا حوصلہ پیدا ہو رہا ہے اور اگر اس وقت دونوں ایک ہو جائیں تو وقت کے دھارے کا رُخ پھیرا جا سکتا ہے۔ یہ کہنا مشکل تھا کہ یہ اتحاد ناسازگار حالات کا نتیجہ تھا، یا واقعی دونوں کے دلوں کی دھڑکنیں ہم آہنگ ہو گئی تھیں۔ لیکن اس جذباتی بحران کی کیفیت میں جو دونوں ایک دوسرے کے لئے پیدا کر رہے تھے، قسمت نے دونوں بچھڑے ہوؤں کو پھر سے ملا دیا۔ اب ان کے پاس ماضی کی تلخیوں کو نظر انداز کر دینے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ حال اور مستقبل زیادہ اہم تھے، ان کا ایک لمحہ بھی نہیں ضائع ہونا

چاہیے۔ اور آخر مفتوح ملکہ اس باغی سے شادی کرنے پر آمادہ ہوگئی جو اُسے تخت و تاج سے محروم کرنے کا ذمہ دار تھا۔ تقدیر اور حالات کی کرشمہ سازیاں بھی عجیب و غریب ہوتی ہیں۔

سولھواں باب

رضیہ نے قید خانے کے باہر پہلی رات گزاری۔ "کتنی خوب صورت صبح ہے" اس نے کہا۔ اُس کے لہجے میں وہی شاہانہ تمکنت تھی جو ایک سلطانہ کے شایاں شان ہے۔ لیکن نئے جذبات کے طوفانی اثرات اس کے چہرے پر موجود تھے جواب اپنی پہلی سی تابناکی کے ساتھ جگمگا رہا تھا۔ جیسے بہت سی تھکا دینے والی پریشانیوں کے بعد کوئی آرام کرکے اٹھا ہو، رضیہ ایک تساہل کی کیفیت میں مبتلا تھی اور اس کے دل میں مسرت کی ہلکی ہلکی راگنی سی تیر رہی تھی۔

التونیہ کے دل کا ساز بھی رضیہ کے ساز سے ہم آہنگ تھا حالانکہ دونوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ رضیہ سنجیدگی اور تمکنت کی تصویر تھی۔ جبکہ التونیہ شگفتہ مزاج اور پرحوصلہ تھا۔ دونوں شادی کے رشتے میں منسلک ہونے والے تھے لیکن اس سے بھی زیادہ اہم ان کا سیاسی مستقبل تھا۔ دل کی وہ دھڑکنیں جو انھیں پہلے کبھی قریب لائی تھیں اب باقی نہیں تھیں، لیکن اب یہ خیال دونوں کو ایک بنا رہا تھا کہ وہ ایک دوسرے کے لئے مفید ثابت ہوسکتے ہیں۔ اتحاد ان کی اصلی طاقت تھا۔

اُن کے طرف دار بھی خوش تھے، الگ الگ رہ کر وہ مرکز سے نہیں لڑ سکتے تھے، لیکن متحد ہوکر وہ مرکز کو زیر کرسکتے تھے، اس لئے وہ اس شادی کا نہایت پرجوش خیر مقدم کر رہے تھے، بڑی پرشکوہ تیاریاں کی گئیں تاکہ یہ واقعہ سیاسی اعتبار سے فائدہ مند ثابت ہوسکے، ہزاروں بڑے اور چھوٹے، اہم اور غیر اہم لوگ دور دور سے آکر اس تقریب میں شریک ہوئے، انھوں نے نئے جوڑے کو تہہ دل سے دعائیں دیں، ان کی نظروں میں ترک امرا کا اس سے بہتر اتحاد ممکن نہیں تھا۔

شادی کی تمام رسمیں خوش اسلوبی سے ادا ہوگئیں، لیکن ظاہری سکون کی تہہ میں ایک ہیجانی کیفیت پوشیدہ تھی۔ اس رشتے پر ماضی کی پرچھائیاں اب بھی پڑ رہی تھیں۔ رضیہ مسرور نظر آرہی تھی لیکن وہ دل ہی دل میں سوچ رہی تھی کہ یہ شادی کامیاب بھی ہوگی یا نہیں، اسکی بنیاد استوار رہے یا نہیں۔ التونیہ اپنی نئی مسرت کے جامے میں خود اعتمادی اور طاقت کا مجسمہ نظر آرہا تھا۔ رضیہ اسکی طرف دیکھ کر سحور سی ہوجاتی تھی۔ یکایک التونیہ کا بازو پکڑ کر وہ اس کے بالکل قریب آگئی۔ اس نے اُسے جب اپنی آغوش میں کھینچنا چاہا تو رضیہ نے تڑپ کر نکل جانے کی کوشش کی لیکن التونیہ کی گرفت مضبوط تھی۔

"رضیہ جو ہونا تھا ہوچکا، اب ہمیں نئی زندگی شروع کرنا ہے" التونیہ نے کہا۔

رضیہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی کا یہ لمحہ صدیوں طویل معلوم ہو رہا تھا۔ پھر وہ یکایک اس سے لپٹ گئی اور التونیہ نے بڑی محبت سے اُسے اپنے سینے سے لگالیا۔

یہ دونوں کے لئے ایک نئی زندگی کی ابتدا تھی، التونیہ یہ سوچ کر کچھ شرمندہ ہوگیا کہ اس نے ملکہ کے ساتھ زیادتی کی تھی

اور اس کا دل دکھایا تھا، وہ کتنی پُرتمکنت اور پُرخلوص تھی کتنی سمجھدار تھی، اس کی قربت سے التونیہ کے اندر ایک نرمی اور لطافت پیدا ہوگئی اور اسکی نظروں میں رضیہ کی عزت بڑھ گئی۔

چند دن شادی کی رنگ رلیوں میں گزرے۔ بھٹنڈے کی دولت جتنی آرائش، جتنی شان و شوکت فراہم کرسکتی تھی وہ سب محل کی دعوت میں جمع تھی۔ مہمانوں میں بڑے بڑے وجیہہ خاندانوں کے وارث، فوجوں کے کماندار اور مختلف شعبوں کے عہدے دار شریک تھے۔ رضیہ اپنے لباس عروسی میں جگمگا رہی تھی۔ یہ کہنا مشکل تھا کہ زیور اس کے حسن میں اضافہ کررہے ہیں۔ یا اسکی خوب صورتی زیوروں کی جوت جگا رہی ہے، اور التونیہ کی مسرت کی تو کوئی حد و انتہا نہیں تھی۔ وہ اس وقت عظیم التمش کی بیٹی کا محافظ اور ہندوستان کی ملکہ کا شوہر تھا۔

"ہم بہت جلد دہلی کا تخت حاصل کرنے کے لئے روانہ ہوں گے۔" اس نے فخریہ انداز میں اتنی بلند آواز سے کہا کہ سارے مجمع نے اس کے الفاظ سنے۔

رضیہ نے خاموشی سے اسکی طرف دیکھا۔ التونیہ کی آنکھوں میں ایک ایسی آگ روشن تھی، جو اس سے پہلے کسی مرد کی آنکھوں میں نظر نہیں آئی تھی۔ اس وقت رضیہ نے محسوس کیا کہ التونیہ کا فیصلہ کتنا اٹل ہے۔ لیکن دہلی پر یلغار کرنے سے پہلے وہ دشمنوں کے منصوبے معلوم کرنا چاہتی تھی۔ حالانکہ اطلاع حاصل کرنا آسان نہیں تھا، اور التونیہ کے جاسوس ناکارہ تھے پھر بھی رضیہ نے اپنے قابل اعتماد غلاموں کے ذریعے بہت سی معلومات فراہم کرلیں۔ اسکی شادی نے نئے سلطان بہرام کو پریشان کردیا تھا۔ اور امرار کو اپنا مستقبل ڈانوا ڈول نظر آرہا تھا، صرف اس کا تراب دار مطمئن اور پُرسکون تھا۔ وہ نئے حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے فراست، تدبر، اور ہمت سے کام لے رہا تھا۔ اس نے سلطان کو اس نئے خطرے سے آگاہ کیا اور اس کا مقابلہ کرنے پر آمادہ کیا۔ اور فوراً فوجیں جمع کرنے کا اعلان ہوگیا۔ اُمرا سے کہا گیا کہ وہ متحد ہوکر رضیہ اور التونیہ کی متحدہ طاقت کو شکست دینے کے لئے سلطان کا ساتھ دیں۔ مدافعت کی تیاری کے بجائے حملے کی تیاری شروع کی گئی فیصلہ یہ ہوا کہ دہلی میں رضیہ کے آنے کا انتظار اور اس سے جنگ کرنے کے بجائے خود رضیہ اور التونیہ کی فوجوں کے خلاف ہلہ بول دینا چاہیے اور دارالسلطنت سے دور کسی دوسرے میدان جنگ میں لڑائی ہونی چاہیے۔

اس تدبیر میں ایک راز تھا، دہلی میں رضیہ کی مقبولیت کا سب کو علم تھا۔ اگر وہ دہلی پہونچ گئی تو عوام اسکی حمایت پر اُٹھ کھڑے ہوں گے، فوجی رہنما کی حیثیت سے التونیہ کا مدمقابل کوئی نہیں تھا۔ اسکی پیش قدمی، تیز رفتاری اور ضرب کاری کا جواب نہیں تھا۔ اسکو زیر کرنے کی صرف ایک ترکیب تھی، اور وہ یہ کہ پہلے ہی حملے میں اُسے دبا لیا جائے۔

بلبن نے سلطان کو تمام داؤں پینچ سمجھا کر شاہی لشکر کی رہنمائی کرنے پر آمادہ کیا۔ اُن کی تنظیم اور تیاری ہر طرح سے مکمل تھی، اور فتح حاصل کرنے کا تہیہ ناقابل شکست۔ کیونکہ یہ حملہ دہلی پر نہیں تھا بلکہ بندگانِ چہل گانی کے وجود پر حملہ تھا۔ انھیں معلوم تھا کہ اگر رضیہ اور التونیہ جیت گئے تو سلطان اور بلبن اور اُمرا کسی کی خیر نہیں ہے۔ نہ ان کی جتھہ بندی باقی رہے گی نہ وہ چند سری نظام جسے انھوں نے اتنی چالاکی سے قائم کیا تھا۔ ان کا سب کیا دھرا ملیامیٹ ہوجائے گا۔

دلی کے غاصبوں کو کچلنے اور التمش کے تخت کو دوبارہ حاصل کرنے کے لئے رضیہ اور التونیہ بھی کچھ کم بے چین نہیں تھے،

ان کا لشکر بھی کم نہیں تھا، التونیہ کی سپاہ مستقل سپاہیوں پر مشتمل تھی اور پوری طرح منظم تھی۔ اور بہترین افسروں کی سرکردگی میں کوچ کر رہی تھی، حالانکہ بھٹنڈے کی شکست کے بعد رضیہ کی سپاہ منتشر ہو چکی تھی مگر اُسے دوبارہ منظم کر کے لیس کر دیا گیا۔ اس کے علاوہ دو طاقتور امیر ملک قراقش اور ملک سالاری بھی اپنے اپنے لشکر لے کر آ گئے تھے، وہ سلطنت کے انتظامات سے بدظن تھے، اس لئے رضیہ اور التونیہ کی امداد پر کمربستہ ہو گئے تھے۔

اُن کی ہمت افزائی کا ایک اور باعث ہندو آبادی کی حمایت تھی۔ خاص طور سے کھوکر، جاٹ اور راجپوت۔ وہ رضیہ کی آواز پر اٹھ کھڑے ہوئے۔ کیونکہ ان کے لئے وہ انصاف، مہربانی اور غیر جانبداری کا مجسمہ تھی، جس نے تن تنہا چالیس امرا کے جتھے بندگان چہل گانی کے خلاف جدوجہد کی تھی۔ تاکہ اس آسمان کے نیچے ہندو بھی عزت اور آبرو کی زندگی بسر کر سکیں۔ اس کی یا د ان کے دل میں شکر گزاری کا جذبہ بن چکی تھی۔ اس نے جزیہ معاف کر دیا تھا۔ اُسے ہندو راجاؤں کے ساتھ مل جل کر راج کرنے کی تمنا تھی۔ وہ ان کو معاشی مصائب سے نجات دلانے کے لئے اور ان کی شکایات دور کرنے کے لئے ہر وقت تیار رہتی تھی اور اس کا عقیدہ یہ تھا کہ حاکم اور محکوم دونوں ایک دوسرے کے محتاج ہیں اور ان کی بقائے باہمی کی بنیادیں صرف انصاف اور مساوات پر استوار ہو سکتی ہیں۔ اس لئے اب مصیبت اور امتحان کے وقت ہندو رعایا اس کے گرد ہزاروں کی تعداد میں جمع ہو گئی اور دلی کے تخت پر اس کے حق کے لئے انھوں نے تلواریں کھینچ لیں۔

رضیہ پہلی مسلم حکمران تھی، جس نے مقامی ہندو آبادی کو مسلم حکمران طبقے کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی، پہلی بار اس نے یہ محسوس کیا کہ سلطنت کے پُرامن اور دیرپا استحکام کے لئے یہ ضروری تھا کہ اس کے انتظام میں ہندو بھی شریک ہوں اور ہندو راجاؤں کو وہ عزت و احترام دیا جائے جس کے وہ مستحق ہیں۔

پہلی بار اس نے اپنے امرا کو یہ احساس دلایا کہ رعایا کی خوشنودی سلطان کا بہترین تحفظ ہے۔ اور اس لئے اس نے اپنی رعایا کو مہربانی اور مفاہمت کے حلقے میں لے لیا۔ لیکن افسوس کی بات ہے کہ ایسی فراخدل اور روشن دماغ ملکہ صرف ساڑھے تین سال تختِ حکومت پر بیٹھ سکی۔

ایسی ملکہ دلوں پر کیوں نہ حکومت کرے گی۔ آج جب وہ سپہ جری اور سورما شوہر التونیہ کی معیت میں دلی پر یلغار کر رہی تھی تو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے فتح و نصرت ان کے ساتھ چل رہی ہے۔ لیکن قسمت کی کمیں گاہ میں کچھ اور تیر بھی تھے، ابھی ان کی فوجوں نے بھٹنڈے سے دلی تک آدھا ہی فاصلہ طے کیا تھا کہ شاہی لشکر نے ان پر حملہ کر دیا۔ گھمسان کی لڑائی ہوئی اور دونوں طرف سے دادِ شجاعت دی گئی۔ لیکن آخر کار شاہی لشکر نے رضیہ اور التونیہ کی فوجوں پر غلبہ حاصل کر لیا۔

شاہی لشکر نے رضیہ اور التونیہ کی فوجوں کو شمال اور جنوب دو طرف سے گھیرا۔ اور پھر سلطان کی سرکردگی میں میسرا دستہ آیا اور محاصرہ مکمل ہو گیا۔ تعداد اور ہتھیار دونوں اعتبار سے شاہی لشکر کو فوقیت حاصل تھی۔ تربیت اور تنظیم بھی بہتر تھی۔ اس کے علاوہ رضیہ اور التونیہ کے پاس محفوظ دستے بھی نہیں تھے، جن سے آخر وقت میں کام لیا جاتا ہے۔ جنگ کا فیصلہ چند ہی دن میں ہو گیا۔ رضیہ

اور اس کے بہادر شوہر نے دیکھا کہ ان کی فوج کا میمنہ اور میسرہ دونوں شاہی لشکر کی زد میں ہیں۔ دشمن کی گھاتیں کامیاب ہو گئی تھیں۔ اور ان کی شکست یقینی تھی۔

رضیہ سے ہتھیار ڈالنے کو کہا گیا لیکن اس نے انکار کر دیا۔ اس شکست کے بعد وہ زندہ رہ کر کیا کرے گی؟ جن اصولوں کے لئے وہ زندہ تھی وہ اسکی آنکھوں کے آگے ایک ایک کرکے پامال کئے جاچکے ہیں۔ دوسرے اس نے دیکھا کہ التونیہ بھی نرغے میں ہے، اس سے بھی کہا گیا کہ وہ اگر سپر ڈال دے تو اس کا جرم معاف کر دیا جائے گا۔ ایک لمحے کو اس نے کمزوری دکھائی اور تذبذب محسوس کیا، لیکن رضیہ پر نظر پڑتے ہی اس کے خون میں نیا ابال آگیا۔ وہ ایک زخمی شیر کی طرح دشمن پر جھپٹا اور میدان جنگ میں بہادروں کی طرح جان دیدی۔

رضیہ کی نظروں میں اسکی عزت بڑھ گئی۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ ایک غازی اور سورما کی رفیق زندگی تھی۔ اس طرح جان دے کر اس نے اپنے گناہوں کو اپنے خون سے دھو دیا تھا۔ یہ رضیہ کے لئے ایک افتخار کا لمحہ تھا، اور اس کا سر سجدۂ شکر میں جھک گیا۔ اسکی پشت پر جو چند تیغ آزما تھے وہ بھی ایک ایک کرکے قتل ہو گئے۔ لیکن ملکہ کی جنگ جاری رہی۔ آخری وقت جتنا قریب آرہا تھا اس کا حوصلہ اتنا ہی بڑھتا جارہا تھا۔ اب وہ تلواروں کے سیلاب میں تیر رہی تھی۔ تیروں کی بوچھار میں نہا رہی تھی۔ آخر ایک تیر اس کے سینے میں آکر لگا اور دل کو توڑ کر نکل گیا۔ اور رضیہ کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ یہ ۱۳ اکتوبر ۱۲۴۰ء کا دن تھا۔

اس طرح ایک بے مثل ملکہ کا دور ختم ہو گیا۔ وہ ملکہ جس کی ذات میں حکمرانی اور رہنمائی کے بہترین جوہر جمع ہو گئے تھے یہ پوچھنے کے بجائے کہ اس نے فلاں فلاں کام کیوں نہیں کئے، اس پر حیرت کرنے کی ضرورت ہے کہ اتنی ذرا سی مدت میں اس نے اتنے سارے اچھے کام کیسے انجام دیئے۔ فرشتہ کی طرح بعض مورخین ہیں جنھوں نے اس کے دامن عصمت کو داغدار دیکھا ہے، اور زبان طعن دراز کی ہے۔ لیکن دوسرے مورخین کی شہادت پر یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچ چکی ہے کہ رضیہ یاقوت کے معاملے میں بھی پاک دامن تھی۔ اس کے کردار پر کوئی دھبہ نہیں ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ بہت سے معاملات میں وہ اپنے عہد سے بہت آگے تھی، اس کے پاس ایک ایسی وسعت نگاہ تھی جس سے اس کے تنگ دل اور تنگ نظر امرا محروم تھے، اس کی آزاد منش رواداری قرون وسطی کے لئے اجنبی تھی، اسکی بے تعصب آزاد خیالی اور فراخ دلی اُن اندھیرے دنوں کے لئے بیگانہ تھی۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ منصف مزاج تھی اور سب کے ساتھ مساوی برتاؤ کرنے کی قائل تھی۔ وہ اپنی رعایا کے لئے ایک شفیق ماں کی طرح تھی، جو پیار بھی کرتی ہے اور تادیب بھی۔

رضیہ نوعمری میں رخصت ہو گئی۔ وہ اگر اور زندہ رہتی اور اس کا عہد حکومت ذرا طویل ہوتا تو مغل اعظم اکبر کے بجائے اس کا نام قومی یکجہتی کی بنیاد ڈالنے والے پیشرو کی حیثیت سے ہندوستانی تاریخ کے اوراق پر سونے کے حروف سے لکھا جاتا، موت کے وقت وہ تیس سال کی بھی نہیں تھی۔ اس کے ساتھ ایک دلنواز شخصیت، ایک خوبصورت ذہانت، ایک گہری دانشمندی، ایک متحرک طاقت اور ایک آہنی عزم و استقلال رخصت ہو گیا۔ وہ ایک کمزور عورت تھی جو مردوں کی ہیبتناک دنیا میں جہاں انسان انسان پر ظلم کرتا ہے ایک لطیف انسانیت کا جذبہ لے کر آئی تھی۔ اس نے عام زندگی میں

شرافت اور پاکیزگی داخل کرنے کی کوشش کی اور قرونِ وسطیٰ کی راتوں میں تہذیب کا شعلہ روشن کیا۔

تلخیص و ترجمہ

سردار جعفری

تین غزلیں، چار نظمیں

کاشانۂ دل میں جب سے تو ہے
تازہ و گل رنگ رخساروں کے بیچ
ترا نام سنتے ہی دل کانپتا ہے

مارلن منرو
جشنِ بہاراں
آج
سارنگی

سکندر علی وجد

○

کاش نہ دل میں جب سے تو ہے
ہر وقت خموش گفتگو ہے

جلووں میں اسیر ہیں نگاہیں
فردوسِ خیال روبرو ہے

وہ نقشِ حسیں، غزل سراپا
ہر خط میں رواں جواں لہو ہے

کل تک جسے، تیری جستجو تھی
آج اس کو خود اپنی جستجو ہے

اے موجِ صبا، ادب سے چلیو!
گلزار، حریمِ رنگ و بو ہے

کانٹوں میں جو ہنس رہا ہے پیہم
وہ پھول، چمن کی آبرو ہے

آئینہ رخوں کی بے نیازی
اے وعدہ، حجابِ آرزو ہے

○

(نذرِ سودا)

تازہ و گل رنگ رخساروں کے بیچ
کٹ رہا ہے وقت انگاروں کے بیچ

دل بروں کے ساتھ یارِ خوش ادا
چودھویں کا چاند ہے تاروں کے بیچ

عمر بھر ہر زخمیِ تیرِ نظر
بے خطر پھرتا ہے تلواروں کے بیچ

درد کم کرتے نہیں بیمار دار
غم سوا ہوتا ہے غم خواروں کے بیچ

زندگی کی قدر ہو سکتی نہیں
موت کے ویران بازاروں کے بیچ

عزمِ آزادی کا شعلہ دم بہ دم
رقص کرتا ہے گرفتاروں کے بیچ

گل فشاں ہے صورتِ موجِ صبا
امن کی آواز خوں خواروں کے بیچ

آدمی علم و عمل کے زور سے
کر رہا ہے سیر سیاروں کے بیچ

سیکھ لو، سچی عبادت زاہدو
چار دن رہ کر گنہ گاروں کے بیچ

بے تکلف مسکراتے ہی رہے
پھول کے مانند ہم خاروں کے بیچ

جانتے ہیں کچھ وہی جینے کا فن
مست رہتے ہیں جو ہشیاروں کے بیچ

دل ہو آئینہ تو آتا ہے نظر
وصل کا اقرار انکاروں کے بیچ

ہر غزل بنتی ہے شمشیرِ دو دم
حسن اور الفت کے گل زاروں کے بیچ

کیا لٹائی ہے سخن کی چاندنی
وجدؔ صاحب تم نے مہ پاروں کے بیچ

○

ترا نام سنتے ہی دل کانپتا ہے
اگر یہ محبت نہیں ہے تو کیا ہے

ہر انداز اُس شوخ کا دل ربا ہے
نظر دل نشیں ہے، سخن دل کشا ہے

رہِ زندگی سے جو گزرے غزل خواں
اُن آوارہ لمحوں کو جی ڈھونڈتا ہے

نہ دل دار کوئی، نہ جاں باز کوئی
الٰہی! زمانے کو کیا ہو گیا ہے

محبت ہی جادہ، محبت ہی منزل
یہی ابتدا ہے، یہی انتہا ہے

جہاں حد ہے احساس اور آگہی کی
وہیں تک خودی ہے، وہاں سے خدا ہے

اسی لطف سے وجد سرشار ہے دل
خوشی دینے والے نے غم دے دیا ہے

مارلن منرو

نشۂ ناز میں سرشار سنہری ناگن
سر بسر ایک لپکتا ہوا شعلہ جیسے
ہر قدم ساتھ پریشان دھڑکتے ہوئے دل
ہر طرف راہ میں مشتاق نگاہوں کی قطار
رنج بے نام کی رنگین اداؤں میں جھلک
وہ لپکتا ہوا موسم وہ مہکتی ہوئی رات
وہ بلکتا ہوا ارماں وہ سلگتا ہوا جسم
گھپ اندھیرے میں بھٹکتے ہوئے جگنو کی طرح
ایک غمخوار کسی مونس محرم کی تلاش
یاس کا زہر سکوں سوز رگ و پے میں رواں
ناگہاں خوف نے اک خواب گراں بخش دیا
زندگی درد کی زنجیر نہ ہونے پائی!

مشہور و مقبول امریکی ایکٹرس مارلن منرو (۱۹۲۶ - ۱۹۶۲ء) نے مستقل تنہائی اور غیر یقینی مستقبل کے خوف سے مجبور ہو کر خود کشی کر لی تھی۔

۲ وی نس (Venus) حسن اور محبت کی دیوی۔ جس کے دو مجسمے، ایک یونانی اور دوسرا فرانسیسی پیکر تراش کا کے شاہکار سمجھے جاتے ہیں۔

جشنِ بہاراں

آیا ہے خوشیوں کا موسم ختم ہوئے آثارِ شبِ غم
بھینی بھینی مست ہوائیں ہلکے بادل، بارش کم کم
سورج کی کومل کرنوں سے چھوٹ رہا ہے سونا ہر دم
موجِ صبا نے صحنِ چمن میں لہرائے پھولوں کے پرچم
فرشِ زمیں پُرنور و معطر موجِ حریر و مخمل و ریشم
غنچے مسکے، بھونرے بہکے سارا میخانے کا عالم
مطربِ دلکش رول رہا ہے صبح کے میٹھے راگ میں سرگم
ساقی مہ وش، جوشِ طرب میں بخش رہا ہے دولتِ بے غم
پیمانوں میں لعلِ مصفّا تختۂ گل پر شعلہ و شبنم
ساغر و مینا زمزمہ پیرا گیت کی لَے پر مدھم مدھم
جشنِ بہاراں، محفلِ یاراں رقصِ نگاراں، نغمۂ پیہم
ساز کی گت پر بول رہے ہیں پایل چھن چھن، گھنگھرو چھم چھم
مجمعِ خوباں، شاد و غزلخواں رسمِ تکلف درہم، برہم
چست قبائیں، شوخ ادائیں عارضِ گلگوں، گیسوئے پُرخم
مدھری آنکھوں میں رقصاں ہے دل داری کا عزمِ مصمم
لرزاں ہے جاں بخش لبوں پر حرفِ تمنا، مبہم مبہم
گرم نگاہیں، ٹھنڈی آہیں کیفِ مسلسل عیشِ دمادم
زندہ دلوں کو عید مبارک حسن و جوانی مونس و محرم
عشرت کا ہر خواب مشکّل لطف کے سب ارمان مجسّم
بے ہوشی میں شرطِ مسرت اب کیوں ہوش میں آئیں گے ہم

اہلِ جنوں، فردوس بداماں
اہلِ خرد، فی نارِ جہنم

آج

آج پر نظر رکھو!

اصل زندگی ہے یہ دورِ مختصر اس کا
تابناک و بے پایاں وقت کے اندھیرے میں
گم ہوا گزشتہ کل خواب، آنے والا کل

آج پر نظر رکھو!

اس طلسمِ حیرت میں عہد آفریں ماضی
جان دار مستقبل ارتقا کا ہر منظر
قافلے مسرت کے نوجواں، حسیں، دنیا

آج پر نظر رکھو!

سارنگی

دم سازِ ہزار داستاں ہے
یہ سوز و گداز کا جہاں ہے
نیرنگِ سرور و شادمانی
ہر بول میں اک نئی کہانی
ہر تان پہ عکسِ آرزو کا
بے لفظ مزہ ہے گفتگو کا
ہر سُر کی صدا کھنک رہی ہے
لہجے میں دھنک لچک رہی ہے
دھیمی صد رنگ آنچ لَے کی
زندہ تصویر کیفِ مَے کی
پردوں سے نکل کے موجِ سرگم
خوابوں کو جگا رہی ہے پیہم
آواز کے زیر و بم سے مِل کے
لرزاں ہیں تمام تار دل کے
راگوں کے جو دَور چل رہے ہیں
یادوں کے چراغ جل رہے ہیں
رکھتا ہے نشاط و غم پہ قابو
سنگیت کا بے پناہ جادو
سنگین سماں بدل گیا ہے
ہر درد خوشی میں ڈھل گیا ہے

اسلوب احمد انصاری

احمد ندیم قاسمی اور اُردو افسانہ

پریم چند کے دَور کے بعد جن افسانہ نگاروں نے اُردو افسانے کی روایت کو آگے بڑھایا، اور اسے سستے پروپیگنڈے کا آلۂ کار نہ بناتے ہوئے زندگی اور سماج کی سنجیدہ فنی تنقید کے لئے استعمال کیا۔ اُن میں احمد ندیم قاسمی کا نام ایک امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ اُردو افسانے نے بتدریج نہیں بلکہ حیرت انگیز تیزی کے ساتھ ترقی کی بہت سی منزلیں ایک ہی جست میں طے کی ہیں۔ اور اس کے نشو و ارتقا میں غیر ملکی افسانوں کے ترجموں اور خود یہاں کی سرعت سے بدلتی ہوئی معاشی اور اجتماعی زندگی کے حالات نے خاصا حصہ لیا ہے۔ افسانے کا فن بڑا ریاض چاہتا ہے۔ اس میں ایک منفرد تجربہ، مشاہدہ کی ایک قاش، تاثر کی ایک تھرتھراتی شعاع ہی پیش کی جاتی ہے۔ لیکن یہ تجربہ، یہ مشاہدہ، یہ تاثر ایک جامِ جہاں نما ثابت ہوتا ہے۔ جس کی تجسیم کے وسیلے سے حقیقت کے بے شمار گوشے سمٹ کر روشنی میں ابھر آتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر یہ کہہ سکتے ہیں کہ افسانہ نگار زندگی کے خلفشار میں سے چند جاذب نقطوں کو چن کر علیحدہ کر لیتا ہے اور پھر انہیں ایسی دل آویزی اور شدتِ تاثر اور قطعیت کے ساتھ نمایاں کرتا ہے کہ پڑھنے والا ان پر بڑی خارجی اور اندرونی حقیقتوں کا قیاس کر سکے۔ غالب کے الفاظ میں قطرے میں دجلہ کا نظارہ کرنا اور دوسروں کو کرانا افسانہ نگار کے لئے ایک بنیادی فنی تقاضا ہے۔

جیسا کہ اوپر کہا گیا، ندیم قاسمی کے یہاں شروع ہی سے ایک سنجیدہ مقصد کی جھلک ملتی ہے۔ اور ان کا فن ایک مہذب اور تربیت یافتہ ذہن کی پیداوار ہے۔ اُن کے ابتدائی اور بعد کے دور کے افسانوں میں یہ فرق ہے کہ پہلے مقصد کا اظہار برملا ہوتا تھا۔ اب فنی آداب کے پردوں میں چھپ کر سامنے آتا ہے۔ ان کے افسانوں کے تقریباً ایک درجن مجموعے اب تک منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ سب افسانے ایک سطح اور معیار کے نہیں ہیں۔ ایسا ہونا ممکن بھی نہیں۔ لیکن ان کا کوئی افسانہ ایسا نہیں جسے محض حسنِ نگارش کی کرشمہ سازی کہا جا سکے۔ یا تفریحِ طبع، لذّتیت اور برہنگی کے جذبے کی نمائش کا نتیجہ کہہ کر اس پر خردہ گیری کی جا سکے۔ کیونکہ ہر افسانے کی تعمیر کسی نہ کسی ایسے تجربے یا حادثے پر کی گئی ہے، جو انسانی روابط کے ڈھانچے کو بہت دیر تک اور دور تک متاثر کرتا ہے۔ ان افسانوں میں سے بیشتر پنجاب کے دیہاتوں میں بسنے والوں کی زندگی کی مصوری کرتے ہیں۔ اس زندگی کے پیچھے برسوں کی روایات، نظامِ معاشرت، عقائد اور توہمات کا سہارا ہے۔ اور افسانہ نگار اس

فضا میں سانس لینے والے انسانوں اور زمینداروں، ان کے بیوی بچوں، ان کے کھیت کھلیان، ان کی چوپال، ان کے کنوؤں، چشموں اور جانوروں تک سے ایسی ہمدردی اور دلچسپی رکھتا ہے، جو پریم چند کے علاوہ کسی اور کے یہاں نظر نہیں آتی۔ یہی ان افسانوں کی کامیابی اور تاثر کا راز بھی ہے۔ اس لئے کہ جس زندگی سے افسانہ نگار کی واقفیت صحیح اور براہ راست ہو، اسے اگر خام مواد کے طور پر کام میں لایا جائے، اور تخیلی قوت کو اس بنیاد پر عمل کا موقع دیا جائے تو اس طرح حقیقت تخیل کی مسلم بھی ہے گی اور تابناکی بھی حاصل کرے گی۔ شاید افسانہ نگار نے یہ بھی محسوس کیا ہو کہ متوسط اور زیادہ تر نچلے طبقوں کی زندگی میں جو زمین سے زیادہ قریب رہتے ہیں۔ بنیادی انسانی محرکات کا مطالعہ جس بے ساختگی کے ساتھ کیا جا سکتا ہے، اتنا شاید ان لوگوں کے سلسلے میں ممکن نہ ہو، جن کی فطرتِ اصلی کو تہذیب کی چمک دمک ملوث کر دیتی ہے۔ شہری زندگی سے متعلق ندیم قاسمی کے افسانے کمزور ہیں۔ ان میں فنی ربط کی کمی ہے۔ کردار نگاری پر افسانہ نگار کی گرفت مضبوط نہیں، اور نہ ان میں وہ رچاؤ ہے، جو مشاہدہ اور نقطۂ نظر میں نکھار اور تیکھا پن پیدا کرتا ہے۔ "ہذا من فضل ربی" "بھرم" "بندگی اور بے چارگی" اس کی نمایاں مثالیں ہیں۔

ندیم قاسمی کے افسانوں میں ایک عمل ارتقاء ملتا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ شروع کے افسانوں میں وہ چیزوں کو جیسا دیکھتے ہیں، ان کی کم و بیش ویسی ہی عکاسی کر دیتے ہیں۔ لیکن رفتہ رفتہ وہ اس کوشش میں مصروف نظر آنے لگتے ہیں کہ ان کے محرکات کا پتہ لگائیں اور انھیں بے نقاب کریں۔ اس بات کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ محض صورتِ حال میں افسانہ نگار کی دلچسپی کچھ عرصہ بعد کرداروں میں دلچسپی کا روپ دھار لیتی ہے۔ پھر یہ آخری دلچسپی بھی اعمال کے مطالعہ سے تجاوز کر کے داخلی کیفیتوں کے تجزیے میں بدل جاتی ہے۔ اسی طرح انسانوں، اداروں اور مروجہ اور جکڑے ہوئے نسلی اور طبقاتی میلانات کے خلاف احتجاج، جھلاہٹ اور رکیک گی ایک ایسے خاموش اور موثر طنز میں بدل جاتی ہیں، جس کی نوک تیز اور جس کا وار بھرپور ہوتا ہے۔ ندیم قاسمی کے افسانوں میں متانت، میانہ روی، دلسوزی اور سمت و رفتار کا توازن ہمیشہ نمایاں خصوصیات رہی ہیں۔ ان سب کی تہ میں انسان دوستی کا وہ جذبہ ہے جو انھیں گرد و پیش کی اٹل حقیقتوں سے چشم پوشی نہیں کرنے دیتا۔ انسان اپنے عقائد، تعصبات اور برتاؤ میں جیسا کچھ ہے وہ ہمارے سامنے ہے، لیکن یہ خواہش بھی افسانہ نگار کا دامن نہیں چھوڑتی کہ وہ ان بندشوں سے اونچا اٹھ کر ان امکانات کو آزمائے اور پورا کرے جو اس کے اندر چھپے ہوئے ہیں۔

ندیم قاسمی کے افسانوں کے موضوعات وہ معاشی ناہمواریاں ہیں جو ہماری زندگی میں قدم قدم پر موجود ہیں۔ ان کی وجہ سے ظلم و انتقام کی بے شمار شکلیں بھیس بدل بدل کر ہمارے سامنے آتی رہتی ہیں۔ اور سیاست اور مذہب کے ٹھیکیدار ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر انھیں ہوا دیتے رہتے ہیں۔ جنگ کی تباہ کاریاں ہیں۔ جن کا نشانہ وہ ضرورت مند بنتے ہیں، جو اپنی مادی ضروریات سے مجبور ہو کر بہ خوشی حکومت کے مقاصد کی برآری کے لئے اپنے آپ کو پیش کر دیتے ہیں۔ فسادات اور اُن کے عواقب ہیں۔ جو آزادی کی نیلم پری اپنے جلو میں لے کر آئی تھی۔ انتقام اور رقابت کی وہ آگ ہے جو قبائلی انسانوں کے کردار میں اتنی نمایاں تھی۔ اور اسے معمولی سے عذر پر انسانوں کو خاک و خون میں ملا دینے پر اکساتی

رہتی بخش۔ یہ آگ آج بھی دیہاتوں میں رہ رہ کر بھڑک اٹھتی ہے اور فطرتِ انسان کی وہ مجبوریاں ہیں جو نہ انسان کو ایک مرکز پر ٹھہرنے دیتی ہیں اور نہ کسی ایک وسیع شاہراہ پر، چاہے وہ اخلاق کی ہو یا مذہب کی، یا انسانیت کے سوز و ساز کی، گامزن ہونے دیتی ہیں۔ عشق و محبت کا موضوع انسان کی زندگی میں اپنی مرکزیت کی وجہ سے ہمیشہ موجود رہا ہے اور ہمیشہ موجود رہے گا۔ لیکن ندیم قاسمی کا کوئی افسانہ محض عشقیہ افسانہ نہیں کہلایا جا سکتا۔ کیونکہ عشق و محبت کے جذبات کی عکاسی ان کے یہاں ہمیشہ سماجی محرکات کے تانے بانے سے متاثر ہوتی ہے۔ ان کے یہاں نہ اس رومانیت کے لئے کوئی گنجائش ہے، جو خواہشات کو بے لگام چھوڑنے سے پیدا ہوتی ہے، اور نہ اس لذتیت کے لئے جو ذہنی اور اخلاقی عدم توازن تک لے جائے۔ ان کے یہاں محبت کا رومان ہی نہیں، اس کی محرومیاں اور مجبوریاں بھی ہیں۔ اس لئے شاید یہ کہنا مناسب ہو کہ ندیم قاسمی کے افسانوں میں انسان کی جنسی اور حیاتی زندگی محض جذباتی سطح پر نہیں، بلکہ ایک وسیع چوکھٹے کے اندر اپنی جگہ رکھتی ہے۔ جہاں زندگی کے دوسرے مطالبات اور ذمہ داریاں بھی ساتھ لگی ہوئی ہیں۔ ان کے یہاں جذبات اور احساسات کی دھوپ چھاؤں بہت سے اور متنوع عناصر کے پس منظر میں ہی دیکھی جا سکتی ہے

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ندیم قاسمی کے یہاں افسانوں میں متضاد رنگ بھی ملتے ہیں۔ اور ان کی تخلیق ایک عملِ ارتقا سے بھی گزری ہے۔ وہ کسی مخصوص فارمولے کو اپنا کر یا کسی نظریے کا پرچار کرنے کی خاطر افسانہ نہیں لکھتے۔ لیکن زندگی میں چاروں طرف جو ظلم اور ناانصافی، جو پریشانیاں اور رسوائیاں بکھری ہوئی ہیں، اور فطرتِ انسانی کے جو پیچ و خم ان کے تجربے کی زد میں آتے ہیں، وہ انھیں تخلیق پر اکساتے ہیں۔ ان کے ایک افسانے "پردیں" (طلوع و غروب) کو لے لیجئے۔ اس میں اس حقیقت کی حد تک براہ راست ترجمانی ہے کہ غربت اور طبقاتی ناہمواری کی وجہ سے کس طرح زبردست زیردست پر غالب رہتا ہے، اور اسے اپنی کامجوئی کے لئے استعمال کرتا ہے۔ اسی موضوع پر ایک اور افسانہ ہے "جب بادل امڈے" (در و دیوار)۔ اس افسانے کا ماحول نئی دیہات کا ماحول ہے، اور یہ ایک مہاجر کی داستان ہے۔ جو اپنا سب کچھ کھو کر اپنے وطن کو خیرباد کہتا ہے۔ لیکن نئے وطن کا زمیندار بھی بہر صورت زمیندار ہی ہے، وہ اپنی سرشت بدل نہیں سکتا۔ اور مزارعے اس کی چیرہ دستیوں کے مقابلے میں حریفِ ناتواں کی حیثیت رکھتے ہیں اور اگر وہ اپنی پوری قوت مجتمع کر کے مدافعت کی کوشش بھی کریں، تب بھی انھیں ناکامی اور ذلت کا منھ دیکھنا پڑتا ہے۔ یہ افسانہ "میرا دیس" سے بہتر ہے، لیکن "کنگلے" اور "پکا مکان" (طلوع و غروب) دونوں اختصار کے باوجود زیادہ کامیاب اور موثر ہیں۔ کیونکہ ان دونوں میں معاشی تنگ دستی کو جاہ و حشمت اور اثر و رسوخ کے مقابلے میں پسپا ہونا پڑتا ہے۔ "جب بادل امڈے" اور "پکا مکان" میں جو بات مشترک ہے وہ یہ کہ نچلے اور پس ماندہ طبقے اور پسے ہوئے اور اپنی جائز خواہشات کی تسکین کے لئے کتنی بھی جد و جہد کریں، وہ بالآخر ان قوتوں سے شکست کھا جاتے ہیں۔ جن کی جڑیں ہمارے نظام میں گہرے طور پر پیوست ہیں، اور جنھیں حکومت اور مذہب دونوں کی سرپرستی حاصل رہی ہے۔ "کنگلے" میں ناداری، بے کسی اور جہالت مجسم ہو کر سامنے آگئی ہیں۔ لیکن "موچی" (بازارِ حیات) ان سب افسانوں میں ممتاز ہے۔ اس میں منظم طور پر کوئی احتجاج نہیں ہے۔ لیکن نچلے طبقے کے ایک مزدور

نادر کی آرزوؤں، ان تھک محنت اور جاں نثار خدمت کی جس طرح پامالی بلکہ تذلیل راجہ شیر خاں کے ہاتھوں ہوتی ہے، اسے دیکھ کر دل پر گھونسا سا لگتا ہے۔ اسی طرح "اصول کی بات" (گھر سے گھر تک) میں جب ایک زمیندار مکرو فریب کے سارے ہتھکنڈوں سے مسلح ہو کر ایک مصیبت زدہ کسان لڑکی کو اپنی حرص و آز کا نشانہ بنانے کا عزم کرتا ہے تو اس پورے معاشرتی نظام سے جس میں انسان محض مہروں کی طرح استعمال کئے جاتے ہیں، شدید نفرت ہو جاتی ہے۔ اس مختصر سے افسانے میں گاؤں کے پورے ماحول اور زمیندار کی اس ماحول میں اہمیت کو جزئیات نگاری کے آئینے میں بڑی خوبی کے ساتھ ابھارا گیا ہے۔ افسانے کے عنوان میں جو تیکھا طنز چھپا ہوا ہے۔ اس کا راز آخر آخر میں کھلتا ہے۔

یہاں ایک اور افسانے کا ذکر نا موزوں نہ ہوگا۔ اس کا عنوان ہے "کنجری" (سناٹا) غربت کے اثرات سے زیادہ اس افسانے میں اس عمل کو واضح کیا گیا ہے جس کے ذریعے روح پر کثافت کی تہیں چڑھتی چلی جاتی ہیں، یہاں تک کہ اس کی اصلی صورت پہچانی نہیں جاتی۔ سردار اور اس کی ماں عرصہ سے جسم فروشی کا کاروبار چلاتے رہے ہیں، اور اس میں اتنے ڈوب چکے ہیں کہ ان کی معمولی سی قوت امتیاز بھی بالکل ختم ہو گئی ہے۔ وہ دونوں سردار کی نوجوان بیٹی کمالاں کو جس بے غیرتی کے ساتھ گناہ کی دلدل میں ڈھکیلنے کی کوشش کرتے ہیں اس سے گھن آنے لگتی ہے۔ پھر کمالاں کی مدافعت جس طرح رفتہ رفتہ کمزور پڑ جاتی ہے وہ عبرت انگیز بھی ہے اور حقیقت پسندانہ بھی۔ آخر آخر میں کمالاں غربت اور ناداری سے مجبور ہو کر اس راستے کی طرف بڑھتی ہے جسے وہ شروع میں نفرت اور حقارت سے دیکھتی تھی۔ اس مجموعے میں "رئیس خانہ" ایک معرکے کا افسانہ ہے۔ غربت کے زیر اثر انسانی بے بسی کی یہ ایک سادہ دل دوز تصویر ہے۔ جسے انتہائی ہنرمندی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اس میں "رئیس خانے" کے مادی اور طبعی وجود کو دلکش پس منظر اور چھوٹی چھوٹی تفصیلات کی روشنی میں ابھارا گیا ہے۔ اس میں پہاڑی میاں بیوی یعنی فضلو اور مریاں کی محبت کی سادگی، سرشاری اور سپردگی کی تصویر بھی ہے اور یوسف جیسے رئیسوں کے چوچلوں اور فریب اور ریاکاری کا عکس بھی۔ اس افسانے میں تحیر کا عنصر بھی ہے، کیونکہ آخر وقت تک یہ قیاس کرنا مشکل ہے کہ اس کا انجام کیا ہوگا۔ لیکن اس پرسکون اور پر فریب انداز سے کہیں زیادہ اہم، جو یوسف مریاں کو اپنے دام تزویر میں گرفتار کرنے کے لئے اختیار کرتا ہے۔ جذبات اور احساسات کی وہ کشمکش ہے جس میں فضلو برابر ہچکولے کھاتا رہتا ہے۔ حق و صداقت اور گناہ کی ترغیب کے درمیان جو آویزش اس کے دل میں پیدا ہو کر مختلف مرحلوں سے گزرتی ہے، اور جس طرح فضلو اور مریاں کی ایک دوسرے سے محبت اور ایک دوسرے کے لئے ہمدردی اور رفاقت کا جذبہ (جو کہانی کے آخر میں شکست و ریخت کے باوجود عود کر آتا ہے) یوسف کی عیاری اور جنسی بھوک سے مات کھا جاتا ہے۔ اسے حیرت انگیز فن کاری کے ساتھ ابھارا گیا ہے۔ افسانے پر بہترین اور آخری فیصلہ خود فضلو ہی کر دیتا ہے: "میری غریبی مجھے دھوکا دے گئی مریاں" فضلو نے رکتے رکتے کہا۔ ہر اعتبار سے یہ ایک مکمل افسانہ ہے۔

اسی طرح "ثواب" (گھر سے گھر تک) اور "الحمدللہ" (سناٹا) میں بڑا فرق ہے۔ "ثواب" میں فضا آفرینی قابل توجہ ہے۔ جیبو کے کنوئیں میں ڈوب جانے کی وجہ سے پورا گاؤں غمگینی کی چادر میں لپٹا ہوا ہے اور فضا بوجھل اور اداس لگ رہی ہے۔ گاؤں کے سب رہنے والے کرماں کی مصیبت میں برابر کے شریک ہیں اور اس کے لئے ہر جتن کرنے کے لئے

بتا ہیں۔ پھر اگر ایک طرف مریاں کے دل میں امید و بیم کی متضاد کیفیات کی مصوّری کی گئی ہے تو دوسری طرف ہماری نظریں اس بے حسی اور لاتعلقی کو بھی دیکھ لیتی ہیں جو مذہب کے خول سے چمٹے رہنے والوں کے اندر پیدا ہو جاتی ہیں۔ ان کی انسانیت کو جلا دینے کی بجائے انھیں محض مشین کا ایک پرزہ بنا دیتی ہیں۔ ملک رحمٰن خان ایسے ہی ایک انسان کا مرقع ہیں۔ "الحمدللہ" میں مولوی ابوالبرکات اپنی بنیادی انسانی ضروریات پوری کرنے کے لئے چودھری فتح داد کے لطف و کرم پر تکیہ کرتے ہیں۔ اور ان "وظیفوں" پر جو ان کے معتقدین پیش کرتے رہتے ہیں ان کی ایک بیٹی مہرن کی شادی انہی سہاروں کی بدولت بخیر و خوبی انجام پاتی ہے۔ لیکن اب انھیں دوسری بیٹیوں کی شادی کی فکر کھانے لگتی ہے۔ رہنے سہنے کے پرانے طور طریقوں اور سوچنے اور عمل کرنے کے انداز میں تبدیلی آ گئی ہے جس کا اثر مولوی ابّل کی کسب معاش پر بھی پڑا ہے۔ اس دوران میں مہرن کے یہاں سے ولادت کی خبر آتی ہے اور مولوی ابّل اور ان کی بیوی جی مسوس کر رہ جاتے ہیں۔ کیونکہ آخر بیٹی کے یہاں خالی ہاتھوں کیسے جائیں۔ فتح داد خاں اپنی علالت کے زمانے میں بھی مولوی ابّل کے ساتھ حسنِ سلوک کرتے رہے ہیں۔ جب آخری بار مولوی ابّل چودھری صاحب کی مزاج پرسی کے لئے جانے کا ارادہ کرتے ہیں اور ان کے مرنے کی اطلاع انھیں ملتی ہے تو اس خیال سے اچھل پڑتے ہیں کہ ان کی تجہیز و تکفین کے سلسلے میں جو کچھ ہاتھ آئے گا۔ اس سے چشم زدن میں بہت سے مسئلے حل ہو جائیں گے۔

"اور مولوی ابّل اس بجتے ہوئے لہجہ میں چلّایا "مبارک ہو عارف کی ماں! تم نواسے کے جوڑے کو رو رہی تھیں۔ اللہ جل شانہ نے جوڑے، جوتی اور ٹوپی تک کا انتظام فرما دیا جنازے پر کچھ نہیں تو بیس روپے تو ضرور ملیں گے۔"

(صفحہ ۱۴۸)

سچّے مذہبی آدمی ہونے کے باوجود مولوی ابّل آخر پیٹ کے تقاضوں کو کہاں لے جائیں۔ مذہب کے ذریعہ تزکیۂ نفس ممکن بھی ہے اور ہوتا بھی رہتا ہے لیکن اس سے مادی ضروریات کی تکذیب کیسے کی جا سکتی ہے۔ لیکن اس کے فوراً بعد ایک دوسرا ڈرامائی موڑ آتا ہے۔ جو عبرت ناک بھی ہے اور بصیرت افروز بھی:

اور پھر ایک دم جیسے کسی نے مولوی ابّل کو گردن سے دبوچ لیا۔ اس کی اوپر اٹھی ہوئی پتلیاں بہت اوپر اٹھ گئیں۔ پھر ایک لمحہ کے دردناک سنّاٹے کے بعد مولوی ابّل جو مرد کے چلّا چلا کے رونے کو ناجائز اور خلاف شرع قرار دیتا تھا چلّا چلّا کر رونے لگا۔ اور بچوّں کی طرح پاؤں پٹختا ہوا ڈیوڑھی کے دروازے میں سے نکل کر باہر بھاگ گیا۔"

(صفحہ ۱۴۹)

"ثواب" کے مقابلے میں یہ افسانہ یقیناً زیادہ گٹھا ہوا اور زیادہ پختہ ہے۔

جنگ کی ہولناکیوں اور تباہ کاریوں کے سلسلے میں ندیم قاسمی نے کئی افسانے لکھے ہیں۔ علاوہ اس کشت و خون اور مالی نقصان کے جو جنگ اپنے ساتھ لاتی ہے۔ اس کا ایک تکلیف دہ پہلو یہ بھی ہے کہ فوجی بھرتی پر جو چیز نوجوانوں کو آمادہ کرتی ہے، وہ غربت اور افلاس سے چھٹکارا حاصل کرنے کا جذبہ ہوتا ہے۔ اور پھر اگر سپاہی میدان جنگ میں ہلاک ہو جائیں، تو ان کے وارثوں کو پنشن بھی ملتی ہے۔ اور یوں بے کسی کے مارے یہ نوجوان خوشی خوشی اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر اپنے آپ کو

تباہی اور موت کے غار میں جھونک دیتے ہیں۔ "سپاہی بیٹا" (در و دیوار) "بابا نور" اور "ہیرا" (بازارِ حیات) اس سلسلے میں تین قابلِ توجہ مطالعے ہیں۔ پہلے دو نسبتاً سادہ ہیں اور تیسرا پیچیدہ۔ لیکن ان تینوں میں جو بات مشترک ہے وہ نفسیاتی گرہیں ہیں جو جنگ سے متاثر ہونے کی وجہ سے سپاہی کی بوڑھی ماں، بابا نور اور ہیرام کے اندر پیدا ہو گئی ہیں۔ ہیرام کا ذہن تیسرے افسانے میں جنگ کی خون ریزی اور بربریت سے اس حد تک متاثر ہوا ہے کہ نہ صرف ان کی شخصیت میں سینکڑوں الجھاؤ پیدا ہو گئے ہیں بلکہ شخصیت بالکل چکنا چور ہو گئی ہے۔ اس کی بیوی اور بچے ہیرام کی زندگی بھی اس کے غیر فطری اور وحشت ناک طرزِ عمل اور رویے کی وجہ سے اجیرن ہو جاتی ہے۔ "دار و رسن" (بازارِ حیات) میں موت ایک دوسرے دروازے سے داخل ہوتی ہے۔ زندہ انسان کو پھانسی پر چڑھانے کا پیشہ نتھو کو وراثتاً اپنے باپ سے ملا تھا۔ متواتر تجربے نے موت کے سلسلے میں اس کے رویے کو خلافِ معمول بنا دیا ہے۔ پھانسی پر چڑھانے میں جو انتہائی ایذا رسانی کا تجربہ کسی شخص کو ہو سکتا ہے۔ اسے اس نے اپنے لئے لاش کو گنگا کا پھول پیش کرنے اور ڈبڈبائی آنکھیں جھکا کے ہاتھ جوڑ کر یہ کہنے سے "مجھے معاف کر دینا دوست" متوازن بنا لیا ہے۔ لیکن جب اسے یہ کام خود اپنے بیٹے خیرو کو سولی پر چڑھانے وقت کرنا پڑتا ہے تو اس وقت یہ سہارا بالکل کام نہیں آتا۔

ندیم قاسمی فطرتِ انسانی کے بہت اچھے نبض شناس ہیں۔ انسان اپنے آپ کو جس جس انداز سے دھوکے دیتا اور اپنے لئے جھوٹے سہاروں میں تسکین کا پہلو تلاش کرتا ہے اس کی بہت اچھی نشان دہی ان کے افسانوں میں ہمیں ملتی ہے۔ "گھر سے گھر تک" اس کی ایک بین مثال ہے۔ یہ افسانہ بظاہر مزاحیہ لیکن در اصل عبرت ناک ہے۔ اور اس سے پتہ چلتا ہے کہ انسان اپنی اصلی حالت کو چھپانے اور دوسروں کی نظروں میں عزت اور اعتبار حاصل کرنے کے لئے اپنے آپ اور دوسروں کو کس کس انداز سے فریب میں مبتلا کرتا ہے۔ "فالتو" (گھر سے گھر تک) میں وہ کشمکش نمایاں کی گئی ہے، جو جوانی اور بڑھاپے کے درمیان ہمیشہ رہی ہے۔ جوانی میں جذبات عقل پر غالب آ رہے ہیں، اور بڑھاپا اور تنگ دستی اگر ایک جگہ جمع ہو جائیں تو انھیں شباب کی سرمستیوں کے سامنے پسپا ہونا پڑتا ہے۔ پیر بخش اور ان کی بیوی، اور حبیب احمد اور خاتون کے تعلقات کا تانا بانا اس راز کو فاش کرتا ہے۔ اس افسانے میں بہت سے نازک موڑ آتے ہیں۔ حبیب احمد اور خاتون کے رویے پر دل شکستہ پیر بخش کا ایک تاثر یوں ادا کیا گیا ہے:

> "پیر بخش کو ایسا لگا کہ اس نے گھر کے باغیچے کے سارے پھول نوچ کر پھینک دیے ہیں۔ اور ہر طرف پودوں کے ننگے خنجر اُگے ہوئے ہیں۔ سناٹے کو توڑنے کے لئے وہ اپنی چارپائی کو گھسیٹتا اس گوشے میں لے آیا جہاں حبیب احمد کی شادی کے بعد نیک بخت اور اس کے کھلونے رکھے رہتے تھے۔ اور جہاں فاتحہ خوانوں کے لئے چٹائی بچھی تھی۔"
>
> (صفحہ ۱۸۷)

ازدواجی زندگی کی وہ ناہمواریاں جو عمر کے تفاوت کا نتیجہ ہوتی ہیں "بیٹے بیٹیاں" (برگِ حنا) میں دکھائی گئی ہیں۔ یہاں جذبات کا مد و جزر خارجی حالات کے پیچ و خم سے منسلک ہے اور جوانی کے فطری احساسات، کمزور اور عارضی موانعات اور

بندشیں بندیوں کو توڑ کر جس طرح امنڈ پڑتے ہیں۔ انھیں بہت ضبط اور سلیقے کے ساتھ بے نقاب کیا گیا ہے۔ اس افسانے میں عمل اور کردار دونوں ایک مبہم فضا کے اسیر ہیں۔ افسانہ بہت آہستگی اور نرم روی کے ساتھ آگے بڑھتا ہے۔ اور بہت سی باتوں کے سلسلے میں محض سرگوشی کا لہجہ اختیار کیا گیا ہے۔ البتہ ہادی کمہار کے بیٹے مراد کی جب بات آ نکلتی ہے تو عمل میں تیز رفتاری پیدا ہو جاتی ہے۔ اور پھر رفتہ رفتہ یہ بھید بھی کھلتا ہے کہ ایک عارضی سمجھوتے کے باوجود، جو ضرورت اور مصلحت نے عائد کیا ہے۔ جبلی تقاضے اپنی نکاس کے لئے راستے نکال لیتے ہیں۔ یہی کیفیت "ست بھرائی" (بازار حیات) میں ملتی ہے اور جوانی کی سرمستی اور خود سری کے سامنے ماں باپ کی محبت بالآخر سپر ڈال دیتی ہے۔

دو اور بہت اچھے نفسیاتی مطالعے "ماتم" (برگ حنا) اور "کفن دفن" (بازار حیات) میں ملتے ہیں۔ پہلے افسانے میں ایک شادی شدہ جوڑے کی باہمی محبت اور اٹکھیلیوں کا نقشہ بہت ایجاز کے ساتھ اور موثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ پھر میاں جی کے مرنے کے بعد ان کی بیوی پر فرط غم کی وجہ سے سکتے کی سی حالت طاری ہو جاتی ہے۔ اس کیفیت کا اتار کسی طرح ممکن نہیں۔ ماضی کی کتنی بھولی بسری یادیں دماغ میں کلبلانے لگتی ہیں۔ مگر بے سود۔ تا آنکہ اس پلیٹ کے کرچی کرچی ہو جانے سے، جو میاں جی نے ایک دفعہ خریدی تھی، "جس کے وسط میں بھرے بھرے جسم کی ایک چینی لڑکی کی تصویر تھی۔ جو انگور کی بیلوں کے حاشیے میں کھڑی مسکرا رہی تھی۔" وہ بند ٹوٹ جاتا ہے۔ جس پر بیوی کی جذباتی واگزاشت اور تطہیر کا انحصار ہے۔ یہ پلیٹ رومان اور جنسی لطافت کی بے شمار مرئی اور غیر مرئی کیفیتوں سے وابستہ ہو گئی تھی۔ اور اسی سے اس افسانے میں ایک علامتی حیثیت حاصل ہے۔

"کفن دفن" میں بناتی کا تانا بانا بہت ہوشیاری سے بنایا گیا ہے۔ اس کے آغاز اور انجام دونوں میں اک اچانک پن ہے۔ غفور کی مردہ بیوی کلی کی تجہیز و تکفین کے سلسلے میں میاں سیف الحق کی رقیق القلبی اور جذباتی شدت کا مظاہرہ جس پر بظاہر ان کے گہرے مذہبی احساس کی چھاپ لگی ہوئی ہے، دراصل ایک نجی غم اور نفسیاتی حادثہ کا خول ہے۔ جوان کے جوان بیٹے حامد کے بے کسی کی حالت میں مارے جانے سے انھیں پہنچا ہے۔ غفور پر جب یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے تو اس کے اندر سوئی ہوئی خودی جاگ اٹھتی ہے اور اس کی غیرت کو کچوکے دیتی ہے۔ وہ میاں جی کا شرمندۂ احسان ہونے اور اس کا اعتراف کرنے کے باوجود ان کی خیرات انھیں واپس لوٹا دیتا ہے۔ اور ایسا کرنے کے بعد اپنے آپ کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگتا ہے:

> "میاں جی، دیکھئے، خفا نہ ہو جیئے، آپ نے مجھ پر بڑا احسان کیا ہے۔ میں ایسا کمینہ نہیں ہوں کہ اس احسان کو بھول جاؤں۔ پر بات یہ ہے میاں جی کہ آپ نے تو کلی کی جگہ حامد میاں کو دفن کیا تھا۔ اور میری کلی تو وہیں سڑک کے کنارے بے کفن پڑی ہی رہ گئی۔ ان روپوں کو چاہے آپ نالی میں پھینک دیجئے۔ پر میں نے تو آج ہی اپنی کلی کو اپنے ہاتھوں سے قبر میں اتارا ہے میاں جی۔" (صفحہ ۲۱۵)

میاں سیف الحق کا کردار خاصا پیچیدہ ہے۔ کیونکہ اس میں مختلف محرکات ایک دوسرے میں اس طرح ضم ہو گئے ہیں کہ وہ ایک دوسرے کی ضد ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے کی نفی نہیں کرتے۔ محرکات کی اسی گنگا جمنی میں ان کی شخصیت

کی درندگی کا ساز مضمر ہے۔

شروع میں کہا گیا تھا کہ نچلے طبقوں کی زندگی میں ابھی تک اس بربریت کے آثار ملتے ہیں، جو قبائلی انسانوں کے ساتھ مخصوص تھی۔ "تبرّ" اور "گنڈاسا" (رت نا) میں انسانی فطرت کے اسی منظر کو خوردبینی مشاہدے کے ذریعے پیش کیا گیا ہے۔ "تبرّ" میں جذبات کی توانائی، ردّ عمل کی شدت اور انتقام کی آگ ملتی ہے۔ یہی بات "گنڈاسا" میں بھی ہے۔ وہی خون آشامی وہی تندی، وہی حرارت اور جوش، لیکن اس میں ایک بہت نازک نفسیاتی حقیقت کی ترجمانی بھی کی گئی ہے۔ یہ وہ ردّ عمل ہے، جو مولا بخش کے دل پر گلے کی منگیتر راجو کے حسن کا ہوتا ہے۔ یہ ردّ عمل ایسا غیر شعوری، براہ راست اور سریع ہے کہ مولا اپنی ساری ترنگ بھول جاتا ہے

"اور مولانے دیکھا کہ راجو کی کنپٹیوں پر سنہرے روئیں ہیں اور اس کی پلکیں یوں کمانوں کی طرح مڑی ہوئی ہیں جیسے اٹھیں گی تو اس کی بھوؤں کو مس کریں گی۔ اور ان پلکوں پر گرد کے ذرے ہیں اور اس کی ناک پر پسینے کے ننھے ننھے سوئی کی نوک کے سے قطرے چمک رہے ہیں اور نتھنوں میں کچھ ایسی کیفیت ہے جیسے گھی کے بجائے گلاب سونگھ رہی ہو۔ اس کے اوپر کے ہونٹ کی نازک محراب پر بھی پسینہ ہے اور ٹھوڑی اور نچلے ہونٹ کے درمیان ایک تل ہے۔ جو کچھ یوں اچٹتا ہوا سلگ رہا ہے جیسے پھونک مارنے سے اڑ جائے گا۔ کانوں میں چاندی کے بندے انگور کے خوشوں کی طرح لس لس کرتے ہوئے لرز رہے ہیں۔ اور ان بندوں میں اس کے بالوں کی ایک لٹ بری طرح الجھی ہوئی ہے۔ مولے گنڈاسے والے کا جی چاہا کہ وہ بڑی نرمی سے اس لٹ کو چھڑا کر راجو کے کان کے پیچھے جما دے یا چھڑا کر یوں ہی چھوڑ دے۔ یا اپنی ہتھیلی پر پھیلا کر ایک ایک بال کو گنتا رہے یا ــــ" (صفحات ۱۹۸-۱۹۷)

وہ گلے سے سرِ بازار تھپڑ کھانے کے باوجود کوئی جوابی کارروائی نہیں کرتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا سارا نشہ ہرن ہو گیا ہے۔ ان دونوں افسانوں میں کردار نگاری اور جذبات کے اتار چڑھاؤ کے علاوہ فضا آفرینی بھی بہت اہم ہے۔ جس سے قبائلی دور کے سماج کو پہچانا جا سکتا ہے۔ اس میں نسلوں تک سے انتقام لینے، اپنی آن کے لئے خم ٹھونک کر لڑنے اور انسانوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح قتل کر دینے سے نہ چوکنے کو قابلِ فخر اعمال کا درجہ حاصل ہے۔ یہاں زندگی کی ریت اور رسم ہی ایسی ہے کہ ہر چیز صاف اور کھلی ہوئی ہے۔ محبت بھی اور عداوت بھی، شقاوت بھی اور ترحم بھی، وفاشعاری بھی اور کینہ پروری بھی۔

تقسیم سے متعلق فسادات پر اردو میں کئی اچھے افسانے لکھے گئے۔ مثلاً بیدی کا "لاجونتی"، احمد عباس کا "سردار جی" اور پریم ناتھ در کا "آخ تھو"۔ اس موضوع پر ندیم قاسمی کے دو افسانے قابلِ ذکر ہیں، یعنی "میں انسان ہوں" (در و دیوار) اور "پرمیشر سنگھ" (بازارِ حیات)۔ "آخ تھو" اور "میں انسان ہوں" میں کئی باتیں مشترک ہیں۔ اوّل الذکر میں زہرناکی اپنی انتہا کو پہنچ گئی ہے۔ "میں انسان ہوں" زیادہ متوازن اور سجل، لیکن تاثیر میں کم نہیں ہے۔ اس میں ایک خوبی یہ بھی ہے کہ

پانی کے ایک گھونٹ کو رمز کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ یہ اس ازلی اور ابدی تڑپ کی نشان دہی کرتا ہے جو انسان کے دل میں انسانیت کی بقا اور تحفظ کے لئے موجود ہے۔ لیکن فسادات نے جن کی وجہ سے انسانی شخصیت بالکل مسخ ہو کر رہ گئی ہے اور تمام آدرشوں کے پرخچے اڑا دیے گئے ہیں، پانی کے اس گھونٹ کو وقتی طور پر انسان کے لئے ناممکن الحصول بنا دیا ہے۔ "پرمیشر سنگھ" کو درجہ اوّل کی تخلیق ماننا مبالغہ نہ ہوگا۔ اوّل الذکر افسانے یعنی "میں انسان ہوں" کی عمومیت یہاں ایک اختصاصی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ یا یہ کہیئے کہ "میں انسان ہوں" میں صرف منتشر جذبات ہے "پرمیشر سنگھ" میں تاثرات واضح کرداروں اور صورت حال کی شکل میں ڈھل کر سامنے آئے ہیں۔ اسی طرح "سردارجی" میں تصویر سچی ہونے کے باوجود کسی قدر غیر متناسب ہو گئی ہے ندیم قاسمی کے یہاں ہر چیز جچی تلی اور نوک پلک سے درست ہے۔ پرمیشر سنگھ ان سب سکھوں اور مسلمانوں سے الگ ہے جن کے سروں پر بہیمیت کے بھوت ناچ رہے ہیں۔ ان کے مقابلے میں اس میں ایک سوز، دردمندی اور دل آسائی ہے۔ اس کا اپنا لڑکا کرتا ما سنگھ بھی اغوا کیا جا چکا ہے۔ اسی لئے اس کا دل اتنا حساس ہو گیا ہے۔ اپنی بیوی اور بیٹی امر کور کے برعکس وہ چھوٹے سے بچے اختر سے جو اسے فسادات کے دوران مسلمانوں کے قافلے سے بچھڑ جانے کی وجہ سے مل گیا ہے۔ انتہائی محبت اور لاڈ دُلار کا برتاؤ کرتا ہے۔ اور ہر طرح اس کی ناز برداری کے لئے تیار رہتا ہے۔ امر کور پرمیشر سنگھ کے اس برتاؤ پر تلخی کے گھونٹ پی کر رہ جاتی ہے اور کبھی کبھی اختر کو برا بھلا کہہ کر دل کی بھڑاس بھی نکال لیتی ہے۔ پرمیشر سنگھ کی بیوی کا دل ایک پکا پھوڑا ہے، جو اب ٹوٹا اور تب ٹوٹا۔ لیکن ہر قسم کی دل جوئی کے باوجود پرمیشر سنگھ اختر کو پوری طرح جیتنے میں کامیاب نہیں ہوتا۔ اور بالآخر یہ فیصلہ کرتا ہے کہ وہ اسے سرحد کے قریب چھوڑ آئے۔ کہانی کا خاتمہ بھی ایک المیہ پر ہوتا ہے اس نیک نیتی کے باوجود پرمیشر سنگھ آخر آخر میں سرحد پر چلائی ہوئی گولی سے زخمی ہو جاتا ہے اور اختر دور خلا میں نظریں جمائے ایک نامعلوم سمت میں بھاگتا چلا جاتا ہے۔ اس افسانے میں ایک عام سکھ گھرانے کی فضا، سکھوں کی عجیب عجیب حرکتیں۔ پرمیشر سنگھ کی بیوی اور بیٹی کی زخمی شخصیتیں۔ فسادات کے نتیجے کے طور پر ذہنوں پر خوف اور ناامیدی کے گہرے اور مہیب سائے، پرمیشر سنگھ کی معصوم اور دل کش شخصیت اور اختر کے دل میں اپنی ماں کی چاہت کی ہوک، اور اس سے جدائی کی ٹیسیں، اور اپنے فطری، روایتی اور مانوس تہذیبی رنگ سے ہم آہنگ رہنے کی نہ مٹنے والی خواہش، حیرت انگیز بصیرت، ایجاز بیان اور گہری ہمدردی کے ساتھ واضح کی گئی ہیں۔

ندیم قاسمی کے افسانے فنی دروبست کے اعتبار سے بھی بہت گٹھے ہوئے ہیں۔ ان کے اکثر افسانوں میں بعض جملوں یا ٹکڑوں کی تکرار پائی جاتی ہے۔ مثلاً "میں انسان ہوں" میں یہ جملے کئی بار آتے ہیں:

" یہ پیاس ہی میری تلاش ہے۔ اور زندگی ہے اور آخرت ہے، اور میں اس وقت بھی پیاسا ہوں۔" (صفحہ ۹)

اور کیچڑ نے خشک ہو کر میرے ہونٹوں کو کمان کی نہ کی طرح تان رکھا ہے۔ چمکتے ہوئے سبز رنگ کی ایک مکھی بار بار میرے حلق تک گھوم آتی ہے۔ اسے نمی کی تلاش ہے۔ اور میں ایک پیاسا انسان ہوں!

اداکی کے پودوں کی جڑیں گن رہا ہوں۔" (صفحہ ۱۱)

" لیکن اس پودے کی جڑیں مضبوط ہیں، اس لئے یہ تنا کھڑا ہے، اور میں زمین پر پڑا ہوں۔
اس لئے کہ میری بنیادیں کمزور تھیں۔ اس لئے کہ میں انسان ہوں۔ اور میں پیاسا ہوں۔" (صفحہ ۱۱)

" تم پانی کی تلاش میں ہو؟۔ مگر کس لئے؟ — انسانیت کے آخری وارث کے لئے؟ — تم یہ
کیوں نہیں کہتے کہ خود اپنی پیاس بجھانے کے لئے تمہیں پانی کی تلاش ہے۔ (صفحات ۲۲/۲۳)

" اور میں اس سوچ میں غرق یہاں مکئی کے ان بے بس پودوں میں گھرا ہوا پڑا ہوں مجھے گھونٹ بھر
پانی کی تلاش ہے ...... مجھے پانی کی تلاش ہے، مجھے ایک نئی زندگی کی تلاش ہے۔ مگر میری تلاش
بے کار ہے، کیونکہ میں خدا کی محبوب ترین مخلوق ہوں میں انسان ہوں۔" (صفحات ۲۴/۲۳)

"دار ورسن" میں یہ دو جملے دو مختلف موقعوں پر آئے ہیں۔

" ایسا پھول سا ہلکا ہاتھ مرنے والے کا کہ سنتے ہیں کہ ادھر جوان کے قدموں تلے سے تختہ کھسکا۔ ادھر
وہ چنے کے بنائے ہوئے پھندے میں یوں لٹک گیا، جیسے بیل سے توری لٹکتی ہے۔" (صفحہ ۸۰)

"خیرو" کی تلاش رسّی سے یوں لٹک رہی تھی، جیسے بیل سے توری لٹکتی ہے۔" (صفحہ ۱۰۵)

"کفن دفن" میں ایک جگہ یہ جملے ملتے ہیں۔

"میاں سیف الحق کی زندگی بالکل ہموار لک پھری چمکتی ہوئی سڑک تھی۔ جو حدِ نظر تک خطِ مستقیم میں جاتی
تھی۔ اور اس کے دونوں طرف قدآور درخت سایہ کئے کھڑے تھے۔ وہ اس سڑک پر کچھ ایسی بے تکلفی سے
چل رہے تھے، جیسے انسان کھانا کھاتے وقت چاہے بات چلیا نوالہ باغ کی کر رہا ہو مگر نوالہ سیدھا منہ کو
جائے۔ البتہ کبھی کبھی اس سڑک پر ایک فصیل سی اُبھر آتی اور وہ ٹھٹک کر خلا میں گھورتے رہ جاتے،
جہاں انھیں اپنے حامد کی کٹی پھٹی لاش سڑک کے عین وسط میں پڑی ہوئی دکھائی دے جاتی۔" (صفحہ ۱۸۹)

اور خاتمے سے ذرا پہلے یہ جملے:

" اور اس بہت بڑے نشیب کے بعد میاں سیف الحق کی زندگی بالکل ہموار لک پھری چمکتی ہوئی
سڑک بن گئی جو حدِ نظر تک خطِ مستقیم میں جاتی تھی، اور جس کے دونوں طرف قدآور درخت سایہ کئے کھڑے
رہتے تھے۔ وہ اس سڑک پر پھر سے کچھ ایسی بے تکلفی اور روانی سے چلنے لگے جیسے انسان کھانا کھاتے
وقت چاہے بات چلیا نوالہ باغ کی کر رہا ہو، مگر نوالہ سیدھا منھ کو جائے۔ اب اس سڑک پر وہ فصیل بھی
نہیں ابھرتی تھی۔ جس کے پاس کبھی کبھی ٹھٹک کر وہ خلا میں گھورتے رہ جاتے تھے۔ اب حدِ نظر تک
مطلع صاف تھا۔" (صفحہ ۲۱۰)

" شکنیں" (برگ حنا) میں غفور کے چہرے کی شکنیں ایک علامتی حیثیت رکھتی ہیں، اور یہ وہ محور ہے، جس کے گرد

گرد کہانی برابر گھومتی رہتی ہے۔ اور "الحمدللہ" میں تو افسانہ نگار نے خود ہی ایک جگہ کہا ہے:

"مولوی ابل کے صرف دو ہی سہارے تھے جو کبھی نہ ٹوٹے، اللہ جل شانہٗ اور چودھری فتح دادخاں۔" (صفحہ ۱۲۸)

اس تکرار سے اکثر دو مقاصد حاصل کئے جاتے ہیں، یا یہ کہئے کہ وہ دو قسم کے اثرات حاصل کرنے میں معاون ہوتی ہے اول افسانے کی مخصوص فضا آفرینی اور دوسرے خیالات اور تاثرات کی شیرازہ بندی۔ یہ جملے جو اکثر دہرائے جاتے ہیں ایک طرح کے (OVERTONES) کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی گونج کہانی کے عمل کے دوران اکثر سنائی دیتی ہے۔ جو تاثر مرکزی تجربہ یا مشاہدہ عمل کے لئے نقطۂ آغاز تھا اور جسے افسانے کے ارتقاء کے ذریعے وسعت دی گئی ہے۔ وہ اکثر جزئیات نگاری کے گنجان اور دبیز پردے میں نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ اسے پھر سے ذہن میں تازہ کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور یہی اس طریقۂ کار کو برتنے کا صحیح جواز ہے۔

ان افسانوں میں اکثر جگہ تشویش (SUSPENSE) کی کیفیت بھی ملتی ہے۔ "الحمدللہ" "بیٹے بیٹیاں"، "کفن دفن" اور "ماتم" اس کی بہت اچھی مثالیں ہیں۔ اس خصوصیت سے یہ مراد نہیں ہے کہ پایان کار افسانے کا انجام ایسا ہو، جس کی کوئی عقلی توجیہ ممکن نہ ہو۔ یا جہاں عمل کی بنیاد کسی اتفاقی حادثے پر ہو۔ کامیاب "تشویش" پیدا کرنے میں افسانہ نگار اس وقت کامیاب سمجھا جا سکتا ہے، جب ہم انجام کو پہلے سے تو متعین نہ کر سکیں، لیکن افسانہ اختتام کو پہنچے تو ہم بلا جھجک اور بہ ذہنی پس و پیش کے اسے قبول کریں۔ اور عمل کی مختلف اکائیوں کے درمیان ہمیں ایک منطقی یا جذباتی ربط و تسلسل اور ایک سببی رشتہ نظر آ جائے۔ اس کے ساتھ ہی ہم یہ بھی محسوس کریں کہ جس تجربے یا تاثر کو مجسم کیا گیا ہے، وہ غیر متوقع ہونے کے باوجود بھی مانوس اور جانا پہچانا ہے۔ اس لئے کہ زندگی میں ایسا ہوتا چلا آیا ہے۔

ندیم قاسمی کے بیشتر افسانوں کا اختتام قابل غور ہے۔ اس میں ایک ڈرامائی عنصر کی کارفرمائی کا احساس ہوتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ کہانی کے آخر میں ہمیں عمل کے عواقب کی تمام تفصیلات سے آگاہ کیا جائے۔ اس سے افسانے میں لازمی طور پر ایک سپاٹ پن پیدا ہو جائے گا۔ افسانے کا فن ناول کے فن کی نسبت زیادہ حسن تناسب اور قطع و برید چاہتا ہے۔ اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ جہاں تاثر اور تجربے کا بھرپور اور تشفی بخش اظہار تمام ہو جائے یا اس کی گنجائش امکانی طور پر کام میں لائی جا چکیں، وہیں افسانہ ختم ہو جائے۔ افسانے کے دوران جو نقطہ ہائے انحراف (TURNING POINTS) پائے جاتے ہیں، وہ سب مل کر ہمیں ایک انجام تک لے جاتے ہیں۔ اس حد تک پہنچنے کے بعد اگر افسانے کو غیر فطری طور پر طول دیا جائے گا تو اس سے وحدتِ تاثر اور فارم کی موزونیت دونوں کو صدمہ پہنچے گا۔ بعض اوقات افسانہ نگار وقت کے بہت سے نقطوں کو پھلانگ کر انتہا تک پہنچنا چاہتا ہے۔ ایسی صورت میں پڑھنے والے کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے تخیل سے کام لے کر اس انتہا کا رشتہ کہانی کے آغاز سے جوڑے۔ اور اس حرکت اور تموّج کو گرفت میں لانے کی کوشش کرے، جو افسانے کے ڈھانچے میں موجود ہے۔ "نیا فرہاد" (در و دیوار) "گونج" (طلوع و غروب) "پرمیشر سنگھ" "ہیرا" (بازارِ حیات) "ماتم" "نصیب" (برگِ حنا) "سلطان" (گھر سے گھر تک)

"الحمد للہ" "گنڈاسا" اور "چور" (سناٹا) کے ڈرامائی اختتام قابلِ غور ہیں۔

ندیم قاسمی ایک خوش گو شاعر بھی ہیں، اور یہ شاعر افسانوں میں جگہ جگہ ہمیں ملتا ہے۔ خاص طور پر جب وہ دلکش تشبیہات استعمال کرتا ہے یا پورے ایک پیراگراف میں فطرت کی نقاشی کرتا ہے۔ لیکن یہ نقاشی فن برائے فن کی حیثیت سے افسانوں میں جگہ نہیں پاتی ندیم قاسمی کی تحریر اس وقت چمک اٹھتی ہے۔ جب وہ جذبات کی کش مکش کو نمایاں کرنے یا معتدل بنانے کے لئے فطرت کی طرفگی اور شادابی کا سہارا لیتے ہیں، اور اس کے بے داغ حسن پر سے پردہ اٹھاتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں پنجاب کی مٹی، ہوائیں، سبزہ زار، ٹیلے، چشمے، چراگاہیں اور ریگستان، ان سب کی بوباس قدم قدم پر اپنی جانب کھینچتی ہے۔ فطرت انسان کے فن کا تکملہ بھی کرتی ہے، اور انسانی جذبات کو فطرت کے آئینے میں ایک نکھار بھی ملتا ہے۔ ندیم قاسمی نے پنجاب کے دیہاتوں میں پلنے والے رومانوں کو جس طرح زندگی، حرکت اور تابناکی بخشی ہے، اُس کی طرف اشارہ پہلے گزر چکا ہے۔ ان رومانوں کی ابتدا اور ارتقاء اکثر فطری مظاہر کے پس منظر میں دکھائی گئی ہے۔ مصوری کے اس عمل میں مشاہدہ اور تخیل دونوں باہم گرا میز کئے گئے ہیں۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فطرت کے بے پایاں حسن کا کوئی نقش ایسا نہیں جس نے ان کی حساس طبیعت کو متاثر نہ کیا ہو۔ چند مثالیں دیکھئے:۔

"جب پو پھٹنے میں کوئی ایک گھنٹہ باقی تھا تو میں باہر نکل آیا۔ زرد چاند دور مغربی افق کے قریب اونگھ رہا تھا۔ اور موٹے موٹے ستارے سلیٹی آسمان پر ناچ رہے تھے۔ ہوا میں خنکی آگئی تھی۔"

"گیتوں کی آوازیں دھیمی پڑتی گئیں ...... ٹیلوں کی ٹھنڈی ریت میرے جوتوں میں بھر گئی تھی۔ جس کی وجہ سے میرے جلتے ہوئے تلووں کو بہت سکون پہنچ رہا تھا۔ صبح کا ستارہ مشرقی افق پہ کسی سانولی دلہن کے ماتھے کی طرح چمک رہا تھا اور آس پاس اکیلی دکیلی ببولوں میں ٹڈے پیں پیں چلائے جارہے تھے۔"

(طلوع و غروب صفحات ۲۷، ۲۶)

"غروبِ آفتاب سے پہلے میں حسب معمول سعید کے ہمراہ باہر کھیتوں میں گیا، تو ننھی بدلیاں شفق کے چھینٹے بن کر آسمان پر بکھری ہوئی تھیں۔ اور ساری دھرتی گلابی ہو رہی تھی۔ ہوا ٹھنڈے پانی کے گھونٹ بن کر جسم میں اُتری جا رہی تھی۔ اور پرندے چپ چاپ ایک طرف اڑے جارہے تھے۔" (بدنام صفحہ ۱۲۵)

"اچانک آشیانوں کی طرف جاتی ہوئی چڑیوں کا ایک بہت بڑا غول کیکر پر اُترا، اور اس کی ہر شاخ پر گنبدیں سی لٹک گئیں .... چڑیوں کے پروں کی جھپٹ میں آئے ہوئے کیکر کے پھولوں نے زمین پر ہلدی سی بکھیر دی تھی۔ اور آسمان پہ دور تک سورج کی کرنیں ایک گھنی بدلی میں سے تیروں کی طرح نکلی پڑ رہی تھیں۔" (اصول کی بات صفحہ ۷)

"لیکن جوں ہی بہار کا پہلا جھونکا درختوں کی سوکھی ہوئی شاخوں پر جگہ جگہ سبز رنگ کے دانے سے ٹانک جاتا اور چٹانوں کی دراڑوں تک سے نرم نرم گھاس پھوٹ پڑتی، جب نیچے وادی میں سے ہریالی کی مہک بلندی پر آتی، اور بلندی کی ہریالی کی مہک نشیبوں میں اُترتی اور وادی میں منتشر ہو جاتی۔ اور نئے سورج کا سونا سکیسر کے قدموں

چمچماتی ہوئی جھیل کی سطح پر آگ لگا دیتا۔ اور پہاڑی ڈھلانوں سے چھپے ہوئے کھیت دور دور تک لہلہا اٹھتے تو جنگلوں کی صفائی شروع ہوجاتی۔ "
(رئیس خانہ صفحات ۲۲، ۲۱)

"بجلی اچانک نہایت زور سے چمکی اور بادل اس شدت سے کڑکا کہ پہاڑیاں دیر تک تانبے کی تھالیوں کی طرح بجتی رہیں، یوسف بھاگ کر باہر صحن میں آ گیا۔ پھر فوراً اندر لپکا۔ ایکدم بادل جیسے پھوٹ پڑا۔ صحن میں تھوڑی سی دھول اڑی اور بیٹھ گئی۔ پرنالوں کے دھانے سے پتے اور تنکے بوکھلا کر باہر آ گرے اور آن کی آن میں سکیسر پر جوانی آ گئی۔ "
(رئیس خانہ صفحہ ۲۷)

"پھر جب میں چونکا تو ڈوبتے ہوئے سورج کی زرد دھوپ دور تک پھیلے ہوئے سرسوں کے کھیتوں پہ اونگھ رہی تھی، سرسوں کے پھولوں کی صاف ستھری صحت مند زردی میں چمک سی آ گئی تھی۔ اور آسمان کے وسط میں اڑتی ہوئی ایک پتلی سی بدلی کو ڈوبتے ہوئے سورج نے بسنتی دوپٹے میں بدل دیا تھا۔
(آتش گل، صفحات ۸۳/۸۲)

"ہم منھ اندھیرے اس جزیرے پر پہنچے، نہایت ہوشیاری سے ساحل پر اترے اور پھر جھاڑیوں میں رینگتے ہوئے جب آگے بڑھے تو اس وقت سامنے مشرق میں جیسے کسی نے انار چھوڑ دیے تھے۔ اتنی اجلی صبح میں نے پنجاب میں بھی کبھی نہیں دیکھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا۔ جیسے میں نے صبح کو عریانی کے عالم میں اس کے خلوت کدے میں دیکھ لیا ہے۔ چڑیوں کے چہچہوں میں ہنسی کی سی کیفیت تھی۔ سمندری پرندے لمبی لمبی ٹانگیں لٹکائے ہمارے سروں پر تیرنے اور غوطے مارنے لگے تھے۔ "

(ماما، صفحات ۱۰۹، ۱۰۸)

ندیم قاسمی اردو کے صفِ اول کے افسانہ نگاروں میں شمار کئے جانے کے مستحق ہیں۔ ان کا مشاہدہ گہرا اور بے جھجک اور انسانی فطرت کے پیچ و خم سے ان کی واقفیت بڑی دور رس اور بلیغ ہے۔ وہ زندگی کی سفاک حقیقتوں پر کوئی رنگین پردہ نہیں ڈالتے اور انسانوں کے عصری محرکات کو ان کے اصلی رنگ میں پیش کرنے سے نہیں جھجکتے۔ جنس سے ان کی دلچسپی معمول کے مطابق ہے۔ اس میں مریضانہ لذّت اندوزی نہیں۔ ان کے یہاں طنز کے چھینٹے بھی جگہ جگہ ملتے ہیں۔ مگر یہ طنز ایسا نہیں جو مردم آزاری کی سرحدوں کو چھو لے۔ ان کے نقطۂ نظر میں اعتدال اور سلامت روی اور ان کے لہجہ میں نرمی، شائستگی اور حلاوت ملتی ہے، جو برسوں کے عمل صیقل اور کام و دہن کی ہر آزمائش سے گزرنے کے بعد پیدا ہوتی ہے۔ وہ مادے کی طہارت کے بھی قائل ہیں، اور روح کو اس طہارت کی ایک ترقی یافتہ شکل بھی سمجھتے ہیں۔ "ماتم"، "کفن دفن"، "موچی"، "ہیرا"، "رئیس خانہ"، "الحمدللہ" اور "پرمیشر سنگھ" اردو کے ستھرے اور معیاری افسانے کہے جا سکتے ہیں۔ کسی بھی ادبی فن کار کے لئے وجہ امتیاز یہ نہیں ہے کہ اس کے یہاں سیاست، مذہب یا فلسفہ موجود ہے یا نہیں، بلکہ یہ کہ وہ ان کی موجودگی یا غیر موجودگی سے قطع نظر انسانی ادراک کی کس حد تک

توسیع کرتا ہے۔ اور اس کے نقطۂ نظر میں کتنی انفرادیت، ہمہ گیری، توازن اور مرکزیت ہے۔ بیش بہا افسانہ حقیقتوں کے ایسے گوشوں کو جنھیں دیکھتے اور محسوس سب کرتے ہیں، اگر یائی عطا کرنا بڑے ظرف اور حوصلے کا کام ہے۔ عام آدمی کے لئے ہر چھوٹے بڑے تجربے کے اردگرد ایک خول سا چڑھا ہوتا ہے۔ یہ خول ہمارے اپنے واہموں، تعصبات اور آدرشوں کا ہوتا ہے۔ اور ہم رسم، رواج، ذہنی کاہلی اور بے رخی کی وجہ سے اس خول کو توڑنے پر رضامند نہیں ہوتے۔ افسانہ نگار، اشیاء، تجربات اور کرداروں کو ہمارے سامنے برہنہ پیش کرنے پر اصرار کرتا ہے۔ اسی میں اس کی جیت ہے۔ ندیم قاسمی کی بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کے یہاں ایک اعلیٰ فن کار کی جرأت اور صداقت کے ساتھ تہذیبا اور دل سوزی، متانت اور میانہ روی، اور ہمدردی اور رفاقت کا جذبہ ہر ہر قدم پر ہمارا ساتھ دیتا ہے۔ وہ انسانوں کے سامنے ایک آئینہ بھی رکھ دیتے ہیں جس میں اُن کی خوبیاں اور خامیاں بلا کم و کاست جھلک اٹھیں اور ایک معیار بھی جہاں تک انھیں پہنچنا ہے۔

دیوندر اسّر

مُرتا ہوا آدمی" اور جدیدیت

مرتا ہوا آدمی کیوں اچھا نہیں لگتا ؟

یہ سوال بڑا اہم ہے۔ کیونکہ یہ سوال اس ذہنی کیفیت پر پھر سے غور کرنے پر مجبور کرتا ہے جو جدیدیت کے نام پر تشدد، جرم، جنسی جنون، امرد پرستی، زنا بالجبر اور بہیمانہ قتل وغیرہ کو ادب کا جدید موضوع قرار دیتی ہے۔ اور اقدار اور انسانیت کی بحث کو دقیانوسی تصور کرتی ہے ویسے اپنے میں یہ اوریجنل خیال نہیں بلکہ یورپ اور امریکی بیٹ میلر زمیں بار بار دہرائے گئے موضوع کی ہی بازگشت ہے۔

جب بھی اِس قسم کی فکر کی تنقید کی جاتی ہے تو ان موضوعات کی سند کے لئے بڑے بڑے ناموں کی پریڈ کی جاتی ہے۔ سارتر اور کامو سے لے کر ہنری ملر، نارمن میلر، ایانسکو، جینے، ولیم بروز، گنٹر گراس، ساب گرئے وغیرہ کی۔ اور ان کے فلسفۂ حیات کو تسلیم نہ کرنا اپنی ذہنی پس ماندگی کا ثبوت ہی فراہم کرنا ہے۔

سب سے پہلا سوال تو یہ ہے کہ کیا مرتے ہوئے آدمی کا اچھا لگنا جدیدیت کا ثبوت ہے۔ بالکل نہیں۔ دَورِ وحشت کے انسان سے لے کر ۱۹۶۶ء کے قاتل رچرڈ سپیک (پچیس سالہ نوجوان جس نے ایک رات میں آٹھ نرسوں کا بہیمانہ قتل کیا) تک ایک طویل سلسلہ ہے مرتے ہوئے آدمی کے اچھا لگنے کا۔ یقین کیجئے "جدید ادب" کے علم برداروں کو رچرڈ سپیک سے بہتر "انٹی ہیرو" یا آدرش کردار بڑی مشکل سے ملے گا۔ ہٹلر کو مرتے ہوئے آدمی بڑے اچھے لگتے تھے اور اس نے ساٹھ لاکھ یہودیوں کو وحشیانہ اذیت کا شکار بنا کر موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ قرونِ وسطیٰ کی تواریخ اِس بات کی شاہد ہے کہ مذہب اور ریاست کے نام پر کیا کیا ظلم روا نہیں رکھے گئے۔ جہاد اور صلیبی جنگیں اور توسیع سلطنت کے لئے لڑائیاں یا محض ہوس اور زر اور ذہنی کجروی کی خاطر قتل و غارت، گاتھ، وینڈلز، اٹیلیا، چنگیز خاں، تیمور لنگ، نپولین، سیزر، اسٹالن[1]، نادر شاہ اور کتنے ہی نام ہیں جن کو مرتے ہوئے آدمی اچھے لگتے ہیں۔ ہندوستان اور پاکستان کے فسادوں میں بھی مرتے ہوئے بچے، بوڑھے اور عورتیں کچھ لوگوں کو اچھی لگتی تھیں۔ ہر ملک میں مختلف اَدوار میں یہ داستان دہرائی گئی ہے۔ اور ان سے حسن پرستی کی تسکین کے لئے بے رحم وحشیانہ اذیت کے نئے نئے طریقے ایجاد کئے گئے۔ مست پاگل ہاتھیوں کے پاؤں تلے غلاموں کو روندنے، رتھ

---

[1] اسٹالن [illegible] لیکن اس فہرست میں اسٹالن کا نام لینا صحیح نہیں ہے۔ ادارہ

کے بیہوں کے پیچھے کچلنے، پلکیں کاٹنے، بھوکے پیاسوں کو کوڑے لگا لگا کر مارنے سے لے کر کنسنٹریشن کیمپوں اور گیس چیمبرس تک موت کے ٹورنامنٹ، موت گھر، جنگیں، نیپام بم اور ہائیڈروجن بم تک ایک ایسا ماحول تیار کیا گیا ہے کہ موت کے تئیں ہم نہ صرف غیر جانب دار ہو جائیں (رحم کی بات تو نری سستی جذبات پرستی ہے) بلکہ اس کو ناگزیر اور قابلِ قدر عمل سمجھ کر اس پر فخر محسوس کر سکیں۔ ورنہ بہیمانہ پُر تشدد اور پُر اذیت موت کا نشانہ بنتے ہوئے لوگوں کو دیکھ کر ہجوم پُر جوش تالیاں بجا بجا کر خوشی کا اظہار نہیں کر سکتا۔

موت کے بارے میں جوش و خروش کا رویہ جدید نہیں، دورِ وحشت کی ذہنیت کا پروردہ ہے۔ جسے تعلیم، فن اور ادب، فلسفہ اور سائنس مہذب بنانے میں ناکام ثابت ہوئے ہیں۔ ورنہ کیا باعث ہے کہ بیسویں صدی میں بھی کوئی جدید ادیب یہ لکھنے کی جرأت کر سکتا ہے کہ مرتا ہوا آدمی کیوں اچھا نہیں لگتا۔ یہ ذہنیت جدید نہیں بہت قدیم ہے۔ انسان کے دورِ درندگی کی ذہنیت ہے۔ جس کی پُر زور مخالفت اگر کسی ایک گروہ نے سب سے زیادہ کی ہے تو وہ فن کاروں اور ادیبوں کا گروہ ہے۔ اس لئے نہیں کہ اس کے پاس حیات و موت کا کوئی نظریہ نہیں بلکہ اس لئے کہ اس کے نظریے میں مرتے ہوئے آدمی کے اچھا لگنے کا احساسِ جمال نہیں۔

فن کا ایک مدرسۂ فکر یہ بھی رہا ہے کہ "اگر ہزار دوشیزائیں مر بھی جائیں تو کیا ہوا اگر ان کی موت ڈیلو کرڈے کو کینوس مہیا کر سکتی ہے۔" یہ خیال محض خالص فن کے پیروکاروں کو ہی مرغوب ہو سکتا ہے۔ لیکن جدید فن کار اِس خالص حسن پرستی کو برسوں پہلے خیرباد کہہ چکے ہیں۔ پھر یہ جدیدیت کہاں سے آ گئی؟ در اصل جدیدیت اس "فنِ محض" کے نظریے کے خلاف پروٹسٹ کے طور پر ظہور ہوئی ہے۔

جب ۱۹۴۳ء میں بنگال میں لاکھوں لوگ چاول کے ایک ایک دانے کو ترستے موت کا شکار ہو گئے تو اس وقت بھی خالص فن کے ایک علم بردار نے ننگی تصویروں سے لطف اندوز ہونے کا نعرہ دیا تھا۔ اور یہ اتفاقیہ امر نہیں کہ ۲۲-۲۰ برس بعد جب اڑیسہ میں قحط پڑا تو ہندی کے ایک ادیب نے سوال کیا کہ "مرتا ہوا آدمی کیوں اچھا نہیں لگتا" اور وہی ادیب بہار کے قحط کے پسِ منظر میں کہتا ہے کہ میں قحط کے بارے میں سوچ کر یا لکھ کر "زندہ عورت سے مباشرت سے حاصل کئے ہوئے حظ کے لمحات" کو کھو نہیں سکتا۔ جدید ذہنیت ۲۲-۲۰ برس پہلے کی ذہنیت سے جا ملتی ہے۔ اور اس وقت بھی ایسی ذہنیت کو جدید کے نام سے ہی پیش کیا گیا تھا۔ معلوم نہیں کہ دورِ وحشت سے لے کر یہ جدیدیت کتنے ہزار برسوں تک "جدید" رہے گی۔ سوال قحط یا جنگ پر افسانے اور نظمیں لکھنے کا نہیں بلکہ اس صورت حال اور برسرِ اقتدار قوت کے خلاف پروٹسٹ کا ہے جو ان کا باعث بنتے ہیں۔ انسان اور زندگی کے بارے میں وشواس کوئی دقیانوسی خیال نہیں جو لوگ اس کو دقیانوسی قرار دیتے ہیں۔ اُن کی تحریریں پڑھ ڈالیے، ان کے پاس مباشرت، امرد پرستی، اور جلق کے سوا کوئی موضوع نہیں گیا۔ جسے ادب کے نام پر پیش کیا جاتا ہے۔ جو فٹ پاتھوں پر پیلے لفافوں میں بافراط مل سکتا ہے۔ سارتر اور کامو کے نام

دہائی دینے والے جدید ادیب کیا بھول گئے ہیں کہ وہ مکمل طور پر کمیٹڈ (committed) ہیں۔ سارتر کی زندگی اور اس کا سارا ادب انسان کی جد و جہد کو منسوب ہے۔ لیکن یہاں بحث commitment پر نہیں۔ کامو کا ایک فقرہ نقل کرنا کافی ہے۔

"میں بغاوت کرتا ہوں۔ اس لئے ہم وجود رکھتے ہیں۔"

ترقی پسند اور تیس کے ادیبوں کی روش سے جو مایوسی کی لہر پھیلی۔ اس کی لپیٹ میں ہر قسم کی انسانی جد و جہد اور سماجی بروشٹ "ابسرڈ" (لغویت) کے فلسفے کا شکار ہو گئے۔ لیکن جدید ادیب بھول گئے کہ ہم اب بھی committed ہیں۔ انسان اور زندگی کے بارے میں۔ کیونکہ احساسِ جمال اور اچھا لگنا۔ انسانی احساس اور عمل ہیں۔ یہاں سیلکام مگرج کے الفاظ کا ترجمہ کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

"نصف صدی جس میں میں شعوری طور پر زندہ ہوں مجھے خاص طور پر فنا پرور، قاتل اور وحشی دکھائی دیتی ہے۔ اس نصف صدی میں زیادہ لوگ مارے گئے ہیں۔ اور تشدد کا شکار بنائے گئے ہیں۔ زیادہ لوگوں کو خانماں برباد کیا گیا ہے۔ زیادہ طور پر قدیم وراثت کو برباد کیا گیا ہے۔ زیادہ جھوٹ کا پرچار کیا گیا ہے۔ اور ادنیٰ قسم کی ذہنیت اور عمل کا ثبوت دیا گیا ہے اور فن اور ادب اور تخیل سے بہرہ فہم و آگہی میں بہت کم ترقی ہوئی ہے۔"

انحطاط پرست اور ذہنی کج روی اور مرض کے الفاظ اب متروک ہو چکے ہیں۔ اگر آج ان الفاظ کا استعمال کیا جائے تو صورتِ حال بڑی مضحکہ خیز سمجھی جاتی ہے۔ کج رو ذہنیت ادب کا موضوع بن سکتی ہے۔ فلسفہ نہیں۔ کیونکہ ذہنی مریض کی تخلیقات بہت کم فلسفہ کا درجہ اختیار کرتی ہیں۔ اس کو تجربات سے ثابت کیا جا چکا ہے۔ اعلیٰ تخلیق جینیس پر جنون کا غلبہ نہیں بلکہ جنون پر جینیس کی فتح یابی کا نتیجہ ہے۔ اس لئے جو ادیب ذہنی مرض کو فن کا درجہ دینا چاہتا ہے جدید نہیں اور نہ ہی تخلیقی۔ فرائیڈ نے تحریر کیا ہے کہ ہم بار بار اس حقیقت پر زور دے سکتے ہیں کہ انسانی عقل انسانی جبلتوں کے مقابلے میں کمزور ہے۔ یہ مانتے ہوئے ہم صحیح ہوں گے۔ لیکن اس کمزوری میں ایک خصوصیت ہے۔ عقل کی آواز مدھم ہے لیکن سنائی دینے سے قبل یہ بند نہیں ہوتی۔ آخر میں اس کے انکار کے بعد بھی یہ سنائی دے جاتی ہے۔ فرائیڈ کے اس قول کو دہرانے کی ضرورت اس لئے پڑی کہ آج جدیدیت عقل کے خلاف جبلت کے اظہار میں سمجھی جا رہی ہے اور زیادہ تر یہ پرچار سے فرائیڈ کے نام پہ۔

ایسے ادیب اقدار کے خلا کی جدید حالت کا واسطہ دیتے ہیں۔ عدم اقدار اور اقدار کا بحران۔ انسان اور زندگی کو حقارت کی نظر سے دیکھنا اور موت کی پرستش کرنا۔ اقدار سے لاتعلقی کا ثبوت نہیں۔ بلکہ ایک قدر کے بجائے دوسری قدر کو تسلیم کرنا ہے۔ ایسی صورت میں بحث اس بات پر ہو گی کہ کون سی قدر صحیح ہے اور اس بحث میں فلسفہ نفسیات اور ادب کا سہارا لینا پڑیگا۔ کسی ایک ادیب کی جبلت کو مطلق، کل اور حرفِ آخر تسلیم نہیں کیا جائے گا۔ کیونکہ ایسے ادیب اس تجزیے سے ڈرتے ہیں۔ اس لئے ان کے پاس ایک ہی حربہ ہے جسے وہ کارگر سمجھتے ہیں کہ ان سب کا مذاق اڑایا جائے اور یہ رجحان موجودہ دور کی ذہنیت کے مطابق ہی ہے۔ لیکن ہم اسے پرچار اور "سنسنی" کا درجہ ہی دیں گے۔ چونکانا اپنے آپ میں مفید ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ وہ ادبی فلسفہ کے روپ

میں بھی تسلیم کیا جائے۔

آخری بات :-

موت ہمیشہ انسان کی آزادی کی طبعی حد رہی ہے اور ادب ہمیشہ آزادی کے افق کو ہمہ گیر اور وسیع بنانے کی انسپریشن۔ اگر قحط کے شکار لوگوں کو موت کے منہ سے بچانے کے لئے آواز اٹھانے سے کوئی ادیب جدیدیت کے لیبل سے محروم ہو جاتا ہے تو شاید ہی کوئی ذی حس ادیب جدید رہ جائے گا۔ کینتھ ٹائینن میرے خیال میں جدید ادیب ہے۔ ایک بار اس نے کہا تھا کہ ادب کی کوئی بھی تخلیق چاہے وہ کتنی ہی لافانی کیوں نہ ہو انسان کی زندگی کی قیمت نہیں۔ ٹائینن دورِ وحشت کا دقیانوسی ادیب نہیں۔ جدید دور کا ذی حس ادیب ہے جو انگریز ہوتے ہوئے بھی انگلینڈ کے سیاسی اور روحانی زوال کو اپنے غصّے کا نشانہ بنا کر یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہے — "مجھے انگلینڈ سے نفرت ہے۔" کیونکہ اس کے لئے انسان سے بالاتر نہ کوئی قوت ہے اور نہ کوئی ادب۔

شیث نظمیں

دیکھو تو خرامِ پافگاراں
جب سے میری آنکھ کھلی ہے
چلو کسی آسماں کے نیچے

زہرہ نگاہ

ویت نام

دیکھو تو خرامِ پا فگاراں
کانٹوں کی زباں پہ گل کھلے ہیں

ہر دیدۂ تر کے لعل و گوہر
ہر سینۂ چاک پر سجے ہیں

تاروں میں اک آگ سی لگی ہے
ذرّوں کے چراغ جل رہے ہیں

ہر ظلم کی وسعتوں کے آگے
اک ذرّے کے کتنے حوصلے ہیں

جو سر کہ قلم ہوئے نشاں ہیں
جو خاک ہوئے وہ راستے ہیں

برسوں سے ہے موت رقص فرما
برسوں سے یہ لوگ جی رہے ہیں

ویت نام

جب سے میری آنکھ کھلی ہے
میں نے اپنی اس دنیا میں
آگ برستی ہی دیکھی ہے
خندق کی اس گود میں میں نے
جینا سیکھا، رہنا سیکھا
ہر دکھ درد کو سہنا سیکھا
جب سے میں نے کہنا جانا
میرے لبوں سے یہ نکلا ہے
میری بستی پر چھائی یہ چھت آخر کب نیلی ہوگی
کب اس میں تارے چمکیں گے
اور کب دو دھ سے بادل
جو میں سوچوں گا وہ بن جائیں گے
اور کب دھوپ کے روشن ذرے
میری مٹھی میں آئیں گے
کب کھیتوں میں دوڑ کے میں بھی
ہوا کے جھونکوں کو چوموں گا
اور کب چاند کی ٹھنڈک کو میں
اپنے ہاتھوں سے چھو لوں گا
میں نے سنا ہے، مجھ کو یقیں ہے
اس دنیا میں سورج چاند ہوا پر کوئی قید نہیں ہے

رہوڈیشیا

چلو کسی آسماں کے نیچے کسی نے سنگِ وفا تو رکھا
چلو کسی بزمِ عاشقاں میں کسی نے پردے تو کر دکھائے
وہ سارے ارکانِ عشق جو بس کہانیاں تھے
چلو کسی کی جبیں تو آخر کردار سے چاندنی سے کے ابھری
چلو کسی کی گھٹتی ہوئی سانس جھونکا بن کے فضا میں بکھری
زباں کی شعل کی لو تو دیکھو، یہ کس کے شانے کو چومتی ہے
بدن کی دولت تھمی ہوئی نبض کے سہارے یہ جھومتی ہے
کسی کے ہونٹوں کے زرد پھولوں پہ عید کی تازگی بھی تو
کسی کے رخسار کی چٹانوں پہ شبنم برگِ گل گری تو
کسی کے بے جان بازوؤں نے کیا تو لہرا کے اک اشارا
چلو کسی کی امنڈتی آنکھوں نے ایک رستہ تو دیکھ ڈالا

قاضی عبدالستار

میراث

رات سو رہی تھی لیکن دھماک رہا تھا۔ بادل کی رعنائی کہیں کہیں سے مسک گئی تھی اور اکا دکا ستارے چمک اٹھے تھے۔ پھر ایک ساتھ کئی گھنٹیاں کھنک اٹھیں۔ اس نے چوڑے چکلے پلنگ پر تھکا ہارا بھاری بھاری بھرکم جسم اور پھیلا لیا۔ پھر گھنگھروؤں نے چٹکی لی۔ اس نے کاہلی سے کروٹ بدل کر دیکھا۔ آنگن کے بائیں چھپر کے آگے چرنیوں کا سلسلہ دور تک پھیلا ہوا تھا اور اس کے اپنے ہاتھ سے خریدے ہوئے جانور اجلے کالے دھبوں کی طرح کھڑے بیٹھے تھے اور کسمسا رہے تھے۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کا ہاتھ ٹارچ ٹٹولنے لگا لیکن پکڑ میں کارتوس آ گئے۔ اس نے حاملہ عورتوں کی طرح بھرا بدن موڑ کر سرہانے سے قالین کا کونا الٹ دیا۔ اندھیرے میں بھی بندوق کا کندا نظر آ گیا۔ اس نے بندوق اٹھا لی۔ سیاہ، چکنی، ٹھنڈی نالوں کو پیار کیا۔ پھر آسمان کی طرف سیدھی کر کے کارتوس لگا دیے۔ اور دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر بیچوں بیچ قالین پر سوئے ہوئے مقدس بچے کی طرح آہستہ سے لٹا دیا اور آٹھ سیلوں کی بڑی ٹارچ اٹھا کر جانوروں کی طرف چلا۔ جب لال اینٹوں کی نئی دیواروں میں لگے ہوئے پھاٹک کے سامنے سے گزرا تو پاؤں دفن ہوئے گوبر کے جلے ہوئے بان پر پڑ گیا اور اس کی ناک، بارود کی خوشبو سے بھر گئی۔ دنیا کی بہترین خوشبو سے چھلک اٹھی۔ کان دنادن کی آوازوں سے گونجنے لگے۔ سورج چھپنے سے پہلے وہ سرپنچ عدالت کا چناؤ جیت چکا تھا اور لوگ اسے بدھائیاں دے رہے تھے۔ نیلو مہتیا کی جے جے کار کر رہے تھے۔ رگھو چمار نے تو اس کے گلے میں کلابتو کا ہار بھی ڈال دیا تھا۔ جسے اس نے بڑے ٹھاکر کی طرح اتار کر بڑکو کے ہاتھ میں رکھ دیا تھا۔ جب بلاک کا پہلا پہلا الکشن ہوا اور بڑے ٹھاکر جیت گئے اور رامپور کے پنڈت نے ان کو ہار پہنایا تھا تو انھوں نے پہنا کہاں تھا۔ کھڑے کھڑے اتار کر کسی سپاہی خدمت گار کو پکڑا دیا تھا۔ وہ اپنے بوڑھے پیروں پر جلدی جلدی چلتا ہوا آیا۔ پانچ دروازوں والا لمبا کمرہ بند تھا۔ اس نے چوروں کی طرح زنجیر کھولی۔ دیوار پر جہاں بیلوں کی ہمیلیں اور مہریاں ٹنگی تھیں۔ وہیں روشنی کے تیز گول دائرے میں اس کا ہار جگر جگر کر رہا تھا۔ اس نے اتار کر پہن لیا اور اپنے آپ پر نگاہ کی تو جیسے ہزاروں من مٹی کے نیچے ماتوں کے سوئے خواب انگڑائیاں لینے لگے۔ وہ دیر تک اس کمرے میں کھڑا رہا۔ جس میں ایک طرف چھت تک بھوسہ بھرا تھا اور جس کی دھمک سے کمرہ دہک رہا تھا۔ جب اس کے ننگے پیٹ پر پسینے کے قطرے کھٹملوں کی طرح رینگنے لگے تو وہ باہر نکلا۔ آم کے بور کی خوشبو کا گہنا پہنے ٹھنڈی ہوا نے اسے اپنے آپ میں سمیٹ لیا۔ اب چرخی پر ہنگامہ گھومنے لگا تھا۔ اس نے جلتی ہوئی ٹارچ قالین پر لٹا دی اور اسی طرح ہار پہنے پہنے کندھے پر بندوق رکھے جانوروں کی طرف اس طرح چلا جیسے بڑے ٹھاکر گڈھی سے

نکل رہے ہوں۔ اس نے چاروں طرف گھوم پھر کر اپنے جانور دیکھے اور بیلوں کے ماتھے اور بھینسوں کے پٹھے سہلائے۔ پھر سانی پانی کرنے والوں کو ڈانٹنے کے لئے گردن گھما کر منہ کھول دیا۔ مگر خیال آ گیا کہ وہ اکیلا ہے اور رات باقی ہے۔ پھر گھمر گھمر چلنے والی چکیوں اور پسنہاریوں کے گیتوں کی ٹھمک ٹھمک چلتی ہوئی آوازوں نے اسے گھیر لیا۔ جیسے موٹی عورتیں ناچ رہی ہوں اور ان کے گھنگھروؤں کے ساتھ نئے ناڑی لگے بھاری بھاری لہنگے سرسرا رہے ہوں۔ اس نے چونک کر اس طرف دیکھا جدھر سے آوازیں آ رہی تھیں اور اس طرح دیکھا کہ اگر دن ہوتا تو اپنی عدالت میں مقدمہ قائم کرا دیتا۔

پھر اس کے اپنے گھر سے اٹھادھری کی آوازیں آنے لگیں۔ بڑکو، منجھلو اور چھٹکو کھانسنے کھنکارنے لگے۔ ان کی دلہنیں بولنے بتلانے لگیں اور لڑکے چیخنے چلانے لگے اور نیم کی پھنگیوں پر سرخی چمکنے لگی۔ جیسے سنہری چڑیوں کی قطار بیٹھی ہو۔ تو سے یقین آ گیا کہ سچ مچ صبح ہو گئی ہے۔ اس نے جلدی سے کارتوس نکال کر بندوق قالین کے نیچے چھپا دی اور ادھر ادھر چلتا ہوا اپنے کمرے میں گھس گیا۔ گلے سے ہار...... اپنی جیت کا تمغہ اتار کر کھونٹی پر لٹکا دیا اور اطمینان سے قالین پر بیٹھ کر سوچنے لگا کہ آج کی رات اتنی جلدی کیسے گزر گئی۔ آگے تو چوٹ کھائے ہوئے پھوڑے کی طرح راتیں رسکتی رہتیں۔ کروٹیں بدلتے بدلتے کولھے اور کندھے درد کرنے لگتے چلیس پیتے پیتے سینہ دھونکنی ہو جاتا اور آج کی رات ..... جیسے کہاں راسم کا لا گھوڑا بات کی بات میں کاٹ گیا ہو۔

وہ اپنے اونچے سفید بیلوں کی جوڑ دیکھ رہا تھا۔ نوکر سینگوں میں سیاہ روغن لگا رہے تھے کہ رگھو چمار آ گیا۔ دبلا پتلا جھکا ہوا سن سفید رگھو چمار لال انگوچھا باندھے تھا۔ جن میں نکلی ہوئی پنڈلیاں سڑی لکڑیوں کے مانند بے جان اور گھناؤنی تھیں۔ چہرے پر جھریوں اور زرد بالوں کے علاوہ جھریوں کی تھالی میں آنکھوں کے ڈھیلے کیچڑ اور خوف میں لتھڑے پڑے تھے۔ لکڑی کے سوکھے ہاتھوں میں ایک بڑا سا دونا لرز رہا تھا۔ وہ بڑی دیر تک کھڑا رہا۔ اس کے ہونٹ پیلتے رہے۔ پھر ملو مہتیا نے اس کو چمکتی نگاہ سے دیکھا اور رگھو نے دونا مہتیا کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ مہتیا نے مٹھائی ایک نوکر کے سیاہ ہاتھوں میں تھما دی اور ناریل کی مہتال دانتوں میں داب کر دونوں ابرو اچکا دئے۔

"بیرا رکھنا ہے آپ سے۔"

ایک جملے کا بوجھ اتار کر رگھو ہانپنے لگا۔ ملو مہتیا اسی طرح دھواں اگلتے رہے اور ادھر دیکھتے رہے جہاں چھٹکو بالٹی کی چھت پر لٹکی رکھی منگنی سے واپس آئی ہوئی جاجمیں اور دریاں نہار رہا تھا۔ مہتیا نے پھر سنا۔

"ایک پلنگ برابر دھرتی ہے ..... مل ایک وکھت کی روٹی دے سکت ہے"

مہتیا نے نگاہ اٹھائی۔ مگر اب رگھوا چل نکلا تھا۔

"مورا کا ہے؟ .... آج مرا کل دوسرا دن .... مل چھوٹے چھوٹے بن باپ کے بچے بلکت ہیں اور کھنڈر مال آپا بھولونا بھر اپڑا ہے۔ اگر دیواریں گرائے کے بتا کو بوئے دین جائے تو ہجار روپیہ کھڑا ہوئے جائے۔"

اور رگھو کی جھولی خالی ہو گئی۔ مہتیا نے پھاٹک کی طرف نگاہ کی۔ جا کم چوکیدار آ رہا تھا۔ خاکی کورٹ پہ پیتل کی چپراس

اور لال صافہ باندھے، ورکندھے پر بلم رکھے وہ بالکل پاس آ گیا۔ مہتیا نے پلنگ پر اس خوف سے دور تک اپنے پاؤں پھیلائے کہ کہیں چوکیدار ان کے برابر نہ بیٹھ جائے۔ اور دونوں ہاتھوں سے مضبوط پکڑے ہوئے ناریل کو منھ سے ہٹائے بغیر پوچھا۔

"کا ہے..... جالم؟"

"سب کچہری بھر گئی اور تمھار راہ تکی جائے رہی ہے۔"

یہ ایک جملہ ریڑھ کی ہڈی میں برف کے خنجر کی طرح اوپر سے نیچے تک تیر گیا جب چلم جل گئی اور چوکیدار چاہیاں لینے لگا، تب کہیں مہتیا اُٹھے۔ نئے کنوئیں کی جگت کے نیچے پکی چبوتریا پر کھڑے ہو کر پاؤں دھوئے۔ تیل پلائے جوتے پہن کر رگھوا کو لگا ہوا سبے رنسند نا کیا اور گھر کی دہلیز پہ پاؤں رکھتے ہی ہانک لگائی۔

"ارے کہاں ہو..... بڑکو کی مہتاری"

بڑی بہو جو سنبھالی ہوکے پاؤں کی ایڑی رنگ رہی تھی ہڑبڑا کر کھڑی ہو گئی۔ چھوٹی اسی طرح بیٹھی اپنے پیٹی کو پہ پکھول کا ڑھتی رہی اور بڑکو کی مہتاری سوپ میں بھنے ہوئے چنے پھٹکتی ہوئی دوسری تدداری سے نکل آئیں اور پوری آواز سے چیخیں۔

"کہو"

"ہمار کرتا کہاں ہے؟ لوا"

"کا ہے"

"ارے عدالت مکدمے لیے بیٹھی ہے اور تم کاہے کا ہے لگائے ہو"

اور بڑکو کی مہتاری کے طباق جیسے چوڑے سرمئی چہرے پر گلابی رنگ کا پتارہ بچھ گیا۔ سوپ کو دہلیز کے حوالے کر کے کٹھیا کے اوپر سے اُچک کر گٹھری اُتار لی اور بھاگل پوری چادر کے کا کرتا نکال کر مہتیا کو پکڑا دیا اور جھپاک سے کوٹھری میں گھس گئیں۔ مہتیا گاندھی بابا کی ٹوپی پہن رہے تھے کہ وہ بینا سوپ لے کر آ گئیں اور رندھی ہوئی آواز میں بولیں۔

"پہلا پہلا مکدمہ ہے..... بھگوان سب نیک کریں"

اور سوپ جس میں گیندے کے پھول، سوکھے لڈو، تلچوری کے دانے، پان کے پتّے اور چراغ رکھے تھے۔ ان کے منھ کے آگے چپکے چپکے نچانے لگیں۔ مہتیا نے جو گھر والی کے منھ کی جھرّیوں پر آنسوؤں کے قطرے ڈولتے دیکھے تو گھٹنے کانپنے لگے لیکن چندن سے بھری ہوئی موٹی موٹی انگلیوں کے لمس نے اُن کی ہمّت بندھائی۔ گھونگھٹوں سے جھانکتی ہوئی سیاہ چمکیلی آنکھوں سے برستی ہوئی دعاؤں نے دھیرج دی اور وہ اپنے پیروں پر گھسٹتے ہوئے باہر نکل آئے۔

جالم چوکیدار اس کے پھاٹک سے دور پکّی سڑک پر گرام سبھا کی لالٹین کے نیچے کھڑا بیڑی پی رہا تھا۔ ان کو آتا دیکھ کر آگے آگے چلنے لگا۔ مہتیا اس کی چالاکی تاڑ گئے اور بڑھاپے کے باوجود ایسا جھوم کر چلے کہ چوکیدار پیچھے رہ گیا۔ اب وہ اس جگہ پہنچ گئے جہاں

گڑھی کا پھاٹک ہوا کرتا تھا اور پہرہ کھڑا ہوتا تھا اور اب وہاں ترکاریاں بوئی ہوئی تھیں۔ پھر وہ اس عمارت کے سامنے سے گزرے جو کبھی دیوان خانہ تھا اور جس میں اُلٹی سیدھی دیواریں کھینچ کر پی۔ ڈبلیو۔ ڈی نے مکان بنا لیا تھا اور جسے دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی شخص نے لنگی اور کھڑاؤں پہن کر ٹائی باندھ لی ہو اور ہیٹ لگا لیا ہو۔ اب املیوں اور نیم کے بوڑھے درختوں کی آڑ میں کھڑی ہوئی سفید عمارت چمکنے لگی تھی۔ یہ بڑے ٹھاکر کی کچہری تھی جسے مرتے وقت وہ گرام سبھا کو دان کر گئے تھے اور جس کے ہال میں حاج پور کی عدالت پنچایت بیٹھتی تھی اور دوسرے حصوں میں ہسپتال، پنچایت گھر، اسٹور اور پردھان کا دفتر تھا۔

آدمیوں سے چھلکتے ہوئے دالان کی سرخ کا مدار سیڑھیوں پر جب اس نے پاؤں رکھا تو پنڈلیاں کانپنے لگیں۔ آدمیوں کی دیوار پھاڑ کر وہ ہال میں داخل ہوئے جس کے ننگے گلابی فرش پر دیوار کے نیچے چوکی بچھی تھی۔ ان کے دونوں طرف ٹیڑھی میڑھی قطار میں مونڈھوں پر عدالت کے ممبر براجمان تھے۔ وہ چوکی کے پاس پہنچ کر ٹھٹک گیا تو سکریٹری صاحب نے ہاتھ پکڑ کر بٹھا دیا۔ آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ سب خون کی باڑھ اتر گئی اور سینے میں چلتی چکی تھم گئی۔ اور سکریٹری پنڈت گرجا شنکر نے پاسنگ شو سگریٹ چوکی کے پائے سے بجھا کر اپنے کان میں لگا لی اور بائیں کان سے قلم اُتار کر رگھو ولد دھاندو ساکن موضع حاج پور کے مقدمے کی کاروائی شروع کر دی اور حالم چوکیدار نے رگھو ولد دھاندو کے نام کی پھٹی پھٹی سی آواز میں ہانک لگائی۔ اور اس نے نفرت سے سوچا کہ یہی حالم چوکیدار اپنے تھانے دار کے سامنے کیسا ریل گاڑی کے انجن کی طرح ڈھکتا تھا۔ اور پھر للّو مہتیا کی نگاہ اندر کھلے دروازوں سے گزر کر اس ستون سے لپٹ گئی جس کا رنگ اُڑ گیا تھا۔ نقش و نگار مٹ گئے تھے۔ پلستر گر گیا تھا اور اینٹیں جھانکنے لگی تھیں۔ اور اب گویا وہ ستون نہیں تھا بلکہ خود للّو مہتیا لنگوٹی باندھے کھڑا تھا اور اس کے جسم پر منڈھی ہوئی متروہی کھال سے پسلیاں جھلک رہی تھیں اور للّو مہتیا نے جلدی سے آنکھیں بند کر لیں۔ اب سکریٹری دیوناگری رسم الخط میں لکھی ہوئی مسل پڑھ رہا تھا۔

"مسمی رگھو ولد دھاندو قوم چمار ساکن حاج پور کو مکان مذکور دوسری غیر منقولہ جائداد کی طرح اپنے باپ دھاندو ولد چھترو سے وراثت میں ملا تھا۔ رگھو بلا شرکت غیرے تیس برس تک قابض و ساکن رہا۔ پھر تلاشِ معاش میں لکھنؤ چلا گیا۔ عدم موجودگی میں مکان مذکورہ آفات ارضی و سماوی کے ہاتھوں کھنڈر ہو گیا اور گرام سبھا نے اپنی تحویل میں لے لیا۔ لیکن قبل اس کے کہ منا بیلے کی کوئی کارروائی عمل میں آوے۔ مسمی رگھو ولد دھاندو شہر سے واپس آ گیا اور مدعی ہوا کہ مکان مذکور کی حقیت سے گرام سبھا اس کے حق میں دست بردار ہو جائے۔ بڑکو پردھان نے جو آپ کے بڑے بیٹے ہیں۔ مقدمہ عدالت پنچایت کے سپرد کر دیا ہے۔ اب عدالت جو فیصلہ کرے۔"

اب رگھو ولد دھاندو جو قتل کے ملزم کی طرح خیالی کٹہرے میں کھڑا کانپ رہا تھا۔ گڑگڑایا۔

"حضور۔۔۔ پنچ پرمیشور میری جوت میں دو بیگھا جمین بھی نائیں ہے۔ ای لئے میرا یو گھر میں کا دان دے سکت ہو۔"
اور رگھو نے آنکھوں میں بھرا ہوا کیچڑ انگوچھے کے کونے سے پونچھ لیا۔ عدالت کے سکوت پر اس کے ہونٹ لُو کے مارے ہوئے آم کی پھانکوں کے مانند لرزنے لگے۔ جیسے وہ بھگوان سے بنتی کر رہے ہوں۔ اُپکار کی پرارتھنا کر رہے ہوں۔ اور بھگوان

سرپنچ کاروپ دھارے سامنے کے ستون پر آنکھیں گاڑے بیٹھا تھا۔ اور دیکھ رہا تھا کہ آج سے بیس برس پہلے اسی دالان کے اسی ستون کے پاس کھڑا ہے اور وہ بڑے ٹھاکر کے ہتھ چھٹ سپاہیوں کی مار سے پھوڑے کی طرح دُکھ رہا ہے۔ اور جب وہ آج کا ملّو مہتیا اور کل کا ملّوا لہار بڑے ٹھاکر سے کچھ کہنے کی نویدن کرتا تو اس کے سر پر اُلٹے ٹھوکے ہوئے جوتے کا بھڑاکا ہوتا۔ پھر اس کی آنسوؤں سے دھندلی آنکھوں نے دیکھا کہ یہ اندھے کھڑے ہیں دروازے رنگ برنگ کے شیشوں کی ان گنت آنکھیں کھولے کھڑے ہیں۔ ریشمی پردے ملبوں کی طرح اُلٹے پڑے ہیں۔ یہیں جہاں یہ ننگی بوچی چوکی پڑی ہے، سیاہ مخملی کوچ بچھی ہے اور بڑے ٹھاکر لیٹے خوشبودار دھوئیں کے چھوٹے چھوٹے غبارے اڑا رہے ہیں۔ اور وہ ان کے سامنے رگھو چمار کی طرح کھڑا ہے اور اپنے مقدمے کا آخری عدالت سے فیصلہ سن رہا ہے۔ کہ ملّوا کہار سے ریاست کی تمام زمین نکال لی گئی۔ پھر سرپنچ عدالت جاج پور ملّو مہتیا کی نگاہ اپنے بائیں ہاتھ کے انگوٹھے پر جم گئی۔ جس کا ناخن اُسی مار پیٹ میں ٹوٹ گیا تھا اور انگوٹھے پر ناخن کے بجائے بدگوشت نکل آیا تھا۔ سیاہ گھناؤنا بدگوشت۔ انگلیاں اپنے ناخن کی یادگار کو سہلانے لگیں اور آنکھوں کے آگے پانی کے پردے لرزنے لگے جن کے اس پار کچھ نظر نہ آتا تھا۔ اس نے جلدی سے اپنی آنکھیں پونچھ لیں۔ عدالت کے ممبروں نے سرپنچ عدالت کو بھری عدالت میں اس طرح روتے دیکھا تو سناٹے میں آ گئے اُنھوں نے جن کے پیروں میں عزیزوں، دوستوں اور مہربانوں کے الجھے ہوئے مفادات کی زنجیریں پڑی تھیں۔ سکریٹری کے سامنے سے کاغذ کا ایک تختہ اٹھا لیا اور کورے کاغذ پر اپنے دستخط کر دئے۔ انگوٹھے کے نشانات بنا دئے۔ پھر کاغذ سرپنچ کے سامنے رکھ کر مدھم آواز میں بولے۔

"آپ جو حکم چاہیں اس پر لکھ لیں۔"

دیر کے بعد ملّو مہتیا نے پورے بدن کو سرکا کر پاؤں نیچے اتارے۔ بڑے ٹھاکر کی طرح جھوم کر اُٹھے اور سر کے اشارے سے سکریٹری کو حکم دیا کہ کاغذ قلم لے کر ساتھ چلے۔ کمرے میں قدم رکھتے ہی محسوس ہوا جیسے بڑے ٹھاکر دوسرے دروازے سے چلے گئے اس کے بدن کے روئیں جھک گئے۔ اسے یاد آیا کہ یہ وہی کمرہ ہے جہاں ٹھاکر کچہری سے اُٹھ کر آرام کیا کرتے تھے۔ اُس کی نگاہ اوپر اٹھ گئی۔ جہاں سلاخوں اور کڑوں کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ تین ٹانگوں کے تخت کے سامنے وہ نیلے چکنے ٹھنڈے فرش پر ایک زانو توڑ کر بیٹھ گیا۔ سکریٹری نے کاغذ کو گدّے پر جا کر دے دیا۔ اور وہ پوری آدھی صدی کے بعد عبارت بنانے کے لئے سوچنے لگا۔ ایک لمبے چوڑے مفلس گھرانے کا مقدّر لکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس آسمانی لمحے کی اہمیت کا اسے احساس تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے فیصلے کی تنسیخ سے دیوتا بھی مجبور ہیں۔ اس کو معلوم تھا کہ مقدمہ اتنا چھوٹا ہے کہ اپیل کا ہاتھی اٹھا نہیں سکتا۔

جب وہ کچہری کے ہال میں آیا تو عدالت کھڑی ہو گئی۔ چلمیں اور بیڑیاں منھ سے نکل کر ہاتھوں میں سلگنے لگیں۔ بھنبھناتی باتیں خاموش ہو گئیں۔ سوکھی لوکیوں جیسی پنڈلیوں پر رگھو کے کھنکھر گھٹنے اور زرد رسے کانپنے لگے۔ پھر اس کے زرد بالوں سے ڈھکے ہوئے کانوں نے سنا۔

"عدالت پنچایت جاج پور مدعی مسمّی رگھو ولد دھانو قوم چمار ساکن جاج پور کا استغاثہ خارج کرتی ہے۔"

اس سے زیادہ سننے کی تاب نہ تھی۔ پھانسی کی سزا پانے والے دفعات کی تشریح سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔

گربچن سنگھ

موتیابند

شہر سے ایک کالی سڑک مزدوروں کی بستی کی طرف آتی ہے۔ بستی کے قریب ایک طرف میدان ہے۔ اور دوسری طرف کھپروں کی چھت والے کچے مکان۔ سڑک کے کنارے درختوں کی قطار ہے۔ ان میں ایک پیپل کا درخت بھی ہے۔ اس کے تنے کو سیمنٹ کے چبوترے سے گھیر دیا گیا ہے۔ ہوا کے جھونکوں سے جھومنے والے پتّے کچھ بکتے جھکتے سے رہتے ہیں۔ جگت مہاجن کا تخت پوش بھی اسی درخت کے نیچے بچھا رہتا ہے، پنواڑی کی دوکان بھی بغل ہی میں ہے۔ مہاجن کبھی کبھی اس تخت پر آکر بیٹھتا ہے۔ بھگوان کی کرنی پینتالیس چھیالیس سال کی عمر ہی میں آنکھیں جواب دے رہی ہیں۔ سر اور مونچھوں کے بال بھی سفید ہو گئے ہیں، لیکن انھیں وہ خضاب سے کالا کر لیتا ہے۔ پر یہ آنکھیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ؟ اب تو ان پر چشمہ بھی کام نہیں کرتا۔ "ڈاکٹر آپریشن کر کہتے ہیں، آپریشن کے بعد روشنی ٹھیک ہو جائے گی ——— لیکن آپریشن موتیابند پک جانے کے بعد ہی ہوگا۔ وہ بھی جاڑے کے موسم میں۔

جب مہاجن تخت پہ آکر بیٹھتا ہے تو ادھر اُدھر کے گپ باز یا قرض خور اسکو گھیر لیتے ہیں۔ لین دین کی بات ہوتی ہے، یا پھر ایک دوسرے کی چغلی۔ ہمیشہ کوئی نہ کوئی بکواس ہوتی ہی رہتی ہے۔ قلی، کباڑی اور دوسرے مزدور مہاجن ہی سے چھوٹا موٹا قرض لیتے ہیں ——— وہ ان کا ان داتا ہے۔

جب کبھی وہ تنہا ہوتا ہے اور کوئی عورت اُسے اپنے دکھ کا قصہ سنانے چلی آتی ہے تو وہ اس سے گھل مل کر باتیں کرتا ہے۔ للچائی ہوئی نظروں سے اسکی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس سے کرید کرید کر گھر بار کی باتیں پوچھتا ہے۔ اور اگر وہ اپنا دکھڑا رو کر اس سے کچھ روپئے ادھار مانگے تو آہستہ سے کہہ دیتا ہے

"جاؤ پرمیسری سے لے لو، ہم تو آنکھوں سے مجبور ہو کر کاروبار ایک دم چھوڑ بیٹھے ہیں۔"

پرمیشوری اسکی بیوی کا نام ہے۔ ایک نحیف اور لاغر، روگ کی ماری، چڑچڑے مزاج کی عورت، کسی کو پاس نہیں پھٹکنے دیتی۔ مہاجن بھی اس سے گھبراتا ہے، اُسے دوائیں کھلا کھلا کر ہار چکا ہے۔ نہ کبھی اسکی صحت ٹھیک ہوئی اور نہ کبھی مہاجن کو سکھ ملا۔ اولاد تو بھگوان کے ہاتھ ہے، قسمت میں ہوتی تو مل جاتی۔ بازار میں کرڑھو کی ماری عورتیں بھی بچوں کی ماں ہیں۔

مہاجن نے بڑی رسیلی طبیعت پائی ہے۔ اُسے درخت پہ چہکنے والی چڑیوں کی چوں چوں سے لیکر رونے والی عورت کی آواز تک

میں ایک نئے اوطرزہ سنائی دیتی ہے ۔ جب اُسے کچھ بھی سننے کو نہ ملے تو خود گنگنانے لگتا ہے ۔" جب اُسے اپنی لے بھونڈی اور بدمزہ سی لگتی تو نیواڑی کو مخاطب کر کے کہتا ۔

"ارے میاں سلامت میتجو نہیں سناؤ گے ؟"

سلامت مہاجن کا قرضدار ہے ۔ خان کا بچہ احسان فراموش نہیں ہو سکتا ، کیا ہوا جو آبائی پیشہ چھوڑ کر پان کی دکان لگاتا ہے اسی لئے خواہش نہ ہونے پر بھی مہاجن کی فرمائش پر بے وقت کی راگنی چھیڑ دیتا ہے ۔

اس دن ایسا ہوا کہ مہاجن کی طبیعت نہ تو گنگنانے کو چاہی اور نہ میتجو سننے کو ۔ چڑیوں کی چہک بھی اُسے بے معنی سی لگی ۔ کوئی ٹھمرا رونے والی بھی نہیں آئی ۔ گپ باز بھی کہیں مر گئے تھے ، اس لئے وہ تخت پر لیٹ گیا ۔ اسی درمیان لمحہ بھر کے لئے اسکی آنکھ لگ گئی ۔ اور اس نے محسوس کیا کہ ایک سریلی میٹھی آواز اُسے جاگنے پر مجبور کر رہی ہے ۔ کتنا حسین خواب ہے ۔ لیکن آواز جب قریب آ گئی تو اس کا بھرم مٹ گیا ، اس نے خواب نہیں دیکھا تھا ، حقیقت میں اس کے کان سنگیت سن رہے تھے ، وہ اٹھ کر بیٹھ گیا ۔

آواز قریب آئی ـــــــ بالکل قریب ، اور پھر سنائی دینے لگی گھونگھرو کی چھن چھن ....

"کون ہارمونیم بجا رہا ہے بھائی .... ؟"

"ہم ہیں مالک ... "

آواز جانی پہچانی سی لگی ۔ پھر مہاجن نے سامنے کھڑے ہوئے اندھے کو دیکھ کر کہا ۔

"جھگڑو تم ہو ... "

"ہاں مالک "

"کتنے دن کہاں رہے ؟" مہاجن نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا ـــــــ "آخر بستی چھوڑ کر کہاں چلے گئے تھے ـــــ ؟"

"کلکتہ چلا گیا تھا مالک "

"وہ چھوکری کہاں ہے ؟"

"ساتھ ہی تو ہے "

مہاجن نے منہ گھما کر دیکھا تو سامنے بارہ چودہ برس کی لڑکی گھگرا پہنے ، کجراری آنکھوں میں جھینپ لئے اسکی طرف دیکھ رہی ہے ۔ قریب ہی کھڑا تھا منیا ۔ اس کا چھوٹا بھائی ۔ دونوں کے چہروں پر ہلکا ہلکا پوڈر تیا ہوا تھا ۔ ہونٹوں پر سُرخی لگی ہوئی تھی ، مہاجن ایسی پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُسے دیکھنے لگے جیسے اسکی جان نکلا چاہتی ہے ۔ وہ کھانستا ہوا آہستہ سے پھسپھسایا ۔

"کیسی ہے اندو ؟"

لڑکی کچھ نہیں بولی ، شرما کر رہ گئی ۔

"ٹھیک ہی ہے مالک ......" جھگڑو اپنی آنکھوں کی پلکوں کو جنبش دیتا ہوا بولا۔

"کیا اب بھی ناچتے گاتے ہو....."

"ابھی تک تو یہی چل رہا تھا۔ لیکن اب .....؟"

"ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے..... سمجھ گیا" مہاجن مسکراتا ہوا بولا۔ "گھر میں ایک جگہ خالی ہے، وہیں تم لوگوں کے رہنے کا بندوبست ہو جائے گا"

"مہربانی ہوگی مالک ...."

"چلو گھر چلو..." مہاجن اٹھ کھڑا ہوا۔ جھگڑو بچوں کے ساتھ ان کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔

گھر پہنچ کر مہاجن نے اپنی بیوی کو بلایا اور بولا۔ "دیکھو تو کون آئے ہیں...."

وہ اندر کے کمرہ سے باہر آئی۔ ایک مرتبہ اس نے مہاجن کی طرف گھور کر دیکھا۔ اور پھر جھگڑو کی طرف اسکی نظریں پھر اندو اور جنیا کی طرف مڑ گئیں۔ وہ چند لمحوں تک غور سے انھیں دیکھتی رہی۔ "ابھی بھی کیا ناچتے گاتے ہو.....؟" اس نے پوچھا۔

جنیا اندو کی طرف دیکھنے لگا اور اندو جنیا کی طرف، پھر دونوں مسکرا دیے۔ پر مشوری کو ان کا یوں مسکرانا بُرا لگا۔ خاص کر اندو کی مسکراہٹ اُسے زہر لگی۔ وہ اُسے سر سے پیر تک گھورنے لگی۔ اندو نے جو چولی اور گھگرا پہن رکھا تھا وہ چھوٹا پڑ رہا تھا۔ اس لباس میں اس کے جسم کا ابھار اور خم واضح نظر آ رہے تھے۔

"جاؤ ——" وہ نفرت سے بولی۔ اور پھر منھ بسور کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

مہاجن انھیں آنگن والی کوٹھری میں لے آیا۔

"آج بھر یہیں رہو، کھانے کا بھی بندوبست ہو جائے گا، بستی کے لوگ کہیں گے تو ناچ گانے کا پروگرام بھی بن جائے گا، ٹھیک ہے نا.....؟"

"[illegible]" جھگڑو راضی ہو گیا۔

[illegible] پنا گانا منظور نہیں تھا۔ [illegible] نے مایوس نظروں سے اپنے باپ کی طرف دیکھا۔

مہاجن [illegible] بیوی کے پاس آیا۔

"دیکھ لیا [illegible] لڑکی کتنی سیانی ہو گئی ہے" وہ کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولا۔

"دیکھ لیا" بیوی چمک کر بولی۔ "اسی لئے تو یہاں لائے ہو"

"لاتا نہیں تو کیا کرتا، بیچارہ پردیس سے لوٹا ہے۔ رہنے کو کوئی ٹھکانا تو چاہئے۔ کہاں سب مارے مارے پھرتے"

"تم کو کیا؟ تم ان کے کون لگتے ہو؟"

"منگتا تو کچھ بھی نہیں، لیکن بستی کا پرانا آدمی ہے۔ آسرا تو دینا ہی پڑے گا۔"

"بڑے دھرماتما بن گئے ہو۔ ۔ ۔ ۔ کاہے آسرا نہیں دو گے۔ اس بے شرم بوڑھے کو تو دیکھو، جوان بیٹی کو نچاتا ہے۔" وہ دانت پیستی ہوئی بولی۔ "جھاڑو مار کر سب کو باہر نکالوں گی۔"

"دھیرے بول ناچلاتی کاہے ہے۔ ۔ ۔ ۔ مہاجن نے آہستے سے سمجھایا۔ "لڑکی ابھی بچی ہے۔"

"ابھی بدل گئے نا۔ کچھ دیر پہلے کہہ رہے تھے، لڑکی سیانی ہے۔ اب بچی بن گئی۔" پرمیشوری منھ بناتے ہوئے بولی

"چھوکری کو گھر میں نوکر رکھ لو۔ نوکرانی کے لئے کہہ رہی تھیں نا۔"

"نہیں ۔ ۔ ۔ ۔" وہ چیخ کر بولی۔ "میں سب سمجھتی ہوں۔"

"تم تو ایسے ہی چلانے لگتی ہو ۔ ۔ ۔ ۔" مہاجن نے اٹھ کر چلتے ہوئے کہا۔ "اچھا ذرا ان کے کھانے پینے کا بندوبست کر دینا۔"

"ضرور کر دیں گے، تم بھی آ کر ڈٹ کر کھا لینا۔" وہ غصہ میں بل کھاتی ہوئی پلنگ پر لیٹ گئی۔

غصہ تو اس کی ناک پر دھرا رہتا تھا۔ اس وقت اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ چوکے میں جا کر سب برتن وغیرہ توڑ ڈالے۔ غصہ کی شدت سے اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا تھا۔ اس نے آنکھیں موند لیں۔

گھنٹہ، ڈیڑھ گھنٹہ کے بعد جب اس کی طبیعت بحال ہوئی، وہ اٹھ کر کمرے سے باہر آئی۔ جب کوٹھری میں مہاجن جھگڑو کو ٹکا گیا تھا۔ اس طرف سے ہارمونیم کی آواز آ رہی تھی۔ گانے کے میٹھے بول سنتے ہی غصہ ہلکا ہوا۔ وہ باورچی خانہ میں چلی گئی۔ اور چولہا سلگاتی ہوئی گانا سننے لگی۔ گیت اچھا لگ رہا تھا۔ گانا کچھ دیر بعد ختم ہو گیا۔ وہ جھلاتی ہوئی باورچی خانہ سے باہر نکلی۔ کوٹھری کے دروازے کے پاس جا کر اندر جھانکتی ہوئی بولی۔

"کیوں جی! یہ گھر ہے یا سرا؟"

"کیا اسی کام کے لئے یہاں آئے ہو؟"

"گانا بجانا ہے، تو کہیں اور جاؤ۔"

"گانا برا لگتا ہے تو نہیں گاتے ہیں۔" جھگڑو عاجزی سے بولا۔ اب تو گاتے، بجاتے، ناچتے بچے بھی تھک گئے ہیں۔"

"کوئی دوسرا کام کیوں نہیں کرتے۔"

"اسی کے لئے تو یہاں آئے ہیں۔"

"ہم کو یہ ناچ گانا بالکل پسند نہیں ہے۔" پرمیشری یہ کہتی ہوئی پھر باورچی خانے میں چلی گئی۔

رات کے وقت پیپل کے درخت کے نیچے محلے کے بہت سارے لوگ جمع ہو گئے تھے، جنیا اور اندو کا گانا سننے،

ان کے کمال دیکھے'
جھگڑو ہارمونیم پر انگلیاں نچا رہا تھا۔ اچانک اس کے ہاتھوں کی حرکت تیز ہو گئی۔ اندو اور جینا اپنی جگہ سے اُٹھے' چند لمحوں تک
وہ ہارمونیم کے تال پر پیر پٹختے رہے۔ پھر ایک گانے کی طرز شروع ہوئی۔
"دھڑکا ... دھڑکا ... او دل دھڑکا ...."
اشاروں کنایوں کے ساتھ رقص شروع ہوا۔ تعریفی جملے کہے جانے لگے' دیکھنے سننے والے دیدے پھاڑ پھاڑ کر ان کی طرف
دیکھنے لگے۔ مہاجن کی للچائی نگاہیں اُن پر گڑ سی گئیں۔
پیر تھرک رہے تھے' گھونگھرو چھنک رہے تھے' واہ واہ ہو رہی تھی۔ دل کا غبار پھوٹنے لگا تھا۔
جھگڑو بہرہ ہے' وہ کچھ نہیں سن رہا تھا۔ بہن اور بھائی ناچ رہے تھے' گا رہے تھے' ایک فلمی گیت
"دھڑکا ... دھڑکا ... او دل دھڑکا
گزرا میری گلی سے
میرے سپنوں والا لڑکا!"
جھگڑو اندھا ہے' اُسے نظر نہیں آ رہا تھا۔ اندو کی آنکھوں میں شرم ہے' اس کے بھائی کی آنکھوں میں جھجک ہے۔
پھر بھی وہ آؤ بھاؤ دکھاتا ہے۔ اس کے گالوں کو چھونے کی کوشش کرتا ہے۔ اندو سرکتی ہے۔ سکتی ہے۔ اس کی پکڑ میں نہیں
آتی ——
گیت ختم ہوتے ہی ان کے پیر رک گئے۔ تالیاں گونجنے لگیں۔ سیٹیاں بجنے لگیں۔ چھن چھن ..... پیسے بھی برسنے
لگے' فرمائش ہوئی۔ "ہو جائے' ہم تم سے محبت کرے گا"
"جنیا آتا ہے رے یہ گانا" جھگڑو لڑکے سے پوچھنے لگا۔
"ہاں بابو جی" لڑکے نے جواب دیا۔
جھگڑو اسی طرز پر ہارمونیم کے سُر نکالنے لگا۔ "ہم تم سے محبت کرے گا"
جنیلے نے پیر تھرکاتے ہوئے اندو کو بھی ناچنے کا اشارہ کیا۔ لیکن اس نے ناچنے سے انکار کیا۔
"آ نا ....." اس نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کی۔
"نہیں" اندو ہاتھ چھڑاتی ہوئی بولی۔
"دیکھو بابا۔ اندو نہیں ناچتی"
"اندو ...!" جھگڑو کا کرخت لہجہ اُبھرا۔
اندو بھی پیر کو حرکت دینے لگی۔ گیت شروع ہوا۔

ہم تم سے محبت کرے گا
دنیا سے نہیں ڈرے گا ؏

ویسے ہی آؤ بھاؤ۔ وہی ناز نخرے، وہی واہ واہ، تالیاں اور سیٹیاں، کئی گیت، کئی فرمائشیں، ایک کے بعد ایک مجمع بڑھتا ہی گیا۔

رات دس گیارہ بجے تک سب ہوتا رہا۔ ہارمونیم بجاتے بجاتے جھگڑو کی انگلیاں تھک گئیں۔ گاتے گاتے بہن بھائی کا گلا بیٹھنے لگا۔ اندو تھک کر نڈھال ہو گئی ——

"مالک اب بس —" جھگڑو آہستہ سے بولا۔

"تو نے خوش کر دیا جھگڑو" حاجن مسکراتے ہوئے بولا۔ اس کے دل کی ہوس ابھی پوری نہیں ہوئی تھی۔

"ذرا اندو کو تو پوچھو، اور ناچے گی؟" حاجن نے جھگڑو سے سوال کیا۔

"نہیں بابا، اب ہم نہیں ناچیں گے" جھگڑو کے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی اندو بولی۔

"چلو بابا گھر چلو . . . ."

جھگڑو اندھا بھی ہے اور بہرہ بھی، اس لئے وہ نہیں دیکھ سکا کہ اسکی بیٹی کس قدر پریشان ہے، کتنی بری نظریں اُسے گھور رہی ہیں۔

"چلو بھائی، سب اپنا اپنا راستہ ناپو، کھیل ختم۔ چلو جھگڑو گھر چلو" حاجن تخت پوش سے اٹھتے ہوئے بولا ——

اندو بہت تھک گئی تھی، وہ چلتے ہوئے لنگڑا رہی تھی۔ جُگیا نے سہارا دینے کے خیال سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اندو نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ بھائی پر اُسے غصہ آ رہا تھا۔ وہ ایک طرح کا پرایا پن، ایک طرح کی بیگانگی محسوس کر رہی تھی۔

گھر پہنچتے ہی حاجن ان کے کانوں میں پھسپھسایا، "تم لوگ کوٹھری میں چلو، کھانا وہیں پہنچ جائے گا۔ پھر وہ کمرے میں آیا۔ اندر لیٹی ہوئی پرمیشوری کو اس نے جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

"سو گئی ہو کیا . . . . ؟"

وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

"آ گئے رت جگا کر کے، بھر گیا من . . . . ؟" وہ کڑک کر بولی۔

"دھیرے سے بولو" حاجن نے خوشامدانہ منہ بنا کر پرمیشوری سے کہا۔ "بیچارے غریب ہیں، کچھ کما لیں اسی لئے تو سب ڈھونگ ہے۔"

"تو اب میرے لئے کیا حکم ہے . . . . ؟"

"جاؤ ان کو کچھ کھانے کو دے دو، بھوکے ہیں بچارے"

"آنگن میں بھات، دال، ترکاری، سب ہی کچھ رکھا ہے۔ جاؤ تم ہی دے دو"

"نہیں تم ہی دے دو، تمہارے ہاتھ سے اچھا رہے گا"

"جاؤ جاؤ ان کو" وہ بڑبڑاتی ہوئی اٹھی۔

مہاجن سب کو کھانے پر بلانے کے لئے کوٹھری میں گیا۔

"چلو سب کھانا کھالو" مہاجن نے جھگڑو کو مخاطب کیا۔

"اچھا...." جھگڑو مسرت آمیز لہجے میں بولا۔ "چلو بیٹی اٹھو، چل اے جنیا"

"میں نہیں جاؤں گی بابا" اندو نے جو ایک کونے میں تھک کر لیٹ چکی تھی جواب دیا۔

"کاہے....."

"نہیں...!" اندو نے لیٹے لیٹے کروٹ بدل لی۔

"چلو مہاجن بھیا ہم آتے ہیں" جھگڑو یہ کہتے ہوئے اندو کی طرف بڑھا۔ "کدھر سوئی ہے رے، چل اُٹھ" اس نے ہاتھ سے ٹٹولتے ہوئے کہا۔

"نہیں بابا، جی ٹھیک نہیں ہے" اس نے پھر کروٹ بدل لی۔

"اچھا تو سو جا" جھگڑو جنیا کا ہاتھ تھامے آنگن میں آگیا۔

"وہ نہیں آئی" مہاجن نے پوچھا

"اسکو بخار معلوم ہوتا ہے" جھگڑو نے جواب دیا۔ "وہ نہیں آئے گی، دیر تک ناچے تو اُسے ایسا ہی ہو جاتا ہے"

پرمشیدی نے باپ بیٹے کو پتل میں کھانا پروس دیا۔ اور خود باورچی خانہ میں چلی گئی۔

جب دونوں باپ بیٹے کھانا کھانے لگے تو مہاجن ان کی آنکھ بچا کر کوٹھری میں آیا۔ اس نے دیکھا کہ اندو زمین پر چت لیٹی ہوئی ہے

"ارے اندو، تیرے کو بخار ہے کیا....؟" مہاجن اس پر جھک کر جیسے کچھ ٹٹولنے لگا۔ اس کا ہاتھ کہیں سے کہیں جا پڑا۔

"دھت...." اندو نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔ مہاجن کا دل سرعت سے دھڑکنے لگا۔ "کھانے نہیں چلے گی؟" وہ ہانپتے ہوئے بولا۔

"نہیں" اس نے روکھے پن سے جواب دیا۔

"اچھا سو جا۔ میں سمجھ گیا تیرے کو بخار ہے" مہاجن چند لمحے کھڑا اسکو للچائی نظروں سے دیکھتا رہا۔ پھر باہر آ کر جھگڑو سے بولا۔ "اور جو جو چیز درکار ہو مانگ لینا"

مہاجن اپنے آپ میں ایک سرور اور امنگ محسوس کر رہا تھا۔ جب وہ بھی کھا پی کر سونے لگا تو اپنی بیوی کو کہنی کا ٹھوکا دیتے ہوئے بولا۔ "تو تو ایسے ہی مر جائے گی، یوں ہی من میں زہر گھولتے گھولتے۔"

"میں کیوں مروں، مریں تمہارے اگلے پچھلے۔" پرمیشوری مہاجن کی طرف کروٹ لیتے ہوئے بولی۔

"تو تو اس لئے مرے گی کہ تیرے من میں زیادہ دھرم نہیں ہے۔"

"ہم نے کیا پاپ کیا ہے۔" وہ ذرا تیکھے لہجے میں بولی۔

"آہستہ بولو۔" مہاجن اس کے کانوں میں پھسپھسایا۔ "تو ہی دیکھ، بے چاری لڑکی بیمار پڑ گئی ہے۔ سویرے ان کو گھر سے نکال دیگی تو بڑھا بے چارہ اسے کہاں لے کر جائے گا۔"

"تو ہم کیا کریں؟"

"اسی بہانے اس گھر میں رکھ لو۔ گھر کا کام کاج کر دیا کرے گی۔"

"ہوں، میں تمہاری چال سمجھتی ہوں۔" پرمیشوری دانت پیستی ہوئی بولی۔

"یہ بیماری کا نخرہ تمہارا ہی سکھایا ہوا ہے۔"

"تو خود جا کر دیکھ لے، بیمار ہے کہ نہیں۔ بہت بخار ہے بیچاری کو۔"

"بدن چھو کر دیکھے ہو.....؟"

"رام رام، میں کاہے کو اس کا بدن چھوتا؟" مہاجن دل ہی دل میں بیوی کی چالاکی کا قائل ہو گیا۔

"تو ہی جا نا چھو کر دیکھ لے۔" وہ بولا۔

"ٹھیک ہے، سویرے دیکھوں گی۔ اب سو جاؤ۔"

پرمیشوری کا ارادہ تھا کہ وہ مہاجن کے اٹھنے سے پہلے ہی جھگڑو وغیرہ کو گھر سے چلتا کرے گی۔ اس لئے اس کی آنکھ جلدی کھل گئی۔ اٹھتے ہی وہ سب سے پہلے کوٹھری کی طرف گئی۔ دروازے سے جھانکا تو اس نے دیکھا، اندو بڑی بے چینی سے کروٹیں بدل رہی ہے، اندھا جھگڑو اس کے ہاتھ پاؤں دبانے کی کوشش کر رہا ہے۔

"کیا ہوا جھگڑو.....؟" وہ دروازے پر ہی سے بولی۔

"بٹیا کا من ٹھیک نہیں ہے۔" جھگڑو کے ہاتھ رک گئے۔

"کیا ہوا؟"

"ہاتھ پاؤں اور ماتھا دکھتا ہے۔"

"چھوڑو اسکو ہاتھ مت لگاؤ، ہم دیکھ لیں گے۔"

"اچھا۔" جھگڑو نے املا کے پاس سے ہٹتے ہوئے کہا۔

"تم لوگوں کو جہاں جانا ہے جاؤ۔ اس کو یہیں رہنے دو۔"

کچھ دیر بعد جب وہ دوبارہ کوٹھری میں گئی تو اس نے دیکھا باپ بیٹا جا چکے ہیں۔ اندو اُسے دیکھتے ہی گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ اور سہمی سہمی نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"بچی۔" پرمیشوری غور سے اس کی طرف دیکھتی ہوئی بولی۔ "کیا ہوا ہے رے تیرے کو؟"

اندو کا سر نیچے جھک گیا۔ جیسے چہرے کا رنگ تپے ہوئے تانبے کی طرح تمتمانے لگا۔

"بولتی کاہے نہیں رے چھنار؟"

وہ پھر بھی کچھ نہیں بولی۔

پرمیشوری کچھ دیر تک اس کے چہرے کا اتار چڑھاؤ دیکھتی رہی۔ پھر بولی "ہم کچھ گئے۔ باپ اندھا ہے، وہ کیا دیکھے گا، کیا سمجھے گا کہ لڑکی جوان ہو گئی ہے۔" وہ پھر رک رک کر بولی۔ "پہلی بار ہے کیا۔۔۔؟"

اندو جیسے زمین میں گڑ سی گئی۔

پرمیشوری کا جی چاہا کہ اندو کی چھاتی پر ایک لات مارے تاکہ سب کچھ پچک کر رہ جائے۔ لیکن پھر آخر وہ عورت تھی، اُس کا دل پسیج گیا، بے ماں کی بچی ہے، ماں ہوتی تو، بہن ہوتی تو، سمجھا دیتی، سب کچھ بتا دیتی۔ پھر کوئی ملنے جلنے کو نہ بھیجتا، سر نہیں دکھتا۔ جسم یوں نہیں ٹوٹتا، باپ کو ساتھ نہیں دبانا پڑتا۔

"اٹھ کر منہ ہاتھ دھو، میں تیرے لئے کچھ کھانے کو لاتی ہوں۔" پرمیشوری ہمدردانہ لہجے میں بولی۔ پھر وہ اپنے کمرے میں آئی، اور بستر اٹھاتے ہوئے کہنے لگی۔ "انجان لڑکی ہے، بچاری کیا سمجھے، کیا جانے، کیا کہے کسی سے۔"

"کیا بات ہے؟" مہاجن نے کروٹ بدلتے ہوئے پوچھا۔

"اب اٹھو گے بھی یا نہیں۔" وہ کچھ اونچے لہجے میں بولی "اٹھو، اٹھو۔" مہاجن کے اوپر سے چادر کھینچتے ہوئے اس نے پھر تنک کر کہا "ہم کو تنگ مت کرو۔"

"سویرے ہی سویرے لڑو لڑو شروع کر دی۔" مہاجن اٹھتے اٹھتے بڑبڑایا۔ "وہ لوگ چلے گئے کیا؟"

"ہاں" اس نے روکھے پن سے کہا۔

"کہاں گئے؟ کچھ کہہ کر نہیں گئے۔۔۔۔؟"

"نہیں!"

"اندو کو یہیں چھوڑ گئے۔"

"تو کیا کرتے، بیمار لڑکی کو کہاں ساتھ لے جاتے۔۔۔!"

"ابھی تک بخار ہے کیا ؟"

"ہاں ..... " اس نے اس پر زور دیتے ہوئے کہا "جاؤ اپنا کام کرو۔"

مہاجن نے اور کچھ نہیں پوچھا۔

تین چار دن بعد اندو کا بخار اتر گیا۔ اس کا روپ پہلے سے کہیں زیادہ نکھر آیا۔ تین دن تک پرمیشوری نے اس کے ناک میں دم کئے رکھا۔ اُسے طرح طرح سے کوسا۔ نفرت اور غصّہ کا اظہار کیا، جیسے وہ لڑکی نہ ہو غلاظت کا ڈھیر ہو۔ لیکن جب اس نے اس کا نکھرا ہوا روپ دیکھا تو غصہ اور نفرت کم ہو گئی۔ دوپہر کے وقت پاس بٹھا کر بولی۔

"بھجن بھی گانا آتا ہے، یا صرف چٹک مٹک ہی کے گانے جانتی ہو؟"

"آتا ہے۔" اندو نے دھیرے سے کہا

"سناؤ تو۔"

اندو اٹھ کر گنگنانے لگی۔ "میرے تو گردھر گوپال دوسرا نہ کوئی۔" آواز بلند ہوئی اور آہستہ آہستہ آؤ بھاؤ کے ساتھ ناچنے لگی۔

"بیٹھ جا.....!" پرمیشوری بولی۔ "بیٹھ کر سناؤ۔" اندو بیٹھ کر گانے لگی۔ کافی دیر تک گاتی رہی۔ ایک ایک بھجن کو کئی کئی مرتبہ گایا۔ اسکو بھجن کم ہی آتے تھے۔

پرمیشوری کو اس کا گانا بہت پیارا لگا۔ کہنے لگی، تو یہیں رہ جا نا رے۔" بول تیرے باپ سے کہوں ؟"

"آپ ہمیں اپنے پاس رکھیں گی.....؟" اندو نے بھولے پن سے سوال کیا۔

"ہاں۔ لیکن ٹھیک سے رہنا ہوگا!"

"ہاں رہیں گے۔"

"اچھا شام کو تیرے بابا کو آنے دے اس سے بات کریں گے۔

اندو شام کو پرمیشوری جھگڑو سے بولی۔ دیکھ جھگڑو لڑکی جوان ہو گئی ہے۔ اُسے اب گلی گلی اور بازار میں مت لے جا، کوئی دھوکا نہ دیگا اسے یہیں رہنے دے۔ پانچ روپے مہینہ دوں گی، کھانا کپڑا الگ سے، جب کہیں اسکی شادی بیاہ کی بات ہو تو بتا دینا۔ نہیں تو ہم ہی اس کے لئے کوئی دیکھ بھال کریں گے، بول منظور ہے نا۔"

"میں کیا بولوں بہن۔ اندو تمہاری ہی بیٹی ہے۔ ٹھیک ہے یہ تمہارے ہی پاس رہے گی۔" جھگڑو نے جواب دیا۔

"تو ٹھیک ہے۔ اسکو سمجھا دو۔ ٹھیک سے رہے۔ ٹھیک سے کام کرے۔ تم نے کہ اگر ٹکر ٹکر دیکھے گی تو آنکھیں پھوڑ دوں گی۔"

اندو لجا سی گئی۔

" نہیں میری بٹیا ایسی نہیں ہے " جھگڑو پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔

دوسرے دن سویرے جھگڑو لڑکے کو ساتھ لے کر کہیں اور چلا گیا۔ اور اندو کو مہاجن کے حوالے کر گیا۔

پرمیشوری نے لڑکی کو صاف کپڑے پہننے کو دیے، دوپہر کے وقت جب مہاجن کی نظر اندو پر پڑی تو چور نظروں سے اُسے دیکھتا ہی رہا۔ پھر آہستہ سے بیوی کے کانوں میں پھسپھسایا " میں نے سوچ سمجھ کر ہی کہا تھا کہ لڑکی کو کام کاج کے لئے گھر میں رکھ لو ـــــ ٹھیک ہی کیا تم نے "

" بس بس رہنے دو۔ میں نے اپنی غرض سے رکھا ہے۔ تمہارے کہنے سے نہیں "

" رکھ تو لیا نا "

" اور دیکھو لڑکی جوان ہے۔ بیٹی کی طرح ہے۔ کل کو اگر کوئی بات ہو گئی تو ہم سب کی بدنامی ہو گی "

مہاجن سنکر چپ رہا۔

اندو اب گھر کی ایک فرد بن گئی۔ کام کاج کی ذمہ داری اس پر آ گئی۔ جھاڑو وہ دے، برتن وہ مانجھے، نہانے کے لئے نل سے پانی وہ لائے۔ اس پر پرمیشوری کی بکواس، کبھی ڈانٹ رہی ہے، کبھی جھڑک رہی ہے۔ اور وہ چپ چاپ اپنے کام میں لگی ہوئی ہے۔ ناچنے والی اندو اور گھر کی اندو میں بہت فرق ہو گیا۔

مہاجن بیوی کی نظر بچا کر اُسے گھورتا، اسکی آنکھوں میں کچھ تلاش کرتا۔ وہاں سے ایک معصومیت کے سوا اور کچھ دکھائی نہ دیتا۔ اندو نظریں ملتے ہی آنکھیں نیچے جھکا لیتی۔ مہاجن کی نظریں دھندلا جاتیں۔ جانے آنکھوں کا موتیا بند کٹ کر کب باہر آئیگا وہ ٹھنڈی سانس لیتا۔

" اندو سے گانا سناکر، بہت اچھا گاتی ہے، کبھی سنا ہے کہ نہیں " ایک دن اس نے پرمیشوری سے پوچھا۔

" رہنے دو، کام کاج کرے گی یا گانا گائے گی۔ ہاتھ منھ توڑ کر رکھ دوں گی " پرمیشوری نے مہاجن پر شعلے برسانے شروع کئے۔

" لڑکی پر سختی کروگی تو کہیں بھاگ جائے گی "

" بھاگے گی تو ٹانگ توڑ ڈالوں گی "

مہاجن دیکھتا رہتا تھا کہ اندو سے اگر کوئی بھول ہو جاتی تھی تو پرمیشوری تڑاک سے ایک چھڑی اسکی پیٹھ پر برسا دیتی ہے،

" تم بیچاری کو بہت مارتی ہو، اتنا نہ مارا کرو، میں پھر کہتا ہوں، اگر کچھ ہو گیا تو۔ ۔ ۔ ۔ ؟ " اس نے پرمیشوری کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

" ماروں نا تو کیا پیار کروں " پرمیشوری بولی۔

"ارے نہیں! بچاری غریب پر اپنے یہ پیارے پیارے ہاتھ مت چلایا کرو۔" اس نے پرمیشوری کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

"اوہ۔ چھوڑو میرا ہاتھ۔۔۔۔"

"اگر نہ چھوڑوں تو۔۔۔؟"

اور پھر یہی کرتا مہاجن اپنا ہاتھ ملنے لگا۔ بڈھی ہو گئی ہو، لیکن بچوں کی طرح ابھی تک کاٹنے کی عادت نہیں گئی۔

پرمیشوری ہنسنے لگی۔

پرمیشوری بہت کم گھر سے باہر نکلتی تھی۔ ہاں کبھی کبھی رشتہ داروں کے یہاں گھڑی دو گھڑی ہو آتی تھی۔ ایک دن اس کے بھائی کے بیمار ہونے کی خبر آئی۔ وہ دوپہر کے بعد اس کے یہاں چلی گئی۔ مہاجن گھر پر ہی تھا۔ اندو اندر کمرے میں جھاڑو دینے آئی تھی۔ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر بولا۔

"تھوڑا ناچ گا نا۔"

"نہیں بابو نہیں" وہ ہاتھ چھڑا کر باہر آگئی۔ مہاجن بھی پیچھے پیچھے آیا۔ دروازے پر کھڑے ہو کر بولا۔

"بھاگ کر کہاں جاؤ گی۔"

"ماں جی سے کہہ دوں گی۔"

"کیا کہے گی۔۔۔؟"

"آپ مجھے ناچنے کے لئے کہتے ہیں۔"

"ماں نے منع کیا ہے کیا؟"

"ہاں ——!"

"اچھا تو ٹھیک ہے۔ جا اپنا کام کر۔ مہاجن یہ کہتا ہوا گھر سے باہر چلا گیا۔ وہ دل میں کڑھ رہا تھا، عجیب لڑکی ہے گانے ناچنے سے انکار کرتی ہے۔ سامنے منہ بھی کھولنے لگی ہے۔ بس چلتا تو اسے بید سے پیٹتا۔

مہاجن تیسرے پہر کا تکلارات کو کچھ دیر سے گھر لوٹا، بستی میں ایک نوٹنکی آئی تھی۔ وہی دیکھ رہا تھا۔ کارخانے کا بھونپو اسے راستے میں سنائی دیا۔ جوں ہی وہ گھر میں داخل ہوا، اسے کوٹھری کی طرف سے ہلکی سی ایک گنگناہٹ سنائی دی۔

اس نے دروازے کے سوراخ سے اندر جھانک کر دیکھا۔ اندو گا رہی ہے۔ ناچ بھی رہی ہے۔ وہ کھوئی ہوئی ہے بالکل بے فکر۔ وہ کھڑا دیکھتا رہا، خوبصورت درمیانہ قد، گٹھا ہوا بدن، اس کے دل میں ایک انتشار سا پیدا ہونے لگا۔ لیکن چند لمحوں کے بعد وہ انتشار غصہ میں تبدیل ہو گیا۔ دوپہر کے وقت اندو نے اس کے سامنے ناچنے گانے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ اندر گیا اور پرمیشوری کو آہستہ سے جگاتے ہوئے بولا۔

"پرمیسری، پرمیسری.... اٹھ...... اُٹھ ذرا دیکھ.... چل آ میرے ساتھ۔"

"کیا ہے....؟" وہ چونک کر بولی۔

"اُٹھ ذرا باہر آ۔ دیکھ اپنی لاڈلی کو...."

پرمیشوری آج شام کو ہی اندو پر برسی تھی۔ فوراً اٹھ کر باہر آ گئی۔ جاجن اُسے کوٹھری کی طرف لے گیا۔

"ذرا اندر جھانکنا۔" پرمیشوری نے اندر جھانک کر دیکھا، اندو گا رہی ہے۔ "میرے سپنوں میں آ نا رے۔" اور ساتھ ہی ساتھ ناچ بھی رہی ہے۔ اپنے آپ کا ہوش نہیں ہے۔ پہناوا اکھڑ سا گیا ہے۔

"تم جاؤ، میں اسے نچاتی ہوں۔" پرمیشوری غصّے سے کانپتی ہوئی جاجن سے بولی۔ وہ باورچی خانہ کی طرف گئی اور وہاں سے ایک جلی ہوئی لکڑی اٹھا لائی۔ اس نے کوٹھری کے دروازے پر لات ماری۔ دروازہ کھل گیا۔ اندو چونک کر سنبھلنے نہ پائی تھی کہ لکڑی اس پر برسنے لگی۔ دھپ.... دھپ.... دھپ۔"

"نہیں، ماں، نہیں...." وہ چیخ اٹھی۔

"کلموہی، حرام زادی، ہماری ناک کٹا کر رہے گی، ہزار بار کہا ہے، ناچنا گانا بند کر دے۔ مانتی ہی نہیں۔ آج میں تیرے ہاتھ پاؤں توڑ کر رکھ دوں گی، تو ہمیشہ کے لئے ناچنا گانا بھول جائے گی۔ دھپ.... دھپ.... وہ لکڑی برساتی ہوئی خود بھی برس رہی تھی۔

"بول۔ بول اور گائے گی، ناچے گی....؟ تیری آنکھوں میں مرچیں جھونک دوں گی۔ زبان کھینچ لوں گی۔" لکڑی برستی رہی۔ اندو چیختی چلاتی، اس کے قدموں پر گر کر رحم کی بھیک مانگنے لگی۔

"ماں جی، ہم کو معافی دے دو۔ اب نہ ناچیں گے، نہ گائیں گے، معافی دے دو ماں جی۔"

بالآخر پرمیشوری کا ہاتھ زیادہ دیر تک نہیں چل سکا۔ وہ ہانپتی، کانپتی، بکتی، جھکتی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

جاجن بیوی کی یہ سختی دیکھ کر کانپ اُٹھا۔ اس کا ضمیر اُسے لعنت ملامت کرنے لگا۔ اس سے ایک بہت بڑی غلطی ہو گئی، وہ کمرے میں چپ چاپ چارپائی پر لیٹ گیا۔ اس نے دیکھا پرمیشوری کا دم پھول رہا تھا۔

کوٹھری سے اندو کے سسکنے کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ اس کا دل ڈوبا جا رہا تھا۔ اس نے پرمیشوری سے اندو کی شکایت کیوں کی۔ اس بیچاری نے اس کا کیا بگاڑا تھا۔ جو اُسے مار کھلائی۔ وہ اپنے آپ کو کوسنے لگا، بُرا بھلا کہنے لگا۔ اگر تیری اپنی بیٹی ہوتی تو!

"اے پرمیسری۔" اس کے دل کا کرب بڑھ گیا۔

"اندو کو اتنا نہیں مارنا چاہیے تھا۔ آخر پرائی بیٹی ہے۔ اگر جا بے جا مار لگ جاتی تو کیا ہوتا۔ اتنا نہیں تو بس تھوڑا ذرا دھمکا دیتیں، کافی تھا۔"

"پیٹتی نہیں تو تمہارا من کیسے خوش ہوتا۔" پرمیشوری نے طنز کیا اور کمرے کی بتی بجھا دی۔

یہ بات مہاجن کے دل کو ڈس گئی۔ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ کیا پرشوری نے اُسے خوش کرنے کے لئے اندو کو اس بُری طرح پیٹا ہے۔ کیا وہ اس کے دل کی بات جانتی ہے؟ اس کی اپنی کمزوری اُبھر کر سامنے آ گئی۔

مہاجن کو بہت رات تک نیند نہ آئی۔ وہ پچھتاوے کی آگ میں کروٹیں بدلتا رہا۔ کوٹھری کی طرف سے متواتر سسکیوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

سویرے اس کی طبیعت بہت اداس تھی، وہ تڑکے بغیر کچھ ناشتہ کئے گھر سے نکل گیا۔ اُسے اندو کا سامنا کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ بازار جا کر اس نے کسی ہوٹل میں منہ جھوٹا کیا، پھر گیارہ بجے کے قریب اپنے اڈے پر آ کر بیٹھ گیا۔

وہ اداس سا تخت پوش پر بیٹھا ہوا تھا۔ آج اس کا نہ تو کسی سے ملنے کو جی چاہ رہا تھا اور نہ کسی سے بات کرنے کو، نہ اس نے نجو ماسٹر سے چلم سلگانے کو کہا۔ چند یار دوست آئے بھی تو انھوں نے ہنسی مذاق کے بعد اندو کا چرچا چھیڑ دیا۔ اُسے بہت بُرا لگا۔ لیکن اس نے اپنا غصہ ظاہر نہیں ہونے دیا۔ وہ خاموش رہا۔ بکنے والے بک جھک کر چلے گئے۔

اب وہ تنہائی کے عالم میں بیٹھا پیپل پر چہچہانے والی چڑیوں کا نغمہ سن رہا تھا اور اس کے دل کو بڑا سکون سا مل رہا تھا۔ دفعتہً اسے پیچھے سے ایک آواز سنائی دی۔

"بابا...؟"

وہ چونکا، منہ پھیر کر دیکھا اندو سر جھکائے کھڑی تھی۔ ماتھے پر چوٹ کا نشان تھا جس پر ہلدی چونا لگا ہوا تھا۔ گالوں پر کئی جگہ خراشیں لگی تھیں۔ جس پر تیل لگا ہوا تھا۔

مہاجن سنبھلا۔ اس کے منہ سے نکلا "کیا بات ہے بیٹی...؟"

"ماں جی نے کھانے کے لئے بُلایا ہے۔"

"نہیں کھاؤں گا، تیری ماں کے ہاتھ کا کھانا نہیں کھاؤں گا۔" مہاجن کے گلے میں جملے اٹک گئے۔ "دیکھنا رات کو اس نے تجھے کتنا مارا ہے، بہت چوٹ لگی ہے نا...؟"

رات مار کھانے کے بعد اندو نے کسی سے ہمدردی کے الفاظ نہیں سنے تھے، مہاجن کے منہ سے جو یہ بات سنی تو اس کی آنکھوں سے آنسو پھوٹ پڑے۔ وہ آنچل سے اپنی آنکھوں کے آنسو پونچھنے لگی۔

"مت رو، مت رو۔ میں تیری ماں کو ڈانٹ دوں گا، اب وہ تجھے ایسے نہیں مارے گی۔" مہاجن پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ اندو نے سسکتے ہوئے اس کی چھاتی سے اپنا سر ٹیک دیا۔ وہ اس سے ایسی چپک گئی جیسے ڈرا ہوا بچہ اپنی ماں سے چپک جاتا ہے۔ مہاجن نے محسوس کیا کہ اس کے اندر کی ایک آگ، ایک پچھتاوا، جو اس کا تن بدن پھونکے جا رہا تھا، سرد پڑ گئی۔ وہ بے حس سا بیٹھا رہا۔

نجو ماسٹر یہ منظر دیکھ کر ہنس پڑا۔ لیکن جب اس کی نظر مہاجن کی ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں پر پڑی تو شرمندہ ہو گیا۔ مہاجن پیار سے اندو کے سر پر ہاتھ پھیرے جا رہا تھا، اور وہ آہستہ آہستہ سسک رہی تھی۔

حافظ حیدر

ایک سالگرہ

آنٹی پورے پچاس کی ہو چکی تھیں۔ آج ان کی اکاونویں سالگرہ تھی۔

"زرنگار" کے احاطے میں اور باہر شاہراہ پر دور دور تک نئے نئے رنگوں اور نئی نئی وضع کی نئی نئی کاریں چمک رہی تھیں — کاریں آرہی تھیں، خالی ہو رہی تھیں اور جا رہی تھیں۔ اندر ڈرائنگ روم، لونگ روم، بیڈ رومز، ڈائننگ روم اور برآمدے ہر نسل اور فرقے کے مردوں اور عورتوں سے بھرے جا رہے تھے، ہر طرح کی خوشبوؤں سے فضا مہک رہی تھی، حسن و زیبائش کے پیکروں سے ماحول جگمگا رہا تھا۔

آنٹی بڑی خوش خلقی اور خوش مزاجی سے اپنے مہمانوں کا استقبال بھی کر رہی تھیں اور خبر گیری بھی۔ میں نے اس سے پہلے آنٹی کو کبھی ایسے سنگھار میں نہیں دیکھا تھا۔ انھوں نے شیفون کی سیاہ فرنچ ساڑی پہن رکھی تھی۔ جس پر سنہرے نقوش بنے تھے، اس سال کی گرمیوں میں جب وہ پیرس گئی تھیں تو بیگم آغا خان نے انھیں بطور تحفہ یہ ساڑی پیش کی تھی۔ اس کے ساتھ بیر بہوٹی جیسا سرخ بغیر آستینوں کا بلاؤز پہنے ہوئے تھیں جس کی تراش خاص ان کی فرمائش پر اسی موقع کے لئے بالکل اچھوتے ڈھنگ سے کی گئی تھی۔ سوئٹزرلینڈ کے دوران سیاحت میں خریدی ہوئی پلاٹینم کی گھڑی جس کے کانٹے بھی پلاٹینم کے تھے اور ہندسے ہیرے کے، دائیں کلائی پر پلاٹینم ہی کے جالی دار تودے سے بندھی تھی۔ بائیں کلائی میں زمرد کے ننھے ننھے نگینوں کا جڑاؤ بریسلیٹ تھا۔ بڑے بڑے اصلی موتیوں کا ہار سینے پر لٹک رہا تھا۔ اور ڈنلک کا بنا ہوا ہیروں سے مرصع گلوبند اس کے اوپر تھا۔ جس کے بیچوں بیچ آنسو کی شکل میں تراشا ہوا بڑا سا نیلم چمک رہا تھا۔ کانوں کی لووں سے ہیروں کے جھاڑ لٹک رہے تھے۔ دن بھر کے بیوٹی ٹریٹمنٹ کے بعد ان کی گلابی جلد کی طنابیں کھنچ گئی تھیں، سنگترے کے چھلکے جیسی جلد سیب کے چھلکے جیسی ہو گئی تھی۔ جدید طرز کے کٹے ہوئے بال گردن اور کندھوں تک پھیلے ہوئے تھے۔ پیشانی کے درمیان سے ذرا ہٹ کر کوئی دو انگل چوڑی سفید دھاری پشت کو جاتے جاتے پھیل کر بڑی پرکشش لگ رہی تھی۔ اور آنٹی کی وجاہت کو نمایاں کر رہی تھی۔ اس وقت ان کی آنکھوں میں ایک عجیب سا نور تھا۔

ہر سال کی رسم کے مطابق جیسے ہی مرتعش چائم نے نو بجائے جو ان کی پیدائش کا وقت تھا، آنٹی نے تالیوں کی گونج میں

کیک کاٹا۔ ہر طرف سے نغمہ بلند ہوا۔ ہیپی برتھ ڈے ٹو یو۔۔۔۔

" زرنگار" میں اس سے بڑی دعوت میں نے کبھی نہ دیکھی تھی۔ اور آنٹی کے ولولے دیکھ کر مجھے بے حد مسرت ہو رہی تھی۔ کیوں کہ آنٹی پچاس سال سے زیادہ جینا وبال سمجھتی تھیں! اور پچاس سے اوپر کی زندگی کے تصور ہی سے گھبراتی تھیں۔

مجھے یہ دیکھ کر بڑا اطمینان تھا کہ آنٹی اب زندگی کی ان بوجھل ان دیکھی منزلوں کی طرف بڑھتے ہوئے خوف زدہ ہونے کے بجائے ایک اور رنگ میں کے گزرنے پر اتنی مسرور تھیں۔ پورے پچاس سال انھوں نے گزار دیے تھے۔

پچھلے سال ہی کی تو بات ہے جب کہ میں آنٹی کے ساتھ کھنڈالا کی ایک سربلند چوٹی پر بیٹھا تھا' ہم افق تک پھیلے ہوئے اور پھیلے ہوئے سلسلۂ کوہ اور بیچ بیچ میں ان پہاڑوں کو ایک دوسرے سے ہمیشہ کے لئے جدا رکھنے والی سیکڑوں فٹ گہری اور خوفناک کھائیوں کا نظارہ کر رہے تھے۔ گرمیوں کے دن تھے' سبزے کا میلوں پتہ نہ تھا۔ زردی مائل پس منظر دھندلا ہوتے ہوتے بھورا ہو رہا تھا' اور دور آسمان اور زمین کے اتصال پر مبہم سرمئی خاکے آپس میں گڈمڈ ہو رہے تھے' منظر بڑا پُرسکون تھا مگر یہ سوچ کر دہشت ہوتی تھی کہ یہ پہاڑ جس کے سر پر ہم سوار ہیں اگر نیچے سے کھسک گیا تو ہمارا کیا حال ہوگا۔ ویسے یہ سوچنے کی کوئی وجہ تو نہ تھی۔ بس ایک یوں ہی سا خیال آ گیا اور عجیب اتفاق تھا کہ آنٹی بھی کچھ اس قسم کی بات سوچ رہی تھیں۔

" ڈارلنگ سپوز میں یہاں سے گر کے مر جاؤں " وہ اپنی مخصوص زبان میں بولیں۔ جو ان کی عادت تھی' یعنی انگریزی الفاظ کا بہت استعمال کرتی تھیں' اور بعض دفعہ تو جملے کے جملے بھی بول جاتی تھیں۔ " یہ سوچ کے آئی شڈر۔ میں تو مرنا ہی نہیں چاہتی۔ نہ ایکسی ڈنٹ سے' نہ سوئسائڈ کر کے' نہ کسی اور طرح۔ ہاؤ ایور آئی ہیو ناٹ یٹ ڈی سائڈڈ کہ میں کیسے مروں گی۔ موت سے مجھے سخت نفرت ہے "

"آپ موت کے بارے میں سوچتی ہی کیوں ہیں؟ "

"کیوں نہیں سوچوں۔ میں مرنا ہی نہیں چاہتی۔ لیکن ضعیفی کی ہو کر جینا بھی تو نہیں چاہتی۔ کیوں کہ پھر لائف بی کمس سو مزریبل' یو نو "

میں چکرایا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا' میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

" سب سے آسان موت ہارٹ فیل ہے " آنٹی نے کچھ سوچ کر فیصلہ کیا۔

" اس میں کوئی لمبی چوڑی تکلیف نہیں ہوتی۔ یو نو۔ آئی ڈونٹ لائک سفرنگ۔ نہ اپنی نہ دوسروں کی۔ تم بلیو نہیں کرو گے کہ میں نے آج تک کسی ان سیکٹ تک کو نہیں مارا۔ ہر طرح کی پارٹیوں میں یا مٹی سی ہیٹ کیا مگر ہنٹنگ پارٹی میں کبھی نہیں گئی۔ کسی فیونرل میں کبھی شریک نہیں ہوئی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا ہاؤ آئی ونڈ فیس دی ڈیتھ۔ اسپشلی بڑھاپے میں۔ کبھی کبھی مجھے ڈاؤٹ ہونے لگتا ہے کہ شاید کوئی خدا ہے۔ اور پھر آئی پرے ٹو ہم کہ مجھے ہارٹ فیل سے مارنا' اور جب میرا ایمان لوٹ آتا ہے کہ خدا وُدا کوئی نہیں تو ڈیٹرمن کرنے لگتی ہوں کہ ہارٹ فیل سے آرام سے مروں گی تاکہ مجھے مرنے میں کوئی ٹربل نہ ہو۔

نہ چلیے آنٹی دیر ہو رہی ہے۔ رات کو پہاڑی رستے پر ٹریکیں بہت چلتی ہیں۔ بستی پہنچنے میں ہمیں دیر ہو جائے گی۔"

ہم پہاڑ سے اتر آئے۔ راستہ بھر کوئی بات نہیں ہوئی۔ ہماری کار کھنڈالا کے پُرپیچ اور نیم تاریک نشیبی زاویوں سے چلی جا رہی تھی، ہم دونوں خاموش تھے، خاموشی دہشت ناک تھی۔

ویسے آنٹی شاید ہی کبھی خاموش رہتی ہوں گی اور ان کی باتوں میں بات کرنا بڑے دل گردے کی بات ہے۔ اس بات کا احساس مجھے ان سے پہلی ہی ملاقات میں ہو گیا تھا۔ ان سے میری یہ پہلی ملاقات چند سال پہلے ہوئی تھی۔

میں جب تشہیری ادارے میں ملازم تھا اس کے مالک سے میرے تعلقات بہت ہی دوستانہ تھے، وہ میری کارکردگی سے متاثر تھا، اور میں اس کی خوش حالی سے۔ اکثر شامیں ہم ساتھ گزارا کرتے تھے، ایک دن اس نے کہا:۔

"آج میں تمہیں ایک خاص آنٹی کے پاس لے چلوں گا۔"

میں اب تک اس کی کئی اصلی اور منہ بولی آنٹیوں سے مل کر بہت بور ہو چکا تھا۔

"یہ کون سی آنٹی ہیں؟" میں نے بددلی سے پوچھا۔

"یہ دراصل ساری دنیا کی آنٹی ہیں۔ تم انہیں شیطان کی آنٹی بھی کہہ سکتے ہو۔"

اس مختصر سے غائبانہ تعارف کے بعد ہم ان آنٹی کے بنگلے پر پہنچے۔

ڈرائنگ روم میں قدم رکھتے ہی یوں محسوس ہوا جیسے کسی خواب آور دوا کے زیر اثر میں خوابوں کے جزیرے پر پرواز کرنے لگا۔

یہ ایک ایرکنڈیشنڈ ہال تھا۔ جو انتہائی ماڈرن ذوق اور مزاج کے مطابق سجایا گیا تھا۔ ایک دیوار فیروزی رنگ کی تھی، ایک بنفشی سرخ، ایک گہری سرمئی اور ایک ہلکے سبز رنگ کی جس پر کیوبک اسٹائل میں زرد، سفید اور نارنجی خاکے تھے جن کا موضوع سکون اور تازگی تھا، تازہ ترین رواج اور ڈیزائن کے پوشش، الگ الگ رنگوں اور ناپ کے غلاف، الگ الگ رنگ اور وضع کے صوفوں کے نیچے بچھے تھے، خوش ذوقی اور حسن کارانہ طور پر ترتیب دیے ہوئے پھول، بیش قیمت اور نادر گلدانوں میں سجے تھے، دیوار اور چھت کی مخفی روشنی مصنوعی چاندنی کی طرح چھٹکی ہوئی تھی، جس کی برائے نام روشنی میں وہاں ادھر ادھر بیٹھے ہوئے مردوں اور عورتوں کے خدوخال سے ان کی تمناؤں اور حسرتوں کے تاریک گوشے ابھر رہے تھے۔ چھت سے آویزاں پرشکوہ بلوری جھاڑ کے گوشوارے میں مخفی روشنی کے انعکاس سے جلبلیں سی چمک رہی تھیں۔

طرح طرح کے پھولوں اور خوشبوؤں کی مہک سے تمباکو کی بو اور سگریٹوں کا گھٹا ہوا دھواں خلط ملط ہو رہا تھا۔ اس دھوئیں میں سے ایک ادھیڑ عمر کی باوقار عورت ہماری طرف بڑھتی چلی آئی۔ منقش سنہری فریم کے چشمے میں اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں دہک رہی تھیں۔ اور پھیکے پھیکے لپ اسٹک والے ہونٹ، استقبالیہ مسکراہٹ لئے ہوئے تھے، ہاتھ میں سگریٹ تھا۔ ابتدائی رسمی گفتگو اور مصافحے کے بعد میرے دوست نے ان سے میرا تعارف کروادیا۔ یہ تھیں وہ آنٹی۔

"ہاؤ ڈو یو ڈو ؟" آنٹی نے میرے جواب میں کہتے ہوئے ہاتھ ملایا۔

وسیع و عریض ڈرائنگ روم کے ایک کونے میں دیوان پر انھوں نے ہمیں بٹھا دیا۔ میرے دوست نے دور بیٹھی ہوئی دو لڑکیوں کو اشارہ کیا۔ اور دونوں جیسے ایک دکھائی نہ دینے والے دھاگے سے بندھی چلی آئیں۔ ایک دھان پان گجراتی اور دوسری اونچی پوری پنجابی۔ بیرا بھی آ گیا اور میرے دوست نے اسکاچ کا آرڈر دیا۔

"انجوائے یور سیلوز بوائز" یہ کہہ کر آنٹی کچھ نو وارد مہمانوں کی مدارات کو چلی گئیں۔

بوتل آئی، گلاس آئے، سوڈا آیا، جام ٹکرائے، گھونٹ اترے، لڑکیوں سے چھیڑ چھاڑ چلی مگر میں اس چھیڑ چھاڑ میں شریک نہ تھا۔ مخفی روشنی کے آدھے سے زیادہ اندھیرے میں میری نگاہیں دوسری شکلوں کو ٹٹول رہی تھیں۔ غور سے دیکھنے پر ایک مشہور فلمی ہیرو دکھائی دیا۔ جس کے ساتھ ایک نامور پروڈیوسر اور ایک کامیاب ڈائرکٹر بھی بیٹھا تھا۔ ان کے حلقے میں پانچ عورتیں بیٹھی ان کے ساتھ پی رہی تھیں، ان تینوں کی آنکھوں سے شراب کے ساتھ ساتھ دولت اور عیاشی کا نشہ بھی آشکار تھا۔ ان پانچوں کی آنکھوں میں تجربے کاری اور خود اقتصادی کا نشہ بھرپور تھا، وہ ان کا شکار کر رہے تھے اور یہ ان کا شکار کر رہی تھیں۔

ایک جگہ ایک بھاری بھرکم توندیل مارواڑی جو ساٹھ کے لگ بھگ ہوگا کھادی کے نہایت ہی اجلے کپڑے پہنے بیٹھا تھا۔ ایک ہاتھ سے تلے ہوئے گردے اور جھینگے کھا رہا تھا اور دوسرا ہاتھ برابر بیٹھی ہوئی ایک اینگلو انڈین لڑکی کی ران پر بار بار مار رہا تھا جو چپکے چپکے مسکراتی ہوئی تھوڑی تھوڑی دیر سے چسکی لیتی رہتی تھی۔ دور ہی سے لگتا تھا کہ وہ اس سے گندے لطیفے سن رہی تھی۔

درمیانی میز کے گرد صوفوں پر تین نوجوان اپنی آبائی دولت کا فراخدلی سے استعمال کرتے ہوئے ایک ایک کمسن لڑکی پہلو میں لئے بیٹھے پی رہے تھے، ان کی بات چیت کے انداز سے پتہ چلتا تھا کہ یورپ کے پچھلے سفر کا ذکر ہو رہا تھا، یا ٹی شاندار اور قیمتی کاروں کی خرید و فروخت کا۔

ایک کونے میں بہت قد بہت بڑھیا سوٹ میں ایک درمیانی عمر کا تین آدمی بیٹھا تھا۔ اس کے پاس ایک گداز بدن بنگالی عورت تھی، شراب کی بوتل اور آدھے آدھے گلاس سامنے میز پر رکھے تھے، دونوں سگریٹ پھونک رہے تھے، دونوں خاموش تھے۔

ایک طرف صرف کچھ عورتیں ہی بیٹھی تھیں۔ وہ اس وقت بے کار اور بے روزگار تھیں۔ شاید ہر ایک کو امید ہوگی کہ اس کا اپنا کوئی گاہک بس آ ہی ہوگا۔ آنٹی بھی ان ہی کے ساتھ بیٹھی سگریٹ پی رہی تھیں۔ آنٹی کو میں غور سے دیکھنے ہی لگا تھا کہ ان سے نگاہیں چار ہوئیں۔ اور وہ فوراً میری طرف آنے لگیں۔ میں اپنے جائزے اور خیالات سے چونکا۔ تو پتہ چلا کہ میں اکیلا ہی بیٹھا تھا۔ میرا دوست اس پنجابی عورت کے ساتھ کہیں غائب ہو گیا تھا اور وہ دھان پان گجراتی لڑکی فلمی ہیرو کے پاس جا بیٹھی تھی۔

"تم اکیلے کیوں بیٹھے ہو ڈارلنگ ——— ؟" آنٹی میرے سامنے کھڑی مجھ سے پوچھ رہی تھیں۔

"جی ..... وہ ..... " میں گھبرا سا گیا۔

"شوق نہیں کرو گے ؟ اندر بہت سے ویکنٹ رومز ہیں "

"جی نہیں شکریہ۔ میں یہ شوق نہیں کرتا۔"

"سچ؟" یہ کہتے ہوئے وہ میرے پاس بیٹھ گئیں۔ "یہاں تو جو بھی آتا ہے جسٹ ٹو ہَیو فَن اینڈ گُڈ ٹائم ——"

"جی ہاں۔ مگر میں اپنے دوست کے ساتھ یوں ہی چلا آیا۔"

"تم ان کی فرم میں پبلک ریلیشنز آفیسر ہو؟"

"جی۔"

"یہ بھی تو ایک اسٹیبلشمنٹ آف پبلک ریلیشنز ہے!" آنٹی نے فوراً ایسی سنجیدگی سے جوڑ ملایا کہ میں ہنسے بغیر نہ رہ سکا۔

"تم میریڈ ہو؟" آنٹی نے پینترا بدلا۔

"جی نہیں۔"

"گڈ گریشس! کنوارے ہو کر ایسے خشک مزاج ہو، کمال ہے۔" انھوں نے بڑی حیرت ظاہر کی۔ ان کی یہ سبھی باتیں محض ایک اور گاہک حاصل کرنے کے لئے تھیں۔ اور میں ان کے مال بیچنے کی ماہرانہ صلاحیت کا دل ہی دل میں قائل ہو گیا۔

"اِمپاسبل۔" کچھ دیر رک کر جیسے انھوں نے اپنے آپ سے کہا۔

"بات یہ ہے آنٹی...... کہ میں اس کام کو، اس پیشے کو، اس ماحول کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتا۔"

"واٹ؟" آنٹی چونکیں اور کچھ دیر تو بس مجھے دیکھتی ہی رہ گئیں۔ پھر اپنے حواس ٹھیک کرتے ہوئے بولیں۔ "آن چیک میں منہ پر نو وِک ٹولڈ لائک دِس۔"

اب میرے بدحواس ہونے کی باری تھی، آنٹی کے گھر میں بیٹھ کر میں نے ان سے ایسی بات کہہ دی جس سے ان کے جذبات کو ٹھیس لگی تھی۔ میں جانے کے لئے کھڑا ہو گیا۔

"آئی ایم سو ساری۔" اور میں جانے لگا۔

"سِٹ ڈاؤن۔" آنٹی نے کچھ ایسی خود اعتمادی سے حکم دیا کہ میں ایک پٹے ہوئے شریر لڑکے کی طرح ان کی حکم عدولی نہ کر سکا اور بیٹھ گیا۔

"میں نے کچھ مائنڈ نہیں کیا۔ بلکہ مجھے تمہاری فرینکنیس پر حیرت ہے۔ آئی ایڈمائر یو سو مچ۔ میں تو ہول لائف تم جیسے آدمی کی راہ دیکھ رہی تھی جو آنسٹ اور ٹروتھ فل ہو۔ کوئی اپنے آپ کو کس کر چانٹا نہیں مار سکتا۔ ایسے سلیپ کے لئے دوسرے کا ہاتھ چاہیے.... اور نہ جانے آنٹی کیا کیا کہتی رہیں۔

اگر میں کوئی ڈیفادر ہوتا تو آنٹی کی باتوں سے مجھے بے حد مسرت ہوتی، مگر اس وقت ان کی باتوں سے مجھے بے حد شرمندگی ہو رہی تھی کیونکہ انھوں نے مجھے ڈیفادر کا رتبہ دے دیا تھا۔

شاندار ڈنر کھلا کر میرے دوست کے ساتھ جب وہ مجھے رخصت کرنے لگیں تو مجھ سے دوسرے دن بھی آنے کا وعدہ لے لیا۔ دوسرے دن انھوں نے مجھے اکثر آتے رہنے کی تاکید کر کے رخصت کیا۔ اور میں اکثر ان کے ہاں آنے جانے لگا۔ بہت جلد ہم ایک دوسرے سے قریب ہوتے گئے اور کچھ ہی عرصے میں یہ نوبت آگئی کہ مجھ سے زیادہ ان کا منہ چڑھا کوئی نہ تھا۔ بغیر کسی غرض اور مطلب کے ہم ایک دوسرے کے بہترین دوست بن گئے تھے۔ وہ مجھے میری بے باکی اور اصول پرستی کے لئے عزیز رکھتی تھیں اور میں ان کی شفقت اور پیچیدگیٔ کردار کے سبب ان میں دلچسپی لینے لگا۔

آنٹی کی شخصیت ہمہ گیر تھی۔ وہ اس قدر ہر دل عزیز تھیں کہ عوام کے بھی ہر دلعزیز اداکار، مشاہیر، فنکار، ادیب اور سیاسی رہنما ان پر نچھاور ہوئے جاتے تھے۔ بمبئی کے اونچے طبقے کی کوئی تقریب، کوئی محفل اور کوئی جلسہ ایسا نہ ہوتا تھا جس میں وہ مدعو اور موجود نہ ہوتی تھیں۔ ایوز ویکلی اور آن لوکر کی کوئی اشاعت ایسی نہ ہوتی تھی جس میں وہ کسی سماجی اجتماع کی تصویروں میں اپنی جھلک نہ دکھا رہی ہوں۔ کسی غیر ملکی وی آئی پی کے استقبال کے لئے گیٹ وے آف انڈیا یا سینٹا کروز ایروڈروم پر وزرا، شیرف، غیر ملکی قونصلوں اور عمائدین شہر کے ساتھ وہ بھی دکھائی دیتیں۔ ہر نئی فلم کے پریمیئر یا مہورت پر، بریبورن اسٹیڈیم میں کرکٹ کے ٹسٹ میچ میں، بمبئی جمخانہ کے بین الاقوامی ٹینس چیمپین شپ کے مقابلوں میں، کوپریج پر روورس کپ کے فٹ بال ٹورنامنٹ میں، بلیرڈز، اسنوکر، گالف اور برج کے مقابلوں میں، ایمانکس، کاوس جی جہانگیر ہال کے نیم سیاسی جلسوں میں، مغربی موسیقی کے کنسرٹ میں، جہانگیر آرٹ گیلری میں پینٹنگ کی نمائشوں میں، رنگ بھون کے اوپن ایر خیراتی مشاعروں میں، بھارتیہ ودیا بھون کے ڈراموں، برلا ماتوشری سبھاگرہ کے پروگراموں، شری سنگار سمسد کے میوزیکل فیسٹیول اور مہالکشمی ریس کورس کی ہر ایک میٹنگ میں آنٹی اپنے نہایت ہی فنکارانہ ذوق کے ملبوس اور نئی نئی وضع کے بیش قیمت زیورات پہنے اپنی مخصوص تمکنت اور وقار کے ساتھ نمایاں طور پر ضرور شرکت کرتیں۔ سب ہی ان کو آنٹی پکارتے تھے۔ اجتماعی تصویروں کے نیچے اور سماجی خبروں میں ان کا ایک نام ضرور چھپتا تھا، مگر وہ اصلی نہیں تھا۔ کسی کو ان کے اصلی نام کا اور کسی اور اصلیت کا پتہ نہ تھا۔ بہت سے بہت ایرسٹوکریسی کے لوگوں کو ان کے کاروبار کا پتہ نہ تھا۔ اس سے زیادہ نہ وہ جاننا چاہتے تھے، اور نہ جاننے کی ان کو کوئی خاص ضرورت تھی ———!

آنٹی کا کاروبار مالابار ہل پر ان کی اپنی کوٹھی "زرنگار" میں ہوتا تھا۔

جب سورج تاریکیوں میں کھو جاتا تو "زرنگار" میں سویرا ہونے لگتا۔ آنٹی کو اِن سومنیا کی شکایت تھی، اس لئے وہ دن کو ہی سوتی تھیں۔ سرِ شام ہی ملازم ڈرائنگ روم، ڈائننگ روم، خواب گاہوں، برآمدوں، گیلریوں، اور ٹیرس کی صفائی کرنے لگتے۔ آنٹی جب دلہن کی طرح ایک نئی عورت بن کر کمرے سے برآمد ہوتیں تو سب سے پہلے سارے گھر کا جائزہ لیتیں۔ ہر چیز بڑے قرینے سے اپنی جگہ پر صاف ستھری دکھائی دیتی، فرش، دروازے، کھڑکیاں، شیشے، چمکتے دکھائی دیتے۔ جگہ جگہ رکھے ہوئے گلدانوں میں تازہ

بہ تانہ تر بہ تر پھول مہکتے رہتے۔ معطر خوابگاہوں میں تکیوں پر اُجلے اُجلے غلاف رہتے اور بستروں پر اجلی اجلی چادریں ہوتیں جن پر تہوں سے پیدا ہونے والی شکنیں کہیں ابھری ہوتی اور کہیں دبی ہوئی لکیروں کی شکل میں لیٹی رہتیں۔ سائڈ ٹیبل کی دراز کھول کر آنٹی دیکھ لیتیں کہ مخصوص ضرورت کے پیکٹ اور چھوٹے تولیئے ان میں رکھے ہیں۔ ہر طرف سے اطمینان کر کے وہ برآمدے میں چلی آتیں۔ پودے، بغیچے اور "ان" کے گیٹ سے پورچ تک آنے والے اور پورچ سے "آؤٹ" کے گیٹ تک جانے والے راستے پر نظر دوڑاتیں۔ اگر کچھ دکھائی دے جاتا تو مالیوں کو ڈانٹتیں۔

"یُو لَیزی سوائن۔ وہ دیکھ۔ وہاں ایک پتہ پڑا ہے، اٹھا جلدی سے"

"ادھر دیکھ یو اسکَنگ، وہاں پھول گرا پڑا ہے، پھینک اسے"

نئی نئی آبیاری سے اٹھنے والی پھولوں اور پتیوں کی خوشبو میں ایک گہری سانس لے کر وہ ڈرائنگ روم میں چلی آتیں اور ریڈیو پر کہیں سے مغربی موسیقی کا پروگرام دھیمے سروں میں لگاتیں۔ پھر مختلف تپائیوں اور میزوں پر رکھے ہوئے طرح طرح کے ڈبوں میں کسی ایک سے سگریٹ نکال کر جلاتیں اور کسی ایک صوفے پر آرام سے بیٹھ جاتیں۔

اب اتنا وقت ہو جاتا کہ ستارے ایک کے بعد ایک اترنے لگتے، اور ان کی وقتی پرستش کرنے والے ان کے گرد جمع ہونے لگتے۔ یہ زہرہ جبیں قوم اور مذہب سے بے نیاز ہوتی تھیں۔ جیسا کہ اس پیشے کا قاعدہ ہے، لیکن شناخت کے لئے ہر قوم اور مذہب کی ہوتی تھیں۔ اسی طرح گاہک ہوا کرتے تھے۔

سرکاری مصروفیات سے بوکھلائے ہوئے بڑے بڑے عہدیدار، کاروباری الجھنوں سے گھبرائے ہوئے تجار، ایسے نئے اور خام دولت مند جن کو سرد ریکام و دہن کا بڑا شوق تھا یا ہوس پرستی کو جنہوں نے اپنا شعار بنا لیا تھا، وہاں آجایا کرتے۔ اپنی ٹولی الگ سے کر بیٹھ جاتے، یا ڈرائنگ روم اور ڈائننگ روم کے درمیان بنے ہوئے بار سے جام لیتے جاتے۔ اپنی اپنی نازنین کے ساتھ کچھ برس پے چلے جاتے، کچھ خوابگاہوں میں چلے جاتے، کچھ ڈرائنگ روم یا لونگ روموں میں ہی دور دور بیٹھے رہتے اور ہلکی ہلکی موسیقی کے پس منظر میں سرگوشیاں یا چھیڑ چھاڑ کرتے رہتے۔ کچھ ووڈن فلور پر ڈانس کرنے لگتے، آنٹی سب کی خاطر تواضع میں لگی رہتیں اور تھوڑی تھوڑی دیر سے ہر ایک گروہ یا جوڑے کے پاس جا کر پوچھنے لگتیں۔

"ڈُو یو وانٹ انی تھنگ ڈارلنگ؟"

ہر طرح کی اعلیٰ شراب کے ساتھ طرح طرح کے لوازمات اور لذیذ غذائیں بھی تیار کی جاتی تھیں۔ اور جسکو جس وقت جہاں کھانے کی ضرورت محسوس ہوتی وہاں منگوا لیتا۔

کبھی کوئی جوڑا کچھ دیر کے لئے ڈرائیو پر چلا جاتا۔ کوئی دو ایک گھنٹے گزار کر ہی اپنی گھر والی کے ڈر سے جلدی چلا جاتا۔ کوئی نصف شب کو، کوئی اس سے بھی دیر سے، کوئی صبح سویرے، اور کوئی گاہک تو ناشتے سے بھی فارغ ہو کر جاتا۔ قاعدہ یہ تھا کہ جانے والا جاتے جاتے آنٹی کو سودے کے مطابق سو سو کے بہت سے نوٹ یا ہزار کے ایک دو نوٹ دے جاتا۔ اس کے بعد

آنٹی اپنا بڑا سا حصہ کاٹ کر باقی معقول رقم کمانے والی کو دے دیتیں۔ یہ ایک سیدھا سا اصول تھا۔ تمام عورتوں اور آنٹی میں ایک طرف، اور تمام گاہکوں اور آنٹی میں دوسری طرف ایک ایسی ہم فہمی ہوتی تھی کہ کبھی کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہ آتا۔

آنٹی کا دائرۂ اثر و رسوخ حسبِ ضرورت محدود تھا، ان کی ہمدردی اسی طرح بے انتہا تھی۔ کسی دوسری تجارت کی طرح یہاں بھی نیا نیا مال آتا رہتا تھا، کھپتا رہتا تھا، اور جب ٹھکانے لگ جاتا تو اور نیا مال سجا کر آنٹی بیٹھ جاتی تھیں۔

آنٹی کئی طریقوں سے اپنا مال دستیاب کرتی تھیں۔

ایک طریقہ تو یہ تھا کہ متوسط طبقے میں کاروبار کرنے والے دلالوں سے ان کا ربط تھا۔ یہ دلال ایسی دوشیزائوں کو آنٹی سے ملا دیتے تھے جو معاشی مجبوریوں کی وجہ سے چوری چھپے پیشہ کرتی تھیں۔ ان میں کالج کی لڑکیاں بھی تھیں۔ دفتروں میں کام کرنے والیاں بھی، اور گھریلو بیویاں جو شوہروں کی مرضی یا شوہروں کی لاعلمی میں "زر نگار" آیا جایا کرتی تھیں۔ خالص اور بلا غیر پیشہ ور عورتوں کو ان کے نمایاں گھٹیا پن کی وجہ سے آنٹی نہیں لیتی تھیں۔ سوائے ایسی لڑکی کے جو بے حد قبول صورت یا غیر معمولی جنسی کشش رکھنے والی ہوتی تھی۔ ایسی لڑکی کی وہ خفیہ طور پر کئی روز تک تربیت کرتیں کہ کس طرح چلنا چاہیئے، کس طرح اٹھنا اور بیٹھنا چاہیئے، مسکرانے کے انداز اور بات چیت کے طور طریقے کیا ہوں۔ اور اس میں جو بھی خامیاں ہوتیں وہ دور کر دیتیں۔ مثلاً دوران گفتگو میں چھت کی طرف دیکھنا، سر کھجانا، منہ میں انگلی ڈال کر دانتوں سے کچھ نکالنا، ڈکار لینا، وغیرہ۔ آنٹی بڑی خوش اسلوبی سے یہ عیب نکال دیتیں، پھر اسکو ایسے لباس اور زیور مہیا کر دیتیں جو دیکھنے میں بڑے قیمتی لگتے تھے، لیکن دراصل اتنے قیمتی نہ ہوتے تھے۔ رنگوں کے امتزاج، مختلف اوقات میں رنگوں کا استعمال، اور سنگھار کے اصول اور معیار اچھی طرح سکھا دیتیں، اور ان چیزوں کا ذوق اس میں "کاشت" کرتیں۔ جب آنٹی کو اطمینان ہو جاتا تھا کہ کسی گاہک کو اس مال سے کوئی شکایت ہی پیدا نہیں ہو سکتی، تب وہ اسکی نمائش کرتیں، اور بڑے دل لبھانے والے انداز میں اسکو پیش کرتیں اور مال یکایک چل پڑتا۔

دوسرا طریقہ یہ تھا کہ آنٹی جو اونچے طبقے کے کئی گھرانوں اور خاندانوں میں رسوخ رکھتی تھیں، اسکینڈلز پر ہمیشہ کان لگائے رہتی تھیں۔ جہاں انہیں پتہ چلا کہ کسی بیوی کی اپنے شوہر سے ان بن رہتی ہے۔ یا کسی نے علیحدگی اختیار کر لی ہے، یا طلاق لے لی ہے تو اس کو بڑی ترکیب سے اپنے دام میں لے آتیں، پھر "شورومز" میں منتقل کر دیتیں۔ جہاں اس نئی آمد کو خوش آمدید کہا جاتا۔ اور ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا۔

تیسرا طریقہ یہ تھا کہ آنٹی سماجی محفلوں اور تقریبوں میں ایسی لڑکیوں اور عورتوں پر نظر رکھتیں جو ان کے نزدیک اس پیشے میں بڑا خوشگوار مستقبل رکھتی تھیں۔ آنٹی کی یہ ٹوہ پہلے تو ان کی عادت بن گئی پھر جبلت، جو غیر شادی شدہ عورت، یا نوخیز بالا ان کو بڑی ایڈوانس، فیشن زدہ، مخلوط حلقوں میں گھل مل جانے کی دلدادہ، بے تکلف، بے حجاب، شوقین، اور رنگین مزاج نظر آتی، وہ اس پر ذہنی طور سے نشان لگا دیتیں۔ فوراً اسکی گرویدہ ہو جاتیں، بڑی جلدی اسے بھی اپنا گرویدہ کر لیتیں۔ اور اس کے بہت سے گرویدہ ہونے والے اسے مہیا کر دیتیں۔

چوتھا طریقہ یہ تھا کہ امریکہ، یورپی ممالک اور مشرقِ وسطیٰ کے علاوہ ہانگ کانگ، ٹوکیو اور سنگاپور کے اعلیٰ معیاری تجربہ خاتون اور پیشہ ور عورتوں کے تاجروں سے ان کا ربط تھا، وہ اپنے اور ان کے ذخیروں کے نوادرات کا تبادلہ کیا کرتی تھیں۔ دساور سے آئے ہوئے بیش بہا تحفوں کو وہ تاج، ایمبیسیڈر، سن این سینڈ، نٹ راج اور رٹز سے کم درجے کی ہوٹلوں میں نہ رکھتی تھیں اور ان کے فرضی خاندانی پس منظر کے ساتھ ان کی تشہیر کر کے اونچے شوقین حلقوں میں ان کے لئے طلب پیدا کرتی تھیں۔

یہ چار عام اور مستقل طریقے تھے، ان کے علاوہ کئی اور طریقوں سے بھی آنٹی مال حاصل کرتی تھیں یا مال ان تک پہنچ جاتا تھا، حسن و جمال کے یہ نوادرات خرچ کرنے والوں کی حیثیت کے مطابق ہمیشہ دستیاب ہو سکتے تھے۔

"زرنگار" محض اعلیٰ پیمانے کی ہوس کاری کا مرکز ہی نہیں تھا، جہاں کتنی ہی کنواریوں نے اپنا مقصدِ حیات مقرر کیا تھا اور کئی دوسری عورتوں نے دنیا کا سب سے پرانا اور آسان پیشہ شروع کیا تھا، بلکہ بڑے بڑے تاجروں اور سرکاری عہدیداروں کی کارگزاریوں کی ابتدا اور انتہا بھی یہاں ہوا کرتی تھی۔ اور آنٹی کو کمیشن کے طور پر بڑی بڑی رقمیں اور تحفے تحائف ملا کرتے۔

سرکاری اور غیر سرکاری ٹھیکے، درآمد و برآمد کے اجازت نامے، بڑی بڑی رکی ہوئی کارروائیوں کی تجدید یا رواں دواں کارروائیوں کی رکاوٹ، عظیم و فلک بوس عمارتوں، بے نظیر تھیٹروں، نئی فیکٹریوں، ملوں اور فیکٹریوں کے قیام کے منصوبے یہاں بنتے تھے، اور مشکلوں میں گرفتار بڑے بڑے سرمایہ داروں کی نجات کا یہاں انتظام ہوا کرتا تھا۔ بعض دفعہ سیاسی اور صنعتی پالیسی غیر سرکاری طور پر یہاں سے طے پاتی تھی، جو بعد میں سرکاری نوعیت اختیار کر لیتی تھی۔ ایک دفعہ تو ایک سیاسی جماعت کے مینی فیسٹو کا خاکہ یہاں تیار کیا گیا تھا۔

آنٹی کا مقولہ تھا "دنیا میں کوئی کام امپاسبل نہیں۔ عورت اور شراب سپلائی کر کے دیکھ لو۔"

عورت اور شراب سپلائی کر کے انھوں نے نہ صرف دوسروں کے کام بنوائے تھے، بلکہ اپنے کام بھی نکالے تھے۔ ان عورتوں کا کام بھی بن گیا تھا جو سپلائی کی گئی تھیں۔ سب اپنی اپنی جگہ خوش تھے۔

آنٹی کی خدمات بڑی مخلصانہ، باذوق، انتہائی آرام دہ، بے خطر، اور اپنی تجارت میں اتنے اونچے معیار کی تھیں کہ کوئی ان سے مسابقت ہی نہ کر سکتا تھا اور اس اجارہ داری میں ان کا کاروبار چمک چمک اٹھا۔

آنٹی سے میرا ملنا جلنا بہت بڑھ چکا تھا، آنٹی کی شفقت اور نوازشیں بھی بڑھتی ہی جا رہی تھیں، ہم ایک دوسرے سے اتنے مانوس ہو گئے تھے کہ اگر کسی وجہ سے چار پانچ روز تک ملنا نہ ہوتا تو ہم بے چین ہو کر ایک دوسرے کو ڈھونڈ نکالتے۔ اپنے مسائل، اپنا دکھ درد، ایک دوسرے کو سناتے، مشورے لیتے اور دیتے۔ دل کا بوجھ ہلکا کر لیتے۔ میں ان کو کافی حد تک سمجھ گیا تھا اور وہ بھی شاید مجھے سمجھنے کی کوشش کر رہی تھیں، جبھی تو ایک روز اچانک پوچھ بیٹھیں۔

"یہ بتاؤ ڈارلنگ، تم کو میرا آکیوپیشن پسند نہیں، تم کو مجھ سے کوئی مطلب نہیں، ویل وائی ڈو یو لائک ٹو کم ہیئر اینڈ سی می؟"

"آپ میرے لئے بہت اچھی ہیں۔ بس یہی میرے لئے بہت کافی ہے" میں نے بے ساختہ جواب دیا۔

"یو آر سو سویٹ" آنٹی جذباتی ہونے لگیں۔ "آئی تھینک یو ویری مچ۔ آئی لو یو ڈیئر۔ جی چاہتا ہے تم کو ہمیشہ اپنے ساتھ رکھوں۔ تمہاری ایک ایک چیز کی کیئر کروں، تم کو ہر ایک کمفرٹ پہنچاؤں۔ میں تم سے اتنی کلوز ہو گئی ہوں کہ کسی اور سے نہیں ہوں۔ آئی ڈونٹ نو وائی؟ یا شاید بی کاز سم ٹائمز آئی بیلیو دیٹ یو آر مائی سن"

بولتے بولتے ان کی آنکھیں نم ہو گئیں اور وہ کہیں کھو گئیں۔ میں چپ چاپ وہسکی کے گھونٹ اتارتا رہا۔ بڑی دیر تک ہم یونہی بیٹھے رہے، یکایک آنٹی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

"ڈیم می" وہ رو رو کر کہتی جاتی تھیں، "آئی ایم اے سوائن ڈارلنگ، آئی ایم اے بچ، آئی ایم اے ہور، آئی ایم رچیڈ، ڈارلنگ میں بہت بری عورت ہوں"

آنٹی جو ہر وقت مسکراہٹوں اور مسرتوں سے لدی رہتی تھیں، اور ہمیشہ مسکراہٹوں اور مسرتوں کی ہی تجارت کرتی تھیں وہ آنسوؤں کی چوری چوری ساخت بھی کرتی تھیں۔ میں انہیں ایسے دیکھنے لگا جیسے وہ اب تک کوئی بے گناہ تھیں۔ اور حیرت خیز طور پر انھوں نے اچانک، ایک اعتراف جرم کیا ہے، جس پر مجھے یقین نہیں آتا۔ میں ان سے پوچھنا چاہتا تھا کہ آنسوؤں سے آپ کا کیا واسطہ، لیکن پوچھا نہ گیا۔ اس قدر خوش حال اور خوش مزاج عورت کے بارے میں سوچا بھی نہ تھا کہ اسے بھی کوئی دکھ ہو گا۔ اس کی روح بھی مجروح ہو گی۔ بظاہر ہم جن کو دائمی طور پر مسرور سمجھتے ہیں وہ بھی دراصل دائمی طور پر مغموم ہی ہوتے ہیں؛ ان کا ملمع ہم کو ان کی اصلی تہہ تک پہنچنے ہی نہیں دیتا مگر اس ملمع کا چھلکا ایک دفعہ یوں نکل آتا ہے جیسے پیراکی کے پیرہن میں نیم عریاں تنومند عورت کو دیکھ کر نظر اس کا برائے نام لباس فوراً اتار دیتی ہے۔

انہی "سوائن" اور "رچیڈ" آنٹی نے مجھے ایک روز ٹیلیفون کیا۔ اس سال بمبئی میں بڑے زور کی برسات ہو رہی تھی، اور ایک تسلسل تو ایسا تھا کہ کئی روز سے بمبئی مفلوج پڑی تھی، اور زندگی معطل سی، کتابیں اور رسالے پڑھ پڑھ کر، ریڈیو سن سن کر اور خوب سو سو کر میں بڑی طرح اکتا گیا تھا۔ بس ایسے ہی موقعوں پر کنوارپن سے سخت نفرت ہونے لگتی ہے۔ اور کسی سے بھی شادی کرنے کو جی تڑپنے لگتا ہے۔ ایک دھواں دھار اور تنہائی گزیدہ شام کو چائے پیتے ہوئے میں مختلف لڑکیوں کو تصور ہی تصور میں شادی کی پیش کش کر رہا تھا کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔

"ڈارلنگ، کسی طرح چلے آؤ۔ امیڈیٹلی، ارجنٹ کام ہے"

"آنٹی آپ کا حکم سر آنکھوں پر، مگر راستے میں پانی بھرا پڑا ہے۔ تین چار روز سے کار یونہی کھڑی ہے۔ پتہ نہیں بیٹری کام بھی کر رہی ہے یا نہیں۔"

"میں اپنی کار بھیج دیتی ہوں"

جب میں آنٹی کے ہاں پہنچا تو ایک لڑکی ان کے پاس بیٹھی تھی، مجھے ایک نظر دیکھ کر اپنی بڑی بڑی پلکوں کے خلاف

اس نے اپنی غزالی آنکھوں پر ڈال دیئے۔

"ڈارلنگ، ان سے ملو، مس پاربتی مصرا" پھر آنٹی نے اسکو میرا نام بتایا۔ اس نے ہاتھ جوڑ دیئے، میں نے بھی جواب میں نمستے کی۔

"ڈارلنگ تم ان سے شادی کرلو۔"

بادل بہت زور سے گرجے اور بجلی چونھیا گئی۔

"میں کل ہی رجسٹرار کو انفارم کردوں گی۔" آنٹی مسلسل برس رہی تھیں۔

"پہلے میں ماں باپ کو خط لکھ کر اجازت تو لے لوں۔" میں نے مورچہ سنبھالا۔ "آخر وہ بھی تو شریک ہونے شادی میں۔"

"ڈیم اِٹ۔ یہ ہندوستانی ماں باپ بھی پکیولر چیز ہیں۔ میرج ہوگی اولاد کی، اور سلکشن ہوگی ان کی۔ تیا کہتی ہو لا ڈارلنگ تم اپنی مرضی کی شادی میری سلکشن سے کیوں نہیں کرلیتے۔"

میں اور پاربتی سکوٹے بغیر نہ رہ سکے۔

"بات یہ ہے آنٹی آپ میرے گھر کی پکیولر حالت اور مجبوریاں نہیں جانتیں۔۔۔۔"

"میں جاننا بھی نہیں چاہتی۔" آنٹی نے بات کاٹ کر کہا۔ "میں تو صرف یہ چاہتی ہوں کہ تم اس لیڈی سے شادی کرلو۔ شی از سو سویٹ اینڈ چارمنگ اینڈ کیوٹ۔" وہ پاربتی کو یوں دیکھنے لگیں جیسے وہ ان ہی کی اپنی تخلیق تھی۔ "پور پاربتی۔" پھر میری طرف رخ کیا۔ "بچاری بڑی بدنصیب ہے، یو دل سمپلی کرائی ایٹ ہر مس فارچون۔ بڑی اچھی فیملی کی ہے۔ گریجویٹ ہے۔ کلچرڈ ہے۔ اپنے لوائے فرینڈ سے ایلوپ کرکے آگئی اور یہاں آکے اس باسٹرڈ نے اسے بی ٹرے کردیا۔ کہنے لگا شادی کی ایک کنڈیشن ہے فلموں میں کام کرو، پھر پاربتی کو ایکٹری کرنا پڑا۔ جینس جو تھی۔ پھر کیا ہوا یو نو؟ آل دوز ڈرٹی پروڈیوسرز اور اسٹنٹنگ ڈائرکٹرز فرینڈز وغیرہ وغیرہ۔ پھر وہ بھی دغا دے گئے۔ کوئی کہنے لگا چین نکیلی ہے۔ کوئی بولا واکس مردانہ ہے۔ کسی کی اوپینین تھی کہ آئی فورہیڈ ہے۔ اینڈ سو آن۔ اینڈ سو فورتھ۔ اور پتہ ہے اس کے سن آف اے گن لوائے فرینڈ نے کیا کہا؟" یہاں تک آتے آتے آنٹی کے لہجے میں غضب ناک آثار چڑھاؤ پیدا ہوگیا تھا۔ یہاں وہ ایک ثانیے کے لئے رکیں۔ میری نظر فطری طور پر پاربتی پر گئی۔ اور اسی وقت اس کی نظر جو مجھ پر تھی جھک گئی۔ شرم کے مارے اس کا چہرہ زرد ہوا جارہا تھا۔ میں نے اسکو ہراسانی سے بچانے کی خاطر آنٹی کی طرف دیکھا جو کہہ رہی تھیں "ہی آسکڈ ہر ٹو ڈو پروسٹی ٹیوشن!" آنٹی کے لہجے میں بڑی تلخی تھی۔

تھوڑی دیر سکوت طاری رہا۔ اس سکوت کی چٹان تلے تین ذہنوں کی ہلچل تھی۔

"دیٹ از وائی شی از ہیر۔ لیکن یہ بچاری اس پروفیشن سے سخت نفرت کرتی ہے۔ تمہاری طرح۔ اینڈ شی ٹونڈ کہ کوئی بھی شریف آدمی اس سے شادی کرلے تو شی از ریڈی۔ میں نے سوچا تم سے اچھا پارٹنر کو کون ہسبینڈ مل سکتا ہے، ڈارلنگ۔ بیسٹر

تھنک اوور اٹ :

میری فکر و فہم خلاؤں سے بھرپور ہو گئی۔ اس طرح مجھے خاموش دیکھ کر آنٹی کو حیرت سی ہو رہی تھی۔ انھوں نے یہ یقین کر لیا تھا کہ میں ان کے حکم سے انکار نہیں کروں گا۔ پاربتی معمولی طور پر مایوس دکھائی دیتی تھی۔ گویا اسے یقین تھا کہ میں اس پیشکش کو ٹھکرا نہ کروں گا۔

"کیا سوچ رہے ہو ڈارلنگ ؟" آنٹی نے پوچھنے کے انداز میں جیسے کہا کہ آخر اس میں سوچنے کی بات ہی کیا ہے، ہاں کر دو ورنہ اتنی اچھی لڑکی پھر نہ ملے گی۔

لڑکی بہت اچھی تھی اس میں تو کوئی شک نہیں تھا، لیکن دراصل میں شادی کرنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ ایک تو اس لئے کہ میرے آمد و خرچ کے موازنے میں اور ذمہ داریوں کی فہرست میں ابھی اس کی بالکل گنجائش نہ تھی۔ دوسرے اس لئے کہ جس ڈھب سے میری زندگی گذر رہی تھی میں اس میں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں چاہتا تھا۔ تیسرے یہ کہ ایسے ماضی رکھنے والی لڑکی کو میں بیوی بنانے کے لئے ہرگز تیار نہ تھا۔

"آئی ایم سو ساری آنٹی۔ آئی کانٹ"

آنٹی کو بڑی سخت مایوسی ہوئی۔ انھوں نے بڑی ہمدردی سے پاربتی کو دیکھا اور اندر چلی گئیں۔ پاربتی کے آنسو نکل پڑے مجھے بڑا افسوس ہوا مگر میں مجبور تھا۔ کچھ دیر بعد آنٹی ایک سفید لفافہ لئے آ گئیں اور پاربتی کے حوالے کرتی ہوئی بولیں۔

"تمہارا ایک ویک کا خرچ"

"نو، تھینکس آنٹی" پاربتی نے بڑی خودداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا

آنٹی نے بہت اصرار کیا لیکن اس کے انکار کو اپنی جگہ سے جنبش نہ ہوئی۔

"ڈونٹ گیو اپ ہوپ" جب وہ جانے لگی تو آنٹی نے اس سے کہا "مجھ سے ملتی رہنا کوئی نہ کوئی راستہ نکل آئے گا"

"پروسٹی ٹیوشن کے لئے میرے پاس سیکڑوں لڑکیاں آئیں" اس کے جانے کے بعد آنٹی مجھ سے بولیں۔ "اونلی دس ون اس کے لئے آگر بھی یہ نہیں کرنا چاہتی۔ سو اسٹرینج"

دوسرے دن شام کو آنٹی نے پھر فون کیا۔

"ہلو ڈارلنگ، یو نو؟ پاربتی نے سوسائیڈ کر لی۔ ایوننگ نیوز میں خبر آئی ہے۔ آئی ڈونٹ نو کیسے لوگ اتنے جذباتی ہو جاتے ہیں۔ مرنے کو کیسے تیار ہو جاتے ہیں۔ جسٹ امیجن! وہ پاربتی جس کے ساتھ کل شام کو تم میرے پاس بیٹھے تھے، اس نے آج خود اپنی جان لے لی۔ کانٹ بیلیو۔ میری سمجھ میں نہیں آتا یہ کیا مسٹری ہے۔ سفرنگ اور ڈیتھ کیوں ہوتی ہے اور کہاں سے آتی ہے۔ ڈارلنگ اگر دنیا سے یہ ختم ہو جائیں تو دنیا کتنی بیوٹی فل اور کلرفل بن جائے۔ کیا خیال ہے تمہارا؟"

"آنٹی ہر ایک کی زندگی اور موت اس کا اپنا تجربہ ہے جس میں کوئی دوسرا شریک ہو ہی نہیں سکتا..."

"پارٹیوں کی جگہ میں ہوتی تو کبھی سو رانڈ نہیں کرتی" آنٹی نے میری بات کاٹی اور فون رکھ دیا۔

قہقہوں کے ایک شور سے میں چونکا۔ مہمانوں کا آخری گروہ رخصت ہو رہا تھا۔ رات کے دو بج چکے تھے۔ آنٹی اور ان کے ہی کے بارے میں سوچتے سمجھنے میں ذہنی طور پر ایسا گم ہو گیا تھا کہ مجھے پتہ ہی نہ چلا کب ان کی سالگرہ کی دعوت ختم ہوئی۔ آنٹی میرے پاس آئیں۔

"کم ان ٹو مائی روم ڈارلنگ"

ہم دونوں ان کے کمرے میں پہنچے۔ مجھے انہوں نے ایک صوفے پر بٹھا دیا۔ اور خود میرے سامنے کھڑی ہو گئیں۔ مسکراتے ہوئے بڑے پیار سے مجھے دیکھتی رہیں۔ میری پیشانی کو بوسہ دیا اور دونوں ہاتھوں سے میرا چہرہ تھام کر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیر تک دیکھتی رہیں۔ ان کی آنکھوں میں میرے لئے جو جذبات چھلک رہے تھے میں ان کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ اپنے آپ کو گویا میری گمشدہ ماں محسوس کر رہی تھیں۔ مجھے یقین ہو چلا کہ آنٹی جو کبھی کبھی پچاس سے زیادہ کی زندگی پر خوف زدہ ہو جاتی تھیں اب پچاس ہزار برس جینے سے بھی پیچھے نہیں ہٹیں گی۔

"ڈیئر پریزنٹ تم ایک ہی آدمی ہو جسے میں اپنا سمجھتی ہوں۔ بائی دی وے تم میرے بارے میں کافی جانتے ہو لیکن بہت زیادہ نہیں۔"

"آنٹی اگر آپ اپنے بچپن اور جوانی کے بارے میں۔۔۔۔"

"رائیٹروں کی ذات بڑی ان کوئیزیٹو ہوتی ہے" آنٹی نے مسکرا کر کہا۔ "مجھے پتہ تھا تم ایک نہ ایک روز ضرور پوچھو گے۔ خیر۔ تمہاری کیوریاسٹی کے لئے میں بہت ہی شارٹ کر کے بتاؤں گی۔ بی کاز یو آر ڈیئر ٹو می۔ آئی ایم پراؤڈ ٹو ہیو این ان سیلفش فرینڈ لائک یو۔"

"تھینک یو آنٹی" میں نے اپنی تعریف سے خوش ہو کر کہا۔

"دیکھو۔ یہ اور بات ہے کہ تمہارے اور میرے آئیڈیاز کبھی نہیں ملے۔ بٹ یو آر ڈفرنٹ کیریکٹر۔" آنٹی نے دو پیگ بنائے ایک میرے سامنے رکھا۔ ایک سگریٹ مجھے دیا اور ایک خود سلگایا۔ گہرے کش کا دھواں چھوڑتے ہوئے کہنے لگیں "کسی کو میرا پاسٹ کچھ معلوم نہیں۔ میں گجرانوالہ شہر کے ایک فار آف ولیج میں آج سے پورے چھپن برس پہلے پیدا ہوئی تھی۔ آئی واز بارن اے مسلم۔ آفٹر برتھ میرے کانوں میں اذان دی گئی اور اذان دینا میرے فادر کا پیشہ تھا۔ میں بڑی منتوں مرادوں اور ان سالوں آف نائن سنز کے بعد پیدا ہوئی تھی۔ اسی روز شام کو مائی مدر ڈائیڈ۔ دن آئی واز برائٹ اپ بائی اے اسٹیپ مدر۔ جب ہوش سنبھالا ظلم اور تاریکی کی گود میں اپنے آپ کو پایا۔ چار پانچ سال کی تھی کہ فادر آلسو پاسڈ اوے۔ پھر ایک جاگیردار نے مجھے خرید لیا۔ وہاں بھی دن رات بیٹنگ ہوتی تھی۔ ڈرٹی ہنڈی برتن، جھاڑو، چولہا اور سر و شکن چھپنے بھرتے جس کا جی چاہتا اکثر صاف کرتا رہتا۔ سنتے ہوئے کھانے، ڈسٹی کو دھونے، کبھی وہ بیمار، کبھی وہ ڈیتھ پتہ نہیں کیسے

جی گئی اور کیوں جی گئی۔ اوہو ـــ ڈیم می۔ میں سب بے کار ڈی ٹیلس میں جا رہی ہوں۔

"ایسے ہی سنائیے آنٹی" میں نے مچل کر کہا۔

"نو، نو، نیور" آنٹی نے اسکاچ کا گھونٹ لیا۔ "خواہ مخواہ آئی ایم گٹنگ اموشنل فار دیٹ ہارڈ پاسٹ، فل آف سفرنگ۔ جب میں جوان ہوئی تو میری رچ لس بیوٹی میرے لئے بلا بن گئی۔ اس کے لئے میں نے بہت دکھ جھیلے، بڑی سخت اور منحوس بیماریوں سے بچ نکلی، کسی کے ساتھ بھاگ گئی۔ کسی کی وائف بنی۔ محبت بھی کی، رومانس بھی کیا، پروسٹی ٹیوشن بھی کیا، گندے سے گندے اور گھٹیا سے گھٹیا مردوں کے پاس رہی جن میں اسمگلرز، پک پاکٹس، موالیز، اور بیسں بھی تھے۔ اچھے سے اچھے مردوں کے ساتھ بھی رہی جن میں جنادری اسکالرز، آرٹسٹس، کیونٹ، سوشلسٹ، کانگریسی عیاشی کے ایک سے ایک بڑھ کر خلیفہ کو انٹرٹین کیا۔ بہت رچ مل اونرز، گورنمنٹ آفیسرز، اور نہ جانے کس کس کے بستر گرم کئے۔ سولہ بچے گرائے، دو دفعہ وومب میں ٹیومر ہوا۔ آپریشن کروائے۔ اس بار اگر ہوگا تو کینسری ہوگا"

وہسکی کا ایک اور گھونٹ، سگریٹ کا ایک اور کش لے کر آنٹی نے سلسلۂ بیان جاری رکھا۔

"وَن فائن مارننگ اِٹ ڈانڈ اپان می کہ دنیاداروں سے جوتے کھا کر جینے سے یہ بہتر ہے کہ دنیا کو جوتے مار کے جیا جائے۔ دِن آئی مٹ دتھ ٹری منڈس سکسس۔ میری لائف جو ایک ویران ڈزرٹ تھی، میں نے اس میں ایک نہایت ہی پُرفریب اور خوب صورت سراب کری ایٹ کیا اور یہ باسٹرڈ مرد دوڑ پڑے۔ ناؤ آئی ہیو گاٹ اوری تھنگ، اٹ آف مانیٹری سکیورٹی، اینڈ سوشل اسٹیٹس"

پھر ٹھنڈی سانس بھر کر بولیں۔

"بس ایک ڈر ہے، اگر یہ سب کچھ چھن گیا تو کیا ہوگا۔ اس عمر میں کہاں جاؤں گی، کیا کروں گی۔ میرا تو کوئی نہیں ہے۔ یہ سفرنگ کس طرح ہوگی۔ اسی لئے تو میں لنگرنگ لائف، اسٹرگل فار اگزسٹنس اور ڈی لیڈ ڈیتھ سے ڈرتی ہوں"

"مگر یہ تو کسی کے بس کی بات نہیں آنٹی"

"یو آر ٹو فیلسٹ۔ پھر وہی ڈفرنس آف اوپی نین کی بات آگئی"

"تو پھر بتائیے، سفرنگ اور ڈی لیڈ ڈیتھ کا خود آپ کے خیال میں کیا علاج ہے؟"

آنٹی نے معنی خیز نظروں سے مجھے دیکھا اور طنز سے مسکرائیں۔ جیسے وہ کوئی بہت ہی پختہ کار ہستی اور میں ان کے مقابلے میں بڑا ہی نادان تھا۔

"لوہے کو لوہا کاٹتا ہے۔ زہر کا علاج زہر سے ہی ہو سکتا ہے" آنٹی نے ایش ٹرے میں سگریٹ بجھاتے ہوئے کہا!

ان کے اس جواب سے میری تشفی نہیں ہوئی اور میں سوچ میں پڑ گیا۔

"اوکے۔ گڈ نائٹ مائی بوائے۔" آنٹی کھڑکی بھیڑنے لگیں۔

"مگر آنٹی ......"

"آئی ایم ٹو نائٹرڈ ناؤ۔ سلیپنگ پلز کھاکر سورہوں گی۔"

میں جانے کے لئے اٹھا اور ان سے ہاتھ ملایا۔

"گڈ بائی۔" اور آنٹی نے میرے گال چومے۔

راستہ بھر میں ان کی نامکمل اور غیر تشفی بخش گفتگو سے جھنجھلاتا رہا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا، لباس تبدیل کرکے اور روشنی بجھاکر بڑی دیر تک بستر پر پڑے پڑے سوچتا رہا۔ نہ جانے کب آنکھ لگ گئی۔

صبح کوئی نو بجے ٹیلیفون نے شور مچاکر مجھے جگایا۔

خبر ملی کہ آنٹی نے رات کو بہت سی خواب آور گولیاں کھالی تھیں۔

فیض احمد فیض

انقلابِ رُوس

مرغِ بسمل کے مانند شب تلملائی
اُفق تا اُفق
صبحِ محشر کی پہلی کرن جگمگائی
تو تاریک آنکھوں سے بوسیدہ پردے ہٹائے گئے
دل جلائے گئے
طبق در طبق
آسمانوں کے در
یوں کھلے ہفت افلاک آئینہ سا ہو گئے
شرق تا غرب سب قید خانوں کے در
آج وا ہو گئے
قصرِ جمہور کی طرحِ نَو کے لئے آج نقشِ کہن
سب مٹائے گئے
سینۂ وقت سے سارے خونیں کفن
آج کے دن سلامت اُٹھائے گئے
آج پائے غلاماں میں زنجیر پا
ایسے چھنکی کہ بانگِ درا بن گئی
دستِ مظلوم میں ہتھکڑی کی کڑی
ایسے چمکی کہ تیغِ قضا بن گئی

ماسکو - ۵ر نومبر ۶۷ء

محمد مہدی

انقلابِ روس میں شامل ہونے والے چند ہندستانی

ہندوستان کی سیاسی تعلیم کا یہ ایک دلچسپ واقعہ ہے کہ جو لوگ ترکی میں خلافت کو بچانے کے لئے جہاد پر کمربستہ ہو کر ملک سے نکلے تھے ان میں کچھ انقلابِ روس کو بچانے میں شامل ہو گئے۔

۱۹۲۰ء میں خلافت تحریک پورے شباب پر تھی۔ شاہ افغانستان امان اللہ خان نے ایک فرمان شائع کیا تھا جس میں ہندوستانی مسلمانوں کو دعوت دی گئی تھی کہ وہ ہجرت کر کے افغانستان آجائیں۔ نوجوان ہندی مسلمان جوق در جوق افغانستان کی طرف روانہ ہونے لگے۔ افغانستان میں ان سب ہی کو بڑی مایوسی کا سامنا کرنا۔ خلافت کو بچانے کا جو جوش و ولولہ ہندوستانی مسلمانوں میں تھا وہ افغانستان میں سرے سے مفقود تھا۔ اب جو وہاں پہنچے تو دنگ ہی الگ پایا۔ ایک مہاجر رفیق احمد نے امان اللہ خاں سے ملاقات کا ذکر یوں کیا ہے:

"مجھے امیر کے اجلاس کی طرف لے جایا گیا.... امیر کے سامنے ایک وسیع میز تھی۔ اس لئے مصافحہ کے لئے ان کو کرسی سے اٹھنا پڑا۔ راستے کی صعوبتوں اور تکلیفوں کا رسمی تذکرہ کر کے مختصر لیکن پُرجوش تقریر کی.... امیر خاموش ہوئے تو میں نے امیر کی مہربانی اور ان کے دلی جذبات کا شکریہ ادا کیا اور دعا پر اپنی تقریر ختم کی۔ امیر نے سب کو رخصت کرتے ہوئے فرمایا کہ آپ لوگوں کے قیام کا انتظام جبل السراج میں کیا گیا ہے۔ وہاں آپ کو سکون ملے گا۔ اور آپ لوگ مطمئن رہیں ہر شخص کو اس کی اہلیت کے مطابق ملازمت دی جائے گی اور اگر کاشتکاری کرنا پسند کریں تو اس کا بھی انتظام کر دیا جائے گا۔ دستکاروں کو بھی خاص مراعات دی جائیں گی۔ امیر کے ان آخری الفاظ نے ہم کو خوابِ غفلت سے چونکا دیا۔ کیونکہ امیر صاحب کے وہ بیانات جو ہندوستانی اخباروں میں شائع ہو رہے تھے کہ جب تک خلافتِ عثمانی کا فیصلہ مسلمانوں کے منشاء کے مطابق نہ ہوگا۔ امیر کی تلوار نیام میں نہ جائے گی۔ سب باطل ہو گئے تھے۔ افغانی دوستوں کے پروپیگنڈے کی قلعی تو پہلے ہی کھل چکی تھی۔ رہی سہی امید پر امیر صاحب نے پانی پھیر دیا۔ میں نے عرض کیا کہ ہم لوگوں نے کاشتکاری کے لئے اپنے وطن کو نہیں چھوڑا ہے۔ ہم جہاد کی غرض سے آئے ہیں اور جس جگہ جہاد میسر ہوگا وہاں چلے جائیں گے۔ امیر میرے اس جملے پر مسکرائے۔ میں نے پھر عرض کیا کہ جو لوگ ملازمت وغیرہ کے لئے آئے ہیں ان کو جبل السراج مبارک ہو۔ میں

کچھ دن کابل میں رہنا چاہتا ہوں۔ امیر نے فرمایا کہ نہیں کچھ عرصے کے لئے تم کو جبل السراج جانا ضروری ہے۔ محمد خاں جو دلّہ سے ہمارے ساتھ ہو گیا تھا۔ اس نے کہا کہ "امیر آپ ہم کو چاہے توپ سے باندھ دیں یا ہاتھی کے پیر سے لیکن ہم جبل السراج ہرگز نہ جائیں گے۔

افغانستان کے رویّہ سے مایوس ہونے کے بعد مہاجرین کے سامنے سوال پیدا ہوا کہ اب کیا کیا جائے۔ عام طور پر فیصلہ ہوا کہ روس ہوتے ہوئے اناطولیہ جائیں اور انگریزوں کے خلاف جہاد کریں۔

لیکن افغانستان میں قیام کے دوران ہی ان مہاجرین کو پتہ چلا کہ پڑوسی ملک روس میں ایک نئے قسم کا انقلاب رونما ہوا ہے اور اب وہاں مزدوروں اور کسانوں کی حکومت قائم ہو گئی ہے۔ افغانستان سے بددل ہو کر دو سو آدمیوں پر مشتمل ایک قافلہ روس کی طرف روانہ ہوا۔ افغانستان کی حکومت نے روس جانے کی اجازت نہ دی تو یہ قافلہ حکومت افغانستان کی مرضی کے خلاف بلکہ اس کی حکم عدولی کر کے کوہ ہندوکش کو پار کر کے روس کی طرف چل کھڑا ہوا۔

راستے کی صعوبتیں برداشت کرتا ہوا آخر یہ قافلہ ترمذ پہنچا جو اب ازبکستان میں شامل ہے۔ اس وقت تک وہاں سرخ فوج کا قبضہ ہو چکا تھا۔ ہندوستانیوں کے ساتھ یہاں کیا برتاؤ کیا گیا۔ اس کا قصہ رفیق احمد کی زبانی سنئے :۔

"کچھ دیر بعد روسی قلعہ سے دو روسی افسر اور ایک مترجم آئے اور دریافت حال کر کے یہ کہہ گئے کہ آپ لوگ یہاں جمع ہو جائیں اور سرائے کے اندر ہی رہیں چنانچہ جو لوگ بازار میں گھوم رہے تھے، ان کو بلا لیا گیا۔ قلعہ میں ہمارے استقبال کی شاندار تیاریاں ہو رہی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد بینڈ کی آواز سنائی دی۔ آگے آگے بینڈ اس کے پیچھے سُرخ فوج کا ایک دستہ۔ اس کے پیچھے سوار اور گاڑیاں۔ فوج کے دستے نے سرائے کے دروازے سے دور تک صف باندھی۔ ہم سب لوگ باہر آ چکے تھے۔ ہمارے بعض ساتھیوں کو استقبال کا علم نہ تھا۔ اس لئے یہ بات اُن کی سمجھ میں نہیں آئی کہ یہ سب کچھ کیا اور کیوں ہو رہا ہے۔ بعض لوگوں کو خیال ہوا کہ چونکہ ہم بغیر پاسپورٹ کے داخل ہوئے ہیں۔ اس لئے اب شائد گرفتار کر لئے جائیں گے۔ لیکن فوجی کمانڈر نے ہم کو دیکھ کر پہلے ہی اندازہ لگا لیا تھا کہ ہم ہندوستانی انقلابی ہیں۔ یہ غالباً جولائی ۱۹۲۰ء کا واقعہ ہے۔ کمانڈر نے کاشن دیا۔ بینڈ نے سلامی بجائی اور فوج نے گارڈ آف آنر دیا۔ روسی کمانڈر نے ایک تقریر کی۔ جس کا ترجمہ ایک بخاری نے کیا۔ تقریر میں کہا گیا تھا "روس کے محنت کش عوام نے انقلاب کے ذریعہ جبر و استبداد کی زنجیروں کو توڑ دیا ہے اور دنیا بھر کے مظلوموں اور محنت کشوں کے لئے اپنے ملک کے دروازے کھول دئے ہیں۔ یہاں کی دولت، زمین، مکان ساری دنیا کے محنت کشوں کی ملکیت ہے۔ یہاں جب تک آپ رہیں گے۔ آپ کو وہی حقوق حاصل ہوں گے جو یہاں کے باشندوں کو ہیں۔ آپ اپنے ملک کی آزادی کے لئے جدوجہد کریں۔ یہاں کے کسانوں اور محنت کشوں کو آپ اپنے دوش بدوش دیکھیں گے۔ ... آج سے آپ حکومت روس کے مہمان بھی ہیں اور اس کے شہری بھی ..... "

تقریر کے بعد جلوس بنا اور اس شان سے چلا کہ " آگے آگے بینڈ، ان کے پیچھے کچھ فوجی افسران، ان کے پیچھے ہمارا قافلہ،

اور قافلے کے پیچھے سرخ فوج کا دستہ۔ ان کے پیچھے سامان کی گاڑیاں ... قافلے کا حال یہ تھا کہ کپڑے بوسیدہ اور کیفیت کسی کے پیر میں ایک جوتا اور ایک ٹوٹا ہوا جوتا ہاتھ میں کوئی بالکل ہی ننگے پاؤں اور ٹوٹے ہوئے جوتے ہاتھ میں۔ تمام کپڑے جابجا پھٹے ہوئے جس سے جسم نظر آتا تھا۔ فرط شرمندگی سے نظر اونچی نہیں ہوتی تھی اور مخلوق تھی کہ تماشے کے لئے ٹوٹی پڑ رہی تھی۔ عورتیں اور بچے نعرے لگا رہے تھے کوئی ترکی زبان میں، کوئی روسی زبان میں۔ معلوم نہیں ان نعروں کا مطلب کیا تھا۔ وہ ہم کو ہندوستانی انقلابی سمجھ رہے تھے۔ ڈیڑھ میل کی مسافت طے کرنے کے بعد ہم فوجی بیرکوں کے قریب پہنچے۔ ایک بیرک میں ہم کو جانے کے لئے کہا گیا۔ لوگ، اپنی حالت کو چھپانے کے لئے بھاگ بھاگ کر بیرک میں داخل ہوئے۔ اندر جاکر دیکھا کہ بیرک میں دو طرفہ پلنگ بچھے ہوئے ہیں۔ کسی پر گدّہ اور کسی پر قالین بچھا ہوا ہے۔ ایک جانب دو بڑے بڑے سماوار گرم ہو رہے ہیں۔ بورے کشمش اور تمباکو کے رکھے ہوئے ہیں۔ بخاری باورچی دُنبہ ذبح کر کے کھانا پکا رہے ہیں۔ میزوں پر کانچ کے گلاس چائے پینے کے لئے رکھے ہوئے ہیں۔ روشنی اور پانی کا انتظام بھی معقول تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک سرخ فوج کا افسر اپنے ہمراہ جوتے سینے والے اور دھوبی اور درزی کو ساتھ لے کر آیا۔ جس کے ساتھ ترجمان بھی تھا۔ اس نے کہا کہ یہ سرحدی مقام ہے آپ ہمیں معاف کریں کہ یہاں آپ کی تواضع آپ کے شایان شان نہیں ہو سکتی۔ یہ لوگ موجود ہیں۔ جن لوگوں کو کپڑوں کی ضرورت ہو اپنا ناپ دے دیں اور موچی سے اپنے جوتوں کی مرمت کرالیں اور دھوبی سے کپڑے دھلوالیں .... ''

مہاجرین میں کچھ لوگ تھے جو اناطولیہ جانے پر بضد تھے کہ وہاں جاکر جہاد پر کمر کسیں گے اور کچھ ایسے تھے جو روس میں رہ کر یہاں کے حالات دیکھنا چاہتے تھے۔ ترمذ میں چند دن قیام کے بعد یہ قافلہ دو کشتیوں کے ذریعہ روانہ ہوا۔ لیکن ابھی کشتیاں کچھ ہی دور گئی ہوں گی کہ انقلاب دشمن ترکمانوں کے ہاتھ پڑ گئیں اور مہاجرین قید کر لئے گئے۔ اب یہ لاکھ سمجھاتے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں۔ لیکن کون سنتا ہے۔ سارا سامان لوٹ لیا گیا اور ۸۰ آدمیوں کے اس قافلے کو ایک سرائے میں قید کر دیا گیا۔ ایک ہفتے بعد یہ قافلہ پھر زیر حراست روانہ ہوا۔ سرائے میں ہم سے بیشتر لوگ نماز اور قرآن بھی پڑھتے تھے تو یہ لوگ (ترکمان) آپس میں کہتے کہ یہ دیکھو یہ کافر نماز اور قرآن بھی پڑھتے ہیں۔ فیروز الدین منصور اکثر ان لوگوں سے سوال کرتا کہ کیا تم مسلمان ہو تو وہ جواب دیتے الحمدللہ۔ وہ کہتا کہ اچھا کلمہ تو پڑھو وہ کہتے کہ کلمہ ہمارے مُلّا جانتے ہیں۔ ہم نہیں جانتے۔''

"تقریباً دو بجے ہوں گے کہ ہمارا قافلہ ایسی جگہ پہنچا جہاں کافی وسیع میدان تھا اور درخت تھے۔ وہ قطعۂ زمین جس میں ہم کو کھڑا کیا گیا تھا۔ چاروں طرف ٹیلوں سے گھرا ہوا تھا ... اس نواح کے کلاں بتر (بڑے لیڈر) آپس میں مشورہ کر رہے تھے اور طے کیا گیا کہ ان لوگوں کو گولی سے اڑا دیا جائے۔ تمام ترکمان ان ٹیلوں پر بندوقیں لے کر جم گئے۔ بعض لوگ یہ مشورہ دے رہے تھے کہ جب مرنا ہے تو مردانگی سے مرو۔ یہ کلاں بتر جو تمہارے پاس کھڑے مشورہ کر رہے ہیں ہمارے گھیرے سے نہ نکلنے پائیں۔ جب تک یہ یہاں ہیں گولی نہیں چل سکتی۔ اس لئے ہر شخص کو

چاہئے کہ وہ ان کلاں تبروں سے لپٹ پڑے۔ ابھی یہ لوگ جلسہ ختم کر کے علاحدہ ہونا چاہتے تھے تاکہ ان لوگوں کو جو مورچہ بنائے ہوئے رائفل علم کئے ہوئے بیٹھے تھے فائر کرنے کا حکم دیں کہ عین اسی وقت ایک بوڑھا شخص سفید لباس میں ملبوس سفید گھوڑے پر سوار بے تحاشا گھوڑے کو دوڑاتا ہوا آیا۔ سب کلاں تبر تعظیم کے لئے آگے بڑھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ بوڑھے کو ان کا ارادہ معلوم ہو گیا تھا۔ اس نے کہا کہ ان لوگوں کے پاس حکومت افغانستان کا ویزا ہے اور یہ رعایا افغانستان ہیں اگر ان کو ہلاک کر دیا گیا تو حکومت افغانستان ہم پر حملہ کر دے گی۔ ادھر سرخ فوج سے ہم لڑ رہے ہیں۔ دو طرفہ حملے سے ہم مارے جائیں گے۔ اس لئے فی الحال ان کو قید رکھنا ہی مناسب ہے۔ سب کلاں بتروں کی سمجھ میں یہ بات آگئی اس کے بعد وہی بوڑھا شخص گھوڑے پر سوار ہو کر اس جانب کو گیا جہاں ترکمان مورچہ بنائے ہوئے تھے۔ اس نے کوڑا ہلا کر دو ایک کو مارا ہی تھا کہ سب غازی بھاگ کھڑے ہوئے۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

چند ہفتے بعد جب سرخ فوج نے انقلاب دشمنوں پر حملہ کیا تو ہندوستانی مہاجرین کو آزادی نصیب ہوئی۔ لیکن اس حالت میں کہ "ایک ہفتے کے اندر ہمارے ۶۹ ساتھی جمع ہو چکے تھے باقی گیارہ قتل کر دیئے گئے تھے جن کے جسم اس حالت میں ملے کہ ہاتھ پیر، انگلیاں غرض ہر عضو کٹا ہوا الگ الگ تھا"

یہ لٹا ہوا قافلہ پھر سرخ فوج کی پناہ میں پہنچا۔ اس بار پناہ گاہ کرکی کا قلعہ تھی جس پر سرخ فوج کا قبضہ ہو چکا تھا۔ لیکن قلعہ انقلاب دشمنوں نے گھیر رکھا تھا۔ یہاں کا قصہ شوکت عثمانی سے سنئے جو خود بھی اس وقت کرکی کے قلعہ میں موجود تھے۔

"ہمیں معلوم ہوا کہ ترکمانوں نے شہر کو پھر گھیر لیا ہے۔ پانچ ہزار شہر کے سامنے تھے جدھر قلعہ تھا اور تین ہزار دریا کے پار دوسری طرف تھے اور اس انتظار میں تھے کہ یہ پانچ ہزار ترکمان جس وقت اشارہ کریں یہ لوگ دریا پار سے حملہ کر دیں۔ اس کے برعکس بخاری اور روسی فوجیوں کی تعداد صرف تین ہزار تھی۔ شہر بڑا تھا جس کی آبادی کوئی بیس ہزار ہوگی لیکن لوگوں کے رویّے کے متعلق کچھ کہنا آسان نہ تھا کیونکہ ملّا اور ان کے ایجنٹ امیر بخارا انتہائی رجعت پرستی کی تائید میں پروپیگنڈا کر رہے تھے۔

"دریا کے محاذ کی حفاظت کرنا کافی دلچسپ فوجی مسئلہ تھا۔۔۔ لیکن ہم کیا کر سکتے تھے؟ ہم صرف ۶۰ لوگ تھے۔ لیکن دوسرا راستہ تھا بھی کیا؟ یا تو ہم لڑتے ہوئے مارے جائیں یا شہر کو اپنی آنکھوں کے سامنے لٹتا دیکھیں۔ اور پھر ترکمانوں کے ہاتھ پڑ کر بے عزتی اور بزدلی کی موت مریں۔ اور پھر بخاری فوجی جس مقصد کے لئے لڑ رہے تھے کیا وہ دنیا بھر کے آزادی پسندوں کا مقصد نہیں تھا۔ ہم وہاں موجود تھے اور چاہتے تھے کہ بخاری سپاہیوں پر جو بیتے اس میں ہم بھی شریک ہوں۔ چنانچہ ہم نے ایک چھوٹا سا فوجی دستہ بنا لیا اور صدر کو اطلاع دے دی کہ ہم خون کے آخری قطرے تک ترکمانوں کے خلاف لڑیں گے۔ ہمارے جوش اور ولولے کا روسیوں پر بھی اچھا اثر پڑا۔ انھیں احساس ہوا کہ وہ اکیلے

رفیق احمد۔ ناقابل فراموش سفر (غیر مطبوعہ)

نہیں ہیں۔ ہم نے پیش کش کی کہ دریا کے محاذ کی حفاظت ہم کریں گے جس کا طول پانچ میل کے قریب تھا۔۔۔ چنانچہ ہمیں بندوقیں وغیرہ سے دی گئیں۔"

جو لوگ اناطولیہ جانے پر کمر باندھے ہوئے تھے انہوں نے اس فیصلے کی مخالفت ہی نہیں کی بلکہ اس کا مذاق بھی اڑایا لیکن ۳۶ ہندوستانیوں کے اس دستے نے دو حصوں میں بٹ کر دریا کے اس محاذ کی حفاظت شروع کر دی۔

رات کو پہرہ دیتے ہوئے ہندوستانی مہاجرین نے دو ترکمانوں کو مشتبہ حالت میں گرفتار کر لیا۔ تلاشی لینے پر ایک خط برآمد ہوا۔ اس پر اس شخص کو گرفتار کر کے صدر کے سامنے پیش کیا گیا۔ ایک بخاری کمیسار نے خط کا ترجمہ انھیں سنایا اور ترجمہ سنتے ہی صدر سیدھے ہمارے پاس پہنچے اور گلے ملنے لگے۔ اب تو نعرے بلند ہونے لگے "ہندوستانی ساتھی زندہ باد" "ہندوستان کی آزادی زندہ باد" "کرکی کے محافظ زندہ باد۔"

ہم حیرت سے ان لوگوں کا منھ دیکھ رہے تھے۔ بخاری کمیسار نے ہمیں بتایا کہ خط ایک رجعت پسند تنظیم نے لکھا تھا اور مضمون اس کا اس قسم کا تھا۔

تم تین ہزار کی تعداد میں ہو اور یہاں صرف ۳۶ ہندوستانی نفر ہیں۔ تمھیں شرم آنی چاہیئے کہ تم خوف زدہ ہو گئے اور چند ہندوستانیوں کی فوجی سمجھ بوجھ نے تمھاری بہادری پر فتح پائی۔ اٹھو ہم بالکل تیار ہیں۔ ہندوستانیوں کے مقابلے میں صرف ۷۰ آدمیوں کو بھیجو تو شہر پر تم قبضہ کر سکتے ہو۔ ہم جدیدیوں کو قتل کرنے میں تمھاری مدد کریں گے۔

رجعت پسندوں کی اس سازش کی ناکامی کے بعد انقلاب دشمنوں کو شکست ہوئی اور انقلاب کی اس فتح میں جن ہندوستانیوں نے حصہ لیا تھا۔ بخارا کی تاریخ میں ان کا نام جلی حروف میں لکھا گیا۔

انقلاب مختصر سی مدت میں بہت کچھ سکھا دیتا ہے۔ مہاجرین میں سے بہتوں نے محسوس کیا کہ انھیں سوویت روس میں رہ کر کچھ سیکھنا چاہیئے تاکہ ہندوستان واپس جا کر آزادی کے لئے کچھ کام کر سکیں۔ تاشقند میں ان ہندوستانیوں کے لئے ایک فوجی اسکول قائم کیا گیا جس کا نام تھا 'اندوسکی کرس' اس میں نہ صرف یہ ۳۶ مہاجرین شامل ہوئے بلکہ مہاجرین کے دوسرے قافلے کے لوگ بھی شامل ہو گئے جو اس وقت تک تاشقند پہنچ چکا تھا۔ یہاں مشین گن اور توپ چلانے اور ہوائی جہاز چلانے کی تعلیم دی جاتی تھی۔

اور یہیں تاشقند میں ۱۷ نومبر ۱۹۲۰ء میں ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی قائم ہوئی جس کا الحاق انقلاب کی تیسری سالگرہ یعنی ۷ نومبر کو کمیونسٹ انٹرنیشنل سے کر دیا گیا۔ پارٹی کے سکریٹری صوبہ سرحد کے محمد شفیق مقرر ہوئے جنھوں نے ایک اخبار "زمیندار" کے نام سے تاشقند سے شائع کیا تھا۔

جب سوویت یونین اور برطانیہ کے درمیان ایک تجارتی معاہدہ ہوا تو اس میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ ہندوستانیوں

عہ انقلاب کے حامیوں کو جدیدی کہتے تھے۔ "ماسکو سے پشاور" شوکت عثمانی ۱۹۲۷ء

کو ترکستان سے نکال دیا جائے۔ چنانچہ تمام ہندوستانیوں کو ایک یونی ورسٹی میں داخل کر دیا گیا جس کا نام تھا مشرقی اقوام کے محنت کشوں کی یونی ورسٹی۔ اس یونی ورسٹی میں مشرق کے بہت سے ملکوں کے طالب علم زیر تعلیم تھے۔ ناظم حکمت جو بعد میں ترکی کے نامور شاعر ہوئے اس زمانے میں اسی یونیورسٹی میں پڑھتے تھے۔

مشرقی یونی ورسٹی کے نصاب تعلیم میں مندرجہ ذیل مضامین شامل تھے،

۱۔ یورپ کے ملکوں کی مزدور تحریک کی تاریخ
۲۔ یورپی ملکوں کی ٹریڈ یونین تحریک کی تاریخ
۳۔ روسی کمیونسٹ پارٹی کی تاریخ
۴۔ پہلی دوسری اور تیسری (کمیونسٹ) انٹرنیشنل کی تاریخ
۵۔ مارکسزم کی تعلیم
۶۔ ہندوستان کی تاریخ

چھ مہینے کا کورس ختم ہونے کے بعد بہت سے ہندوستانیوں نے جو کمیونسٹ پارٹی میں شامل ہو گئے تھے۔ فیصلہ کیا کہ اب انھیں ہندوستان واپس جاکر کام کرنا چاہئے۔ کچھ لوگ تاشقند کا فوجی اسکول بند ہونے کے بعد ہی ہندوستان واپس چلے گئے تھے۔ جن میں محمد اکبر خاں قریشی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اکبر خاں میں لیڈر شپ کی خصوصیات بدرجہ اتم موجود تھیں۔ کابل سے تاشقند تک ایک قافلے کی رہنمائی انھیں نے کی تھی۔ ہندوستانیوں کو انگریزوں سے آزاد کرانا ان کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد تھا۔ تاشقند اسکول کے بعد کمیونسٹ پارٹی کی ایما پر وہ خفیہ طور پر وطن واپس آئے۔ آزاد قبائل کے علاقے میں ایک پریس قائم کرنا چاہتے تھے تاکہ انقلابی لٹریچر ہندوستان بھیج سکیں۔ اسی کوشش میں گرفتار ہوئے اور تین برس کی سزا ہوئی۔ جیل میں بھی انھوں نے پریس قائم کرنے کی کوشش جاری رکھی۔ اس سلسلے میں ان کے کچھ خط سی آئی ڈی نے پکڑے اور انھیں مزید سات برس کی سزا ہوئی۔ دوسری سزا پہلی سزا کے خاتمے کے بعد شروع ہوئی۔ اس طرح انھیں دس برس کی سزا ہوئی۔ یہ "ماسکو تاشقند سازش کیس کا" پہلا مقدمہ تھا۔ اکبر خاں آج کل اپنے گاؤں میں مقیم ہیں اور یادداشت لکھنے پر غور کر رہے ہیں۔

اب ماسکو میں مقیم ہندوستانیوں نے بھی ہندوستان واپس آنے کا فیصلہ کیا اور آخر سوویت کمیونسٹ پارٹی اور سرخ فوج کی مدد سے ہندوستانی کمیونسٹوں کا ایک چھوٹا سا قافلہ انتہائی دشوار گزار راستے سے ہندوستان کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس قافلے کے سفر کا ذکر یہاں نامناسب نہ ہوگا کیونکہ اول تو یہ وہ داستان ہے جسے آج بھی پڑھنے سے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں اور یقین ہو جاتا ہے کہ جب تک کسی اعلا مقصد کی تڑپ نہ ہو کوئی شخص یہ مصیبتیں برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہو سکتا اور دوسرے یہ کہ یہی وہ قافلہ ہے جس پر پشاور میں "ماسکو تاشقند سازش کیس" چلایا گیا جسے ہندوستانی کمیونسٹوں پر سازش کا پہلا مقدمہ سمجھنا چاہئے۔

رفیق احمد نے اپنے غیر مطبوعہ سفرنامے میں اس سفر کا بیان دلچسپ انداز میں کیا ہے۔ ممکن ہے اس میں کہیں کہیں غلطیاں ہوں لیکن مجموعی اعتبار سے سفر کے تمام شرکا اس بیان سے متفق ہیں۔:

"حکومت افغانستان راہ داری دینے کے لئے تیار نہیں تھی۔ براہ کابل جانا ممکن نہیں تھا۔ اس لئے براہ پامیر جانے کا فیصلہ ہوا۔ ہمارے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ پامیر کا راستہ افغانستان کے راستے سے اس قدر دشوار ہوگا۔ آج کل کا پامیر نہیں بلکہ ۱۹۲۲ء کا پامیر تھا۔

ہم کو ہر قیمت پر ہندوستان آنا تھا۔ چنانچہ اخیر مارچ ۱۹۲۲ء کو ہم لوگ ماسکو سے تاشقند واپس آگئے۔ اس وقت میرے ساتھ حسب ذیل اشخاص تھے۔

(۱) رفیق احمد (۲) حبیب احمد (۳) عبدالمجید (۴) فیروزالدین منصور (۵) فدا علی زاہد (۶) سلطان محمد (۷) عبدالقادر صحرائی (۸) سعید (۹) عبدالحمید (۱۰) نظام الدین۔

فضل الٰہی اور عبداللہ صفدر کو بھی ہمارے ہمراہ آنا تھا۔ لیکن انھوں نے انکار کر دیا۔ اور وہ ماسکو میں رہ گئے۔ عبدالحمید ماسٹر عبدالحمید کے نام سے پکارے جاتے تھے کیونکہ وہ کابل کے کسی اسکول میں اردو پڑھاتے تھے۔ ہمارے سفر کا انتظام کرنے کی ذمہ داری کمیونسٹ پارٹی کے سر تھی۔ جو اطلاعات فراہم کر رہی تھی۔ چنانچہ کچھ عرصہ کے بعد ان کو یہ خبر ملی کہ اسکابلوف سے جس کو شاید اب مارگیلان کہتے ہیں سرخ فوج پامیر کی طرف جائے گی۔ ان کے ہمراہ جانے میں سہولت ہوگی۔ چنانچہ ہم کو ایک کمیونسٹ روسی دوست کے ہمراہ مارگیلان پہنچا دیا گیا۔ اس علاقے میں کچھ روز قیام کیا۔ اس کے نواح میں بغاوت پورے شباب پر تھی۔ باہر سے رسد کا آنا قطعی مسدود تھا۔ ایک روز دوپہر کا وقت تھا۔ ہم لوگ بازار میں تفریح کر رہے تھے۔ سرخ فوج کو چونکہ دو روز سے کچھ کھانے کو نہیں ملا تھا۔ ڈیوٹی پہرہ وغیرہ معاف تھا۔ یکایک بگل کی آواز کان میں آئی۔ دوڑ کر ہم سب بیرک میں آئے۔ دیکھا فوج تیار ہوگئی ہے۔ فوجی کمانڈر نے کاشن دیا اور فوج روانہ ہوئی۔ اس کے بعد جو فوجی آئے گھوڑے پر زین کسا، رائفل اور پیٹی لے کر جس طرح کو فوج گئی تھی روانہ ہو جاتے۔ ہم قطعی کچھ نہ سمجھ سکے کہ معاملہ کیا ہے۔ شام کے قریب فوج واپس آئی کہ انور پاشا کی خبر سن کر مقابلے کو گئے تھے۔ انور پاشا شہید ہوگئے اور ان کا تابوت فوجی اعزاز کے ساتھ تاشقند روانہ کر دیا گیا۔ قطعی طور پر کوئی رائے قائم نہیں کی جا سکتی۔ البتہ ان خطوط سے جو روسی فوج کے ہاتھ آئے یہ قیاس کیا جاتا ہے کہ جب ان کی قوت ختم ہوگئی تو وہ افغانستان واپس جانا چاہتے تھے لیکن افغانستان نے جواب دے دیا کہ ان کا افغانستان میں داخلہ ملکی مصالح اور خارجہ پالیسی کے خلاف ہے۔ ان کے لئے کوئی راستہ نہ تھا۔ وہ اسی وقت چین جانے والے راستہ پر تھے۔ ممکن ہے کہ یار قند جہاں سے ان کو امداد مل رہی تھی جا رہے ہوں۔ سیاست میں اس قسم کی سب باتیں جائز ہیں۔ کبھی دشمن کے سینے پر گولی ماری جاتی اور کبھی دوستی کی جاتی ہے۔

• تھوڑے عرصے کے بعد ہم یہاں سے روانہ ہو کر اوش (جس کو تخت سلیمان بھی کہتے ہیں) پہنچے جہاں سے زاد راہ اور اسباب سفر مہیا کرنا تھا۔ تخت سلیمان ایک پہاڑ پر واقع ہے، دامن کوہ تک ریل ہے۔ پہاڑ پر ایک اور پہاڑ ہے جس پر چھوٹی سی

گنٹیلہ۔ اس پر ایک جائے نماز کا نقشہ پتھر پر بنا ہوا ہے۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ حضرت سلیمانؑ کا تخت یہاں پر اُترا تھا۔ بعض مؤرخین کا بیان ہے کہ بابر بادشاہ یہاں پیدا ہوا تھا صحت کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ بہر صورت آخری ریلوے اسٹیشن ہے۔ اور یہاں سے کوہستان کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ قصبہ چھوٹا سا ہے لیکن تمام ضروریاتِ زندگی دستیاب ہو جاتی ہیں۔ یہاں پر ہمارے لئے گھوڑے خرید لئے گئے اور بار برداری کے لئے اونٹ کرائے پر لئے گئے۔ سامان خوراک فراہم کر کے چند روز قیام کے بعد پامیر کی طرف روانہ ہوئے۔ کچھ دور جا کر ہم کو دریائے آموں دوبارہ گھوڑوں سے عبور کرنا پڑا۔ یہاں پانی اگرچہ زیادہ نہ تھا لیکن دھارا تیز تھا۔ سرخ فوج کے دو گھوڑے مع مشین گنوں کے بہہ گئے لیکن تھوڑی جا کر نکل آئے۔ دوسری جانب چھوٹا سا گاؤں تھا جس کا نام یاد نہیں رہا۔ ایک روز قیام کیا اور دریائے آموں کے کنارے کنارے درۂ کوہ کے راستے پر چل کھڑے ہوئے۔ راستہ نہایت درجہ خراب تھا۔ معلوم ہوا کہ سرکاری طور پر اس راستہ پر سال میں ایک مرتبہ آمد و رفت ہوتی ہے۔ کچھ روز چلنے کے بعد دشتِ قراقرم میں داخل ہوئے۔ آبادی تقریباً ختم ہو چکی تھی۔ اس دشت میں کچھ ایسے حصے پر چلنا پڑا جو ربر کی طرح ملائم تھا۔ قیاس تھا کہ شاید اس کے نیچے دلدل ہے۔ اس دشت کو طے کرنے کے بعد ایسے مقام پر پہنچے جہاں سے کوہ الطائی شروع ہوتا ہے۔ درۂ کوہ میں داخل نہیں ہوئے تھے کہ یکایک قافلہ روک دیا گیا اور سرخ فوج نے درۂ کوہ کا محاصرہ شروع کر دیا۔ ہم حیران تھے کہ کوئی کاشن نہیں ہے اور ہر شخص اپنی رائے کے مطابق کام کر رہا ہے۔ جب محاصرہ مکمل ہوا تو فائرنگ شروع ہوئی اور چند گولیاں چلنے کے بعد فائرنگ رک گئی۔ تھوڑے انتظار کے بعد دیکھا کہ کچھ لوگ گرفتار کر کے درہ سے باہر لائے گئے۔ ان کے بیانات قلم بند ہوئے اُن کے ہمراہ ڈبے، اگائیں، گھوڑے تھے۔ معلوم ہوا کہ چین سے یہ سامان لا رہے ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ باغیوں کے لئے یہ سامان آ رہا تھا۔ یہ یقینی تھا کہ یہ لوگ تاجر نہیں تھے۔ اگر باغیوں کے لئے نہیں تو چرا کر لا رہے ہوں گے۔ یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ان لوگوں کو گرفتار کر کے اوش روانہ کیا اور گھوڑے اور گائیں، ڈبے ضبط کر لئے گئے۔ پھر معلوم نہیں ہوا کہ ان کے متعلق کیا کارروائی ہوئی۔

چند روز سفر کرنے کے بعد ہم مرغاب پہنچے۔ یہاں روسی قلعہ ہے اور کچھ فاصلے پر چینی سرحد۔ یہاں جانوروں کا مرنا شروع ہو گیا۔ میرا گھوڑا ارات کو کسی وقت ختم ہو گیا۔ میں نے اس کی اطلاع دی۔ کمانڈر نے دوسرا گھوڑا مجھ کو دلوا دیا۔ مرغاب سے آگے روانہ ہوئے۔ راستہ بہت دشوار گزار تھا۔ اب حبیب کا اس کے بعد مجیدکا اور پھر فیروز وغیرہ کے گھوڑے مرتے چلے گئے۔ ان کے بجائے ہم کو اونٹ ملتے رہے۔ اب اونٹوں کی باری آئی۔ چنانچہ چار اونٹ بھی مر گئے۔ ہمارے پاس دس گھوڑے تھے اُن میں صرف ایک زندہ رہا۔ اور آٹھ اونٹ تھے اُن میں صرف چار زندہ بچے۔ باقی سب مر گئے۔ اب ہم پامیر کے قریب ہو گئے تھے۔ ایک روز ہم کو قند کی ڈلیاں دی گئیں اور کہا گیا کہ انتہائی بلندی کو وہ پر ہوا کم ہے۔ جب تنفس میں تکلیف محسوس کرو تو شکر چابنا شروع کر دینا۔ چنانچہ ہدایت کے مطابق ایسا ہی کیا گیا۔

... داکر کے سطح مرتفع پامیر پر پہنچے۔ یہ ایک وسیع، مرتفع اور ہموار کوسوں لمبی اور تقریباً ایک میل چوڑی ہے۔ اس پر چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں ہیں۔ اس قدر قدیم زمانے کی ایک چوکی ہے۔ جس پر چھت نہیں تھی۔ ہوا تیز اور تند چل رہی تھی۔ اس لئے فوجی افسر نے حکم دیا کہ تم اس کی دیواروں کی آڑ میں پناہ لو۔ رات وہاں بسر کی۔ صبح کو پھر اُترنا شروع کیا۔ مغرب کے قریب پامیر سے اُترے اور دامنِ کوہ میں رات بسر کی۔ یہاں بھی سردی بہت تھی اور ہوا بھی چل رہی تھی۔ اس تمام راستے میں برف نہیں ملا۔ پامیر سے اُترتے اُترتے دو اونٹ اور مر گئے۔ سرخ فوج کے گھوڑے اور اونٹ بھی اسی طرح مر گئے تھے۔ تقریباً ⅔ حصہ فوج کا پیدل ہو گیا تھا۔ ہم نے کل سامان اونٹوں پر لاد لیا اور پیدل روانہ ہوئے۔ چند روز سفر کرنے کے بعد ہم شغنان پہنچے۔ یہاں افغانی قلعہ ہے اور اس کے مقابلے میں روسی چھاؤنی ہے۔ بازار افغانی سرحد میں ہے مگر روسی بھی اپنی ضرورت یہاں سے پوری کرتے ہیں۔ یہ سب کچھ کسی معاہدے کے تحت ہوتی ہیں۔ شغنان سے ایک میل دور ایک پہاڑی پر ایک بنگلہ تھا۔ ہم کو یہاں ٹھہرنے کو کہا گیا۔ یہاں تقریباً ایک ہفتہ قیام رہا۔

فوج کی کمیونسٹ پارٹی ہمارے لئے سفر کی تیاری میں مصروف تھی۔ وہ کیا کر رہی تھی ہم کو معلوم نہیں۔ ایک روز مجھ کو اور ایم مجید، فیروزالدین اور حبیب کو رات کے وقت طلب کیا گیا اور مقامی لوگوں کے پُرانے کپڑے اور چاموش (ایک قسم کا جوتا ہوتا ہے جس کا اوپر اور سول ایک ہی چمڑے کا ہوتا ہے) دئیے گئے اور دس دس پونڈ دئے گئے اور ہدایت کی کہ صبح تڑکے ہم روانہ ہو جائیں اور ایک خط سلمان نامی شخص کے نام دے کر کہا کہ یہ خط سلمان کو دے دینا وہ تمھارے آگے جانے کا انتظام کر دے گا۔ چنانچہ وہ کپڑے وغیرہ لے کر ہم آ گئے اور دوسرے روز اندھیرے میں چل دئے۔ درۂ کوہ میں آمو دریا کے کنارے جا رہے تھے۔ اکثر گاؤں راستے میں ملے۔ راستہ اگرچہ ہموار تھا لیکن راستے میں اس قدر کنکر تھے جس کی انتہا نہیں۔ کنکر پیر میں اس طرح چبھ رہے تھے معلوم ہوتا تھا ہم برہنہ پا سفر کر رہے ہیں۔ بڑی تکلیف کے بعد مغرب کے بعد ہم اسکاشم پہنچے۔ دریا کے ایک طرف روسی قلعہ اور دوسری جانب افغانی قلعہ تھا۔ روسی قلعہ کسی قدر بلندی پر تھا اور نیچے اسکاشم گاؤں۔ چاند کی آخری تاریخیں تھیں۔ اندھیری رات کے سبب ہم نے اسکاشم میں رات بسر کرنے کا ارادہ کر لیا اور ایک مکان میں رات بسر کرنا چاہی۔ اس علاقے میں ہر مکان کے ساتھ ایک کوٹھڑی ہوتی ہے جو مسافروں کے لئے بنائی جاتی ہے۔ اور وہاں کی اصطلاح میں اس کو کوچ خانہ کہتے ہیں۔ چنانچہ کوچ خانے میں اُتر پڑے مالک مکان نے پانی کا انتظام کر دیا۔ اور روشنی کے لئے ایک باریک سی لکڑی کو جس پر کاجل اور مکھن ملا ہوا تھا، سلگا کر رکھ دیا اور خود روسی قلعہ میں جا کر اطلاع دی کہ کچھ جاسوس میرے مکان میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ اسکو اڈرلن کمانڈر اپنے ہمراہ چار فوجیوں کو لے کر ایک دم کوچ خانہ میں داخل ہوا۔ اور رائفل سینوں کی طرف کر کے روسی زبان میں کہا کہ کھڑے ہو جاؤ۔ ہم حیران تھے کہ یہ بلائے ناگہانی کہاں سے آ گئی۔ بالکل غیر ارادی طریقہ پر میرا ہاتھ رائفل کی نال کی طرف بڑھا اور میں نے پوری طاقت سے نال پکڑ کر اپنے سینے سے الگ کرتے ہوئے کہا کہ نز نابتے میںیا (کیا تم ہم کو نہیں جانتے) یہ کمانڈر اور فوجی اسکا بلوف سے شغنان تک ہمارے ساتھ آئے تھے۔ میں نے عرض کیا کہ میرا ہاتھ غیر ارادی طور پر

نالہ کی طرف بڑھا۔ اس میں نہ جبڑات کو نہ بہادری کو دخل ہے۔

کمانڈر نے سپاہی اور فوجیوں کو باہر چلے جانے کا حکم دیا۔ جب سب چلے گئے تو اس نے دریافت کیا کہ آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہے۔ مجید بول اٹھے کہ تمباکو اور ماچس کی۔ کمانڈر واپس چلا گیا اور تھوڑی دیر بعد بڑا سا بنڈل جس میں شکر، چائے، ماچس اور تمباکو تھی، لا کر دیا اور کہا یہ نقطہ سرحد ہے۔ یہ لوگ اچھے نہیں ہیں۔ مناسب ہوگا کہ تم یہاں سے پچھلی رات کو روانہ ہو جاؤ۔ اس بندۂ خدا نے یہ معلوم کرنے کی کوشش بھی نہیں کی کہ آخر تم کہاں جا رہے ہو۔ چنانچہ ہم لوگ اسی رات کو ۲-۳ بجے روانہ ہو گئے۔ صبح ہوتے ہوتے جائے سلیمان پر پہنچ گئے۔ سلیمان کی عمر پچاس سال ہوگی۔ وہ اپنے ملازمان کے ساتھ مکان سے باہر باتیں کر رہے تھے۔ ہم کو دیکھا، بلایا۔ ہم نے روسی کمانڈر کا خط دیا۔ اس نے پڑھا اور کہا کہ یہ سنار ہیں اور ان کا نام فاروق ہے۔ آپ لوگوں کی اچھی قدر ہوگی۔ آج یہیں رہیں۔ کچھ مجھ کو بھی بنوانا ہے۔ ہم خاموشی سے یہ باتیں سنتے رہے۔ اس نے اپنے ملازمین کو رخصت کیا اور ہم کو اپنے مکان میں لے آیا۔ یہ باتیں ان لوگوں کو دھوکا دینے کی غرض سے کہی گئی تھیں۔ درۂ کوہ میں سلیمان صاحب کا نیا مکان تھا جو بہت وسیع تھا۔ اس لئے اس کو جائے سلیمان کہتے تھے۔

اب گفتگو شروع ہوئی اور انھوں نے بیان کیا کہ راستے میں پہاڑوں کے علاوہ ایسی خندقیں ہیں جن کی گہرائی ہزاروں فٹ ہے۔ اگر کوئی آدمی یا جانور گر جائے تو پھر اس کا نکلنا غیر ممکن ہے۔ بعض وقت ان خندقوں کے کنارے برف کی تہہ جم جاتی ہے آدمی ناواقفیت کی بنا پر ان پر پیر رکھ دیتا ہے اور برف لوٹ جاتا ہے اور آدمی خندق میں گر جاتا ہے اس لئے راستے میں پوری احتیاط برتنی چاہئے۔ پہاڑوں کی بلندی بھی ۲۲ ہزار فٹ ہے اور ڈھلوان پہاڑ ہیں ان پر چڑھنا اور اترنا ہوگا۔ میں ایک اچھا راہبر آپ کو دوں گا۔ اس کو چار پونڈ دینا پڑیں گے۔ رات کے وقت میں اپنے اونٹ کے ذریعے دریائے آموں کو عبور کرا دوں گا۔ آپ سامنے کے پہاڑ پر چڑھ جانا اور تیغ کوہ کے سہارے سہارے افغانی قلعہ کے سامنے کا راستہ طے کر لینا۔ غرض اچھی طرح سمجھا کر دو تین روز اپنے یہاں مہمان رکھا اور اس کے بعد ایک رات کو تقریباً بارہ بجے ہم وہاں سے روانہ ہوئے۔ لبِ دریا مکان تھا۔ دریا یہاں پر اس قدر تنگ ہے کہ آسانی سے ہلکا سامان دوسری جانب پھینکا جا سکتا تھا لیکن دریا کی روانی تیز ہے۔ اونٹ پر سوار ہو کر دریا کو عبور کیا۔ اب ہم افغان سرحد میں داخل ہو گئے۔ راہبر کے نقشِ قدم پر چلتے رہے۔ یہاں تک کہ ہم تیغ کوہ پر پہنچ گئے۔ جس طرح ممکن ہوا ہم اپنے کو چھپاتے ہوئے راستہ طے کر رہے تھے۔ جب افغانی قلعہ کے مقابل پہنچے تو کتوں نے بھونکنا شروع کیا۔ چاندنی رات تھی۔ سیاہ لباس چاندنی میں دور سے دکھائی دیتا ہے۔ کتوں کے بھونکنے سے ہم تیغ کوہ کی آڑ میں ہو گئے اور آہستہ آہستہ راستہ طے کرنا شروع کر دیا۔ جب افغانی قلعہ سے کافی دور نکل آئے تو پہاڑ سے اتر کر چلنا شروع کیا۔ یہاں پر پانی کے بہاؤ سے ایسے کٹاؤ پیدا ہو گئے تھے جن کی بلندی درمیان میں پانچ پانچ سو فٹ سے کم نہیں تھی۔ بستر اور کھانا پیٹھ پر باندھ رکھا تھا۔ ان کٹاؤں کو یکے بعد دیگرے طے کرتے وقت یہ معلوم ہوتا تھا کہ سینہ پھٹ جائے گا۔ یہاں تیز روی بھی ضروری تھی۔ پچھلی رات کو ہم ایک غار میں جا پہنچے۔ راہبر کے کہنے سے ہم غار میں داخل ہو گئے۔

ہم نے کوہ ہندوکش کو طے کیا۔ پامیر جیسی جگہ کو عبور کیا۔ جہاں کی سختی سے جانوروں نے دم توڑ دیئے تھے لیکن اس راستے کے مقابلے میں وہ کچھ نہ تھے۔ زیادہ تر تکلیف کا باعث چاموش تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ ننگے پیر جا رہے ہیں۔ راہبر کا یہ عالم تھا کہ وہ کوشش کرتا تھا کہ ہم سے دور رہے۔ خدا نے ان پہاڑوں کو کنکروں کا بنایا ہے۔ یا تو ان پر برف ہوتا ہے یا کنکر۔ گھاس اور درخت نام کو نہیں چڑھائی، اُتار دونوں دشوار تر تھے۔ نہ آدمی چڑھ ہی سکتا ہے نہ اُتر سکتا ہے۔ ڈھال اس قدر تیز ہے کہ پیر کا جمنا دشوار۔ پھر پکڑے جانے یا گولی کا نشانہ بن جانے کا خوف دامن گیر۔ ہندوکش اور پامیر پر اس قسم کا کوئی خوف نہ تھا۔ ہم کو غار میں آئے ہوئے مشکل سے آدھ گھنٹہ ہوا ہوگا کہ چند سواروں کے آنے کی آواز سنائی دی۔ وہ غار کے قریب سے ہو کر نکل گئے اور آپس میں کہہ رہے تھے کہ آخر ایں پدر سوختگاں چہ شدند و کجا رفتند (ان کا باپ جل جائے یہ کیا ہوئے اور کہاں چلے گئے)

یہ لوگ ہماری تلاش میں آئے تھے۔ تلاش کرتے کرتے ایسے مقام پر پہنچے جہاں انسان چڑھ سکتا تھا۔ تھوڑی دیر میں واپس ہو کر درہ میں چلے گئے۔ شاید ان کا خیال ہو کہ درہ کے راستے جا رہے ہوں۔ ہم خاموشی کے ساتھ یہ سب کچھ سنتے رہے۔ رات بسر کرنے کے بعد صبح کے وقت پہاڑ پر چڑھنا شروع کر دیا۔ تھوڑی راہ طے کی ہوگی کہ حبیب احمد نے کہا کہ میں اب آگے نہیں جا سکتا۔ مجھ کو میری حالت پر چھوڑ دو اور تم لوگ چلے جاؤ۔ (میں نے مجید کو آواز دی)۔ باہم مشورہ ہوا کہ حبیب احمد کا سامان میرے اور مجید کے درمیان تقسیم کر لیا جائے اور ان کو سہارا دے کر لے جایا جائے۔ سامان تقسیم کیا گیا۔ اور ہمت دلا کر آگے چلے۔ نصف گھنٹے کے بعد فیروز الدین منصور نے جواب دے دیا کہ اب میری طاقت مجھ کو جواب دے چکی ہے۔ میں قطعی آگے نہیں چل سکتا۔ ان کا سامان بھی لے لیا گیا۔ اس عرصے میں راہبر پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ چکا تھا۔ لیکن برف پر پیروں کے نشانات باقی تھے۔ ان نشانات پر قدم رکھتے ہوئے چلتے رہے۔ آگے نصف دائرے کی شکل میں راہ دکھائی دے رہی تھی۔ داہنی جانب زبردست غار اور دوسری جانب پہاڑ تھا۔ بہ ہزار دقت اس راستے کو طے کر کے تیغ کوہ پر پہنچ گئے۔ یہاں بہت سنبھل کر چلنا تھا۔ فیروز الدین اور حبیب پیروں کی وجہ سے ڈگمگا رہے تھے۔ اندیشہ تھا کہ اگر توازن بگڑا تو غار میں جا پڑیں گے لہٰذا ان کی کمر میں رسی باندھ رکھی تھی۔ اس کے سہارے وہ حصہ طے کیا۔ یہاں قطعی کوئی راستہ نہ تھا۔ پہاڑ اس قدر ڈھلوان تھا کہ پیر جمنا مشکل تھا۔ مجبوراً بیٹھ کر اُترنا چاہا۔ لیکن بیٹھ کر اُترنا بھی ممکن نہ ہوا تو پھسلنا شروع کر دیا۔ پھسلنا اس لئے دشوار تھا کہ رگڑ سے جو کنکر پتھر اپنی جگہ سے اُکھڑ جاتے تھے وہ سر پر آ کر لگتے تھے۔ چنانچہ بستر سر پر رکھ کر سروں کی حفاظت کر لی اور پوستین کے دامن میں خود کو لپیٹ لیا اور لڑھک پڑے۔ تھوڑی دیر میں دامن کوہ میں پہنچ گئے جہاں کثرت سے برف تھا۔ برف کو علاحدہ کر کے پھر چلنا شروع کیا۔ دور درۂ کوہ میں راہبر نظر آیا۔ اُس نے اشارہ کر کے اپنی طرف بلایا۔ اس کے پاس گئے۔ راہبر نے کہا کہ اب ہم خطرے سے نکل گئے ہیں۔ افغان فوجی یہاں نہیں آسکتے۔ یہ اطمینان کر کے درۂ کوہ میں چلنا شروع کیا۔ برف کی کثرت تھی لیکن چلنے کے سوا اور چارہ بھی کیا تھا۔ شام کے وقت ایک لکہ ابر نمودار ہوا اور برف باری شروع ہو گئی۔

ہم نے اپنے کمبل سے شامیانہ بنایا۔ جو لاٹھیاں ہاتھ میں تھیں ان سے چاروں کونے باندھے۔ راہبر کی لاٹھی کو

درمیان میں کھڑا کر کے ایک دوسرے سے مل کر بیٹھ گئے۔ جب برف کا وزن زیادہ ہو جاتا تو برف گرا کر پھر بیٹھ جاتے۔ تقریباً رات بھر برف گرتی رہی۔ صبح برف بند ہوئی۔ آفتاب طلوع ہوا ہم سامان باندھ کر آگے روانہ ہوئے شام کے وقت ایسے مقام پر پہنچے جہاں بڑی بڑی چٹانیں تھیں۔ پانی بہہ رہا تھا اور برف کے گلیشیر جگہ جگہ لٹکے پڑے تھے۔ صبح راہبر نے بتایا کہ قریب کا پہاڑ افغانستان اور چترال کے درمیان حد فاصل ہے۔ اس پہاڑ کے اس طرف چترال کا علاقہ ہے۔ پھر پہاڑ پر چڑھنا شروع کیا۔ بعض جگہ ہاتھوں کی مدد سے آگے بڑھا جاتا تھا۔ دن بھر چلنے کے بعد تقریباً پانچ بجے ہم تیغ کوہ پر پہنچے۔ راہبر نے وہاں اشارے سے بتلایا کہ یہ درہ چترال تک جاتا ہے۔ راستے میں علاوہ نشیب و فراز کے کوئی پہاڑ نہیں ہے۔ اس مژدہ سے ہم بہت خوش ہوئے اور جس طرح دو روز پہلے پہاڑ سے اُترے تھے اسی طرح پھسلنا شروع کیا۔ یہ پہاڑ بھی اس قدر ڈھلوان تھا کہ درمیان میں بہت جد و جہد کی کہ رُک جائیں لیکن ممکن نہ ہو سکا۔ نیچے آئے ایک غار اتفاق سے یہاں بھی تھا۔ راہبر نے بکریوں کی مینگنیاں جمع کر کے سلگائیں اور سب بڑے آرام سے سو گئے۔ لیکن فاقہ سے۔ کیونکہ راشن ایک روز پہلے ختم ہو چکا تھا۔

اسی درہ میں فیروزالدین منصور اور حبیب احمد کے پیروں کے ناخن گر گئے تھے اور پیر برف سے جل چکے تھے۔ چترال والے درہ میں برف نام کو بھی نہ تھا لیکن شدت سردی سے ایک چھوٹا سا چشمہ جس کو عبور کرنا تھا جم گیا تھا۔ غالباً یہ دریائے چترال کا منبع تھا۔ جیسے ہی پاؤں سطح برف پر رکھے وہ سطح ٹوٹ گئی اور ہم پنڈلیوں تک پانی میں اُتر گئے۔ چونکہ حبیب اور فیروزالدین منصور کے پیر زخمی تھے اور ان کے پیروں سے خون جاری تھا اس لئے یکے بعد دیگرے ان کو اپنی پیٹھ پر بٹھا کر اس چشمہ کے دوسری طرف لائے اور چلنا شروع کیا۔ تھوڑے فاصلہ پر ایک چھوٹا سا جنگل ملا۔ ہمارے پورے سفر میں یہ پہلا جنگل تھا۔ ہمارے راہبر کے پاس آٹا تھا۔ اُس نے چشمہ سے پانی لیا اور آٹا گوندھا پھر سوکھی لکڑیاں جمع کر کے کچھ چپٹے پتھر رکھے۔ اس کے بعد لکڑیوں میں آگ لگا دی۔ آگ سے پتھر گرم ہو گئے تو اس نے روٹیاں بنا کر ان پتھروں پر چپکا دیں۔ روٹیاں قطعی کچی تھیں لیکن اس کے سوا چارہ ہی کیا تھا۔ کھانا شروع کر دیں۔ جب روٹیاں کھا کر فارغ ہوئے تو راہبر نے کہا کہ یہ درہ چترال تک جاتا ہے اور وہاں ہندوستان کی سرحد ہے۔ میرا کام ختم ہو گیا۔ اب میں جاتا ہوں۔"

اس سفر کا ایک دلچسپ واقعہ میر عبدالمجید نے سنایا۔ ایک ہم سفر نظام الدین تھے جو نظام دین کہلاتے تھے یہ فن داستان گوئی کے استاد تھے۔ جب قافلہ تھک کر راستہ کو ڈیرے ڈالتا تو نظام دین کہانی سناتے۔ کچھ دن بعد انھوں نے ایسی لمبی کہانی شروع کی جو سارے سفر میں سنائی جاتی رہی۔ کہانی کا نام تھا "دلبر جوہر کی کہانی"۔ اب سب لوگ دلبر جوہر کی کہانی سے تھک چکے تھے اس لئے ایک دن طے ہوا کہ دلبر جوہر کی کہانی ختم کرو ورنہ کہانی نہیں سنیں گے نظام دین نے جو پلاٹ بنایا تھا اس سے ... دماغ اور درکار تھے لیکن قافلہ سننے کے لئے تیار نہ تھا۔ ایک رات جب ایک منزل پر قیام ہوا تو نظام دین سب سے الگ ہو کر کہیں چلے گئے۔ میر عبدالمجید اتفاق سے ادھر سے گزرے تو کان میں کچھ آواز آئی جیسے کوئی باتیں کر رہا ہے گئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ یار نظام دین ایک پتھر پر اکیلے بیٹھے دلبر جوہر کی کہانی زور زور سے سنا رہے ہیں۔ کہانی کو تو بہرحال ختم ہونا تھا۔

چترال پہنچنے پر یہ لوگ گرفتار کر لئے گئے اور پشاور میں مقدمہ چلا۔ بعد میں محمد شفیق اور فضل الٰہی، قربان اور دوسرے لوگوں پر بھی الگ الگ مقدمے چلے اور اس طرح ماسکو تاشقند سازش کیس اختتام کو پہنچا۔

ڈاکٹر قمر رئیس

جدید ازبکی شاعری
(ایک جائزہ)

(اس مقالہ میں شامل نظموں کے ترجمہ میں از بک احباب بی محمد وف، تیشا بالف اور محمد جان رحمان بیوی نے جو مدد و خلوص عنایت کی ہے اس کا اعتراف ضروری سمجھتا ہوں)

وسط ایشیا کے سرزمین واقع ازبکستان سوویت یونین کی ایک خود مختار اشتراکی جمہوریہ ہے۔ اس میں سمرقند، بخارا، خوارزم، خیوا، فرغانہ، اندیجان، خوقند اور تاشقند جیسے تاریخی شہر شامل ہیں اس خاک سے ترمذی، امام ابو حنیفہ، البیرونی، بو علی سینا، الغ بیگ، علی شیر نوائی، بابر اور تیمور جیسے عالم، حکیم اور فاتح اٹھے ہیں۔ اس کے تہذیبی سرچشموں میں عرب، ایران اور ترکی ہی نہیں ہندوستان اور چین کی قدیم تہذیبوں اور فکری تحریکوں کا بھی نمایاں اثر رہا ہے۔ [1]

موجودہ ازبکستان میں لسانی اور نسلی اعتبار سے کئی قومیتوں کے لوگ آباد ہیں، مثلاً تاجیک، ترکمان، کرغیز اور قزاق وغیرہ۔ ملک کی کل آبادی صرف ۹۰ لاکھ ہے اور اس میں ازبکی زبان بولنے والوں کی تعداد ۶۵ فیصد یعنی کم و بیش ۶۰ لاکھ ہے۔ اس کے وسیع رقبہ میں نسبتاً آبادی کے انتشار اور کمی کا سبب قدرت کا بخل یعنی پانی کی قلت اور بے آب و گیاہ بنجر اور ریگستانی علاقوں کی کثرت ہے۔ تاہم آمو دریا اور سیر دریا کے ساحلوں پر اور جنوب و مشرق میں تیان شان کے کوہستانی سلسلے کے دامن میں جو بستیاں آباد ہیں وہ نہ صرف یہ کہ تاریخی جاہ و حشمت اور اسلامی دور کے علمی اور تہذیبی فروغ کی یادگار رہی ہیں بلکہ قدرت کے بیکراں حسن، شادابی، رنگا رنگ پھلوں اور پھولوں کی کثرت اور اپنے موسموں کی نیرنگی کے اعتبار سے بھی اپنا ثانی نہیں رکھتیں

اشتراکی انقلاب سے پہلے اس علاقہ کے لوگ خانوں، زمینداروں اور ملاؤں کے استحصال اور مظالم کا شکار ہو کر جہالت، افلاس اور بے سرو سامانی کی جیسی زندگی گذار رہے تھے۔ اس کا اندازہ اس سے کیجئے کہ آج بھی وہ یقین دلانے کے لئے نان، نمک اور پانی کی قسم کھاتے ہیں جو اپنی کمیابی کی وجہ سے ان کی زندگی میں سب سے زیادہ اہمیت، تقدس اور قیمت رکھتے تھے اس صورت حال نے ان میں محنت، برداشت، جفاکشی اور خطر پسندی کی صلاحیت پیدا کی اور صدیوں کے مشترکہ دکھوں کے احساس نے ان کے دلوں میں انسانیت اور اخوت کے مقدس جذبات کو زندہ رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ اکتوبر انقلاب کے کامیابی کے بعد ۱۹۱۸ء میں جب سرخ نوجوں نے اس زمین پر قدم رکھا تو سارے محنت کش عوام ان کے ساتھ ہو گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے اس خطہ میں زارشاہی حاکموں، خانوں، زمینداروں اور مذہبی علما کا فرسودہ اور جابرانہ تسلط ختم ہو گیا

[1] یہاں اس واقعہ کی طرف اشارہ بے محل نہ ہوگا کہ سوویت ماہرین آثار قدیمہ، وسط ایشیا خصوصاً وادی فرغانہ اور آمو دریا کے بعض ساحلی مقامات کی کھدائیوں میں اور ان میں دستیاب اشیاء اور نجیروں کے مطالعے اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ تین ہزار سال سے دو ہزار سال قبل مسیح کے درمیان
(باقی ۲۴۹ کے نیچے)

گذشتہ نصف صدی کا زمانہ ازبکستان میں اشتراکی نظام کی تعمیر کا دور ہے اور یہی زمانہ ازبکی زبان میں جدید شعر و ادب کی تشکیل اور فروغ کا زمانہ بھی کہا جائیگا۔ اس لئے جدید ازبکی شاعری اور اس کے رجحانات کے مطالعہ میں ... تعمیر کے اس دور کے چند حقائق کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ ازبکستان میں قبل انقلاب کا معاشرہ جاگیردارانہ زرعی نظام کے انتہائی پسماندہ دور کا نمونہ تھا جو صنعتی ترقی، سرمایہ داری کی لعنتوں اور بورژوا سماج کی الجھنوں سے یکسر بے نیاز اور بے بہرہ تھا۔ اس طرح گویا انقلاب کے بعد وہ سماجی ارتقاء کے اس تکلیف دہ عبوری دور سے گزرے بغیر ایک جست لگا کر اشتراکی سماج کی تعمیر کر رہا تھا۔ یہ صورت حال روس میں نہیں تھی۔ وہاں کے نیم جاگیردارانہ بورژوا سماج نے انقلاب سے پہلے گوگول، ٹالسٹائی، پشکن، ترگنیف، چیخوف اور دستوفسکی جیسے ... پیدا کئے تھے اور واقعہ یہ ہے کہ دنیا کا بلند پایہ نثری ادب بورژوا معاشرہ کی سب سے بڑی دین ہے اور اس لئے ازبکستان اس کی نعمتوں کے ساتھ ساتھ اس نعمت سے بھی محروم رہا۔ لیکن اس صورت حال سے ایک فائدہ بھی ہوا اور وہ یہ کہ روس میں اشتراکی سماج کی تعمیر کے دوران جو دشوار ایک مشکل کام قدیم بورژوا ذہنیت اور معاشرہ کی بچی کھچی باقیات کو مٹانا تھا جس کی جڑیں روسی قوم کی زندگی میں دور تک پھیلی ہوئی تھیں اور جن کے نتیجہ میں وہاں فرد کی ذات زیادہ پیچیدہ ہو گئی تھی۔ اس صورت حال نے روسی شعر و ادب کو بھی متاثر کیا۔ اس کے برعکس ازبکستان میں اشتراکی ذہنیت اور اشتراکی معاشرہ کے قیام و استحکام کا کام زیادہ دشوار نہیں تھا۔ وہاں تیز رفتار صنعتی ترقی، برق کاری، زراعت کی مشین کاری، اچھوت زمینوں کی زرخیزی، معدنی ذخائر کی دریافت، اور عظیم تعمیرات نے ذہن و احساس کے جن نازکیوں اور پیکروں کو جنم دیا وہ الجھنوں اور پیچیدگیوں، افراط و تفریط، ہیجانی کشمکش اور اعصابی تشنج کے غیر صحت مند دباؤ سے بڑی حد تک پاک ہیں۔ ازبک عوام کے کردار میں توازن، فطرت میں بچوں کی سی معصومیت اور روح میں رزمیہ نغمہ کی سی دلنوازی، حوصلہ مندی اور بلند ... ہے۔ ان کی حالت اس مسافر کی سی ہے جو برسوں کسی تپتے ہوئے بے آب و گیاہ ریگستان میں سفر کرنے کے بعد اچانک ایک غیر آباد لیکن شاداب وادی میں پہنچ جائے اور پھر وہاں اپنی تخلیقی محنت سے باغبانی اور چمن بندی کر کے زمین کو رشک ارم بنا دے، نئی فصلیں کاٹے اور پھر نئی بہاریں نئے جوش و خروش سے نوروز منائے۔ ازبک عوام کو اپنی اشتراکی محنت کی فتوحات پر بجا طور پر ناز ہے۔ ان کی سیدھی سادی لیکن پُر عظمت تعمیراتی محنت، جفاکشی اور عزم و حوصلہ سے معمور زندگی کی تخلیقی ترجمانی کا نام ہی جدید ازبکی شعر و ادب ہے۔

قدیم ازبکی شاعری اردو کی کلاسیکی شاعری کی طرح فارسی کے زیر اثر غزل، قصیدہ، مثنوی اور رباعی جیسی اصناف پر مشتمل ہے۔ اس کا فنی سرمایہ تشبیہات، تلمیحات، استعارے کنایے بڑی حد تک فارسی سے ماخوذ ہیں۔ ۱۶ ویں صدی کے اوزبکی شاعری کے اولین دور کے شاعر بابر اور نوائی کے کلام میں بھی امرد پرستی کے رجحان اور جذبات کا کھلا اور بے حجابا اظہار ملتا ہے۔ تصوف اور معرفت کے مضامین کم سے کم ہیں۔ ایہام اور رعایت لفظی کی کثرت ہے۔ مطرب و ساقی اور بادہ و مستی کے مضامین اور زاہد و محتسب پر اسی طرح طنز ہے جو قدیم اردو شاعری کا خاصہ ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وطن پرستی اور دردمندی کا جذبہ بھی قدیم ازبکی شاعری میں نمایاں حیثیت

ہندوستان آنے والے آریہ قبائل وسط ایشیا کے ان ہی علاقوں سے آئے تھے۔ ان ماہرین آثار قدیمہ میں بودس، لت ... کا نام خصوصیت سے قابل ذکر ہے جس نے وسط ایشیا اور وسطی ہندوستان میں دستیاب ہونے والے ظروف اور اوزاروں میں مشابہت کے مطالعہ سے اس نظریہ کو تقویت دی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ہندوستان میں آنے والے اولین دور کے آریہ قبائل بھی دھات کا استعمال جانتے تھے۔

رکھتا ہے۔ مجموعی طور پر قدیم ازبکی شاعری کا کردار شمالی ہندوستان میں اولین دور کی اردو شاعری سے مماثلت رکھتا ہے۔ بابر کے چند اشعار ملاحظہ ہوں

؎ میں بظاہر تھا بڑا سرکش مگر
اس کی پابوسی میں سرخم ہو گیا

؎ جو تو نے بال کھولے کھل گیا بابر کا دل گویا
ترے گیسو صنم دلبند بھی ہیں دلکشا بھی ہیں

؎ نہ چمن میں کوئی بوٹا قد رعنا جیسا
نہ گلستان میں کوئی گل رخ زیبا جیسا

؎ اے اہل جنوں ملک جنوں مل گیا مجھ کو
آنسو مجھے نشے میں سر گیسوئے تر نے

؎ شعر گوئی سے منع کرتا ہے مجھکو شیخ پھر
پیرنا بالغ ہے وہ لطف بلاغت کیا اٹھائے

؎ جب تلک کہ آیا عارض رنگیں پہ اس کے خط
بابر ہمارا خط خط بیزار ہو گیا

اٹھارویں صدی تک اکثر شعرار فارسی اور ازبکی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے اور ہندوستان کی طرح وہاں بھی درباری شعر فارادہ علمی زبان فارسی تھی لیکن انیسویں صدی میں ازبکستان میں مقیمی، فرقت، گلبانی اور نادرہ جیسے شاعر پیدا ہوئے جنھوں نے فارسی کے مقابلے میں ازبکی زبان کو اہمیت دی اور فارسی شاعری کی تقلید سے گریز کیا۔ ان شعرار نے عربی اور فارسی کے ساتھ ساتھ ترکی کے نظام اوزان کو جو مبنی بر ہاتی کہلاتا ہے اپنایا۔ فرقت نے ہندوستان کی سیاحت کی اور یہاں کی تہذیبی زندگی اور حسن کی فراوانی سے متاثر ہو کر متعدد نظمیں لکھیں۔ اس دور کی غزلوں میں ریزہ خیالی اور پراگندگی کے بجائے معنوی تسلسل ملتا ہے۔ ان میں زیادہ درد وافر ہے، مثنویاں بھی کثرت سے لکھی گئیں جن میں قومی روایات اور عوامی داستانوں کو موضوع بنایا گیا ہے فرقت اور مقیمی نے عوام پر حکمرانوں کے صبر و تشدد کے خلاف آواز بلند کی۔ اس طرح موضوع، مواد، تخیلی سرمایہ اور فنی اسالیب کے اعتبار سے ازبکی شاعری میں وسعت پیدا ہوئی۔

انقلاب کے بعد ازبک عوام کی قومی زندگی میں جو تبدیلی اور تہذیبی ترقی ہوئی اس کی سب سے نمایاں خصوصیت میرے نزدیک حسن تناسب ہے انھوں نے ماضی کی روایات اور تہذیبی ورثہ سے وہ صحت مند عناصر چن لئے جو نئی زندگی اور اشتراکی سماج کی تعمیر میں معاون یا کم از کم بے ضرر تھے۔ اشتراکی سماج اور ایک نئے انسان کی تعمیر میں انھوں نے مادی خوشحالی، اخلاقی استواری اور روحانی آسودگی کے تقاضوں کو یکساں طور پر عزیز رکھا اور ان کی باہمی کشمکش اور تضاد کو مٹایا۔ نئے ازبکستان کی قومی زندگی اور تہذیب کی [illegible] آسودگی، [illegible]

ظرافت، خوش ذوقی، سادگی، بے ریائی اور بلند حوصلگی ہے۔ وہ اسی حسن تناسب کا مظہر ہے۔ اس منصفانہ، مساویانہ جمہوری اشتراکی معاشرہ کے معیار کو جاگیردارانہ یا نو بورژوا معاشرہ میں پیدا ہونے والے ادب کے معیاروں پر پرکھنا میرے نزدیک غلط ہوگا۔ قدیم شعرو ادب کی انسانی ذہنی اور دوسری فنی جمالیاتی روایات کے اخذ و قبول کے باوصف سوویت ادب کی اپنی اقدار اپنے معیار ہیں اور اسے ان ہی معیاروں اور محرکات کی روشنی میں پرکھا جا سکتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ازبکستان میں اشتراکی سماج کی تعمیر کے ابتدائی اور عبوری دور میں قدیم نظام زندگی کی انفعالی اور رجعت پسندانہ قوتوں نے کچھ عرصہ تک مدافعت کی۔ اس عہد کا ادب اس آویزش کے مختلف پہلوؤں کا ترجمان ہی نہیں بلکہ اس میں عملی طور پر شریک رہا۔ اس دور کے انقلاب دشمن عناصر میں ادیبوں کی ایک جماعت بھی منظم طور پر اشتراکی سماج، عقائد اور نئی اقدار کی مخالفت کر رہی تھی۔ اس کی فکری، فنی اور نظریاتی سطح پر اس دور کے ترقی پسند ادیبوں نے ان کا مقابلہ کیا۔ ازبکستان میں اشتراکی ادب کے ان اولین معماروں میں حمزہ حکیم زادہ نیازی، موسیٰ ایبک، غفور غلام، عبداللہ قہار اور میر تیمور کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان ادیبوں نے روسی زبان و ادب کا مطالعہ کر کے ازبکی زبان میں ناول، ڈرامہ، افسانہ اور نظم جدید کے اولین نمونے پیش کئے۔ ایک جانب انھوں نے قدامت پرستانہ خیالات، فرسودہ رسم و رواج، توہم پرستی، ضعیف الاعتقادی، جہالت اور عورتوں کے حقوق کی پامالی کے خلاف آواز بلند کی تو دوسری طرف خلاقانہ محنت کے کرشموں اور ان عظیم اشتراکی کارناموں کے رزمیہ گیت گائے جو عوام کی زندگی کو نئی برکتوں اور آسائشوں سے مالا مال کر رہے تھے۔ اس دور کی ازبکی شاعری میں جرأت و ہمت، ایثار و دیانت، عزم و استقلال اور تعمیر و تسخیر کے بے مثل اور برگزیدہ انسانی جذبات ایک رزمیہ شان و شکوہ کے انداز میں ملتے ہیں۔

چونکہ دورِ جدید کے بیشتر ازبک شاعر گاؤں کے مفلوک الحال دہقانوں اور محنت کش عوام کی صفوں سے آئے ہیں اس لئے ان کی شاعری میں کلاسیکی روایات کے احترام کے ساتھ ساتھ عوامی زبان اور گیتوں کی سادگی، حقیقت پسندی اور ایسا جوش و ولولہ ملتا ہے جو اجتماعی تجربات میں شریک ہونے سے پیدا ہوتا ہے۔ یوں بھی عوامی اقدار کے اس دور میں کلاسیکی ادب اور شہری زندگی کے جاگیردارانہ کلچر پر دیہاتی اور عوامی آرٹ اور کلچر کا اثر انداز ہونا فطری اور ناگزیر تھا۔ اور اسی کے نتیجہ میں ایک نئی جمالیاتی میزان بھی وجود میں آ رہی تھی اور یہ عمل ابھی جاری ہے۔

میر تیمور اور غفور غلام کی شاعری اسی رجحان اور رویے کی نمائندہ ہے۔ میر تیمور کی نظمیں جوش ملیح آبادی کی یاد دلاتی ہیں اگرچہ ان کے یہاں وہ گھن گرج، ہیجان اور لفظی امارت نہیں جو جوش سے مخصوص ہے لیکن اجتماعی زندگی کی رفتار اور مظاہر فطرت کی رنگا رنگی کا احساس اور اپنے تجربات کا برجستہ اظہار دونوں کے یہاں مشترک ہے۔ میر تیمور فطرت کے صد رنگ جلووں کے احساس کے باوجود اس کے مظاہر کو ایک رومان پرست کی طرح صرف بے چین روح کی آسودگی کا ذریعہ نہیں سمجھتے اگرچہ "صحرائی پھول" اور "سفید بادل" جیسی نظموں میں وہ فطرت کے اضطراری اور ازلی رقص میں انسانی روح کی معصومیت اور رعنائی کی قوت کا مشاہدہ کرتے ہیں جہاں فطرت سے ہم آہنگی کا احساس بھی جھلکتا ہے لیکن بالعموم ان کی نظموں میں فطرت کی سرکشی، بے رخی، اس کی ستم کشی کا احساس، اور اس کی تسخیر کا جذبہ ہی نمایاں نظر آتا ہے۔ ایک نظم "ساحل آمو پر" کا یہ ابتدائی بند ملاحظہ ہو۔

مشتعل، بے چین، بے کل بے عناں
برق رو، پر ہیبت و کف در دہاں
ریگ زاروں کی متاعِ بے بہا
ڈولتا گاتا مچلتا جھومتا
کتنی صدیوں سے ہے بس یونہی رواں

—— . . ——

اپنے پہلو میں چھپائے چشمہ ہائے گرم و سرد
خارزاروں، جھاڑیوں میں دوڑتا
جنگلوں کی کلفتوں کو جھیلتا
خشک لب صحراؤں کو چھوتا ہوا
چومتا ہر پیڑ کے قدموں کی خاک
بخشتا ہے قوت و عزم و حیات

—— . . ——

تو مقدس ہے مبارک ہے مگر
روح تیری سرکش و وحشت زدہ
گونج تیری نیم شب میں جیسے ضیغم کی صدا
جلکو سنگر کانپتے ہیں تیرے ساحل بار بار
دیو کی مانند تیرا غیظ ہیبت خیز ہے
اے تلون کیش دشت ترکماں کے راہوار
آب جوئے نیل کی مانند تیرا سیل آب
توڑ کر ساحل بپھر جاتا ہے میدانوں میں جب
بستیوں کو کھیتیوں کو روند دیتا ہے سدا
تیرے طوفانوں کی زد میں جو بھی آیا مٹ گیا

اس کے بعد شاعر کا تخیل دریائے آمو کے ساحل پہ برپا ہونے والے تاریخ کے بعض ہنگاموں اور سانحوں کو دیکھتا ہے جب تیمور ملک چنگیزی قبائل سے بنرد آزما تھا اور پھر جب بہار (امن) کی بیک ہواؤں کے دوش پر آگاہی (ایک کلاسیکی شاہکار نظم) کی جادوانی سطریں دنیا میں ہر طرف ترنم بکھیر رہی تھیں وغیرہ، نظم کے آخری چار مصرعے ملاحظہ ہوں

تو بہت مغرور ہے گستاخ ہے سفاک ہے
تیری ہر موجِ رواں اک شعلۂ بیباک ہے
دیکھ لیکن آرہا ہے عہدِ نو کا آدمی
اپنی باہوں میں جکڑنے تیرا زورِ سرکشی

یہ محض خواب نہیں تھا۔ اس نظم کے چند سال بعد ہی ازبک عوام نے آمو پر بند کی تعمیر کرکے اس کا رُخ موڑ دیا جسکے نتیجہ میں ہزاروں ایکڑ بنجر زمین سیراب ہوگئی اور اس سے حاصل ہونے والی برقی قوت نے ملک کی صنعت کاری کو فروغ دیا۔

میر تیمیر کی طرح ازبکستان کے دوسرے ممتاز شاعر غفور غلام ہیں جو پچھلے سال ۱۹۶۶ء میں ۶۳ سال کی عمر میں وفات پاگئے۔ موصوف نے ایک نجی گفتگو میں مجھے بتایا تھا کہ ان کا سلسلۂ نسب براہ راست امیر خسرو کے جدِ اعلیٰ تک پہنچتا ہے فارسی ان کی دوسری مادری زبان تھی۔ عربی اور روسی سے بھی بخوبی آشنا تھے۔ ان کی شخصیت نہ صرف یہ کہ مشرقی تہذیب کے جوہر بلکہ مشرق کی آزادی کے سچے جوش و ولولے سے معمور تھی۔ انھیں ازبکستان کے سب سے محترم اور محبوب قومی شاعر کا مرتبہ حاصل تھا۔ انھوں نے اشتراکی سماج کی تعمیر کے لئے تعلیم، صحافت اور فن و ادب کے میدان میں اپنی بہترین صلاحیتیں صرف کیں۔ ان کی شاعری جدید ازبکستان کی ذہنی اور جذباتی تاریخ ہے۔ نوجوان ادیبوں اور شاعروں کی ذہنی تربیت میں ان کا نمایاں اثر رہا ہے۔ یہاں ان کی شاعری کے رنگ و آہنگ کا ایک تصور دینے کے لئے ایک نظم "آب ولوز" پیش کرتا ہوں۔ ترکمانیہ کے ریگستانوں میں آمو دریا کا رخ موڑنے کے بعد دوسری جنگ عظیم کے آغاز پر ازبک عوام نے فرہاد نام کے پہاڑ کو کاٹ کر سیر دریا کو مرزا چول نام کے ریگستان میں لانے کا عزم کیا تاکہ یہ صدیوں کی پیاسی زمین سیراب اور شاداب ہوسکے۔

اس نظم میں شاعر نے ازبکی شاعری کی کلاسیکی روایات اور فرہاد و شیریں کی عوامی داستان سے جس طرح فائدہ اٹھایا ہے وہ ترجمہ میں بھی قارئین سے پوشیدہ نہیں رہیگا۔ نظم میں ان جوانوں سے خطاب ہے جو نازی حملہ آوروں کا مقابلہ کرنے محاذ پر گئے ہیں۔

دلیر بیٹو، جواں سپوتو، ہماری دھرتی کے سورماؤ
تمہاری لوحِ جبیں درخشاں رہے شگفتہ رہے ہمیشہ
ہمیشہ تم پر ہو سایہ گستر تمہارے باپوں کا نورِ شفقت
متاعِ صد برکت و سعادت ہو شیرِ مادر و مہرِ خواہر

تمہیں خبر ہے تمہارے شایانِ شان تحفہ کے طور پر ہم
کنارِ فرہاد اک حسیں یادگار تعمیر کر رہے ہیں
وہ اک شہکار ہوگی اپنے وطن کی خلاق محنتوں کی
کہ شیریں فرہاد کی حسین داستان میں ایسا رقم ہوا ہے

سنا ہے تم نے بھی یہ فسانہ کہ جس کا ہر واقعہ و منظر
ہمارے قلب و نظر میں اب تک ہزار داغ دل جگا رہا ہے
سنو کہ یہ خواب زار اپنا متاع تعبیر بن رہا ہے
بڑھو کہ تخیل کا کرشمہ عمل کے سانچے میں ڈھل رہا ہے

کوئی بھی ایسا مکاں ہوگا جہاں نہ بے خوش نصیبوں کے
جلے ہوں اور یہ لطیف قصہ جنھوں نے ملک نہ داں سنا ہو
یہی تو ہے وہ فسانہ جس کے فسوں میں ہر طفل دیر اپنے
سنہرے سپنوں کی مسکراتی حسین تعبیر ڈھونڈتا ہے

ہماری دیرینہ آرزو ہے کہ آب اور نور ہوں فراواں
ہزارہا سال سے یہ از ملک عوام کا خواب بن گیا ہے
جو دن گذارے ہیں تشنگی میں جو راتیں بے نور ہم نے کاٹیں
وہی تو ہیں اس فسانۂ بے ستون کا سرچشمۂ تخیل

سناتے آئے ہیں شیریں و کوہکن کے ناموں سے جو فسانہ
ہمارے سینہ میں آرزؤں کا گویا اک شب چراغ ہے وہ
یہ اک بہانہ تھا تاکہ امید کا سرا ہاتھ سے نہ جائے
کہ ساحل سیری تو منزل تھا اپنی پروازِ آرزو کا

یہ فخر کیا کم ہے آج ہم کو کہ ہم ہیں فرہاد عہد نو کے
ہمارے ہاتھوں میں ہے وہ تیشہ جو کاٹ کر رکھ دے پربتوں کو
ہمارے بازو میں ہے وہ کس بل جو باندھ دے سیل ندیوں کا
ہمارے عزمِ جواں کو فرہاد کا کرشمہ کہا گیا ہے

ہزارہا سال ہم نے گائی یہ داستان عجیب و شیریں

ہزاروں فرہاد دے گئے اپنے دل کو زخموں سے گل بنائے
پہاڑ جو سدّ آرزو ہے چلو کہ اب اس کو کاٹ پھینکیں
بنائیں ارضِ وطن کو اپنے قدیم خوابوں کا اک گلستان

حریفِ فطرت کے لشکروں پہ کئے جو بڑھ بڑھ کے ہم نے دھاوے
تو آب اور نور کے ذخیرے ہماری ضربوں سے جاگ اٹھے
عوام ہی کے یہ دست و بازو ہیں جن کی قوت سے ہیں خراماں
زمیں پہ نہریں، نہر میں لہریں عجیب انداز دلبری ہے

ہزار با لہلہاتے باغوں کی دلبری دفن ہے زمیں میں
کہ جن کے رازوں کا یہ امیں سیر دریا صدیوں سے سو رہا ہے
لگاؤ اس پیر تہ نشیں کو وہ ایک ٹھوکر کہ جاگ اُٹھے
بدن سمیٹے، ہوا میں نکلے فضا میں کچھ اپنا سر اٹھائے

ہمارا تیشہ ہمارا دیرینہ آشنا اک پکار سن کر
چمک کے اٹھا تو کوہ فرہاد پر کہیں جیسے برق تڑپی
ملگوں ملگوں سے جو ایک جا پر تنا کھڑا تھا وہ کوہ سرکش
ہمارے قہر و غضب سے لرزا ہمارے تیشہ سے کانپ اُٹھا

نہیں ہے کچھ دور وہ گھڑی اب ہمارے قدموں کے پاس ہی جب
جھکائے گا سر یہ سیر دریا، یہ برق رفتار رخشِ فطرت
بجھائے گا مرزا چول بھر اپنی پیاس، جی بھر کے سیر ہو کر
یہ دشت بے آب سیگوں آئینوں کا صحرائے نور ہو گا

یہ نظم جدید ازبک شاعری کے ایک غالب رجحان کی نمائندہ ہے۔ اس میں تسخیرِ فطرت کا مقدس جذبہ روح بنکر دوڑتا ہے
انقلاب سے پہلے ازبک عوام کی زندگی فطرت، سماج، مذہب اور حکومت الغرض گرد و پیش کے ہر مظہر، ہر ادارہ سے ہم آہنگی اور
خاموش مفاہمت کی آئینہ دار تھی۔

اور تسخیر و تعمیر کی حوصلہ خیز فضا میں بدل گئی۔ اس دور کی ازبکی شاعری بھی اسی روح عصر کی مظہر ہے۔ تسخیر و تعمیر اور اشتراکی انسان دوستی کے علاوہ جدید ازبک شاعری میں وطنیت پرستانہ جذبات و خیالات بھی نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ چونکہ لسانی بنیاد پر ازبک عوام کو پہلی بار ایک علیحدہ سوویت قومیت کا مرتبہ حاصل ہوا تھا اس لیے وسط ایشیا کی ایک ممتاز قوم کی حیثیت سے وہ اپنے ماضی اور اپنے اجداد کے تاریخی اور تہذیبی کارناموں پر فخر کرتے ہیں۔ چرچل نے ایک موقع پر ازبک لوگوں کو قبیلہ کہہ دیا تھا اس سے متاثر ہو کر غفور غلام اپنی ایک طویل نظم "شرق نامہ" میں لکھتے ہیں۔

اے مری قوم ملتِ ازبک * اے گُلِ آدم و ریاضِ نعیم

تیری تاریخ تیرا افسانہ * مصر و اہرام مصر سے بھی قدیم

وہ محلات خشت و سنگ کہ جو * شہر خوارزم کی اساس بنے

کسقدر ہیں قدیم و برتر وہ * اینگلو سیکسن تمدن سے

ہم نے جب چٹکیوں میں لمحوں میں * حل کیے مشکل و دقیق سوال

حرف اعداد و صوت کو ہم نے * دے دیا علم و فکر و فن کا کمال

اپنی دس انگلیوں کو بھی اس وقت * لارڈ چرچل کے بے زبان اجداد

گن نہ سکتے تھے اور آج انھیں * دعویٰ عظمت و نجابت ہے

جب ہماری کپاس سے اکثر * کرۂ ارض کے امیر و غریب

اپنے تن کو چھپایا کرتے تھے * اس سے بُنتے تھے وہ لباس عجیب

اس زمانہ کے غرب زادوں کی * عقل و دانش سمجھ سکی اتنا

کہ ہماری کپاس کا پنبہ * ہے درختوں کی بھیڑ کا ریشہ

اسی طرح اپنے ماضی کے علوم و فنون، فن تعمیر و زراعت اور تہذیبی فروغ پر فخر کرکے اور اس کے توانا عناصر کو جذب کرکے انھوں نے اپنے نئے اور اشتراکی قومی کردار کی تعمیر کی

اس میں شک نہیں، کہ سوویت اشتراکی ادب میں مریضانہ انفرادیت مجہول تصور پرستی اور ماورائیت کے لیے کوئی جگہ نہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس میں فرد کی ذات کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ اس برق رفتار کارواں کا ہر مسافر بہرحال اپنا ایک الگ وجود رکھتا ہے سفر کی صعوبتوں کا احساس، مناظر فطرت سحر وافسوں کا اثر، ساتھیوں کے بچھڑنے کا درد ہر مسافر کے یہاں اپنی شدت کیفیت اور نوعیت کے اعتبار سے مختلف رہا ہے۔ ان کے انفرادی تجربات سے صورت پذیر ہونے والا ان کا باطنی وجود دوسروں سے الگ پہچانا جاتا ہے ان کے دکھ درد ہی نہیں مسرتیں، آرزوئیں اور امنگیں بھی دوسروں سے مختلف ہیں لیکن اس میں کسی کو اختلاف نہیں کہ ان کا عزم سفر، ان کا کارواں، ان کی منزل مقصود ایک ہے اور کون ہے جو اس کارواں سے الگ ہو کر بھوک بیچارگی، تنہائی یا پھر جنگلی درندوں کا شکار ہونا پسند کرے گا۔ فرد کی ذات میں جو تبدیلیاں ہوئی ہیں ازبک ناول نگاروں اور ڈرامہ نگاروں نے انھیں کرداروں کی شکل میں حقیقت پسندانہ

ڈھنگ سے پیش کیا ہے۔ لیکن جدید ازبکی شاعری میں بھی انفرادی تجربات کی حسن کارانہ مصوری ملتی ہے۔ حمید عالم جان، مقصود، شیخ زادہ، شاہ محمود رحمت اللہ دلی سخن از رضیہ خانم، سعیدہ اور دیگر نوجوان شعرا رکے شعری مجموعوں میں ایسی بے شمار نظمیں ملتی ہیں جن کا اجتماعی جدوجہد سے براہ راست کوئی تعلق نہیں۔ یہ نظمیں اپنے محبوب اعزا، فطرت اور کائنات کی بے شمار اشیاء و مظاہر سے شاعر کے ذہنی جذباتی اور روحانی رابطوں کی دلکش کہانیاں کہتی ہیں۔ حمید عالم جان نے "وادی نجف" کے عنوان سے اپنے وطن کی فرغانہ کی شاداب وادی پر جو نظم لکھی اور "انا" کے عنوان سے اپنے ماں کی موت پر جو طویل مرثیہ لکھا ان کا شمار ازبکی شاعری کے شاہکاروں میں ہوتا ہے۔ حمید عالم جان کو بیک وقت ازبکی زبان کا پشکن اور مایا کوفسکی کہا جاتا ہے۔ یہ نوجوان شاعر جب ایک موٹر حادثہ میں زخمی ہو کر مر گیا تو اس کی بیوی اور ازبکی زبان کی ممتاز شاعرہ زلفیہ نے اس کی یاد میں جو درد بھری نظمیں لکھیں وہ جدید ازبکی شاعری کے فن پاروں میں شمار ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر زلفیہ کی نظم "بہار آئی تیری تلاش میں" یا "میرے سارے گیت ہیں تیرے" یا "تیرے درد کے لئے زندہ ہوں" جدید ازبک شاعری کی شاہکار نظمیں ہیں۔ ان میں جذبہ کی جو شدت، احساس کی لمسیت اور تخیلی نزاکت ہے وہ کم شاعروں کو نصیب ہوئی ہے۔ ان شعرا رکے کلام میں صحت مند رومانیت اور ایسی لطیف اشاریت ہے جو باطنی تجربات کو دھندلانے کے بجائے روشن بناتی اور اس طرح ابلاغ کا سہارا بنتی ہے۔ بعض شعرا ر نے علامتی اور تمثیلی انداز کی نظمیں بھی لکھیں لیکن ان کا ہر تجربہ اظہار و ابلاغ کے نئے سانچوں اور اسی طرح نمو پذیر فن کی نئی منزلوں کی دریافت کا درجہ رکھتا ہے۔

حمید عالم جان کی نظموں میں شاعرانہ تجربہ اور تخیل کی جو نزاکت اور اظہار میں جو شیرینی اور رمزیت ہے اس کی وجہ سے ترجمہ میں ان کی شعری روح کی بازآفرینی بہت دشوار ہے۔ نمونے کے طور پر ایک مختصر نظم "خوبانی کے شگوفے" ملاحظہ فرمائیے۔

خوبانی کے شگوفے

سامنے کھڑکی کے میری
ایک خوبانی کا پیڑ
ہو گیا ہے سر سے پا تک پھر حسیں پھولوں میں غرق
اس کی نازک ٹہنیوں میں پھر شگوفے کھل گئے
نو دمیدہ، نرم، چاندی کی طرح
ہر سحر جو زندگی کو تام دیتے ہیں کوئی
اور پھر بادِ صبا
ان کی خوشبو کو فضا میں لے کے یوں اڑتی ہے
جیسے ابر کے آغوش میں ہو موجزن روحِ بہار

یہ وہ رُت ہے
جو سدا آتی ہے جانے کے لئے
اس کی اس تکرار میں افسوں بھی ہے اسرار بھی

موسم گل کی ہوائیں
میرے پہلو سے گزرتی زیر لب کہتی ہیں
تو ہے خوش نصیب!
باغ میں اتروں
تو طائر پھول' کلیاں، کونپلیں
سب چہچہا کر مسکرا کر مجھ سے کہتے ہیں کہ
تو ہے خوش نصیب!
گونجتا ہے نغمۂ خوش طالعی ہر کنج میں
مجھ سے کہتی ہے بہار
لے ترے قدموں میں ہے پھولوں کا اک عالم نثار
چن کے بھر لے اپنا دامن تا کنار
اس چمن کی بخت ہے بیدار
اس جا رنگ افشاں گردش لیل و نہار

پھول اس وادی میں ایسے بھی کھلے ہیں
جن کو ساری عمر لاکھوں آدمی ترسا کئے
تو نے دیکھیں وہ بہاریں جن کی حسرت لے کے
صدہا لوگ روتے چل بسے
سامنے کھڑکی کے میری
ایک خوبانی کا پیڑ
ہو گیا ہے سر سے پا تک پھر جیسے پھولوں میں غرق

اس میں شک نہیں کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد سارے سوویت ادب میں اور اس طرح از بکی شعر و ادب میں تخلیقی اضمحلال، ذہنی درماندگی اور یاسیت کی ایک لہر آئی۔ کم و بیش سات سال تک سوویت شاعری میں درد و یاس اور شکست و محرومی کی ایک ایسی موج تہ نشین معلوم ہوتی ہے جو اس سے پہلے کسی دور میں نہیں تھی۔ اس زمانہ میں ایسی ہی شاعری مقبول عام تھی ظاہر ہے کہ اس رجحان کے اسباب تھے۔ انقلاب کے بعد اپنی ۲۵ سالہ لگاتار محنت اور شب و روز کی جانفشانی سے انھوں نے اپنے ملک میں جو عظیم تعمیرات کی تھیں اور مستقبل قریب میں جس ارضی جنت کے خواب دیکھے تھے پانچ سالہ جنگ نے ان کے ملک کو ایک کھنڈر اور آسیب زدہ ویرانے میں بدل دیا اور ان کے معصوم خوابوں کا رنگ محل مسمار ہو گیا۔ انسانی تاریخ میں کسی ملک نے اتنی اور ایسی مادی، مالی اور جانی تباہی اور ہلاکت کا منظر نہیں دیکھا جتنا کہ سوویت یونین نے اور اس کے ساتھ یہ بھی سچ ہے کہ کسی ملک کے عوام نے ایسی پامردی استقامت، جرأت، شجاعت اور جانبازی سے دشمن کا مقابلہ نہیں کیا جیسا کہ سوویت عوام نے چند سال کی جنگ میں تیس لاکھ جوانوں نے اپنی جانیں قربان کر دیں لیکن جنگ کے بعد جب انھوں نے اپنے گھروں، اپنے شہروں اور بستیوں میں اپنے بھائیوں، باپوں اور بچپن کے دوستوں کو تلاش کیا تو ان کے دل اتھاہ دکھ سے بھر گئے۔ ان کی روحیں نڈھال ہو گئیں حوصلے شل ہونے لگے۔ چنانچہ اس دور کی سوویت شاعری میں حالات کے فطری نتیجے کے طور پر یاسیت پسندانہ انفرادیت کا رجحان غالب نظر آتا ہے۔ اس رجحان کا ذکر سوویٹ کمیونسٹ پارٹی کی ۱۹۴۶ء کی ادبی رپورٹ میں بھی ملتا ہے۔

آ!۱ احمد و دا کی ایک نظم ایک دوست کی یاد میں ملاحظہ فرمائیے۔

فتح کے ایام میں
دھند سناٹا سسکتی دھوپ میں ڈوبی
سحر کے پرفسوں ہنگام میں
ایک بیوہ کی طرح
میں بے نشاں بے نام مرقد پر کھڑی
اور فضا میں ہر طرف
بے کلی سے پھر رہی ہے موسم گل کی ہوا
میں دو زانو ہو گئی
خورشید نرم اور شفاف کلیاں
ہر طرف بکھری ہوئی
ان کے پہلو میں جو میں نے سانس لی
ہر نفس میں تازگی محسوس کی
اک اچھوتا ارتعاش، ایک لمس اجنبی
اور پھر دھیرے سے آنسو کے

اس زمیں کے تقارض گلزیک سے
ایک تتلی میں نے پکڑی
اور اس کو زرد پھولوں کی طرف
پھونک سے اپنے اڑا کر
چپ کھڑی تکتی رہی

اس نظم میں شاعرہ کے دھیمے دھیمے درد نے جو نشتریت اور تشنگی پیدا کی ہے ظاہر ہے وہ ترجمہ میں نہیں آسکی لیکن اس کی دلکش دل انگیز علامتی فضا کو میں نے پوری طرح گرفت میں لینے کی کوشش کی ہے۔ نظم میں یاس و حسرت کی موج تہ نشین ہونے کے باوجود نو دمیدہ کلیوں کے آغوش میں سانس لے کر تازگی اور زندگی محسوس کرنے کا جو اشارہ ہے وہ امید اور زندگی پر ایمان کی علامت ہے۔ انسان نہیں مرتا۔ زندگی امر ہے ہر خزاں کے بعد بہار آتی اور نئے نورس شگوفے کھلتے ہیں آخر میں زرد پھولوں کی طرف اس کی پکڑی ہوئی رنگین تتلی کی پرواز اس کے دوست کی موت، جدائی اور موت کی وادیوں کی طرف فرد کا ازلی سفر ہے۔

اس دور میں بہت سے شاعروں نے پارٹی کے تعمیری لائحہ عمل کی پیروی کرتے ہوئے بلند آہنگ جوشیلی اور خطیبانہ نظمیں لکھیں لیکن وہ بے کیف اور بے اثر ٹھہریں اس لئے کہ وہ ان کی شکستہ روح کی آواز نہیں تھیں۔ عوام میں بھی یہ نظمیں مقبول نہیں ہوئیں لیکن ۱۹۵۰ء کے بعد جیسے جیسے ملک کی نئی تعمیر کے کام نے فروغ پایا اور عمل کی برقی قوت نے جنگ کی ہلاکت اور دہشت کے سلبی اور منفی اثرات کو مٹایا شعر و ادب میں بھی آرزومندی اور حیات افروزی کی لَے تیز ہو گئی اور آج پھر ان کا ادب اس کاروان کیف و مستی کی خوشخرامی بے مثل انسان دوستی، تقدیس محنت، ارضیت اور رجائیت کا آئینہ دار ہے۔

گذشتہ بیس سال کی ازبکی شاعری اس نئی سوویت تہذیب کے رنگارنگ پہلوؤں اور اس نئے انسان کے نو بہ نو تجربات کی داستان ہے جو ایک نئی دنیا کی تخلیق کر رہا ہے اس دور میں ایک طرف ایسے بزرگ شاعر نظر آتے ہیں جنھوں نے کلاسیکی روایات اور رموز و علائم کو نئے مفاہیم سے آشنا کیا۔ دوسری طرف نئی پود کے ایسے شاعر جنھوں نے نئے ذہن و احساس کو اور نئی حقیقتوں کے اظہار کے لئے نئے تخلیقی اور ہیئتی سانچے تلاش کئے۔

بزرگ شعراء میں میرتیمیر، زلفیہ خانم، ایبک، حمید غلام اور شیخ زادہ کے علاوہ شاہ محمود کی خدمات کا ذکر ناگزیر ہے۔ عمر خیام کے ترجم

انا احمد بوا ازبکی شاعری کی نہیں بلکہ سوویت شاعری کی نمائندہ ہیں۔ یہ تاتار خاتون سوویت دور کے سب سے عظیم دانشوروں اور فنکاروں میں سے ایک ہیں۔ ایلیا اہرن برگ نے اپنی ایک تصنیف میں ان کے کارناموں کا ذکر عقیدت سے کیا ہے وہ جون ۱۸۸۹ء میں پیدا ہوئیں اور انقلاب سے پہلے مدت تک پیرس اور روم میں جلاوطنی کی زندگی گزاری اور وہاں کی ذہنی اور فنی تحریکوں سے متاثر ہوئیں لیکن ان کے انقلابی شعور، عوام دوستی، اور وطن پرستی نے ان کی شخصیت کو ان تحریکوں کے انحطاطی اثرات سے پاک رکھا۔ وہ کہتی ہیں۔ آرٹ اور شاعری کے بغیر میرے لئے زندہ رہنا ممکن نہیں اور میری شاعری کا آہنگ میرے وطن کی زندگی کا زیر و بم اور اس کے جانبازانہ کارناموں کا آہنگ ہے

کی حیثیت سے ازبکی ادب میں انھیں وہی مقبولیت حاصل ہے جو انگریزی میں فٹز جیرالڈ کو۔ انھوں نے حافظ اور دیگر فارسی شعراء کے فکر و فن پر عالمانہ مقالے لکھ کر انھیں ازبک قارئین سے روشناس کرایا۔ مشرقی ادب کے ناقد اور محقق ہونے کے ساتھ ساتھ شاہ محمد روف ایک ممتاز شاعر بھی ہیں ان کی رباعیات اور نظمیں سوویت انسان کی باطنی شائستگی، روحانی برگزیدگی اور اخلاقی پاکیزگی کی ترجمان ہیں اور اس لحاظ سے وہ ایک منفرد رنگ رکھتی ہیں

شاہ محمد روف کی ایک نسبتاً مختصر نظم ملاحظہ فرمایئے عنوان ہے "جوان سائے"

ہم عہد جنوں میں بھی اسی راہ سے گزرے
ہاتھوں میں دیئے ہاتھ محبت کی پئے سے
کس شوق سے تکتے تھے ہمیں چاند ستارے
پہلو میں سدا چلتے تھے دو سائے ہمارے

مدت ہوئی اس دور کو اب بال ہیں چاندی
گلرنگ جبینوں پہ اُبھر آئیں لکیریں
اور آج اسی راہ پہ ہم پھر ہیں خراماں
ہمزاد تھے جو عہد جوانی میں ہمارے
آگے کبھی پیچھے ہیں وہی رینگتے سائے
ہم بدلے مگر یہ تو بدلنے نہیں پائے

ایسے بھی ہیں کچھ لوگ جو اے جان تمنا!
اک عمر گزر جاتی ہے بوڑھے نہیں ہوتے
رہتے ہیں بس اک حال میں وہ جاگتے سوتے
احساس ہے جذبہ ہے نہ ہیجان و جنوں ہے
سائے کی طرح ان کے جہاں میں بھی سکوں ہے

سایے کی طرح پر کسے جینے کی ہوس ہے

اس عہد کے نئے اور نمائندہ شعراء میں ارکن عاصدوف، بیرات باستے قابوف، نظام کاملوف، گلشن فولاد حمید اور

بیند نطافوف کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان کے یہاں فرد کی حیثیت اور سوویت سماج کے مختلف مظاہر سے اس کے روابط کا احساس زیادہ شدید ہے ان کی نظموں میں انفرادی تجربات، روزمرّہ زندگی کے مشاہدات اور گاؤں کی کھلی فضا سے قربت زیادہ نمایاں ہے۔ اس دور کے سوویت معاشرہ میں فرد کے مسائل، اس کے بدلتے ہوئے مطالبات اور انفرادی فکر کی اہمیت کے بارے میں جو رویہ اختیار کیا گیا ہے اس نے بھی شعر وادب میں نئے رجحانات کو تقویت بخشی۔ اس سلسلہ میں ایک اہم بات یہ ہے کہ سوویت فنکار یا ادیب بالعموم پیشہ ور نہیں ہوتا۔ وہ کسی نہ کسی شعبہ سے وابستہ ہو کر سوویت معشیت یا سوویت سماج کی تعمیر میں حصہ لیتا اور اس کے ساتھ ہی فن کی تخلیق بھی کرتا ہے۔ اس لئے بدلتی ہوئی زندگی سے اس کا براہ راست تعلق اور اس کے فروغ میں اس کا عملی حصہ اگر ایک طرف اس کی تخلیقی فکر کے سوتوں کو زندہ اور تر و تازہ رکھتا ہے تو دوسری طرف اشتراکی سماج اور اشتراکی اقدار پر اس کے ایمان کو استحکام بخشتا ہے۔ صرف یہی نہیں عملی زندگی سے اس کا رابطہ اس کے تخیل کو بھی توانائی اور شادابی دیتا ہے۔ مثال کے طور پر ذوت کینچک، سعید آلالف قراقلپاق کے ایک ماہی گیر شاعر ہیں ان کی اکثر نظموں کے موضوعات علامات اور استعارے سمندری دنیا سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان شعرا نے اپنے تجربات کے اظہار کے لئے نئے محاورے، نئے فارم، اور نئے علائم ضرور تلاش کئے ہیں اور بعض کی نظموں میں تمثیلی یا علامتی اظہار اور درون بینی کا عنصر بھی غالب ہے۔ لیکن ان کی داخلیت اور حقیقت پسندانہ اشاریت میں تخیلی نزاکت اور لطیف تہ داری کے باوصف مریضانہ یاسیت اعصاب زدگی یا ابہام کا شائبہ تک نہیں اس لئے کہ انسان اور زندگی سے پیار ان کی تخلیقی فکر کا جوہر ہے۔ ایک نوجوان ازبک شاعرہ سعیدہ کی ایک نظم سے اس شعری رجحان کا اندازہ کیجئے

> بچے نے بے سوچے سمجھے پھینک دیا اک بیج زمیں پر
> لیکن اس کو خبر نہیں تھی
> یہی تو تھی اس کی اک خواہش
> بیج نے دھرتی کے سینہ کا بوسہ لے کر
> اپنے خشک لبوں سے کہا
> دیکھو میں زندہ ہوں
> اب میں نہیں مروں گا
> نہیں مروں گا

اس طرح کی بے شمار نظمیں جدید ازبک شاعری میں اس نئے تخلیقی شعور کی نمائندہ ہیں جس کی تربیت سوویت اشتراکی تہذیب کی ترقی پسند اور صحت مند قدروں سے ہوئی ہے۔

انقلاب سے پہلے جس زبان کا سرمایہ ادب چند درباری اور مثنویوں تک محدود تھا آج اس کے جدید شعر و ادب کو ایشیا کی بعض ترقی یافتہ زبانوں کے مقابلے میں رکھا جا سکتا ہے۔ انھوں نے فن و ادب کو جو انسانی ذہن کی اعلیٰ ترین تخلیق ہے ایک مخصوص گروہ کے

اجارہ سے نکال کر عام اور محنت کش انسانوں تک پہنچایا۔ ازبک ادیبوں اور شاعروں نے شیکسپیئر، گوئٹے، خیام، حافظ، کالیداس، غالب، پشکن، ٹیگور، پریم چند اور اقبال کے شاہکاروں اور دنیا کی دوسری زبانوں کے بہترین ادب کے ترجمے کر کے اپنی زبان کو اور اپنے عوام کو عالمی ادب کے معیاروں سے آشنا کیا۔ جدید ازبکی شاعری ازبکی اشتراکی کلچر اور تہذیب کی ہمہ جہتی ترقی کا ہی ایک حصہ ہے اور اس کلچر میں ایسی تازگی توانائی روشنی اور قوت ہے جو عالمی تہذیب کے ارفع مظاہر اور زندگی کی حقیقتوں کے عرفان سے پیدا ہوئی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں اشتراکی ملکوں میں تخلیقی سرگرمیوں کی بعض دشواریوں اور اس کے بعض مضر اثرات کا منکر ہوں۔ یا میرے نزدیک ساری سوویت ازبکی شاعری بلند پایہ شاعری ہے۔ تاہم یہ بھی سچ ہے کہ میں نے اشتراکی ملکوں میں پیدا ہونے والے ادب کے رطب و یابس کو ان کے حریف سامراجی ملکوں میں پیدا ہونے والے ادب کے رطب و یابس سے معنویت اور کیفیت کے اعتبار سے بلند اور بہتر پایا۔ بہرحال یہاں میرا مقصد سوویٹ ازبکی شعر و ادب کا تنقیدی مطالعہ نہیں بلکہ اس کے اہم رجحانات کا جائزہ اور اردو قارئین سے اس کا تعارف رہا ہے۔

یوری کزاکوف
ترجمہ امینہ عکس

روٹی کی خوشبو

تار پہلی جنوری کو پہنچا۔ دوسیا باورچی خانے میں تھی اور تار اس کے شوہر نے کھولا۔ کا خمار اب بھی باقی تھا۔ بنیان پہنے، جمائی لیتے ہوئے اس نے دستخط کیئے اور سوچا نہ جانے کس نے مبارک بادی کا تار بھیجا ہے۔ یونہی جمائی لیتے ہوئے اُس نے اس مختصر سے رنج بھرے تار میں دوسیا کی ماں کی موت کی خبر پڑھی۔ اس کی ستر سالہ بوڑھی ماں کی ایک دور دراز دیہات میں موت کی خبر۔

"بے موقع موت ہوئی!" اُس نے گھبرا کے سوچا اور بیوی کو آواز دی۔ دوسیا کو رونا نہیں آیا۔ صرف اس کی رنگت زرد پڑ گئی اور وہ اپنے کمرے میں جاکر میز پوش سیدھا کر کے بیٹھ گئی۔ شوہر نے میز پر رکھی بوتلوں کی جانب دیکھا جس میں اب بھی کچھ باقی تھا، اپنے لئے اُنڈیل کر پی گیا۔ پھر کچھ سوچ کر دوسیا کے لئے انڈیلا

"آؤ تم بھی پیو!" وہ بولا، لعنت ہے سر بالکل پھٹا پڑتا ہے۔ اے بھئی!.... ایک دن سب کو یہی راہ جانا ہے۔ تمھارا کیا ارادہ ہے، گھر جاؤ گی۔"

دوسیا خاموش رہی۔ میز پوش پر ہاتھ پھیرتی رہی۔ پھر گلاس اُٹھا کر پی لیا اور اندھوں کی طرح اپنے پلنگ کا رخ کیا، اور جا لیٹی۔

"مجھے نہیں معلوم۔" وہ ایک منٹ بعد بولی۔

شوہر دوسیا کے قریب گیا اور اس کے بھرے بھرے جسم کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔

"خیر ٹھیک ہے .... اب کیا کیا جائے، اب تم کیا کرو گی!—" اس سے زیادہ وہ اور کچھ نہ کہہ سکا۔ میز کی جانب لوٹ آیا اور اپنے لئے پھر تھوڑی سی اُنڈیلی۔ خدا کی قدرت ہے۔ اسب ہی کو وہاں جانا ہے!

دوسیا دن بھر بے جان سی فلیٹ میں اِدھر اُدھر پھرتی رہی۔ اُس کے سر میں درد تھا۔ اور وہ کسی سے ملنے نہیں گئی۔ وہ چاہتی تھی کہ پھوٹ پھوٹ کے روئے۔ مگر رونا کسی طرح نہیں آتا تھا۔ بس دل بھاری تھا۔ اپنی ماں کو دوسیا نے پندرہ برس سے نہیں دیکھا تھا۔ جب سے دیہات چھوڑا تھا کبھی بیتے دنوں کا خیال تک نہیں کیا تھا۔ اور اگر کبھی خیال آیا بھی تو بچپن کے زمانے کا اور یا اُن دنوں کا جب وہ کم عمر لڑکی تھی اور اکثر اس کے ساتھی اسے کلب لے کر

چھوڑنے آتے تھے۔

ودوسیا نے پرانی تصویروں کو الٹ پلٹ کرنا شروع کیا مگر رونا پھر بھی د آیا۔ تمام تصویروں میں ماں کا چہرہ کچھ اجنبی سا معلوم ہوا۔ آنکھیں سوجی سوجی سی اور بھاری بھاری باہیں شانوں سے نیچے کو ڈھلکی ہوئی۔

رات کو بستر میں لیٹی ہوئی ودوسیا دیر تک شوہر سے باتیں کرتی رہی اور بالآخر بولی۔

"میں نہیں جاؤں گی، جاؤں گی بھی کہاں، اب میرا وہاں رہ ہی کیا گیا۔ جو کچھ بچا کھچا ہوگا اُس پر غالباً رشتہ داروں نے قبضہ کرلیا ہوگا۔ وہاں رشتہ داروں کی کمی نہیں۔ نہیں میں نہیں جاؤں گی!"

جاڑے ختم ہوگئے، اور ودوسیا ماں کو بھول گئی۔ شوہر اچھے کام سے لگا تھا۔ سب طرح کا آرام انھیں میسر تھا اور ودوسیا اور زیادہ خوبصورت لگنے لگی۔

مگر پھر مئی کے شروع میں اپنے بھانجے میتا کا خط اُسے ملا۔ اسکول کی کاپی کے کاغذ پر یہ خط کسی نے لکھوایا تھا۔ تمام ان گنت رشتہ داروں کی طرف سے دعا سلام کے بعد میتا نے لکھا کہ نانی اماں کا گھر اور اُن کا سب سرمایہ اپنی جگہ پر ویسے ہی موجود تھا اور ودوسیا کو آجانے کی تاکید کی تھی۔

"جاؤ ہو آؤ!" شوہر بولا "جاؤ، زیادہ ٹھہرنا مت، جلدی سے جلدی جو کچھ وہاں ہے، بیچ کر آجاؤ۔ ورنہ دوسرے فائدہ اٹھائیں گے اور یا Kolhoz اُن پر قبضہ کرے گا۔"

اور ودوسیا روانہ ہوگئی۔ بہت مدت سے اُس نے سفر نہیں کیا تھا اور اس دفعہ فاصلہ خاصا تھا۔ مگر سفر لوگوں سے اِدھر اُدھر کی باتوں میں خوب مزے سے کٹ گیا۔

اُس نے اپنے آنے کا تار بھی بھیجا تھا مگر نہ جانے کیوں کوئی اُس کے استقبال کو اسٹیشن نہ پہنچا اور وہ مجبوراً پیدل چل پڑی مگر اس میں بھی ودوسیا کو خاصا لطف آیا۔ پکّی سڑک تھی جس پر اچھی آمد و رفت تھی اور اس کے ہر دو جانب دور دور تک پھیلے ہوئے اس کے وطن سمولنسک Smolensk کے ہرے بھرے کھیت اور اُن کے سروں پر افق سے ہم آہنگ گھنے جنگل دکھائی دے رہے تھے۔

کوئی تین گھنٹے اپنے گاؤں پہنچی۔ دریا پر سے گزرتے ہوئے نئے پل پر وہ رک گئی اور ذرا چاروں طرف دیکھا۔ دیہات میں اتنی کچھ نئی تعمیرات ہوئی تھیں، جا بجا سفید سفید فارم کی عمارتیں کھڑی تھیں کہ وہ اسے فوراً پہچان نہ سکی اور ودوسیا کو یہ تبدیلیاں کچھ پسند نہیں آئیں۔

سڑک پر چلتے ہوئے وہ راہگیروں کو غور سے دیکھا کی کہ شاید کسی کو پہچان سکے۔ مگر تقریباً سب لوگ اجنبی معلوم ہوئے البتہ کئی لوگوں نے اسے پہچان لیا۔ اسے روکا اور تعجب کا اظہار کیا کہ وہ اتنی بڑی ہوگئی تھی۔

اُس کی بہن ودوسیا کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی، رو پڑی اور بھاگ کر سماوار چڑھا دیا۔ ودوسیا نے تھیلے میں سے

تختے نکالنے شروع کئے۔ بہن تختے دیکھ کر پھر سے رو پڑی اور ردوسیا کو سینے سے لگا لیا۔ بیٹا بنچ پر بیٹھا حیران تھا کہ وہ کیوں رو رہی ہیں۔

دونوں بہنوں نے بیٹھ کر چائے پی اور ردوسیا کو پتہ چلا کہ اکثر چیزوں پر رشتہ داروں نے قبضہ کر لیا تھا۔ ڈھور ڈنگر ایک بھیڑ کا بچہ، بکری اور مرغیاں بہن نے لے لی تھیں۔ ردوسیا کو دل ہی دل میں ذرا ملال ہوا مگر جلد ہی وہ یہ سب بھول گئی اور اس لئے بھی کہ ابھی کافی چیزیں باقی تھیں، خصوصاً ماں کا مکان۔ چائے کے بعد جب خوب جی بھر کر باتیں کر چکیں تو بہنیں مکان دیکھنے چلی گئیں۔

مکان کے گرد کھیتی جتی ہوئی تھی اور ردوسیا کو بہن سے سن کر تعجب ہوا کہ یہ پڑوسیوں نے جوتی تھی کہ زمین بے کار نہ رہ جائے۔ ردوسیا کا خیال تھا کہ مکان بڑا ہوگا۔ مگر وہ اسے بہت چھوٹا معلوم ہوا۔

کھڑکیاں تختے لگا کر بند کر دی گئی تھیں اور دروازوں پر قفل لگا تھا۔ پہلے تو بہن دیر تک اسے کھولنے کی کوشش کرتی رہی۔ بعد میں ردوسیا نے کوشش کی اور جب اُسے کھولا بھی تو دونوں بہنیں بالکل تھک چکی تھیں۔

گھر بالکل تاریک تھا، روشنی بہ مشکل تختوں کی درازوں سے چھن چھن کر اندر آ رہی تھی۔ مکان سیل گیا تھا اور اُجاڑ پڑا تھا۔ پھر اچانک کہیں سے روٹی کی خوشبو آئی۔ وہ خوشبو جس سے ردوسیا بچپن سے آشنا تھی۔ اور ردوسیا کا دل دھڑکنے لگا وہ ایک کوٹھری میں اِدھر اُدھر گئی اور تاریکی میں چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ گہرے بھورے رنگ کی نیچی چھت تھی، اب بھی دیواروں پر فوٹو آویزاں تھے۔ مگر صرف ایک مقدس آئکون[۱] کے علاوہ اور آئکون اب نہ تھے اور صندوقوں اور چولھے[۲] پر کشیدہ کئے ہوئے کپڑے بھی اب موجود نہ تھے۔

جب ردوسیا اکیلی رہ گئی تو اس نے ایک صندوق کھولا۔ فوراً ماں سے وابستہ خوشبو اُسے آئی۔ صندوق میں بوڑھی ماں کے گہرے رنگ کے اسکرٹ، لباس، ایک پرانا فرکوٹ رکھے تھے۔ ردوسیا نے یہ سب چیزیں باہر نکالیں۔ انھیں دیکھا اور ایک دفعہ پھر مکان کا جائزہ لیا۔ خالی صحن کی طرف دیکھا اور اسے ایسا معلوم ہوا کہ یہ سب کچھ اُس نے کبھی۔ بہت مدت ہوئی محض خواب میں دیکھا تھا اور آج وہ اپنے اس خواب میں گویا واپس لوٹ آئی تھی۔

یہ سن کر کہ چیزیں بیچی جائیں گی پڑوسی عورتوں نے ردوسیا کے پاس آنا شروع کیا۔ انھوں نے غور سے ہر چیز کا معائنہ کیا۔ اُنھیں چھو کر دیکھا۔ مگر ردوسیا سب چیزیں سستے داموں اٹھا رہی تھی اور وہ جلد ہی بک گئیں۔

مکان اہم ترین چیز تھی۔ ردوسیا نے مکانوں کے داموں کے بارے میں پوچھ گچھ کی اور اُسے حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی کہ دام بہت بڑھ چکے تھے۔ مکان کے لئے فوراً ہی تین خریدار مل گئے دو اُسی دیہات سے اور ایک قریب کے

---

۱ مقدس تصویر (حضرت عیسیٰ، حضرت مریم اور پیغمبروں کی) ۲ روس میں خاص طرح کے چولھے ہوتے ہیں جن کی اوپری سطح چپٹی ہوتی ہے۔

ایک دیہات سے سگر دوسیا مکان فروخت کرنے کو فوراً تیار نہ تھی۔ اسے یہ فکر تھی کہ شاید ماں نے کہیں پیسہ پوشیدہ رکھ چھوڑا ہو۔ وہ تین دن تک پیسہ کی کھوج میں رہی۔ دیواریں ٹھوک بجا کر دیکھا گدّوں کو ٹٹولا۔ تہ خانے میں تلاش کیا۔ کھپریل میں کھوجا مگر کچھ حاصل نہیں ہوا۔

آخر کار خریداروں سے دام چکا کر دوسیا نے سرکاری دفتر میں تمام ضروری کارروائیاں پوری کر کے بنک میں پیسہ جمع کرا دیا۔ جب واپس لوٹی تو بہن کو کچھ اور تحفے وغیرہ دیے اور پھر ماسکو واپس آنے کی تیاری میں لگ گئی۔ شام کو بہن فارم پر چلی گئی اور دوسیا ماں کی قبر دیکھنے۔ یتینا اس کے ہمراہ گیا۔

دوپہر کے بعد ابر چھا جانے سے دن کے اُجالے پر کچھ مُردنی سی چھا گئی مگر شام ہوتے ہوتے بادل بکھر گئے اور صرف دور اُفق پر اُس جانب، جس طرف دوسیا اور یتینا چلے جا رہے تھے سُرخی مائل فاختئی بادلوں کی ایک قطار اب بھی موجود تھی۔ مگر یہ بادل اتنی دور اور خفیف سے دکھائی دے رہے تھے گویا سورج کے پیچھے سے جھانک رہے ہوں۔

گاؤں سے لگ بھگ دو کلومیٹر کے فاصلے پر دریا ایک دائرہ بناتا ہوا سیدھا بہہ رہا تھا اور اسی دائرے میں دائیں جانب اونچے ساحل پر گاؤں کا قبرستان تھا۔ ایک زمانہ تھا جب اس کے چاروں طرف اینٹوں کی ایک دیوار کھڑی تھی اور اندر راستہ اونچے اونچے محراب نما پھاٹکوں سے تھا۔ مگر جنگ کے بعد ٹوٹی پھوٹی دیوار ڈھا دی گئی تھی کہ اینٹیں اور عمارتیں بنانے میں کام آسکیں لیکن کسی وجہ سے بس ایک پھاٹک چھوڑ دیا گیا تھا۔ اور اب قبروں کو کئی راستے ہر طرف سے جاتے تھے۔

راستے بھر دوسیا یتینا سے اسکول کے بارے میں، تنخواہ اور وہاں کے چیرمین کے بارے میں، فصل کے متعلق سوال پوچھتی رہی، اور بظاہر اُسے کسی قسم کی کوئی فکر نہ تھی۔ مگر نیچے سورج کی سرخ روشنی میں ڈوبا ہوا پُرانا قبرستان اُسے نظر آیا۔ اس کی حد دید وہاں جہاں کبھی ایک باڑھ لگی تھی اور جہاں خود رو گلاب کی جھاڑیاں اُگی تھیں اب بے حد پُرانی قبریں تھیں جو مدت سے قبروں سے مشابہت کھو چکی تھیں، اُن کے قریب جھاڑیوں اور تازہ تازہ رنگ بھری باڑھوں کے پیچھے سے اور ہم وطنوں کی قبریں دکھائی دیں۔

دوسیا اور یتینا پھاٹک سے گزر کر برچ اور ویلو کے لہلہاتے درختوں اور تیز خوشبودار جھاڑیوں کے درمیان راستے پر پہلے بائیں اور پھر دائیں مُڑے اور دوسیا کا رنگ اُتر گیا اور منھ کھُلا کا کھُلا رہ گیا۔

—— "یہاں نانی اماں کی ..." یتینا بولا اور دوسیا کو ایک دھنسا ہوا ٹیلا دکھائی دیا جس پر کہیں کہیں خاردار گھاس اُگی ہوئی تھی۔ اس گھاس میں سے زرخیز زمین دکھائی دے رہی تھی۔ نیلے رنگ کا ایک چھوٹا سا صلیب جس کی جاڑوں سے مرمت نہیں ہوئی تھی۔ ایک طرف کو جھکا ہوا تھا۔

دوسیا بالکل سفید پڑ گئی۔ گویا اچانک کسی نے چھری اُس کے سینے میں بھونک دی ہو۔ وہاں جہاں دل دھڑکتا ہے شدید غم سے اس کا سینہ پھٹا پڑتا تھا اور سانس منھ کو آتا تھا۔ وہ کانپ اُٹھی، اور اُس نے اس قدر زور سے چیخ ماری اور زمین پر گر کر گھٹنے کے بل گھسٹتی ہوئی، بلکتی ہوئی، منھ ہی منھ میں نہ جانے کیا کہتی ہوئی قبر تک پہنچی کہ یتینا سہم گیا۔

"ای، ای، ای" —— دوسیا بلک رہی تھی اور منھ کے بل قبر پر پڑی انگلیوں سے گیلی مٹی کو کُرید رہی تھی "میری

پیاری امی..... امی، میری جان، میری آنکھوں کا نور... امی ی ی.... اوہو. وہ اب اس دنیا میں تمھیں دیکھنا پھر کبھی نصیب نہیں ہوگا۔ کبھی نہیں! اب تمھارے بغیر میری زندگی کیسے کٹے گی، کون مجھے پیار کرے گا۔ کون تسلی دے گا، امی امی، یہ تم نے کیا کر ڈالا۔"

"خالہ دوسیا... خالہ دوسیا" یلینا خوفزدہ ہوکر رو پڑا اور اس کی آستین گھسیٹنے لگا۔ اور جب دوسیا کی آواز بیٹھ گئی اور دوہری ہوکر اس نے قبر پہ اپنا سر پٹخنا شروع کیا تو یلینا گاؤں کی طرف دوڑا۔

گھنٹہ بھر بعد، گھپ اندھیرے میں گاؤں سے کچھ لوگ دوسیا کے پاس دوڑتے ہوئے آئے۔ وہ اب بھی اسی جگہ پر پڑی تھی، ہوش وحواس غائب، اب اس کا رونا بھی بند تھا۔ وہ نہ کچھ کہہ سکتی تھی، نہ کچھ سوچ سکتی تھی، بس دانت بھینچ رکھے تھے اور کراہ رہی تھی۔ چہرہ مٹی سے سیاہ اور بھیانک لگ رہا تھا۔

لوگوں نے اسے اٹھایا، اس کی کن پٹیاں سہلائیں، اس کو تسلی دی، گھر چلنے پر آمادہ کیا۔ اور وہ تھی کہ ہرگز کچھ بھی اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ وہ سب کی طرف پھٹی پھٹی سوجی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی اور اسے زندگی رات کی طرح تاریک معلوم ہورہی تھی۔ جب اسے بہن کے گھر لائے تو وہ بستر میں جا گری اور فوراً ہی اس کی آنکھ لگ گئی۔

دوسرے روز ماسکو واپس جانے کے لئے بالکل تیار ہوکر اس نے بہن کے ساتھ آخری دفعہ چائے پی، اب اس کا دل ذرا ہلکا تھا۔ ماسکو میں اپنے فلیٹ کا تذکرہ بہن سے کیا۔ وہ کس قدر خوبصورت اور آرام دہ ہے۔

اسی طرح بے فکری اور خوشی کے عالم میں یلینا کو دس روبل دے کر وہ ماسکو روانہ ہوگئی۔

دو ہفتے بعد بوڑھی ماں کا گھر کھولا گیا۔ فرش دھویا گیا۔ اور سامان واسباب وہاں لایا گیا اور نئے لوگوں نے وہاں رہنا شروع کیا۔

گرسیکوا
ترجمہ اطیزہ عکس

پہلا ہوائی حملہ

ہمارے ماسکو میں شیشوں پر کاغذ چسپاں کیے جا رہے تھے۔ جنگ دوسرے مہینے میں داخل ہو چکی تھی، صرف کھڑکیوں کے چوکھٹوں اور کھلی ہوئی کھڑکیوں میں عورتیں کھڑی دکھائی دیتی تھیں جو کاغذات چسپاں ہونے کے ساتھ ساتھ خبروں کے بارے میں تبادلہ خیالات میں مصروف تھیں۔ اور کاغذ کے لمبے فیتے نما ٹکڑے اٹھائے ان کے سروں کو احتیاط سے تھام کر شیشوں پر ضرب کے نشان کی صورت میں چسپاں کر رہی تھیں۔ ہر سو طنزاً مسکراتے ہوئے ٹیڑھے ترچھے ضرب کے یہ نشان تھے۔ وہ الیزرا نے لکڑی کے ایک طرف کو قدرے جھکے ہوئے مکانوں پر خصوصاً صاف صفائی سے دکھائی پڑتے تھے جو کافی تعداد میں اب بھی ماسکو کے قرب و جوار میں موجود ہیں۔ ایک آدھ لکڑی کا ڈھانچا ایسا بھی نظر آجاتا تھا جس کی غسل خانے کی بالکل چھوٹی سی بالشت بھر کی کھڑکی تک پر سفید کاغذی ضرب چسپاں تھا۔

گرمیوں کے نہایت خوشگوار آنکھیں چوندھیا دینے والے روشن دن تھے۔ ابابیلیں اپنی چہچہاہٹ سے آسمانوں کو چیرتی ہوئی نیلی ہواؤں میں پرواز کر رہی تھیں۔ ماسکو کا جنگ سے ابھی تک ذاتی سابقہ نہیں پڑا تھا بس ہر شام کو پورے ساڑھے سات بجے سائرن گونجتا تھا اور ریڈیو پر ہوائی حملے سے ہوشیار رہنے کی تاکید براڈکاسٹ کی جاتی تھی۔ عام پبلک کو تاکید کی جاتی تھی کہ شیلٹروں کا ترتیب وار رخ کریں۔ مگر پھر ناگہاں عجیب و غریب ناقابل یقین ہوائی حملوں کا آغاز ہوا۔ قرب و جوار کے کسی علاقے میں کہیں طیارہ شکن بندوقیں دندنائیں۔ جن کی آواز تقریباً سنائی نہیں دیتی تھی اور مین شہر تک پہنچنے کی مہلت دشمن کو فوراً نہ مل سکی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خفیہ طور سے نظروں سے پوشیدہ دشمن چوروں کی طرح گھر کا رخ نہایت خاموشی سے کریگا۔ دروازہ کھٹکھٹائے گا۔ مگر طیارہ شکن بندوقیں گویا کہہ رہی تھیں ہرگز نہیں ——— دشمن چلا جائے گا۔

سب کے ساتھ شیشوں پر کاغذ چپکانے میں لیزا گلو بیوا بھی شریک تھی۔ تین بچوں کی ماں، گرہستن، کسی زمانے میں وہ اسکول میں بچوں کو پڑھاتی بھی اور اچھی خاصی استانی سمجھی جاتی تھی۔ بچے اُسے بہت چاہتے تھے۔ پھر اس کی

شادی ہوگئی۔ شوہر سرگے[1] اچھی تنخواہ پاتا تھا۔ اور انھیں کسی قسم کی کمی نہ تھی اور اب کام کرنے کی اُسے کوئی خاص ضرورت درپیش نہیں تھی۔ علاوہ ازیں کوئی ایسا نہ تھا جس کی نگرانی میں بچے چھوڑے جاسکتے لہذا اُسے کام ترک کرنا پڑا۔ لیزا کو کافی عرصے تک اس بات کا ملال رہا اور وہ اکثر باورچی خانے میں رو پڑتی تھی۔ خصوصاً جب ریڈیو بجتا تھا۔ اُسے ہمیشہ ایسا لگتا تو وہ اب انسان نہیں رہی۔ جب کم عمر تھی تو بچے اُسے الیزوِتیا آرکادیونا کہہ کر پکارتے اور اب وہ سوچتی تھی کہ جلد ہی بڑھاپا آجائے گا جلد تیس سال پورے ہوجانا آخر کوئی مذاق نہیں! ادھر وہ لیزا کی لیزا ہی رہے گی اور بحیثیت لیزا کے موت بھی آجائے گی۔ کوئی کہے گا لیزا مرگئی۔ "کون لیزا..... اچھا..... وہ......" اور بس ختم شد، نہیں زندگی نے اس کا ساتھ نہیں دیا۔ البتہ تیسرے بچے کی پیدائش کے بعد اُس نے زندگی کی شرائط مان لیں۔ کچھ عادت سی بھی پڑگئی اور اس نے کڑھنا بند کردیا۔ پھر دل جلانے کا اب وقت بھی کہاں تھا۔ تین عدد بچے مہلت دیتے ہیں.... اور اس سال تو افسوس کرنے کا قطعی وقت نہیں تھا کہ سیریوژا کو فلیٹ دیا گیا تھا، دو کمروں کا، خاصا بڑا، صفائی ہی میں سارا وقت نکل جاتا تھا۔ کمرے کشادہ تھے۔ روشن بڑی بڑی کھڑکیاں، فلیٹ نئی عمارت میں تھا۔ گیس تھی، کوڑا پھینکنے کا انتظام تھا اور کارخانہ بالکل قریب، کھڑکی میں سے دکھائی دیتا تھا۔ اگرچہ فلیٹ سب سے الگ تھلگ نہیں تھا۔ کیونکہ تیسرے کمرے میں ایک بڑے میاں رہتے تھے۔ پھر بھی اچھا خاصا تھا۔ لیزا کو اپنے فلیٹ پر ناز تھا ہمیشہ صاف ستھرا، فرش شیشے کی طرح اور کھڑکیاں چمکتی ہوئی۔ اور اب یہ جنگ.... سرگے تقریباً فوراً ہی محاذ جنگ پر چلا گیا۔ یہاں تک کہ ٹھیک سے خدا حافظ کہنے کا موقع بھی نہ ملا۔ کیونکہ ریلیں پکڑتے وقت کچھ عجیب افراتفری پڑی ہوئی تھی۔ لیزا بچوں کے ساتھ تنہا رہ گئی۔ اب وہ کیا کرے گی.... وہ کوئی فیصلہ نہیں کرپائی تھی کہ اُس کے لئے فیصلہ دوسروں نے کر دیا۔ کارخانے کے اور خاندانوں کے ساتھ اُسے یورال میں پناہ گزیں ہونے کی تجویز کی گئی۔ کیا بھی کیا جاتا'...

اب جانا ہی ہے تو اسے جلا پڑے گا۔ ایک اسپیشل ٹرین کل روانہ ہوگی مگر آج سب ساز و سامان سنبھال کر رکھنا ضروری تھا۔ اور پھر شیشوں پر کاغذ چپاں کرنا نہایت ضروری۔ کیونکہ اس کی سخت تاکید کی گئی تھی۔ ایک وقت تھا کہ وہ ان بڑی کھڑکیوں کو دیکھ کر خوش ہوا کرتی تھی مگر اب ان سے کس قدر جھنجھٹ تھا۔ چپکاتے رہو، چپکاتے رہو، اور کسی طرح خاتمہ نہیں۔ بالکونی میں اوپر کی کھڑکیاں چپکانے کے لئے سیڑھیاں اٹھا کر لانی پڑیں۔ یہاں چھٹی منزل پر بالکونی سے دور دور تک خوب صاف دکھائی دیتا تھا۔ عین سامنے کارخانہ تھا۔ جہاں سریوژا کام کرتا تھا۔ وہیں سے وہ محاذ جنگ پر چلا گیا۔ سوچا تھا ٹھیک سے خدا حافظ کہے گا۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ پچھلے چند دنوں بالکونی سے نظارہ بالکل بدل گیا تھا۔ مکانوں اور کارخانوں کے درمیان جھوٹ موٹ کا ایک دیہات سا بنا دیا گیا تھا۔ چھوٹے چھوٹے سے گھر، مرغیوں کے ڈربوں جیسے نئے نئے، ہلکے رنگ کی پلائی وڈ (PLY-WOOD) کے بنے ہوئے اور ان کی سرخ رنگ کی مخروطی چھتیں تھیں۔ انجینیر الیوان ایگرووچ کا ذاتی ان کی تعمیر میں ہاتھ تھا اور بڑے فخر سے کہا کرتا تھا: "موضوع مشاہدہ"

---

[1] سرگے، پیار کا نام سریوژا۔

غالباً ایسے مصنوعی دیہات کی ضرورت اس لئے تھی کہ دشمن کو دھوکے میں ڈالا جا سکتا۔ کیا اس سے مدد ملے گی؟ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ ایک سبز چھت پر سے گزرتی ہوئی چوڑی، زرد، ریت کے رنگ کی بوریوں کی ایک سڑک سی بچھائی گئی، گویا کھیت اور سڑک ہو، اس قسم کے دھوکے میں کون آسکتا ہے؟ یہاں بالکونی سے یہ سب صاف دکھائی دے رہا تھا۔ صاف نظروں کے سامنے، مضحکہ آمیز اور بچکانہ، اور گھر کی عمارت نہ جانے کس چیز سے ملتی جلتی تھی۔ اس پر یونہی جلدی جلدی اناڑیوں کی طرح رنگ کے برش اِدھر اُدھر مار دیئے گئے تھے.... بالکل مسخرہ پن... دیواروں پر ایک بہت کی تصویر کھینچی تھی۔ چھوٹے چھوٹے مکان، سائبان اور اُن کے درمیان درخت، ایک درخت نہایت بڑا، گہرا ہرا بنایا تھا جو بیک وقت دس کھڑکیوں کے سامنے تک پھیلا ہوا تھا۔ گھر میں رہنے والوں کو تاکید کی گئی تھی کہ جو ضرب کے نشان کی شکل میں کاغذ پہ پائیں وہ رنگ برنگے ہوں تاکہ مکان کی کایا پلٹ میں خلل نہ آئے۔ ان رنگ برنگے ضرب کے نشانوں، مصنوعی دیہاتوں، دیوالی کی ہنڈ کلیاں کی طرح رنگے مکانوں کی وجہ سے چاہے کچھ بھی کہو.... یوں معلوم ہوتا تھا گویا کوئی میلہ لگا ہو مگر ایسی باتوں کا کوئی وقت تھا؟ دکھلاوے کی باتیں اور پھر ابابیلیں تھیں کہ گویا خوشی سے پاگل ہو کر اپنی چہچہاہٹ سے آسمان کو سر پر اُٹھا رکھا تھا۔

لیزا شیشے چپکاتی جاتی تھی؛ اور سوچ رہی تھی ماسکو میں آخری دن، گھر میں آخری دن، اب گھر کہیں اور ہو گا۔ گھر ہوگا بھی؟ کل اسپشل ٹرین چھٹے گی عورتوں اور بچوں کو ErAcua Ie کہا جائے گا۔ میری کیا حیثیت ہے محض ایک عورت ہوں جس کے بچے ہیں اور کچھ نہیں۔ اب کتنے برس ہو گئے کہ میں نے کوئی کام نہیں کیا۔ وہاں یورال میں کام کرنا ہوگا۔ ہائے... یورال کس قدر دور ہے دور دراز اور بھیانک۔ مشرق میں ولگا (VOLGA) سے آگے زندگی بھر مجھے کہیں جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔ ولگا... گرم گرم پانی، ساحل، جا بجا بیراک، پیچھے تیرتے ہوئے، ڈگمگاتے ہوئے۔ مجھے اپنا پیارا ولگا پھر دیکھنا نصیب ہوگا، نہیں نہیں، مگر اس وقت اس بات کی کوئی اہمیت نہیں بس یہ کرب کا نہ زندگی بنی ہے صرف زندگی بنی ہے۔ ہاں یورال میں کام کرنا ہوگا۔ سوچنے ہی سے خوف آتا ہے اور بیناغ ہوائی حملے دل بیٹھا جاتا ہے، وہ بالکل تنہا ہے، بالکل تنہا.... بچے خوش ہیں وہ کچھ نہیں سمجھتے....!

اور بچے واقعی میں ٹھیک تھے۔ بڑی بچی اولیا خوش تھی کہ اُسے ہوائی حملوں کی وجہ سے زبردستی جلدی کا سونے کو نہیں کہا جاتا تھا۔ اور وہ جی بھر کر پڑھ سکتی تھی۔ چاہے تو صبح تک پڑھے۔ پہلے اس کو کبھی کبھار ہی اس کی اجازت ملتی تھی۔ ماں اور وہ اُس کی من مانی" کہتی تھیں اور اب چاہے جتنی من مانی کر و۔ کتنا اچھا تھا یہ لفظ "جنگ" اس کے لئے کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔ وہ ایک گیت جانتی تھی "اگر کل جنگ چھڑی" اور بالکل مطمئن تھی۔

دوسرا بچہ۔ کولیا، جسے کولونیا پکارتے تھے۔ وہ بھی خوش تھا اور ظاہر ہے جب امّی سامان سنبھالنے میں مشغول ہو تیں اور گھر میں ہر طرف گڑبڑ اور نہ جانے عجیب و غریب کھلونے کہاں کہاں سے پیدا ہو گئے تھے۔ بالکل

یا جنم دن ہو کوئی تین مہینے ہوئے۔ یعنی کوکونیا کی ننھی منی یادداشت میں کافی مدت گزر گئی کہ جب وہ دو برس کا ہوا
تھا اور سب اس کے لئے تحفے لائے تھے۔ کتنا مزا آیا تھا صرف ذرا سی ایک خرابی ہوئی تھی کیونکہ وہ خوشی سے بالکل
آپے سے باہر ہو گیا تھا کسی نے اُسے ڈانٹا نہیں صرف ایک اجنبی خالہ نے لتاڑا تھا۔" بی بی ہی اتنا بڑا بچہ اور آپے سے
باہر!" کوکونیا کو اب بھی یہ یاد کر کے شرم آتی تھی۔ اور وہ پاؤں پٹخنے لگتا تھا۔ اب بھی ڈھیر سارے کھلونے چاروں
طرف تھے مگر اب وہ بڑا تھا اور اپنے پہ قابو تھا۔ اور یہ اصل میں کھلونے نہیں تھے بلکہ بڑے لوگوں کی اصلی چیزیں
تھیں۔ مگر اب اُن سے کھیلنا ممکن تھا۔ کوئی انھیں لایا نہیں تھا۔ کسی نے تحفہ بھی نہیں دیا تھا۔ کوکونیا نے اُنھیں
خود فراہم کیا تھا۔ وہ کوئی چیز گھسیٹتا اور پوچھتا، "امّی، یہ بھی میرے لئے ہے۔" اور وہ کہتی تھی۔ "تمھارے لئے بیٹا"
اور وہ کھیل میں اس قدر کھو جاتا کہ لاپرواہی سے کھانا کھاتا۔ اور جب حملے کا سگنل بجتا کوکونیا سمجھتا... یہ بھی
کوئی کھیل ہوگا۔ وہ خوشی سے چلّا اُٹھتا "حملہ املہ" اور راضی خوشی گودی میں سوار ہو کر شلٹر میں چلا جاتا۔
میاں دودھ بلیتو بھی خوش تھے۔ اُس کا اصلی نام تو الیوشا تھا۔ مگر سب "دودھ بلیتو" کہہ کر بلاتے تھے۔ یہ
جس وقت سے جب سے امّی اُسے اسپتال سے لائی تھیں اور آوٗ لیا ذرا افسوس سے بولتی تھی کہ "اسے یہ تو
دودھ بلیتو" ہے۔

میاں دودھ بلیتو تھے غضب کے، انھوں نے کچھ ہی دن ہوئے سوجی کا دلیا کھانا سیکھا تھا۔ اور جب کھاتے
تھے تو منہ سے بلبلے چھوڑتے تھے۔ اُن کی بڑی بڑی فاختئی رنگ کی آنکھیں تھیں۔ اور آنکھ کی سفیدی صاف
شفاف نیلے رنگ کی تھی۔ اور گنجے سر پہ عین چندیا پر ایک سنہری بالوں کی لٹ۔ اُس کی سفید انگلیوں پہ گلابی
دھبے تھے، ننھی منّی انگلیاں، سب الگ الگ اور ہر اُنگلی کے سرے پر ایک ننھا سا سیپی جیسا ناخون، فلس
ماہی کے برابر۔ گرمی تھی اور دودھ بلیتو کے پوتڑا نہیں باندھا گیا تھا۔ پیٹ سے نیچے ننگے وہ لیٹے ہوئے
اپنا پاؤں چوس رہے تھے اور بالکل خوش تھے۔

مگر لیزا بہت خوف زدہ تھی اُس کا دل اندر سے لگاتار بیقرار و بے چین تھا۔ گویا کوئی دل نوچ رہا ہو۔
اور دل منہ کو آتا تھا۔ اور جب سائرن کی آواز زور سے گونجتی اور اُس کی ناہموار آواز آہستہ آہستہ بھیانک
طور سے اور بلند ہوتی۔ خدا جانے اُس پر کیا گزرتی اُسے یوں معلوم ہوتا کہ یہ محض سائرن نہیں بلکہ اُسے سن کر
موت کا خوفناک فہم ہوتا جس کے خیال ہی سے متلی ہوتی تھی اور دل بلّیوں اُچھل جاتا تھا۔ ابھی صحیح معنوں میں
کوئی ہوائی حملہ نہیں ہوا تھا اور چاروں طرف سب ماحول کچھ مصنوعی معلوم ہوتا تھا مگر اب حملے کا خوف گویا
اپنے دانتوں سے سینے کو چبائے ڈالتا تھا اور سریوژا کا کوئی خط نہیں آیا تھا۔ سچ ہے کہ اُسے گئے ہوئے کل
دو ہفتے ہی ہوئے تھے پھر بھی خط آسکتا تھا... آنا چاہئے تھا۔
ایک بڑے سے گھر کی چار دیواری میں ہونے سے لیزا کی قدرے ہمت بندھی رہتی تھی۔ آخر کو مرد تھا۔

بڑا عالم ریاضی کا پروفیسر تھا۔ واسیلی واسیلوچ کا شیکسپیر وابستگی پاتا تھا۔ وہ ہمیشہ پرسکون معلوم ہوتا تھا جب کبھی کمرے کے باہر لیزا سے ملاقات ہوتی وہ نہایت خوش خلقی سے ٹوپی اُتار کر قدرے جھک کر اُسے آداب کہتا۔ وہ ہمیشہ بغیر منہ کھولے کوئی نہ کوئی سمفونی (Symphony) گنگناتا رہتا۔ عموماً بیتھوون (BETHOVEN) کی (وہ اس کا من بھاتا کمپوزر تھا) اور کبھی کبھی خود ہی طبلے کی سی تال منہ سے پیدا کرتا۔ پرم پرم پرم، اور آج فلیٹ میں داخل ہوتے وقت واسیلی واسیلوچ کسی بات سے بہت خوش گا رہا تھا۔ ناک میں نہیں جیسا کہ عموماً گاتے تھے بلکہ پورا منہ کھول کر لفظوں سمیت ۔

"خوشی قدرت کی اوّل ترین کائنات ہے

بڑے باپ کی بڑی بیٹی ...."

لیزا کو باورچی خانے کے دروازے میں دیکھ کر، تھکی ہاری، بال بکھرے ہوئے، بڑی بڑی متعجب آنکھیں اُس نے نہ جانے کیوں لیزا کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا اور نہایت تپاک سے اُسے پیار کر لیا۔ یہ نہ جانے اُسے کیا سمائی؟ اور پھر فوراً لئی بنانے کے لئے میدا مانگا۔ لیزا نے اُس کے لئے ایک گہری طشتری میں لئی پکا دی۔ اور اُس طشتری کو اپنے سے بہت دور پکڑے ہوئے، سارے وقت گنگناتے ہوئے، خالی ہاتھ سے تال دیتے ہوئے اپنے کمرے کا رُخ کیا۔ وہ بھی شیشوں پر کاغذ چپکا رہا تھا۔ اگرچہ اب تک اس نے اس معاملے میں ضد سے کام لیا تھا۔ یہاں تک کہ گھر کے منیجر کو دھمکی دی تھی کہ سیڑھی سے گرا دے گا۔ اور یہ کہ کسی کی مجال نہیں کہ یہ حماقت اُس سے زبردستی کرائے۔ احمق پنا، جس کا کوئی سر پیر نہ تھا۔ ہا۔ چاہو تو جرمانہ لے لو! مگر آج کسی وجہ سے اُس نے بھی اپنی رائے بدل دی۔ اُس کے کمرے سے کرسیوں کے اِدھر اُدھر ہونے کی آوازیں آ رہی تھیں اور جب وہ کھڑکی میں چڑھا تو اس قدر زور سے "پرم" کی آواز آئی کہ آسمان ہل گیا۔۔۔

شام کو ہمیشہ کی طرح ساڑھے سات بجے حملے سے ہوشیاری کی خبر دی گئی۔ سائرن گونجنے لگے۔ کس قدر نفرت انگیز آواز تھی۔ "حملہ امله" کو کو نیا بھی چلایا۔ لیزا نے اوکیا سے نیچے تہ خانے میں جانے کو کہا اور خود "دودھ بیتو" کے پوتڑے بدلنے رُک گئی۔ لیزا جان بوجھ کر ذرا رُک گئی۔ رات سے پہلے کی خاموش صاف شفاف روشنی اور سائرن کے بعد شہر کی خاموشی، بالکل جیسے نوزائیدہ بچے کی چیخ کے بعد کامل سکوت طاری ہو جاتا ہے اور صاف ستھرے شیشوں میں کاغذی ضربیے ٹیڑھے ترچھے نشانوں کے درمیان سے دکھائی دیتا ہوا نیلا نیلا آسمان ۔ یہ سب کچھ کس قدر حسین تھا۔ وہ کھڑکی کے قریب رُک گئی اور اُسی وقت ایک دھماکا ہوا۔ جیسا اُس نے پہلے کبھی نہیں سنا تھا۔ دھماکے کے ساتھ گڑگڑاہٹ ہوئی۔۔۔ بم گرا۔ لیزا نے پہلے کبھی بم پھٹتے نہیں سنا تھا مگر اُسے کامل یقین تھا کہ بم گرا۔ لیزا نے میاں "دودھ بیتو" کو کپڑوں میں لپیٹا۔ سانس پھولا ہوا جیسا اوپر جلدی چڑھنے سے ہو جاتا ہے۔ وہ نیچے اُتر آئی۔ گھر میں بہت عمدہ شیلٹر تھا مضبوط ٹھوس دیواریں، خشک اور آرام دہ اسی شیلٹر پر گھر کے منیجر کو ناز تھا اور پھر گھر کے رہنے والے عورتیں کی گئی اور چیزیں یہاں اٹھا لائے تھے۔ دیوان، پلنگ، میزیں، کرسیاں، الماریاں اور قالین تک لے آئے تھے۔ جب لوگ ہی چلے گئے

تو چیزیں سنبھال کر کس کے لئے رکھا جائے۔ سب چیزوں کی دقعت جاتی رہی تھی۔ بہت سے لوگ اپنی کتابیں تک اٹھالائے تھے۔ اور جو بات آولیا کے لئے خوشی کا باعث تھی وہ تھی ایک کتابوں بھری الماری۔ ایک دیوار پر تصویر ٹنگ آویزاں کی گئی تھی: "سیسٹین مڈونا" (Sistine Madonna) کی ایک نہایت عمدہ کاپی جو واسیلی واسیلوچ نے لاکر لگائی تھی۔

پہلے حملے کے دوران میاں دودو میتو دیوان پلنگ پر بے خبر سوتے رہے اور بعد میں لیزا! س کا اسپرنگ کا گدا اس کے پلنگ سے اٹھا کر نیچے لے گئی۔ پورا پلنگ لے جانا مشکل تھا اور اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ اسپرنگ گدے کو میز پر رکھ دیا گیا اور دودو میتو اپنی کہنیوں اور پنجوں پر لیٹے بہت مزے سے اچھلا کرتے تھے۔

شیلٹر میں کل تک سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا اور سب خوش تھے مگر آج نقشہ پلٹا ہوا تھا۔ سب نے ایک عجیب سا دھماکا سُنا اور محسوس کیا تھا۔ عورتوں کے چہرے زرد پڑے تھے اور اپنے بچوں کو سینے سے لگائے وہ خاموش بیٹھی تھیں۔ بس اب شروع ہوگیا۔ وہ، جو پہلے محض دروازے کو کھٹکھٹا کر دفع ہوگیا تھا۔ اب عین گھر کے اندر گھس آیا تھا۔ ایک بار پھر نہایت زور سے گڑگڑاہٹ اور دھماکا ہوا۔ پہلے سے ہزار گنا خوفناک اور [illegible] نے جلدی سے گویا اس بات کا ڈر ہو کہ دیر نہ ہو جائے زور سے ونڈنانا شروع کردیا۔

یہ سب کتنے عرصے جاری رہا؟ معلوم نہیں قیامت تک! کئی گھنٹے۔ دو گھنٹے گزر گئے پھر تین، چار مگر ختم ہونے کے کوئی آثار نہیں دکھائی دیتے تھے۔ باہر بربادی، تباہی کا دور دورہ تھا۔ شیلٹر میں بلا کی روشنی تھی۔ ہر دھماکے سے چھت پہ لگا بلب ہلنے لگتا تھا اور سفید دیواروں پر پرچھائیاں بے قراری کے عالم میں آگے پیچھے جھومتی معلوم ہوتی تھیں۔ "سیسٹین مڈونا" (Sistine Madonna) بھی اپنے بچے کو سینے سے لگائے سخت خوف زدہ تھی بالکل اُن دُکھیا ماؤں کی طرح جو اس کے چاروں طرف اپنے بچوں کو سینے سے لگائے بیٹھی تھیں۔ وقتاً فوقتاً جب بھی کوئی بم گھر کے قریب پھٹتا، گھر کی عمارت اُس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتی۔ اوپر سے نیچے تک شیشوں کے چٹخنے اور جھنجھنانے اور پارہ پارہ ہوجانے کی گونج تھی۔ چھٹی منزل سے نیچے تک۔ ہر بار ایسا ہی ہوتا، گویا گھر میں غیر محدود تعداد میں صرف کھڑکیاں ہی کھڑکیاں تھیں۔ ہر بار ایسا لگتا کہ شاید یہ آخری دفعہ ہو۔ مگر یہی ہنگامہ سب پھر سے شروع ہوجاتا۔ اور یہ بات خصوصاً خطرناک تھی۔

مگر لیزا کے بچے بالکل اطمینان سے تھے۔ آولیا ہلتے ہوئے بلب کے نیچے ایک موم بتی کی طرح سیدھی کھڑی کتاب پڑھ رہی تھی۔ نہ جانے اُس نے سٹرا (straw) کی ٹوپی کیوں اوڑھ رکھی تھی۔ کمر سے نیچے تک اُس کے سنہرے گھنگھریالے بال لٹکتے دکھائی دے رہے تھے۔ "من مانی" کے اصول پر عمل کرتے ہوئے آولیا نے چوٹیاں تک گوندھنی بند کردی تھیں۔ وہ ایک چینی کی گڑیا، بھیڑیں چرانے والی معلوم ہوتی تھی۔ مگر ایسی گڑیا جس نے چشمہ لگا رکھا ہو۔ کلوپنا ذرا سا بسور کر دیوان پلنگ کے سرے پر پڑے سے مخمل کے بھالو کے پیٹ پر سر رکھ کے سوگیا تھا۔ نہ جانے یہ

یہ بھالو کس کا تھا، شلٹر میں سب ہی کا تھا۔ اور کسی کو معلوم نہ تھا کہ کون اُسے وہاں لایا اور کس وقت، بہرحال وہ سب کی ملکیت تھا۔ کوکو نیا بھالو پر سر رکھے سو رہا تھا اور شاید بہت سہانے خواب دیکھ رہا تھا۔ مگر میاں نکودمہ پیتو کسی وجہ سے نہیں سوئے تھے۔ وہ میز پر لیٹے تھے۔ اسپرنگ کے گدّے کے بیچوں بیچ، جھومتے ہوئے بلب کو اپنی چمکیلی آنکھوں سے ٹکٹکی لگائے گھور رہے تھے۔ نہ سو رہے تھے نہ رو رہے تھے۔ ہر دفعہ جب بم پھٹنے سے دھماکا ہوتا وہ نہایت اطمینان سے تھرتھرا اُٹھتے۔ مگر وہ قطعی نہیں روئے اُس وقت بھی نہیں جب اچانک روشنی گل ہوگئی۔ گھپ اندھیرا ہوگیا۔ بالکل سیاہ جیسا کہ صرف تہ خانوں میں ممکن ہے اور اِس تاریکی میں اوپر ٹوٹتے ہوئے شیشوں کا شور اور پھر جا بھیانک معلوم ہوا۔ کسی نے آہ بھری اور چند گھڑیوں میں پھر سے روشنی آگئی۔ میاں نکودمہ پیتو ایسے لیٹے رہے گویا کچھ ہوا ہی نہیں اور لگاتار بلب کو دیکھتے رہے۔

لیزا سوتے ہوئے کلوریا کی ایک ٹانگ کو ہاتھ میں لئے بالکل ساکت بیٹھی تھی۔ بے جان اور خوف زدہ۔ اور دیکھا جائے تو یہ خوف نہ تھا بلکہ اُسے یہ خیال کھائے جاتا تھا کہ اُس نے بچوں کو ٹھیک سے نہیں لٹایا ٹھیک سے نہیں بٹھایا یا بھی سلامت نہیں رکھا۔ بہتر تو یہ ہوتا کہ وہ ان سب کو سمیٹ کر اُن پر جھک کر اُنھیں بھینچ لیتی۔ ایکدم اُن کا خاتمہ بہتر ثابت ہوتا۔ اسے ایسا لگا کہ سر سے گھر کی چہار دیواری کا سایہ اُٹھ گیا ہے کہ سب کچھ فنا اور برباد ہوگیا ہے اور جو کچھ بھی قائم ہے وہ محض جادو کے زور سے ہے (اور یہ بھی ہر حملے کے ساتھ) کاغذ چپکے شیشوں کے ساتھ پاش پاش ہوجائیں گے۔

واسیلی واسیلوچ شیشوں پر کاغذ چپکاتے وقت یونہی بلا وجہ دکھاوے کے لئے زور زور سے ہنس رہے تھے۔ آج اُن کو بھی اپنی خدمات پیش کرنے کا حکم آگیا۔ پہلے تو وہ سمجھ نہ سکا کس وجہ سے، ایک نوجوان میجر نے جو عرصے سے نیند بھر کر سو نہ سکا تھا۔ اس کا استقبال کیا۔

کشپیروف واسیلی واسیلوچ، آپ ہی ہیں؟ آپ سے ملاقات کر کے میں بہت خوش ہوا، ملک کو آج سب علم و فاضل حضرات کی ضرورت ہے۔ میں ابھی عرض کرتا ہوں کہ ماجرا کیا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ سے ہوائی حملوں کی مخالفت کرنے والے سب سولین ([illegible]) گروپوں کی ہمارے علاقے میں رہنمائی کے لئے کہا جائے۔

"میں نہیں سمجھ سکا۔ یعنی خصوصاً مجھ سے کیوں؟"

"اور کس سے کہا جائے؟ Anti Air craft شوٹنگ کے آپ ماہر ہیں آپ کو کون نہیں جانتا۔ آپ کے اصول ہم اسکول میں پڑھاتے ہیں "اصول کشپیروف"۔

اور واسیلی واسیلوچ کو گزرا زمانہ یاد آگیا۔ مدت ہوئی۔ پہلی جنگ کے دنوں میں جب وہ والنٹیئر ([illegible]) سروس میں ایک جونیئر افسر تھا، اُس نے ایک مختصر سے مقالے میں اپنے نظریات لکھے تھے: "تیزی سے چلتی ہوئی کسی خارجی شے پر نشانہ نہ چوکنے کے مسئلے کے امکانات" یہ اُس کی نوجوانی کا زمانہ تھا۔ جب وہ عشق میں مبتلا تھا اور ماروسیہ کی چمکتی ہوئی آنکھیں اور ریڈ کراس کی نرسوں کا سر پہ بندھا رومال اس کی

کے سامنے لمحہ بھر کو گھوم گئیں ۔ اور مار دسیہ کی شائستگی سے موت کا بھی خیال پل بھر کو آگیا۔ اس کے بعد اس نے شادی کبھی نہیں کی تھی۔ شادی کا خیال تک بھی نہیں آیا تھا "امکانات" پر مقالہ واقعی اس نے اسی زمانے میں لکھا تھا۔ لکھ کر بھول بھی گیا تھا۔ اور آج بھی ذرا سوچیے، اتنی مدت بعد وہ ذرا سا مقالہ کام میں لایا جاتا ہے۔ پڑھا جاتا ہے۔ امتحان میں دیا جاتا ہے۔ "اصولِ کشپیروف۔ !"

چشمے کے موٹے موٹے شیشے صاف کرتے ہوئے وہ بولا۔

"میں نہیں جانتا تھا کہ میرا چھوٹا سا مقالہ کسی کے کام آسکتا ہے۔ یہ میری عزت افزائی ہے۔

"ارے کامریڈ پروفیسر، یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ وہ کون ہے جو آپ کے اصول نہیں جانتا؟ میرا تو ایک دفعہ اس سے امتحان میں واسطہ ہو چکا ہے۔ سب سے اونچے نمبر حاصل کیے۔۔۔۔۔"

لمحہ بھر کو میجر کا اداس نیند بھرا چہرہ اپنی کامیابی یاد کر کے خوشی سے دمکنے لگا۔ کتنا زمانہ بیت گیا تھا اور جو آج رات گزر رہی تھی۔ "اس سب سے کس قدر دور دراز معلوم ہوتا تھا۔۔۔!"

"اسی لیے ہم نے سوچا کہ آپ سے رہنمائی کرنے کی فرمائش کی جائے۔"

"یہ سب کچھ ذرا اچانک ہوا ہے۔ مگر کوئی مضائقہ نہیں ہم رہنمائی کریں گے۔"

اس نے ایسے ہی کہا۔ ہم رہنمائی کریں گے وہ اچھی طرح سمجھ بھی نہیں سکا تھا کہ اس نے اپنے اوپر کیا ذمہ داری لے لی اور شاید ایسا کام جو اس کی طاقت سے باہر ہو مگر بہرحال یہ ایک بہت اہم کام تھا۔

وہ گھر لوٹ آیا۔ گھر کے سامنے مزدور روکھی ہنسی ہنستے ہوئے مصنوعی دیہات بنانے میں لگے ہوئے تھے۔

واسیلی واسیلوچ نے ادب سے ٹوپی اتاری۔

کیا میں معلوم کر سکتا ہوں کہ اس پیتومکن[1] (Potemkin) قسم کے دیہات کے کیا معنی ہیں۔ ؟

"اس کا نام پیتومکن نہیں بلکہ تیموخن ہے۔" ایک ادھیڑ عمر کے مزدور نے اداسی سے جواب دیا۔ کیا کیا جائے[2]؟ وہ بھی حکم کی تعمیل کر رہا ہے؛ وہ اپنا خود مالک کہاں۔ عجب تماشا ہے۔ سارے ماسکو میں اسی قسم کی دھاندلی بازی ہے۔ سمجھتے ہیں ہم باری سے بچا لیں گے۔ ان کا باپ بھی نہیں بچا سکتا۔"

"نہیں چچا سا شا بچا لیں گے۔" ایک نوجوان مزدور، بال بکھرے ہوئے اس سے مخاطب ہوا۔ میرا خیال ہے ایسا ہوگا دشمن اڑان کرے گا۔ سب باتوں کا فیصلہ ان کے یہاں پہلے ہی سے کیا جا چکا ہے۔ نقشے بنائے جا چکے ہیں۔

---

[1] ملکہ کیتھرین دوئم کے زمانے میں اس کے چہیتے جنرل پیتومکن نے کرائمیا فتح کر کے ملکہ کو اپنی نئی سر زمین کے دورے پر بلایا اور بہت سے مصنوعی دیہات ان سڑکوں پر آباد کروائے جہاں سے اس کی سواری کو گزرنا تھا۔ یہاں پر مطلب دکھاوے کے مصنوعی دیہات سے ہے کہ دشمن کو دھوکا دیا جائے۔

[2] ان پڑھ ادھیڑ مزدور پیتومکن کے نام سے واقف نہیں وہ سمجھتے ہیں کہ کشپیروف غلطی سے ان کے نمبر تیموخن کو پیتومکن سمجھ رہا ہے۔

بن کا پھینکو اور ختم شد۔ وہ اُڑان کر رہے ہیں۔ ایک دوسرے کے کہنی مار کر کہتا ہے۔ دیکھ فرٹز (FRITZ) اس کا نام ہائنز (HEINZ) ہوگا۔ دیکھ ان بدمعاشوں کے یہاں اس نمبر لگے کارخانے کے قریب کیا بنا ہے؟ ہائنز کا بم پھینکنے کا موقع ہاتھ سے جاتا رہے گا اور ہم بچ جائیں گے۔"

مزدور ہنس پڑے اور پھر سے ہتھوڑوں سے ٹھوکنا شروع کیا۔

واسیلی واسیلوچ بہت خوشی کے موڈ میں گاتے ہوئے اپنی سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ وہ چلا جا رہا تھا گویا وہ دل کے دورے اس کو کبھی نہیں پڑے۔ گویا وہ استالین پرائز اس نے کبھی حاصل نہیں کئے اور ہزاروں صفحے عالمانہ معلومات سے متعلق اس نے کبھی نہیں لکھے۔ یہ گویا ایک نوجوان مصنف زینہ چڑھ رہا تھا اور گا رہا تھا۔ جس نے تیزی سے چلتی ہوئی کسی خارجی شے پر نشانہ چوکنے کے مسئلے کے امکانات" کے متعلق مقالہ لکھا تھا!

گھر پہنچتے ہی اُس نے قانون کی پیروی کرتے ہوئے سب سے پہلے تمام شیشوں پر کاغذ چپاں کئے۔ یہاں تک کہ دو کاغذ کے ٹکڑوں کے بجائے اُس نے چار چار ٹکڑے چپکا دیئے بالکل برطانیہ کے پرچم کی طرح، اس کے بعد وہ اپنی بہن سے ملنے اُس کے واشچے میں چلا گیا۔ کہ آرٹیلری (ARTILLERY) کے متعلق چند کتابیں لے آئے۔ ذرا شرمندگی کی بات تھی۔ وہ اپنی معلومات میں کچھ کمی سی محسوس کرتا تھا، بہن کا شوہر جنرل تھا اور ملٹری اکاڈمی میں پروفیسر تھا۔

وہ کافی دیر سے حملہ کے دوران، بغل میں چکنی چکنی کتابیں جو بار بار پھسل پڑتی تھیں اُٹھائے گھر لوٹا۔ ریل گاڑی ابھی تک چل رہی تھی مگر بسیں اور ٹرامیں رُک گئی تھیں۔ بغل میں کتابیں دبائے وہ ناک میں گنگناتا ہوا اسٹیشن سے چلا آرہا تھا۔ چاروں طرف ZENITH دندنا رہے تھے۔ بم پھٹ رہے تھے مگر کہیں دور آس پاس نہیں شاید کہیں اُسی علاقے میں جہاں اس کا مکان تھا، کہیں آگ بھڑک رہی تھی اور ایک دفعہ کوئی بڑی سی سیاہ چیز بالکل اس کے سر پر سے چنگھاڑتی ہوئی گزر گئی۔ اُس نے سر کو بچایا اور نظروں سے اُس کا تعاقب کیا۔ آہ۔ ہا.... تو یہ تھی تیزی سے چلتی ہوئی شے، کوئی مضائقہ نہیں ہم رہنمائی کریں گے۔

جب اپنی کنجی سے دروازہ کھول کر وہ اپنے فلیٹ میں داخل ہوا تو تھوڑی دیر کو کچھ امن و سکون تھا اور چاروں طرف کامل خاموشی۔ وہ اپنے کمرے میں داخل ہوا تو قدموں کے نیچے شیشوں کے چٹخنے کی آواز آئی۔ راستہ ٹٹول کر اُس نے دروازہ کھولا اور بالکونی میں آگیا۔ چھٹی منزل کی اونچان سے ایک بھیانک اور عجیب و غریب منظر اسکو دکھائی دیا۔ جہاں بھی نظر پڑتی تھی۔ ہر سو خلا میں شعلے بھڑک رہے تھے۔ آگ لگی ہوئی تھی۔ ماسکو جل رہا تھا۔

اب دندنا دن بند تھی۔ Zenith خاموش تھے۔ گویا دم لے رہے ہوں۔ بس کہیں سے ایک بندوق

سلعوا چا " یعنی شہر سے باہر رہائش کا چھوٹا لکڑی کا بنا ہوا گھر۔

کے چلنے کی آواز آسمان میں گولیوں کا دائرہ سا بناتی ہوئی، آسمان کو گویا چیرتی ہوئی، ایک سنہری سا ٹانکا ابھرتی ہوئی لگا تار سنائی دے رہی تھی۔ واسیلی واسیلوچ، کھڑا تھا اور اس کے منیعف ہونٹ ہل رہے تھے۔ "ماسکو جل رہا ہے.... ماسکو...!"

کمر جھکی ہوئی، وہ کمرے میں لوٹ آیا اور بہت احتیاط سے شیشے کا ٹوٹا ہوا دروازہ بند کر دیا۔ کھڑکی کے شیشے بھی غالباً ٹوٹ گئے ہوں گے۔ بلیک آؤٹ (Black Out) کے آدھے سے زیادہ کاغذ اکھڑ چکے تھے۔ اس نے انھیں بالکل اکھیڑ دیا۔ واقعی میں شیشے ٹوٹ چکے تھے۔ صرف کھڑکیوں کے چوکھٹوں پر کاغذ کے ٹکڑوں کے سہارے کہیں کہیں بڑے اور چھوٹے شیشے کے ٹکڑے لٹک رہے تھے۔ اس انوکھے سے چوکھٹے میں سے جلتا ہوا شہر اور بھی خوبصورت معلوم ہو رہا تھا۔

بالکل سامنے پلائی وڈ (Ply Wood) کے سیدھے کھڑے ہوئے تختوں میں سے عجیب و غریب نارنجی رنگ کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ اور اچانک 'واسیلی واسیلوچ' کے دماغ میں خیال آیا: واہ ... وا... یہ ماسکو نہیں جل رہا ہے بلکہ وہی پتیو مکن، قسم کے دیہات اور ٹاٹ کی بنی ہوئی سڑکیں وہ ہی سب مصنوعی "دھاندلے بازی" "پوشکن" ہوتا تو کہتا "یہ سب بہروپ کا کاٹھ کباڑ" کل اس سب کا نام و نشان بھی نہ ہوگا۔ کل پھر سنجیدہ زندگی کا آغاز ہوگا!۔

مگر اس وقت شلٹر میں نیچے چلے جانا چاہیے۔ دیکھا جائے کہ وہاں سوالین (Civilian) گروپ پر کیا گزر رہی ہے۔ بے چاری عورتیں بچوں کے ساتھ بالکل تنہا۔ شاید مدد درکار ہو.... رہنمائی!

تہ خانے کے شلٹر میں غضب کی آنکھوں کو چندھیا دینے والی ساکت بلب کی روشنی لوگ سہمے ہوئے چہروں کے زنگ فق دبکے بیٹھے تھے۔ صرف عورتیں، بچے، بوڑھی عورتیں۔ اُن میں سے ایک بوڑھا مرد تک نہ تھا۔ وہ اکیلا ایک آدمی تھا۔ دھماکے بند ہو گئے تھے۔ لوگ حملے کے خاتمے کے سگنل کا انتظار کر رہے تھے۔ جب وہ اندر آیا سب نے بیک وقت اُس کی جانب دیکھا۔ گویا سب چیزوں کا دارومدار اُسی پر ہو۔ حملہ اور حملے کے خاتمے کا، مگر اُسی وقت ایک نیا بالخصوص زور کا، خاموشی کو توڑتا ہوا، دھماکا ہوا۔ کہیں بچا کھچا ایک شیشہ افسوس ناک جھنکار پیدا کرتا ہوا پاش پاش ہوا اور کسی عورت کی اچانک ہچکی اور کچھ کہنے کی آواز سنائی دی اور جو بچہ اس کی گود میں سو رہا تھا وہ اچانک بیدار ہو کر رونے لگا۔

"کچھ نہیں، کچھ نہیں" واسیلی واسیلوچ نے زور سے کہا۔ "جلد ہی سب ٹھیک ہو جائے گا۔" اس نے ایک ڈبہ اٹھایا۔ ہاتھوں میں اُسے گھما کر زمین پر رکھ دیا۔ اس طرح ڈبہ کہ نچلا حصہ اوپر کی طرف تھا۔ سب غور سے، نہایت یقین بھری نظروں سے اُس کی طرف دیکھنے لگے۔ اُس عورت اور بچے نے بھی رونا بند کر کے اُس کی طرف دیکھنا شروع کیا.....

وہ ایک ایکٹر کی طرح گویا اسٹیج پہ پارٹ کھیل رہا تھا۔سب سے پہلے اُس نے اپنا چشمہ اتار اور ڈبہ پر رکھ دیا۔ یوں کہ شیشہ اوپر کی طرف تھا۔ پھر اُس نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک نوٹ بک نکالی۔ اُس میں سے ایک ورق پھاڑا، نوٹ بک بند کردی اور واپس جیب میں رکھ لی۔سب نہایت متعجب نگاہوں سے اُس کی جانب دیکھ رہے تھے۔سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔پھر اُس نے ایک چاقو نکالا۔ اور کاغذ کے کئی تپلے تپلے ٹکڑے کاٹ لئے۔ یہ سب کچھ اس نے نہایت اطمینان سے خاموشی سے کیا۔ پھر اپنا چشمہ اُٹھایا۔کاغذ کے پرزوں پر تھوک لگا کر انھیں ضرب کے نشان کی طرح چٹخنے کے شیشوں پر چپکا دیا۔ پھر چشمہ لگا کر اطمینان سے ڈبہ پر بیٹھ گیا۔

تہ خانے میں فوراً ایک قہقہہ بلند ہوا۔ اچانک سب ہنسنے لگے۔کچھ تو مذاق سمجھ کر اور کچھ اس لئے کہ اور سب ہنس رہے تھے۔مگر ہنس سب رہے تھے۔سہمی ہوئی مائیں اور نیند میں ڈوبے بچے اور شرمیلی بوڑھی عورتیں لیزا کی بھی بے ساختہ ہنسی نکل گئی۔ آنکھوں میں پانی آگیا۔ اوکیا بھی اپنی تاب رکھ کر ہنس رہی تھی، کوکونیا بھی جاگ اٹھا اور ہنس پڑا۔

مگر اچانک ایک عجیب سی ہنسی سنائی دی۔ باریک کھلکھلاتی ہنسی۔ بالکل جیسے ایک غبّلا پھٹ گیا ہو سیٹی سی بجاتا ہوا پھٹ پڑا ہو۔ یہ میاں دو دھ پیتو ہنسے تھے وہ اپنی جالی پر لیٹے تھے اور بہت ہی خوش تھے۔ آج اُنھوں نے ہنسنا سیکھا تھا۔ وہ آج زندگی میں پہلی بار ہنسے تھے۔

دوسرے روز شام کے وقت جب سب عورتیں اور بچے اسپیشل ریل گاڑی میں سوار ہو رہے تھے۔ اِدھر اُدھر اپنی اپنی جگہیں سنبھال رہے تھے، اپنی پوٹلیاں، بوتلیں، کمبل وغیرہ بٹور رہے تھے۔ ایک اور حملہ ہوا۔مگر اس دفعہ لیزا کو قطعی خوف محسوس نہیں ہوا۔چاہے مستقبل غیر واضح کیوں نہ ہو۔ چاہے مستقبل میں کتنی ہی دشواریاں کیوں نہ ہوں۔سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اب اسے کوئی خوف نہ تھا۔ وہ ایک ناتجربہ کار ہستی تھی تو کیا ہوا۔ اُس نے اپنے خوف پر قابو پالیا تھا۔ ایک اور جانب منھ موڑ لیا تھا۔ اور سب کچھ برداشت کن معلوم ہونے لگا تھا۔ ایک زینتھ (Zenith) کہیں خنگھاڑا "میں یہاں ہوں"، اس کے جواب میں ایک اور دندنایا "اور میں یہاں گرا" اور "ہم یہاں ہیں، ہم یہاں ہیں!" ارّا اڑا دھم کر کے دوسرے اور زینتھ شور و غل میں اُن کے ساتھ شامل ہو گئے۔ زینتھس (Zeniths) کی دیوانہ وار فائرنگ کے باوجود ریل گاڑی نے اپنی منزل مقصود کی جانب بڑھنا شروع کیا اور جلد ہی اپنی رفتار تیز کر لی۔ ایمرجنسی ریل گاڑی اپنی لائنوں پر بڑھی چلی جا رہی تھی۔ چھت پر ایک ٹوٹے ہوئے شیشوں کی گویا بوچھاڑ سی طبلے کی تھاپ کی طرح سنائی دے رہی تھی جو بہت خوشگوار معلوم ہو رہی تھی۔ کیونکہ یہ ٹوٹے شیشے ہمارے اپنے تھے۔ اُن کی موسیقی کے ساتھ ساتھ تیز بڑھے چلے جانا دنیا بھر میں بنا کسی خوف کے کس قدر اچھا معلوم ہو رہا تھا۔ ایمرجنسی ریل عالم بے خودی میں نعرے لگاتی بھرتی ہوئی آگے بڑھتی جاتی تھی۔ آگے، اور آگے،

دیا بے صبری سے تھرک رہی تھی۔

لیزا اندھیرے میں لیٹی تھی۔ قریب ہی ایک تکیے پر میاں دودھ پیتو سو رہے تھے اور وہ اُس کا گرم گرم سانس اپنے چہرے پر محسوس کر رہی تھی۔ اب کسی بات کا خوف نہیں تھا۔ جو سب کا حال وہ اپنا حال۔ اسے معلوم تھا کہ طیارہ شکن بندوقوں کی دوستانہ فائرنگ کی آواز کے ساتھ ساتھ تیزی سے آگے بڑھے چلے جانا، نہ جانے کہاں؟ اگرچہ دشوار ہوگا مگر دلچسپ بھی ہوگا۔ وہ جاکر کام شروع کرے گی۔ پھر سے اُستانی بنے گی۔ اس کے بہت سے بچے ہوں گے، اپنے اور غیروں کے۔ اور پھر جب جنگ ختم ہوجائے گی وہ سب ماسکو لوٹ آئیں گے "سریوزا" بھی۔ ضرور... ضرور... لوٹ آئے گا۔ اندھیرے میں لیٹی ہوئی وہ مستقبل کا تصور کرتی رہی۔ جنگ کے خاتمے کا۔ اور پھر جنگ کے خاتمے کے خیال کے بعد اس بات کا تصور باندھے اُس کی آنکھ لگ گئی کہ آئندہ مستقبل میں ایک دن ایسا آئے گا جس کا اس وقت سان و گمان بھی نہیں۔ جب میاں دودھ پیتو اسکول جانا شروع کردیں گے۔

براہ راست روسی سے ترجمہ۔

"الوداع، گلسری"

(ناول)

مصنّف

چنگیز احمدوف

ترجمہ

رضیہ سجّاد ظہیر

(ا)

گاڑی پرانی تھی اس کا چلانے والا بوڑھا تھا۔ بادامی رنگ کا گھوڑا جو اس میں جُتا ہوا تھا اُس کا نام کستوری تھا اور وہ بھی بہت بوڑھا تھا۔ اور اِن دونوں کے سامنے اونچائی پر چڑھتی ہوئی لمبی سڑک تھی، جس پر گرمی بھر جہنم کی سی تپش ہوتی تھی، جاڑوں بھر برف جمی رہتی تھی!

اب تانا بیگ کے لیے اس راستے پر چلنا ہمیشہ دشوار ہوتا تھا، ہمیشہ اُسے کھَلتا تھا، ...... جوانی کی بات اور تھی جبکہ خاص کر اسِ چڑھائی پر ہی گھوڑا دوڑانے میں مزہ آتا تھا، زور زور سے ایڑ لگا رہے ہیں، سڑا سڑ چابک برسا رہے ہیں، گھوڑے کی رفتار دَم بدم بڑھتی جا رہی ہے، اس کا دم پھول رہا ہے مگر وہ دوڑے جا رہا ہے ——— یہاں تک کہ سطحِ زمین آگئی۔

اس وقت اُس کا دوست کورتو زندہ تھا اور اکثر اپنے اس سرپھرے دوست سے کہا کرتا تھا "بتاؤں، تم میں کیا عیب ہے تانا بیگ، بس تم میں صبر نہیں ہے ذرا سا بھی! چاہتے ہو کہ ہر کام بس فوراً ہو جائے، تُرت کے پُرت، اب اتنی سی چڑھائی تم رسان رسان نہیں چڑھ سکتے، ایسا دوڑاتے ہو گھوڑا کہ جیسے بھیڑیا لاگو ہو گیا ہو، اور فائدہ کیا ہوتا ہے تمھیں؟ کچھ نہیں، اوپر پہنچ کر دوسرے ساتھیوں کے لیے انتظار تو تمھیں کرنا ہی پڑتا ہے۔ پھر کیا فائدہ ہوا۔ انقلاب کے لیے بھی یوں ہی انتظار کرنا پڑتا ہے میرے بھائی کہ سب ہی جُٹیں تو کام ہو ورنہ کیا اکیلے کوئی انقلاب کر سکتا ہے۔ سب ساتھ آجائیں، تبھی کچھ ہو سکتا ہے، اور سب کے ساتھ چلنے کے لیے تو سبکی ہی رفتار سے چلنا پڑتا ہے"

مگر اِن باتوں کو تو بہت دن گذر چکے تھے۔

اب تو تانا بیگ کو یہ بھی پتہ نہ چلتا تھا، کہ اسکندریہ چوٹی کی یہ چڑھائی کیسے طے ہوتی تھی، بڑھاپا اور اس کے انداز اب ایک عادت بن چکے تھے، اور اب وہ اس چڑھائی پر اکیلا بھی تو ہوتا تھا، وہ چہلیں کرنے، دھوم مچانے والے جو ۱۹۳۰ء میں اس سڑک پر اس کے ساتھ ہوا کرتے تھے۔ وہ اب کہاں تھے، کچھ جنگ میں مارے گئے، کچھ اپنی موت مر

گئے، کچھ اب گھروں میں بیٹھے ہیں اور پنشن کھاتے ہیں۔ رہے نوجوان سو وہ تو اب وردیوں موٹروں میں چلتے ہیں، گھوڑوں کو کون پوچھتا ہے۔

پُرانی سڑک پر گاڑی کے پہیئے کھڑ کھڑاتے، جھٹکے کھاتے، آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہے تھے۔ تانگے والا بدھو کئی دن سے محسوس کر رہا تھا کہ گھوڑا اب جلدی تھک جاتا ہے۔ اس کی طاقت رفتہ رفتہ گھٹ رہی ہے۔ لیکن یہ تو وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اُس کا سنہری رنگ کا، گھوڑ دوڑ دوڑنے والا گھوڑا اس کا پرانا ساتھی کلسری آج آخری بار یہ پرانی چیز کھینچ رہا ہے۔ اُسے کیا معلوم تھا کہ گھوڑے کو چکر آ رہے ہیں۔ اس کی دھندلاتی ہوئی آنکھوں کے آگے زمین گول گول ناچ رہی ہے، جہاں پاؤں رکھتا ہے وہاں تاریک گڑھے دکھائی دیتے ہیں، سڑک کے بجائے لال لال غبار سا، بگولے کی طرح چکر کاٹ رہا ہے۔ پھر بھی بوڑھا گھوڑا اپنی طاقت سے پرانی کھڑ کھڑاتی ہوئی گاڑی اور بوڑھے مالک کو کھینچ رہا تھا۔

پُرانے وقتوں میں بھلا اس کو خیال آ سکتا تھا کہ کلسری کو بھی کبھی ٹھیلہ گاڑی میں جوتا جائے گا۔ وہ تو دوڑ کا گھوڑا تھا۔ پر وہ سب تو گذرے زمانے کی باتیں تھیں۔ اب تو کلسری اپنی آخری طاقت لگا کر آخری نشان چھونے کے لیے اپنے کمزور بوڑھے جسم کو گھسیٹ رہا تھا۔ نہ وہ کبھی اتنا آہستہ چلا تھا۔ نہ خاتمہ کبھی اتنی تیزی سے نزدیک آیا تھا۔

پُرانی سڑک پر پہیئے کھڑکھڑاتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے!

اپنے کھروں کے نیچے زمین کو الٹ پلٹ ہوتا محسوس کر کے، کلسری کو ایک خواب کی سی یاد آئی ۔۔ پہاڑوں میں ہری ہری دوب بچھی ہوئی رہتی تھی۔ چمکدار دھوپ پھیلی ہوتی تھی اور وہ اس دھوپ کے پیچھے دوڑتا دوڑتا بڑی دور نکل جاتا تھا۔ پھر ریوڑ کا سب سے بڑا گھوڑا اُسے گھیر کر واپس لے جاتا، اور پھر سے ریوڑ میں ملا دیتا ـــــــ وہ اس کی ماں تھی نا؟ ایک سفید دوڑتا ہوا بادل، لمبی لمبی ایال تھی اس کی، جب وہ اس کے پیٹ کے نیچے گھستا تو وہ خوش ہو کے عجیب طرح ہنہناتی۔ اس کے تھن کتنے سخت تھے مگر کیسے چکنے، دودھ سے بھرے ہوئے، کبھی کبھی دودھ اتنا بھر جاتا کہ اوپر سے بہہ کر کلسری کے ہونٹوں سے ٹپکنے لگتے اور دودھ کے مارے حلق میں سانس رکنے لگتی اور اچھو لگ جاتا۔ مگر وہ دن کتنے کم دن رہے ـــــــ پھر سردی بڑھنے لگی اور ریوڑ اپنے سفر پر نکل کھڑا ہوا، کھروں تلے برف چرمر کرنے لگی ـــــ پھر اس کی ماں بھی اُسے دودھ پلانے سے کترانے لگی، اگر وہ زیادہ گھستا تو اس کے کولھوں پر دانتوں سے کاٹتی۔ وہ رفتہ رفتہ گھاس کھانی پڑی ـــــ اور وہ زندگی جو چلی تو بڑی لمبی چلی اور اب کہیں جا کے وہ خاتمہ پر آ رہی تھی!

لیکن اتنی لمبی زندگی میں وہ ایک موسم لوٹ کر پھر کبھی نہ آیا گرمیوں کا وہ موسم جو وادیوں میں گزارا تھا۔ بچپن کا موسم! کلسری پر ذین بھی رکھی گئی، سموں میں نعل بھی لگائی گئی، کتنوں نے اس پر سواری بھی کی مگر وہ موسم لوٹ کر نہ آیا، اور آج اتنے دنوں بعد ویسا ہی موسم ایک بار پھر دکھائی دینے لگا، جانے حقیقت تھی کہ نظر کا دھوکا تھا۔ وہی پہاڑ، وہی ٹھنڈی گھاس، وہی ریوڑ اور وہی اس کی ماں ـــــ لمبی ایال والی، سفید بادل کے ٹکڑے کی طرح، اس کے تھن دودھ۔

اور دودھ سے بھرے ہوئے گلسری کو ایسا محسوس ہوا کہ اس کی ماں اُسے ہنہنا کے پکار رہی ہے، بالکل ویسے ہی جیسے
وہ اس موسم میں پکارا کرتی تھی، جبکہ وہ ادھر اُدھر کلیلیں بھرتا دور جا نکلتا تھا۔ نہ اس پر ساز کسا گیا تھا نہ لگام وہ کھلا
تھا، بالکل آزاد، اس نے گردن اٹھا کر آواز نکالنے کی کوشش کی پر آواز رندھ گئی!
گلسری رُک گیا — وہ جھوم رہا تھا، اُس کے کانوں میں ایک عجیب سی گنگناہٹ سنائی دے رہی تھی آنکھوں
میں درد تھا۔
تانا بیگ نے لگام چھوڑ دی، کسی نہ کسی طرح کھانستا کھونستا ٹھیلہ گاڑی سے اترا، اس کے پاؤں بیٹھے بیٹھے
سردی سے جم گئے تھے، پریشان ہو کر گلسری کے پاس پہونچا، بڑے پیار سے کوستے ہوئے بولا " اے کمبخت "
گھوڑا رکا رہا، اس کا بڑا سا سر اور لمبی، دُبلی گردن، پٹے میں سے آگے کو نکلی ہوئی بڑی عجیب لگ رہی تھی،
ریڑھ کی ہڈی کے نیچے ایک ایک پسلی گنی جا سکتی تھی، رنگ جو کبھی چمکدار اور سنہری تھا، اس وقت پسینے اور مٹی اور تھکن
سے مرجھا کر سیاہ پڑ گیا تھا۔
بابا نے اپنی آستین سے اس کا منھ اور گردن پونچھی۔ پھر گاڑی میں سے بچی ہوئی گھاس کے آخری پولے
میں سے ذرا سی گھاس نوچی اور اُسے گلسری کے منھ میں لگانے لگا مگر گلسری نے منھ نہیں کھولا — وہ کھڑا کھڑا لبس کانپے جا رہا
تھا جیسے اُسے لرزہ چڑھ رہا ہو۔
" اے، یہ کیا ہو رہا ہے؟ کیا ہوا بھئی تجھے؟"
گھوڑے کے ہونٹ تو ذرا سا ہلے پر وہ گھاس نہیں لے سکا۔ تانا بیگ نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا
پر اُن اندر دھنسی ہوئی، ادھ کھلی آنکھوں میں کیا دکھائی دیتا ان پر تو پپوٹے جھول کر پردوں کی طرح لٹک گئے تھے۔
دونوں آنکھوں میں ایسی تاریکی تھی جیسے کسی غیر آباد، اجاڑ گھر کی بند کھڑکیاں۔
دونوں اس سنسان، تنہا سڑک پر کھڑے تھے — وہ بوڑھا گھوڑا اور وہ بوڑھا انسان۔ ویسے موسم
کی خرابی کے تو کوئی آثار نہ تھے مگر سردی بڑھتی جا رہی تھی اور شام کا اندھیرا بھی۔ تانا بیگ گھوڑا گاڑی کو چھوڑ کر ایک چھوٹی
سی اونچائی پر چڑھا اور دُور دُور نظر ڈالی، پر کوئی نہ تھا — وہ لوٹ آیا — اب کیا کیا جائے، روانہ ہونا ہی غلطی
تھی، اُفوہ، اس کا غصہ کتنا خراب تھا۔ اب تک اس کا خون یوں کھول جاتا تھا! پر خون کھولنے کی تو بات ہی تھی۔ بھلا
بہو کو سسر سے یوں گفتگو کرنی چاہیے؟ لاکھ کچھ سہی، آخر میں اس کے شوہر کا باپ تھا — نہیں، وہ نہیں رک سکتا
تھا — کیا ڈھٹائی سے کہنے لگی کہ اگر مجھے ساری عمر یوں ریوڑ ہی دیکھنے تھے تو پارٹی میں کیوں شامل ہوا؟ — ارے
تجھے کیا معلوم کیوں شامل ہوا تھا — تو کل کی لڑکی!
اور بیٹے کو دیکھو، چپ چاپ بیٹھا بیوی کی بات سنتا رہا اور ایک لفظ نہیں بولا۔ سارے راستے وہ پیچ و تاب

کھاتا ہوا، کھوندتا ہوا آیا تھا، اس کا جی چاہتا تھا۔ بھوسے کہے میں توسے مجھے، پارٹی میں شامل کروایا تھا یا تو نے نکلوایا تھا؟ وہ زمانے کیسے تھے یہ تو کیا جانے عورت؟ اب تو کہنا بہت آسان ہے ——— پر ہم لوگوں نے کیا کیا بھگتا۔ اور کیا کیا، یہ تم لوگ کیا جانو ——— اور پھر تجھ سے مطلب ہی کیا ہے ——— میرا غم میرا ہے، تجھے اس سے کیا لینا دینا؟ تو کون ہوتی ہے نصیحت کرنے والی، کل کی چھوکری"۔

اُنہہ، اب تو آج کل سبھی جوانوں کا یہی حال ہے، کیا مرد کیا عورت! بڑبڑاتا ہوا وہ گاڑی کے چکر کاٹتا رہا۔ پھر ایک دم سے اُسے خیال آیا کہ کچھ کرنا چاہیے، ایسے کیسے کام چلے گا ——— گلُسری تو ویسے ہی کھڑا تھا ——— کندھے جھکائے آنکھیں بند کئے، پاؤں جوڑے جیسے وہ جیتا جاگتا گھوڑا نہیں لکڑی کا کوئی کھلونا تھا۔

"ارے تو کیا بات ہے بھئی؟ سو گئے ہو؟ کہ بیمار ہو؟ کہ تھک گئے ہو؟ یہ ہے کیا معاملہ؟"

اب اگر گلُسری کو چھوڑ کر پیدل جاتا ہے تو ایک گھنٹے سے کیا کم لگے گا۔ چوکی دار کا وہ سرکاری مکان جس میں وہ چوکیدار ہونے کے بعد رہا کرتا تھا، وہ زیادہ نہیں تو کم از کم دو کیلومیٹر تو ہو گا ہی اور وہ بھی چڑھائی پر! پچھلے سال جب وہ فارم کے دفتر گیا تھا تو ایک نئے افسر سے اس کی ملاقات ہوئی تھی۔ ایک نوجوان جس نے کسی زراعتی کالج میں تعلیم پائی تھی، نہ جانے کہاں کا رہنے والا تھا مگر ویسے تھا خوش اخلاق، اور اس نے کہا تھا "اصطبل میں جا کر دیکھ لیجئے تانا بیگ ہم نے آپ کے لیے ایک گھوڑے کا انتظام کر دیا ہے۔ ویسے وہ ہے تو بوڑھا پر آپ کا کام دے دے گا"۔

تانا بیگ نے کچھ کھسیا کے کہا تھا "کیا مطلب ہوا؟ آپ لوگوں نے پھر گٹھری بھر کے ہڈیاں میرے حوالے کرنے کی سوچ لی؟"

نوجوان نے اس کی بات کا بُرا نہیں مانا تھا، ذرا خوش مزاجی سے مسکرا کر بولا تھا "آپ دیکھئے تو سہی، ہم نے سنا ہے کبھی وہ دوڑ میں چلتا تھا اور یہاں کوئی یہ بھی کہہ رہا تھا کہ جوانی میں آپ اس پر سواری بھی کرتے تھے"۔

تانا بیگ جو اصطبل میں گیا تو پھر انکار نہ کر سکا ——— وہ گھوڑا گلُسری تھا۔

جھک کر وہ گلُسری کے کان میں بولا "اچھا! تو یوں پھر ملاقات ہوئی؟ ایں؟ آؤ دوست، قسمت نے پھر ہم دونوں کی ایک راہ کر دی"۔

اور وہ اُسے اپنے گھر لے گیا۔

تانا بیگ کی بیوی جیدار نے گلُسری کو نہیں پہچانا۔ حیران ہو کر بولی "تانا بیگ، یقین نہیں آتا ہے کہ یہ واقعی گلُسری ہے! نہیں، یہ گلُسری ہے؟"

تانا بیگ اپنی بیوی سے آنکھیں چار کئے بغیر، سر جھکا کے غرایا "ہاں ——— ہے تو پھر کیا ——— کھڑی کھڑی منہ کیوں دیکھ رہی ہو، کھانا گرم کرو اور اس کے لیے کچھ سبزیاں کچی پڑی ہوں تو لے آؤ ——— ہم دونوں

بہت بھوکے ہیں "
"نہیں میں یہ سوچ رہی تھی کہ جاندار کے لیے بڑھاپا بھی کیسی سخت منزل ہے ، اگر تم نہ بتاتے کہ یہ گلسری ہے تو میں تو کبھی نہ پہچان پاتی "
اس سال خزاں کے موسم بھر تانا بیگ نے گلسری کو خوب کھلایا پلایا ـــــ گرم گرم بھوسی، کٹی ہوئی سبزیاں اچھی سے اچھی گھاس ـــــ اور اب ـــــ اب اس ساری محنت کا یہ انجام ہونا تھا۔
تانا بیگ نے گلسری کو آہستہ سے ایک طرف کو دھکیلا " ابے او بے، کر کیا رہا ہے، چلنا ہے کہ رات بھر یہیں کھڑے رہنا ہے "
گلسری نے ایک بار گردن اٹھائی ، ایک آنکھ کھول کر اپنے مالک کو حسرت سے دیکھا اور اس کی گردن پھر جھول گئی !
تانا بیگ لپک کے گاڑی میں چڑھا، اندر گاڑی کے جنگلے سے ٹکا ہوا ایک جھولا رکھا تھا جس میں وہ اپنے بیٹے بہو کے لیے آلو لے گیا تھا، اور اسی جھولے میں بالکل نیچے کچھ بن تھے جو اس کی بیوی نے پکا کر نا شتے کے لیے ساتھ کر دیئے تھے، وہ تو بھول ہی گیا تھا ـــــ کھا نا کب، بھوک نے تو منہ کا مزہ ہی کرکرا کر دیا تھا ، تانا بیگ نے ایک بن نکالا، اپنے کرتے کا جھولا بنا کر، اس میں بن کو توڑا اور ہتھیلی پر رکھ کر گلسری کے منہ کے پاس لے گیا گھوڑے نے زور سے بن کے ٹکڑے کو سونگھا ـــــ پھر گردن جھکا لی !
تانا بیگ نے اپنے ہاتھ سے ایک ٹکڑا اس کے منہ میں ٹھونس دیا ، گلسری آہستہ آہستہ چبانے لگا ۔
تانا بیگ نے اپنے ہاتھ سے ایک ٹکڑا اس کے منہ میں اور دیا۔ وہ چباتا رہا ـــــ تانا بیگ کی جان میں جان آگئی۔
" ہاں ، یہ بات ہے ۔ شاباش ، اب تو گھر پہونچ جائیں گے ہم تم ـــــ ایں نہ ؟" ـــــ اس کے کانپتے تھرتھراتے ہاتھوں پر گھوڑے کا گرم گرم جھاگ دار تھوک گر رہا تھا اور تانا بیگ خوش ہو رہا تھا ـــــ تھوک کا گرم ہونا ، اچھی علامت تھی ۔
پورا بن گھوڑے کو کھلا کر اس نے اپنی آستین سے گلسری کا منہ پونچھا، اس کی ایال چومی اور گاڑی میں بیٹھ کر دھیرے سے لگاموں کو اٹھایا " اب کیا رائے ہے بھئی ـــــ چلو گے نہ ؟"
گلسری نے قدم بڑھائے ، پہیئے کھڑکھڑائے ، گاڑی چرچرا کے آگے کھسکی ـــــ دونوں چل پڑے ـــــ بوڑھا گھوڑا اور بوڑھا انسان ـــــ تانا بیگ نے آگے کو جھک کر بڑبڑانا شروع کیا " کتنے دن ہوئے گلسری ، کتنے دن گذر رہے ؟ بہت وقت بیت گیا نہ ؟ تمہاری بھلا کیا عمر ہوگی ؟ بائیس برس کے ہو ؟ کہ بیس کے ہو ؟ کتنے دن نکل گئے گلسری ، کتنے دن ؟"

(۲)

گلسری اور تاتا نابیگ کی پہلی ملاقات جنگ کے بعد ہوئی تھی۔

سپاہی تاتانابیگ برسوں بعد جب لڑائی پر سے لوٹا تو بازار میں ایک کباڑن نے اس سے ہنس کر کہا تھا: "کہو، بڑے میاں"—— اور تاتا نابیگ کو یہ بات بہت بُری لگی تھی! یہ ٹھیک ہے کہ مونچھوں میں دو چار سفید بال آگئے تھے پر عمر تو ابھی زیادہ نہیں تھی اور دل تو بہر حال جوان تھا، جسم مضبوط تھا، طبیعت چونچال تھی!

سال بھر بعد اس کے یہاں ایک بیٹی پیدا ہوئی، پھر ایک اور ہوئی، پھر ایک بیٹا ہوا۔ بیٹیاں تو اب دونوں بیاہی جا چکی تھیں، دامادوں سے تاتا نابیگ خوش بھی تھا مگر بیٹا بہو—— افوہ، وہ تو ایک اور ہی داستان تھی۔

جنگ سے لوٹ کر آنے کے بعد تاتا نابیگ ایک لوہاری کی دوکان میں ہتھوڑا چلانے پر نوکر ہو گیا تھا۔ پہلے بھی وہ اہرن پر گرم، لال لوہے کو پیٹنے کا کام کر چکا تھا۔ اور اب بھی اتنے زور سے مارتا تھا کہ لوہار گرم تپتا لوہا گھمانے، اس کا رُخ بدلنے کی بھی مہلت نہ دیتا، وہ برابر یہی کہے جاتا: "ارے بھئی، تاتا نابیگ ذرا رک رک کے، اتنی اُتاولی کیا پڑی ہے!"

اس زمانے میں اناج کافی نہیں ملتا تھا، بچے چینی کا نام نہیں جانتے تھے، لوگ میٹھے کو ترس گئے تھے پنچائتی فارم سب ناک تک قرضوں میں لدے تھے، بینک کا حساب کتاب ایسا اڑا تھا کہ گھٹتا ہی نہیں تھا مگر تاتا نابیگ تھا کہ ہتھوڑا مارے جاتا تھا جیسے وہ ان تمام مشکلات اور مصیبتوں کو اپنے ہتھوڑے سے پیٹ پاٹ کر برابر کر دے گا۔ جیسے اس کے ہتھوڑے سے بس یہی ایک صدا ہو "فتح، فتح، فتح"!

پھر تاتا نابیگ کو پہاڑوں میں بھیج دیا گیا—— گھوڑوں کے گلّوں کی دیکھ بھال کرنے اور ان کو بڑھانے کے لیے—— اور بھیڑوں کی نگرانی کے لئے!

یہ سب کورد کا کیا ہوا تھا—— کورد جو تاتا نابیگ کا دوست، اس کا ساتھی اور پارٹی کا رفیق تھا، اس ضلع کی پارٹی یونٹ کا منتظم تھا —— اور جواب مر چکا تھا—— ورنہ بھلا تاتا نابیگ کو کون پہاڑوں میں جانے پر راضی کر سکتا تھا۔ کورد مسلسل بیمار رہتا تھا، دل کا مریض تھا، وہ بے حد لمبا اور بہت دُبلا پتلا تھا لمبی گردن، جھولتے ہوئے ہاتھ پاؤں، فوج میں بھی وہ اسی لیے نہیں بھیجا گیا تھا کہ اس کا دل کمزور تھا اور اس دن اسی پہاڑی ٹیلہ پر بیٹھ کر اس نے تاتا نابیگ سے بات کی تھی "اس علاقے کی پارٹی کے لوگوں نے مجھ سے پوچھا کہ سب سپاہی لوٹ آئے؟" تو میں نے کہا "ہاں، لوٹ بھی آئے اور کام پر بھی لگ گئے، کھیتوں میں، مکانات بنانے میں، سڑکیں تیار کرنے میں" تو وہ لوگ کہنے لگے کہ یہ تو سب ٹھیک ہے مگر گھوڑوں کے گلّے کون دیکھے گا، بھیڑوں کو کون سنبھالے گا——

دو تین بوڑھے آدمیوں سے کیا ہوگا — تمھیں پتہ ہے وہ جو تھا درویش بیگ، وہ سردی سے جم کے مرگیا، اور زیادہ تر سپاہی شہروں میں رہنا چاہتے ہیں، باہر کے ملکوں سے ہو آئے ہیں نہ تو نخرہ بہت بڑھ گیا ہے — تانا بیگ تم کچھ مدد کرو نہ — اگر تم راضی ہو جاؤگے تو ہو سکتا ہے کہ کچھ اور لوگ بھی راضی ہو جائیں — کہو، کیا کہتے ہو؟ کام تو مشکل ہے، پر اب ہم ایسے پرانے کمیونسٹوں کو تو مشکل ہی کام سونپا جائے گا — کہو؟

تانا بیگ نے بس اتنا ہی کہا تھا "اچھا — مگر اتنی مہلت تو دو کہ تمھاری بھابی سے پوچھ لوں"

پھر تانا بیگ پہاڑوں میں چلا گیا اور گلّوں کا حساب کتاب کرتے ہوئے اس کی نظر ایک بچھیرے پر پڑی تھی — وہ اٹھارہ مہینے کا تھا اور ترغائی بیگ کے گلّے میں تھا۔

جب گھوڑوں کو گن گن کر نکالا جا رہا تھا تو تانا بیگ نے کہا تھا "یہ کیا گھوڑے آپ نے رکھ چھوڑے ہیں، ایک بھی تو نسلی نہیں، اصیل نہیں"

ترغائی بیگ بہت بوڑھا تھا، منّا سا قد، چندیا صاف، سوکھا سہما، اس کے سر پر رکھی ہوئی بالدار ٹوپی ایسی لگ رہی تھی جیسے سانپ کی چھتری۔ ایسے لوگوں کو عام طور پر جلدی غصّہ آجاتا ہے لیکن ترغائی بیگ کو اس وقت غصّہ نہیں آیا بڑے طنز سے مسکرا کے بولا "ایسی بات نہیں ہے، اصیل دیکھنے کے لیے بھی نظر چاہیے تانا بیگ، اسے دیکھو، وہ جو سنہری بچھیرا ہے"

پھر تانا بیگ کو بھی یقین آگیا کہ واقعی اس نے پہلے غور سے نہیں دیکھا تھا! لیکن ترغائی بیگ نے اس سے رازدارانہ انداز میں کہا "دیکھو تانا بیگ، اس کے متعلق لوگوں سے زیادہ بک بک نہ کرتے پھرنا، اچھی چیز کو اچک لینے کی فکر سب کو رہتی ہے، اور کسی کو اسے ہاتھ نہ لگانے دینا، کہے دیتا ہوں! اگلے موسم بہار میں اسے خود ہی گاڑی میں ڈالنا۔ کسی اناڑی کے حوالے نہ کر دینا۔ جب پہلی بار اس پر زین کسنا تو خیال رکھنا کہ زیادہ تیز نہ دوڑانا ورنہ اس کی چال ٹوٹ جائے گی۔ اور جب پہلی بار یہ جوڑا کھائے تو شروع دنوں میں ایسے جوڑا کھانے کے لیے پانی نہ دینا ورنہ اس کی ٹانگوں اور جانگھوں میں گرہیں پڑ جائیں گی — اور اس کا نام ہے گلسری — یاد رکھنا اس میں ریس کا گھوڑا بننے کے آثار ہیں"

تانا بیگ نے کنکھیوں سے گھوڑے کو دیکھتے ہوئے کہا تھا "میں بھی گھوڑوں کی دیکھ بھال کے بارے میں کچھ جانتا ہوں ترغائی بیگ، بچہ نہیں ہوں"

"نہیں میں نے احتیاطاً تم سے کہا — اور ہاں جب یہ سواری دینے لگے تو ایک نظر مجھ کو بھی دکھا جانا، یعنی اگر میں اس وقت زندہ رہوں تو — اور یاد کرنا کہ بوڑھا ترغائی بیگ کبھی کچھ کہتا تھا، کہ وہ بھی ایک پہچان کی نظر رکھتا تھا، تم دیکھنا یہ گھوڑا تو بہت کچھ کر کے دکھائے گا"

پھر برف پگھلنے لگی، گھاس پر ہریالی چھانے لگی، گلُسری تیزی سے بڑا ہونے لگا! کون جانے گھوڑوں کی یادداشت کیسی ہوتی ہے، پر انسانوں کو ایک ایک پل یاد رہتا ہے ــــ تانابیگ کو وہ وقت یاد آیا جب وہ کورَوسے رُ ر پڑا تھا، کورَو جو فارم کا چیئرمین ہو گیا تھا۔ چیخ چیخ کر تانابیگ نے دفتر سر پر اٹھا لیا تھا: "ایسا کیوں مجھے گھور گھور کے دیکھ رہے ہو، مجھے پہچانتے نہیں ہو؟ کیا میں انقلاب کا دشمن ہوں، گیا میں فاشسٹ ہوں؟ اٹھا کے اتنے بہت سے گھوڑے میرے حوالے کر دیئے، بھیڑیں الگ ــــ کہاں ہیں اصطبل اور باڑے، کہاں ہے ان کے لیے دانہ چارہ، نمک؟ دیکھو ہم کیسے چیتھڑے لگائے ہیں، پھٹے پرانے خیموں میں میرے بچے سردی کھاتے ہیں، پیٹ بھر روٹی نہیں ملتی۔ اس سے تو جنگ کے مورچے پر ہی اچھا تھا، بڑے انقلاب کرنے والے آئے، ہم کیا کریں تم نے انقلاب کر لیا تو؟ کیا اپنے ہاتھ پیر کاٹ کے ان گھوڑوں کو کھلا دیں؟ چلے ہیں پنچایتی فارم بنانے؟ جیسے ہم نے تو انقلاب کے لیے کچھ کیا ہی نہیں ہے۔"

کورَو چپ چاپ سنتا رہا، ایک لفظ نہیں بولا ــــ یہاں تک کہ تانابیگ گرجتے گرجتے اتھک کے ایک بنچ پر ڈھیر پڑا اور آنسو بہاتے ہوئے بولا "مجھے معاف کرنا دوست ــــ غصہ ذرا جلدی آ جاتا ہے ــــ جاتا ہوں، جان دے کر بھی انقلاب کی حفاظت کروں گا ــــ وہ انقلاب جو میں نے تم نے مل کر بنایا ہے، جاتا ہوں۔"

کورَو نے ایک ٹھنڈی سانس بھری، پیار اور اعتماد کی نظروں سے اپنے دوست کو دیکھا اور رہا ہنستے ہوئے پھر کام میں لگ گیا۔ اُسے اس وقت تیز بخار تھا پر وہ صبح سے دفتر میں بیٹھا کام کر رہا تھا۔ آہ کورَو!

اور یہ تو اس وقت کی بات ہے جب تانابیگ نے سارے گلّے کو اکٹھا کیا تھا ــــ برف اتنی پڑ رہی تھی کہ اس کی سفیدی میں گھوڑے اور انسان دونوں ہی کالے کالے دھبوں کی طرح لگتے تھے۔ اس دن بڑا سخت طوفان آیا تھا۔ گلُسری کو اور گھوڑوں نے دھکیلتے دھکیلتے بالکل ایک کنارے کر دیا تھا۔ برف کی بوچھار گھوڑوں کی دُموں، ایالوں اور پلکوں پر بیٹھتی چلی جا رہی تھی، پھر ایک دم سے ایک بڑا سا گھوڑا تیز دوڑتا ہوا آیا ــــ وہ گلّے کا سب سے بڑا گھوڑا تھا اور اِدھر اُدھر بھٹک جانے، رُل جانے والے گھوڑوں کو سمیٹ کر گلّے میں لانا اس کا کام تھا ــــ اس نے گلُسری کے پیٹ میں ایک لات ماری ــــ گلُسری تڑپ گیا، لڑکھڑا گیا، اور بے قابو ہو کر ایک طرف کو دوڑا ــــ اُس گھوڑے نے پھر اسے گھیرا اور اب وہ بیچ گلّے میں آ کر چپکا کھڑا ہو گیا ــــ اور پھر دور سے ایک لمبی سی، ہولناک چیخ سنائی دی جیسے رونے کی صدا ــــ گلُسری کا خون جمنے لگا۔ اس نے پہلے کبھی بھیڑیے کی ہوک نہیں سُنی تھی اور یہ تو بھیڑیوں کا شاید گلّے کا گلّہ معلوم ہوتا تھا ــــ تمام گھوڑے یوں سہمے ہوئے تھے کہ سناٹا طاری ہو گیا تھا، بس گلُسری بار بار سر اُٹھا کر اِدھر اُدھر دیکھتا تھا ــــ مالک کہاں ہے ــــ؟ پھر دُور کہیں سے بندوق دغنے کی آوازیں آئیں، دھائیں، دھائیں، پہلے ایک گولی، پھر

دوسری گولی، پھر تیسری گولی اور پھر کالے گھوڑے پر سوار ایک سایہ، ہوا سے باتیں کرتا گھوڑوں کے اس گلّے کو پکارتا، پاس سے زن سے گزرا ــــــ تمام گھوڑے اس کے پیچھے دوڑنے لگے ــــــ دوڑتے رہے، دوڑتے رہے، یہاں تک کہ تڑکا ہوگیا ــــــ رات گذر گئی ــــــ تاتا بیگ اپنے گلّے کو بھیڑیوں سے بچا کر نکال لانے میں کامیاب ہوگیا تھا ــــــ جب گھوڑے رُکے تو اُن کے جسموں سے بھاپ اٹھ اٹھ کر فضا میں گھلنے ملنے لگی۔ دوڑتے دوڑتے وہ بھوک پیاس سے بدحال ہو کر برف کھا رہے تھے، تاتا بیگ بھی برف کھا رہا تھا ــــــ اپنا گھوڑا چھوڑ کر وہ برف میں دوزانو ہوگیا تھا اور بڑے ہوکے کے ساتھ دونوں ہاتھوں سے برف کھرچ کھرچ کے کھا رہا تھا!

پھر ایک دن مالک نے ہرے سے ٹین کے کنستر پر تھاپ دی ــــــ اور ساتھ ہی زور زور سے آواز ــــــ پو، پو، پو! ــــــ سب گھوڑے دوڑتے ہوئے آپہونچے۔ گلسری بھی سب کے ساتھ نمک چاٹ رہا تھا، پر اس کو اس سے کیا لینا تھا کہ مالک اور کچھ اور آدمیوں کے ہاتھوں میں پھندے تھے، پھندے تو سواری کے گھوڑوں کے لیے ہوتے ہیں اور وہ آزاد تھا ــــــ پھر یکایک بالوں کے رسّے کا پھندا اس کے گلے میں پڑ گیا، مگر پھر بھی اس پر کچھ اثر نہ ہوا ــــــ وہ اسی طرح نمک چاٹتا رہا ــــــ جب نمک چاٹ کر اس نے چشمے کی طرف پانی پینے کے لیے دوڑنے کا ارادہ کیا تو یکایک پھندا کس گیا ــــــ آہ، یہ کیا تھا؟ یہ تو ایک بالکل ہی نئی بات تھی!

گلسری چونک پڑا اور ایکدم رُک گیا، زور سے ہنہنا کے وہ اپنے دونوں پچھلے پیروں پر کھڑا ہوگیا اور اُس کی آنکھیں باہر کو اُبل آئیں، اس کے چاروں طرف جو گھوڑے تھے وہ اِدھر اُدھر بھاگ گئے ــــــ وہ اکیلا رہ گیا ــــــ ان انسانوں کے بیچ میں جو اسے بالوں کے رسّے سے جکڑے ہوئے تھے، اور اب وہ جتنا ہی کھینچتا تھا، جتنا ہی زور لگاتا تھا، وہ پھندا اُتنا ہی تنگ ہوتا جاتا تھا ــــــ پھر اُس کی آنکھوں پر اندھیری چڑھائی گئی، منھ میں لوہے کا ایک ٹکڑا پھنسا یا گیا، نگامیں لگائی گئیں ــــــ لوہے کا مزہ کتنا خراب تھا، کس بُری طرح سے وہ اس کے دہانے کی دونوں نوکوں کو زخمی کر رہا تھا، جہاں مہمیزیں لگائی جاتی ہیں وہ جگہیں کتنی دکھ رہی تھیں، دور سے چشمے کے بہنے کی میٹھی گڑگڑاہٹ کی آواز آرہی تھی مگر اسے پانی نہیں دیا گیا تھا ــــــ دن بھر، تھوڑی تھوڑی دیر بعد اسے دوڑایا جا رہا تھا ــــــ گول گول چکر، گول گول چکر! آہ، یہ سب کیا تھا؟

پھر رات ہوگئی، چاند نکل آیا اور وہ ایک جگہ جہاں باندھ دیا گیا تھا، وہیں بندھا رہا، کسی نے اُس کی کوئی پرواہ نہیں کی ــــــ مگر یہ کیا ہے؟ گلسری کو محسوس ہوا کہ کوئی اُسے ڈھونڈ رہا ہے ــــــ یہ وہ نوجوان گھوڑی تھی جو چشمے کے اُدھر رہتی تھی، اس کے ماتھے پر سفید ٹیکہ تھا، اور وہ گلسری سے کھیلنے کی بہت شوقین تھی، گلسری کے ریوڑ میں بہت سے جوان گھوڑے اس سے جیسی دلچسپی رکھتے تھے، ویسی گلسری کو نہیں تھی، شائد اُس کے لیے

وہ گلسری سے نہیں ڈرتی تھی اور بلا جھجک اس کے پاس آجایا کرتی تھی۔

آہستہ آہستہ ہنہنا ہنہنا کے وہ گلسری کو بلا رہی تھی مگر وہ کیسے جاتا، اس کے تو اب لگامیں لگ چکی تھیں، وہ بندھا ہوا تھا۔ اب تو قیدی زیادہ!

گھوڑی چشمہ پار کر کے آئی تھی اس لیے جب وہ گلسری کے نزدیک آئی تو تازے پانی کی نمی، خوشبو اور ٹھنڈک اس کے پاس مہک رہی تھی، اس نے گلسری کی گردن میں اپنا سر اڑا کے اسے سونگھنا شروع کیا! اپنے گرم گرم نرم ہونٹوں سے اسے چھونا شروع کیا، آہستہ آہستہ خرخر کرنے لگی جیسے کہتی ہو آؤ چلیں، روز کی طرح کھیلیں، کلیلیں کریں، چھلانگیں لگائیں۔ ـــــ آؤ، آج تمھیں کیا ہو گیا ہے ـــــ پر گلسری پر کچھ اثر نہ ہوا، وہ جکڑا ہوا تھا، بندھا ہوا تھا، اسے سخت پیاس لگی تھی ـــــ اور پھر وہ چلی گئی، کودتی اچھلتی دوڑتی، اور پھر دور سے دھندلکے میں وہ ایک کالے دھبے کی طرح دکھنے لگی ـــــ گلسری کی آنکھوں سے آنسو نکلنے لگے۔

وہ زندگی میں پہلی بار رو دیا!

صبح تڑکے مالک آیا "کیوں گلسری، کل تو تم نے مجھے خوب تگنی کا ناچ نچایا ـــــ مگر تم بھی کیا کرتے، پہلی بار قید ہونا بڑی مصیبت ہے دوست! مگر یہ بتاؤ کہ تم آخر کیا سمجھے بیٹھے تھے کہ زندگی بھر یوں ہی دولتیاں جھاڑتے کلیلیں کرتے پھرو گے؟ ایں؟ آخر کام میں تو لگنا ہی ہوا نہ کبھی نہ کبھی ـــــ تم عادی ہو جاؤ گے گلسری ـــــ عادی ہو جاؤ گے۔ پیاس لگی ہے؟ چلو تمھیں چشمے پر لے چل رہے ہیں۔"

پھر وہ اسے چشمے پر لے گیا تھا ـــــ ساز کھولا تھا اور پھر گلسری نے بیتاب ہو کر پانی میں اپنی تھوتھنی ڈال دی تھی ـــــ آہ کتنا اچھا پانی تھا، میٹھا، ٹھنڈا، اس سے اس کے زخمی منہ کو کتنا آرام ملا تھا، کتنا وہ اپنے مالک کا مشکور ہوا تھا!

تو یوں ہوا ـــــ اور پھر تو وہ زین کا اتنا عادی ہو گیا کہ جیسے زین پیٹھ پر ہے ہی نہیں اور اس کا مالک فخر یہ کہتا تھا۔ "کون گلسری؟ ارے اس کی تو پیٹھ پر ایک بالٹی بھر پانی رکھ کے دوڑاؤ تو کیا مجال کہ ایک بوند چھلک جائے!"

(۳)

پرانی ٹھیلہ گاڑی کے پہیے چرچرا رہے تھے، کبھی کبھی یہ آواز رک جاتی تھی ـــــ جب گلسری تھک کے رک جاتا تھا اور اسے اپنے دل کے دھڑکنے کی آواز دور کہیں سے آتی ہوئی لگتی تھی ـــــ لب ڈب، لب ڈب......

جب گاڑی کی چرچراہٹ تھمتی تو اس وقت "نابیگ" بھی لگامیں ڈھیلی کر دیتا، گھوڑے کو سانس لینے کی مہلت دے دیتا، پھر دھیرے سے لگام اٹھاتا "چلو بھئی گلسری، چلو شاباش، دیکھو اندھیرا بڑھ رہا ہے.... گھر چلنا ہے نہ

پہونچنا ہے بد..... چلے چلو"

ڈیڑھ گھنٹے تک یوں ہی چلنے کے بعد گلسری بالکل رُک گیا ——— "کیا بات ہے؟ پھر رُک گئے؟

چلو گلسری، رات بڑھ رہی ہے"

مگر گلسری کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔

تانا بیگ جلدی سے گاڑی پر سے اُترا، ساز کھولا، بم ہٹائے۔ گاڑی الگ کی اور گلسری کے منھ کے پاس سے لگام پکڑی "ایسی کی تیسی گاڑی کی اور ساز۔ یہ بوجھ لے کر نہیں چل سکتے تو چلو میں تمھیں لیے چلتا ہوں، ہم تم پہونچ جائیں، بس اتنا ہی بہت ہے"

اور مالک آہستہ آہستہ چلنے لگا ——— کتنے دن گذر رہے؟ بھلا کب سے گلسری اس کا ساتھ دے رہا تھا؛ اور اُسے وہ تمام باتیں یاد آنے لگیں جو اس گھوڑے سے متعلق تھیں۔ سب انسان ایک ہی سے ہوتے ہیں کہ زندگی میں تو کسی کی قدر نہ کی اور جب وہ مرنے لگا تب پتہ چلا کہ کیا کھویا ——— کون کون لوگ تھے جنھوں نے گلسری پر سواری کی تھی، اور اب تو وہ اُسے بھول بھی چلے تھے، خود تانا بیگ بھی بہت کچھ بھول چکا تھا پر آج بیٹے بہو کی باتوں نے بہت سے پرانے زخم کرید دیئے تھے!

اب ایک پہاڑی پُدیا آگئی تھی، گلسری رک گیا، اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں، وہ لیٹنا چاہتا تھا مگر تانا بیگ کو معلوم تھا کہ گلسری کو لیٹنے نہیں دینا چاہیئے، اگر ایک بار لیٹ گیا تو پھر نہیں اُٹھے گا، اس نے گلسری کی گردن میں اپنی باہیں ڈال دیں "گلسری ——— نہیں، نہیں، لیٹنا مت، دیکھو لیٹنے کی نہیں ہوتی ہے بھائی، چلے چلو، دیکھو میں بھی تو تمھارے ساتھ چل رہا ہوں"...

پیچھے سے انجن کی آواز آئی، لاری میں سے ایک نوجوان جھانکا، اس کے پاس ہی ایک اور نوجوان بھی بیٹھا تھا، وہ دونوں تانا بیگ کو دیکھ کر حیران رہ گئے ——— یہ رات، یہ اندھیرا، یہ پہاڑ کی چڑھائی، یہ کنکروں بھری سڑک اور یہ اکیلا بوڑھا ——— نہیں، ایک گھوڑا بھی تھا، ہڈی چمڑا، جیسے ڈھانچہ!

"کہاں جا رہے ہو، بڑے میاں؟"

"سار یگاؤ ——— جہاں میرا گھر ہے"

"اوہ ——— اتنی دور ——— کہو تو تمھیں پہونچا دیں"

"نہیں شکریہ، یہ میرا گھوڑا بھی تو ہے"

"یہ؟ یہ ہڈیوں کا پنجر؟ یہ گھوڑا ہے؟ اسے کہاں گھسیٹے پھر رہے ہو، چھوڑ دو"

"چلو چلو، اپنے رستے لگو۔ میں نے تم سے کب کہا کہ مجھے پہونچاؤ"

نوجوان ڈرائیور ہنسا "بڑے میاں سٹھیا گئے ہیں۔"

انجن غرایا، لاری چل پڑی، جب اُس کی روشنیاں ایک موڑ کی آڑ میں چلی گئیں تو پھر وہی اندھیری رات تھی، چاند پہاڑیوں کی اوٹ سے بادل کے ایک ٹکڑے کے پیچھے دھندلا دھندلا جھانک رہا تھا، ستارے آسمان پر سردی سے تھر تھرا رہے تھے ــــ ایک بڑھا گھوڑا تھا اور ایک بوڑھا انسان، ایک دوسرے کے پُرانے رفیق، ہمدمِ دیرینہ ــــ یادوں کا راستہ بہت لمبا تھا، اس میں بڑے نشیب و فراز تھے!

(۳)

جس سال گلُسری کو اڑ گڑے میں ڈالا گیا اور اس پر زین کسی گئی تھی وہ سال تانا بیگ کی زندگی میں بہترین سال تھا، وہ اُسی وقت جنگ سے لوٹا تھا۔ اگر یہ گھوڑا اسے چند سال پہلے ملتا، یا چند سال بعد تو پھر وہ اس سے اتنا لطف نہیں اٹھا سکتا تھا، اور اتنے نفیس رلیس کے گھوڑے پر بیٹھ کر وہ اترائے بغیر رہ بھی نہیں سکتا تھا۔ خاصکر جب رستے میں عورتیں مل جاتیں۔

گلُسری کو بھی یہ بات معلوم تھی!

موسم بہار کے زمانے میں جہاں گلُسری دُور سے دیکھتا کہ کھیتوں سے خوبصورت لڑکیوں کا جھنڈ نکلا ــــ رنگ برنگے گھیردار لہنگے پہنے، سروں پر لال رومال باندھے ــــ بس پگڈنڈی پر اُس کی رفتار تیز ہو جاتی تھی، دُم اتنی اُٹھ جاتی کہ پیٹھ کے برابر ہو جاتی، ایال ہوا میں لہراتی، کنوتیاں جھک جاتیں، اپنے مالک کا بوجھ اُسے محسوس تک نہ ہوتا، نتھنے پھلائے، خرخر کرتا، اتنی نشیلی رفتار پر اپنے آپ مست، جھُومتا، دندناتا وہ عورتوں کے بیچ میں سے ہو کر نکلتا، عورتیں چیخیں مار مار کے بھاگتیں اور اِدھر اُدھر کھیتوں میں گھس جاتیں، اور زور زور سے چلّاتیں "سنہری گھوڑے والے ...... ذرا تھم کے ...... ذرا تھم کے رے رے ......"

کبھی کبھار وہ تانا بیگ کو روک بھی لیتیں، اس کے ہاتھ سے اناج کی ہری ہری لمبی لمبی بالیاں چھین لیتیں، قہقہے پڑتے "ارے اتنی بہت ساری گھوڑیاں پالے ہوئے ہے تانا بیگ، ہم لوگوں کو کمیس (گھوڑی کے دودھ کی شراب) کب پلائے گا؟"

کوئی کہتی "ہائے رے، ہم تو رات دن کھیتوں میں ہڈیاں پیلیں اور یہ مسٹنڈا گھوڑے پر چھیلا بنا دندناتا پھرے ......"

"تم کو کس نے منع کیا ہے میری جان، آؤ میرے ساتھ، آؤ چلو، آجاؤ یہاں زین پر بیٹھ جاؤ، دیکھو میرا گلُسری تمھیں کیسا اُڑائے جاتا ہے ــــ پر ہاں وا اپنے اپنے شوہروں سے کہتی آنا کہ دوسرا نکاح کرلیں، میں

اور میرا گلسری کسی کی واپسی کے ذمہ دار نہیں ہیں ـــــ آؤ، آؤ چلو"۔

کبھی کبھار تانا بیگ ایک دم گلسری پر سے کود پڑتا اور لڑکیوں کے پیچھے بھاگتا، وہ چیخیں مار مار کے ہنستی ہوئی کھیتوں میں گھس جاتیں، گلسری گول گول چکر کاٹتا، اور زور زور سے ہنہنا کے مالک کو پکارتا" بس اب چلے آؤ، زیادہ دور نہ جاتا، ـــــ آجاؤ، بس اب آجاؤ، گھر کا راستہ تو ادھر ہے ادھر"۔

اسی سال تانا بیگ پنچایتی فارم میں چُنا گیا!

جب وہ چُنا گیا تب تو اُسے بہت خوشی ہوئی تھی مگر جب وہ میٹنگ میں پہونچا تو اُسے بڑی گھبراہٹ ہوئی۔ اُس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آرہا تھا۔ ویسے تو شروع ہی سے پارٹی کے ساتھ تھا مگر یہاں تو کیفیت ہی اور تھی، پنچایتی فارم کمیٹی میں کچھ ایسے لوگ بھی گھس آئے تھے جو تانا بیگ سے ذاتی دشمنی رکھتے تھے اور اس دشمنی کو یہاں نکالنا چاہتے تھے، یہ لوگ انقلاب کے بھی کوئی خاص دوست نہ تھے، پھر یہ کیسے یہاں آگے، یہ بات تانا بیگ کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی ـــــ پھر ہر ایک کا رویہ کچھ ایسا تھا کہ گویا تنقید کر کے وہ کوئی بہت بڑا انقلابی فرض انجام دے رہا تھا۔ طرح طرح کے الزامات ان لوگوں کے سر لگائے جا رہے تھے جنھوں نے اپنی زندگیاں انقلاب کو دے دی تھیں، اور آج بھی رات و دن ایک کر کے کام میں جٹے تھے، یہ کیوں نہیں ہوا، وہ کیوں نہیں ہوا ـــــ تانا بیگ میٹنگ میں بہت سی باتیں کہنا چاہتا تھا، کام کرنے کی بہت سی مشکلات اُن کے سامنے رکھنا چاہتا تھا ـــــ باڑے نہیں ہیں، جو ہیں وہ ٹپکتے ہیں، ٹوٹ پھوٹ گئے ہیں چارہ کم ہے۔ گوالنیں کام ہی نہیں کرنا چاہتیں، مزدور وقت پر نہیں آتے، جو آتے ہیں انہیں کام کی زیادتی، تنخواہ کی کمی کی شکایت ہے، آئے دن لوگ فارموں اور ڈھیریوں کو چھوڑ چھوڑ کر بھاگ رہے ہیں شہر ان کے لیے زیادہ دل کش ہے، بھیڑوں کے بچے دینے کا موسم سر پر آگیا ہے، ان کے لیے حفاظت کا انتظام نہیں ہے ـــــ پر کوئی ان مشکلات کو سمجھنے کے لیے تیار نہ تھا ـــــ اعتراض سب کر رہے تھے۔ گویا اعتراض کرنے اور زبانی عمدہ عمدہ تجویزیں رکھنے سے ہی کام ہو جائے گا۔ ایسے میں وہ کسی سے کیا کہتا۔

نائب بس ایک کورو کی ذات تھی جو ان سب سے بالاتر تھی ـــــ کورو جو اس وقت فارم کا چیرمین تھا اس کا دوست تھا، جو اب مر چکا ـــــ آہ کورو! تانا بیگ جب کورو کو دیکھتا تھا تو اُسے بڑی تسلی ہوتی تھی۔ تانا بیگ کے تو چند ہی دشمن تھے مگر کورو سے سب جلتے تھے، وہ فارم کا نائب چیرمین جو تھا، مگر وہ کسی سے نہیں جلتا تھا، کورو کی زندگی لوگوں کو سمجھاتے گذرتی تھی، ہر طرف سے اس پر اعتراضات کی بوچھار ہوتی تھی پر وہ اپنی جگہ جما رہتا تھا ـــــ دل پکڑے ہانپتا، اپنے دُبلے پتلے جسم کو گھسیٹتا وہ ہر وقت کام میں جُٹا رہتا تھا ـــــ کورو ـــــ آہ کورو ـــــ کیا آدمی تھے تم بھی!

جب تانا بیگ دفتر سے نکلتا تو گلسری کو بھلا کیا پتہ ہوتا تھا کہ اندر کیا ہوا، اس کا مالک کیوں دھم سے اُس پہ

معلوم ہوا کیوں اُس نے اتنے زور سے لگام جھٹکی، کیوں وہ اس قدر جھلایا ہوا ہے ـــــ مگر اتنا وہ سمجھ جاتا تھا کہ کوئی گڑبڑ ہے ضرور ـــــ آہ ـــــ مگر، مگر پھر وہ عورت، اکثر راستے میں مل جاتی اور مالک اس کو دیکھ کر کھل جاتا کس پیار سے وہ گلسری کی ایال پر ہاتھ پھیرا کرتی تھی، ویسی نرمی کسی اور ہاتھ میں نہ تھی، اس کے ہاتھ اتنے نرم تھے جتنے اُس جوان گھوڑی کے ہونٹ تھے جس کے ماتھے پر سفید ٹیکہ تھا ـــــ پھر مالک زین پر سے جھک کر اس عورت سے نہ جانے کیا بات کہتا ـــــ پہلے تو وہ کچھ شرما کے مسکراتی، پھر اس کی پیشانی پر بل پڑ جاتے، اس کی آنکھیں جھک جاتیں اور وہ ایک آہ بھرتی ـــــ اس کی سی آنکھیں گلسری نے کسی عورت کی نہیں دیکھی تھیں ـــــ کچھ اس طرح ان آنکھوں میں نور وسایہ لرزتا تھا جیسے چاندنی رات میں کسی تیز بہتے ہوئے، شفاف چشمے کی تہہ میں سفید چمکدار پتھر ـــــ جن میں پانی کا رنگ، چاند کی چمک، لہروں کا بہاؤ سب کچھ ملا جلا ہوا ہو!

پھر جب وہ اپنے راستے پر مڑ جاتی تو تانا بیگ گنگنانے لگتا اور لگاموں کو ڈھیلی چھوڑ دیتا ـــــ گلسری اپنی رفتار ٹھمک ٹھمک، چلتا جاتا اور مالک اپنے خیالوں میں کھویا گنگناتا رہتا!

گلسری کو مالک کے یہ موڈ بہت اچھے لگتے تھے، اور وہ بھی مالک کی طرح اپنے طور پر اس عورت سے عشق کرتا تھا۔

تانا بیگ اس سے کہتا: دیکھو بیو بیوزن ـــــ یہ تمھیں کتنا چاہتا ہے، کیسا تمھارے سامنے کان جھکائے کھڑا ہے مگر گلے میں یہ بڑی بدمعاشی کرتا ہے، جوانی آرہی ہے نہ کمبخت پر"

وہ کہتی "ہاں کم از کم یہ تو مجھے چاہتا ہی ہے ـــــ معصوم جانور ہے نہ"

"کیا مطلب ہوا؟ بس یہی تم کو چاہتا ہے، اور کوئی نہیں چاہتا ہے؟"

"نہیں، میرا یہ مطلب کب تھا ـــــ میں تو یہ سوچ رہی تھی کہ اب ہم لوگوں کا عشق کرنے کا زمانہ نہیں رہا ـــــ مجھے تم پر افسوس ہوتا ہے"

"کیوں؟"

"کیوں کہ تم بعد کو پچھتاؤ گے"

"اور تم؟"

"میرا کیا ہے، جنگ کی ماری ہوئی ایک لاوارث بیوہ ہوں، میرا کوئی کیا بگاڑے گا"

"ہاں ـــــ اور کیا، اور میں فارم کمیٹی کا ممبر ٹھہرا، بڑا آدمی ہوں نہ"

"تانا بیگ، تم کیوں مجھے پریشان کرتے ہو۔ میں اپنے رستے جا رہی ہوں، تم اپنے رستے جاؤ، تم کو مجھ سے الجھنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"سنو تو بیو بیوزن، بات تو سنو"

کیا فائدہ ہے تانابیگ، جو ہونا تھا وہ ہوا، اب تو تم بے کار ہی خود بھی ہراساں ہوتے ہو — اور میرے دل کا سکون بھی چھینتے ہو۔

پھر تانابیگ گاؤں کی ایک اور گلی میں مڑ جاتا، پن چکی اور اسکول کا چکر کاٹتا ہوا وہ گھر کی طرف چلنے لگا جیسے وہ اسی راستے سے آیا تھا اور سوچتا — اب بیوبیزن اپنی ساس کے گھر جائے گی وہاں سے اپنی بچی کو لے گی، جسے وہ کام پر جاتے وقت ساس کے پاس چھوڑ جاتی تھی، کتا اس کے ساتھ ساتھ چلتا ہو گا۔ شاید وہ مڑ کر دیکھے گی کہ تانابیگ کس راستے سے گھر گیا، یا شاید نہیں دیکھے گی پھر وہ اپنے گھر نے گی تکلے دو ہے گی، بچی کو کھلا پلا کے سلا دے گی اور پھر اکیلے ویران ٹھنڈے بستر پر جا لیٹے گی — بے جان، سرد بستر اور بیوبیزن۔
اور تانابیگ اسی سوچ میں کھو جاتا کہ اسے یہ بھی پتہ نہ چلتا کہ گلسری نے کب چشمے کو پار کیا اور دوسرے کنارے پر نکل آیا اور چڑھائی پر بھی پہ لگا — اور جب گلسری گلے کے اتنی نزدیک آجاتا کہ اور گھوڑوں کی بو سونگھ کر اس کی رفتار تیز ہو جاتی تب تانابیگ یکایک چونکتا اور لگام کھینچنے لگتا کدھر، کدھر — کہاں جا رہے ہو؟ گلسری — ہاں ٹھیک ہے۔ چلے چلو، شاباش، تم مجھے ہمیشہ گھر کے رستے پر لے آتے ہو گلسری — اور وہ جھک کر اس کی ایال چومتا "گلسری، دل بہت بے قرار ہے"

(۵)

یہ سب کچھ تھا پر وہ زمانہ بہترین تھا، تانابیگ کے لئے بھی اور گلسری کیلئے بھی۔ اس موسم بہار میں گلسری گاؤں بھر کا دلارا بن گیا تھا۔
ننھے ننھے بچے اپنے آپ میں لگامیں باندھتے، دوسرے بچے ان کو دوڑاتے "ہم گلسلی ہیں، ہم دوڑو گلسلی۔ شاباش گلسلی"
گھوڑ دوڑ کا گھوڑا ابھی فٹ بال کے کھلاڑی کی طرح ہے — آج ایک لڑکا اپنے صحن میں بال لڑھکاتا پھرتا ہے تو کون اس کو جان پہچان سکتا ہے، کل کو وہی فٹ بال کا چیمپین بن کر میدان میں آگیا تو جسے دیکھو اس پر فدا ہے، قربان ہے، سب تالی بجا رہے ہیں، واہ وا، کیا کہنا، تو تو ہمارے گاؤں کی عزت ہے، ہمارے ضلع کی آبرو ہے — پر یہ واہ وا جبھی تک ہے، جب تک زندگی شکست نہیں دیتی، اور جہاں ہار ہوئی، میدان سے ہٹے کہ لوگ بھول گئے کہ ایسا کوئی چیمپین تھا بھی!
یوم مئی کا وہ واقعہ گلسری کو یاد تھا — اس کی ہر دلعزیزی کا نکتۂ عروج! لوگ کہہ رہے تھے جنگ کے بعد سے ایسا جشن تو کبھی نہ ہوا تھا۔
مالک نے اس کی ایال سہلا کے، منہ چوم کے کہا تھا "گلسری، دیکھو یار، دھوکہ نہ دینا"
کتنے لوگ تھے، کیا اژدھام تھا، گھوڑے اور آدمی اور عورتیں اور بچے، دریا کا کنارہ، رنگین شالیں، چمکدار

کپڑے، جھنڈیاں، رومال، اجب ہریڈی کی سیٹیاں بجیں تو مجمع بھر میں ایک دبی سی آواز تیر گئی "گلسری، وہ رہا گلسری، وہ ہے، وہ مڑا، ادھر ـــــ کیا بانکا ہے، کیا تیکھا تیور ہے ـــــ کیا انداز ہے، موئے گلسری، آہ گلسری" اور وہ اپنے مالک کو لیے، بڑے ناز و انداز کے ساتھ چلتا، مجمع میں سے گذرتا ہوا، اپنی جگہ پر جاکے کھڑا ہو گیا تھا، پھر دوڑ میں شریک ہونے والے سبھی گھوڑے آ پہونچے تھے، جن کی تعداد پچاس کے قریب تھی۔

پھر سب گھوڑے دھیرے دھیرے دُلکی چلتے ہوئے اس جگہ پر پہونچے جہاں سے دوڑ شروع ہونے والی تھی۔ یہ جگہ کھیتوں سے پرے، نو کیلو میٹر پر تھی!۔

دوڑ شروع ہوئی تو گلسری کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا ـــــ ایک بار زور سے بندوق دغی، پھر اس نے اپنی جگہ پر ایک کاوا کاٹا، پھر ایکا ایکی اس نے دیکھا کہ ایک گھوڑا زن سے اس کے پاس سے گزرتا ہوا آگے نکل گیا ـــــ گلسری نے ایکدم کنوتی بدلی، گردن اٹھائی اور روانہ ہو گیا ـــــ اُف وہ لگامیں اُسے کتنا ستا رہی تھیں، مالک کو کیا ہو گیا تھا جو اسے چھوڑ نہیں دیتا تھا، کیوں کھینچے جا رہا تھا۔ غصے اور تیز ہوا کے جھونکوں سے اس کی آنکھیں اندھی ہوئی جا رہی تھیں۔ چونا پڑی لکیر پاؤں تلے، تیزی سے نکلتی جا رہی تھی، سورج آگ کے ایک گولے، دہکتے ہوئے گولے کی طرح زمین میں بیٹھتا جا رہا تھا۔

پھر اس کے آس پاس دوڑتے ہوئے گھوڑے آہستہ ہونے لگے، آدھا رستہ ختم ہو چکا تھا، اب مالک نے اس کی لگامیں ڈھیلی کیں، جھک کے گلسری کی ایال سے اپنا چہرہ ملا دیا اور اس کے کان میں بڑے جوش سے کہا "اب دوڑو گلسری، شاباش، اب وقت آ گیا"

گلسری نے کان جھکائے اور ہوا سے باتیں کرنے لگا۔ پھر وہ ایک کے بعد ایک گھوڑوں سے آگے نکلتا گیا۔ پیچھے رہ جانے والے سواروں کے غضب ناک چہرے، ان کے گھوڑوں کے پھولے ہوئے نتھنے، ڈھیلی لگاموں تلے۔ اوپر اُٹھے ہوئے ہونٹوں کے اندر سے پیلے پیلے، بڑے بڑے دانت، منہ سے اُڑتا ہوا جھاگ ـــــ یہ سب زناز ن، زناز ن، پیچھے چھوٹتے گئے ـــــ اب گلسری پر مقابلے کا جنون طاری ہو چکا تھا، سوار اور گھوڑا دونوں پر ایک ہی نشہ چڑھا ہوا تھا ـــــ ترغائی بیگ کے الفاظ ایک دم تانا بیگ کے دماغ میں گونجنے لگے تھے ـــــ یہ گھوڑا تو بہت کچھ کر کے دکھائے گا!

مگر ابھی تک دو گھوڑے گلسری سے آگے تھے ـــــ ایک مشکی، ایک سُرخ ـــــ کبھی وہ گلسری کے آگے ہو جاتے، کبھی گلسری کے بالکل برابر ـــــ مشکی پر دہشت اور ضد طاری تھی، وہ برابر زور لگائے جاتا تھا اور بار بار گلسری کے برابر آ جاتا تھا، سُرخ مستقل برابر تھا، پھر ایکا ایکی مشکی کی آنکھیں غائب ہو گئیں، پھر ان کے پھولے ہوئے نتھنے گلسری کی آنکھوں سے اوجھل ہوئے ـــــ پھر وہ پیچھے رہ گیا ـــــ سرخ ابھی تک دوڑ رہا تھا مگر اب اس کی چال کچھ کچھ تھک چلی تھی، پھر وہ گلسری کے کان کے پاس آ گیا، پھر گردن کے پاس، پھر اس کی تھوتھنی گلسری

کے پیٹ کے پاس پہونچی اور پھر دم پر آگئی، غصّے میں اس نے ایک کاٹا کاٹا، دونوں پچھلے پیروں پر کھڑا ہو کر زور سے ہنہنایا، پھر دونوں اگلی ٹانگیں زمین پر پٹک کر جو اس نے دوڑنے کی کوشش کی تو گلسری تب تک کہیں سے کہیں پہونچ چکا تھا، جھنجھلاہٹ کے مارے وہ کاوے کاٹنے لگا!

سامنے بڑی بھیڑ تھی، لوگ زور زور سے چلّا رہے تھے، "گلسری، گلسری" ــــ گلسری میں ایک بار پھر سے جان پڑ گئی نئی قوت عود کر آئی اور وہ زیادہ تیزی سے دوڑنے لگا۔ اب ـ دونوں طرف سے گھوڑ سواروں کی قطاریں آ رہی تھیں اور انھوں نے اسے اپنے بیچ میں لے لیا تھا، بھیڑ میں سے اُٹھتے ہوئے شور کو وہ تازی ہوا کی طرح نتھنوں سے اپنے جسم میں کھینچ رہا تھا، مالک نے اُسے چمکارا، پھر چمکارا، اور ایک پتلے سے راستے پر دُلکی چال میں ڈال دیا، اب اس کے چاروں طرف اتنی بھیڑ تھی کہ وہ چل نہیں سکتا تھا ــــ رُک گیا!

اور لوگوں کی بھیڑ میں اُسے اس عورت کی صورت نظر آئی ــــ یوتیوزن ــــ وہ اس وقت سیاہ شال نہیں اوڑھے تھی بلکہ اس کے سر پر ایک سفید، برف سا غیبہ، کلف دیا ہوا رومال بندھا تھا جس کی آڑ سے اس کی گھنی، کالی لٹیں جھک جھک کر اس کے بھولے بھالے گلابی رخساروں کو چوم رہی تھیں ــــ وہ سامنے ہی کی قطار میں کھڑی گھوڑے اور سوار دونوں کو بڑے پیار سے دیکھ رہی تھی، اور اس کی آنکھوں میں وہی چمک تھی ــــ وہی تیز بہتے ہوئے شفاف چشمے کی تہہ میں پڑے ہوئے پتھروں کی رنگ برنگی چمک ــــ اور وہ بہت خوش لگ رہی تھی ــــ گلسری اپنی عادت کے مطابق اس کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ اس کے پاس کھڑا ہو جائے گا تو مالک کو اس سے بات کرنے میں آسانی ہوگی اور وہ بھی ہاتھ بڑھا کر اس کے ایال پر پھیر سکیگی کتنے اچھے تھے اس کے ہاتھ، چکنے، کسے ہوئے ہاتھ جیسے اس جوان گھوڑی کے ہونٹ جس کے ماتھے پر سفید ستارہ تھا! ــــ لیکن مالک نے نہ جانے کیوں لگام کس لی اور اُسے دوسری طرف کو موڑنے لگا، گلسری اس عورت کی طرف زور لگانے لگا کیونکہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مالک ایسا کیوں کر رہا ہے، وہ اس عورت سے یہاں کیوں نہیں بات کر رہا ہے، کیا اسے نظر نہیں آ رہا ہے کہ وہ تو بالکل سامنے ہی کھڑی ہے! انسانوں کے بھی طریقے عجیب ہوتے ہیں!

دوسرا دن بھی گلسری کے ہی ہاتھ رہا!

اُس دن پہاڑیوں کے بیچ والے میدان میں "الامان" ہونے والا تھا ــــ ایک قسم کا پولو جس میں ایک بکرے کا بے سَرا دھڑ بیچ میں ہوتا ہے اور گیند کے بجائے اسی دھڑ کو حاصل کرنا ہوتا ہے، دو ٹیمیں ہوتی ہیں اور ہر ایک اس کو اڑا لے جانا چاہتی ہے، بکرا اس لیے رکھا جاتا ہے کہ اس کے جسم پر لمبے لمبے بال ہوتے ہیں، سوار چاہے تو بال بھی پکڑ سکتا ہے، ٹانگ بھی اور دھڑ کا کوئی حصہ بھی!

دن بھر کرغیزیوں اور قزاقوں کی ٹیمیں پریکٹس کرتی رہیں، پھر جب سورج کی کرنیں، صحرا کے دامن میں بیٹھنے لگیں تو ایک بکرا بیچ میدان میں پھینکا گیا اور بڑے زور سے اعلان کیا گیا "الامان!"

چاروں طرف سے سوار جھپٹے! گھوڑے ایکدوسرے سے ٹکرانے لگے، پچھلی ٹانگوں پر کھڑے ہو ہو کر وہ زور زور سے ہنہنانے لگے، ایک دوسرے کو بکٹے بھرنے لگے، ایالیں اور دُمیں کھڑی ہوگئیں، دانت نکل آئے —— گلسری کو یہ بھیڑ یا دھان بہت بُری لگ رہی تھی، وہ سب کچھ چھوڑ کر بھاگ جانا چاہتا تھا، پر مالک اس کو کب چھوڑتا تھا، پھر یکایک ایک زور کا شور اٹھا: "ارے قزاق لوگ لے گئے —— ارے چھڑاؤ، ارے دوڑو۔ روکو، روکو"۔

ایک نوجوان قزاق، وحشت ناک سُرخ گھوڑے پر سوار، بکرے کے دھڑ کو اپنی ران تلے دبائے، سرپٹ دوڑا جارہا تھا، گلسری کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ مالک اس کی لگامیں کیوں کھینچے ہوئے ہے، اسے آزاد چھوڑ دے تو وہ منٹوں میں اس قزاق سوار کو جالے —— بھلا اس گھوڑے کی حقیقت ہی کیا تھی!

پھر وہ لمحہ آیا کہ تانا بیگ نے گلسری کو چھوڑ دیا —— اصل میں تانا بیگ اس موقعہ کے انتظار میں تھا کہ قزاق جوان ذرا ایک پلے میں مِل جائے اور اس نوجوان کے اندازے میں یہ غلطی ہوئی کہ وہ سمجھا بس اب میں لے کے نکل آیا —— وہ سیدھا دریا کی طرف دوڑا لیکن جیسے ہی اس کے اور ساتھی پیچھے چھوٹ گئے اور مطمئن ہوگئے، تانا بیگ نے گلسری کی لگامیں ڈھیلی کردیں! پلک جھپکتے میں وہ قزاق کے برابر آپہونچا، قزاق نے جلدی سے بکرے کو دوسری طرف لے لیا، لیکن تانا بیگ نے پھرتی سے کاوا کاٹ کے گلسری کو اس کے گھوڑے سے بالکل سٹا دیا اور ہاتھ بڑھا کر بکرے کی ٹانگ پکڑلی قزاق کا گھوڑا پچھلے دونوں پیروں پر کھڑا ہوگیا اور اس زور سے ہنہنایا کہ میدان گونج اٹھا، بڑے زوروں کی کشمکش ہونے لگی جیسے دو عقاب ایک ہی شکار کو کھینچ رہے ہوں، پھر دونوں گھوڑے برابر سرپٹ دوڑنے لگے اور بکرا بیچ میں لٹکنے لگا۔ قزاق سوار جوان تھا، اس میں طاقت، تانا بیگ سے زیادہ تھی پر تجربہ اسے کم تھا۔ تانا بیگ نے دوڑتے میں یکایک گلسری کو پھر اس کے گھوڑے ملا دیا، رکاب سے اپنا ایک پاؤں نکال کر اس کے گھوڑے کے پیڑو میں ایک لات ماری اور دونوں ہاتھوں سے لگامیں چھوڑ کر، دونوں ہاتھوں سے بکرے کو پکڑا، پھر اس کے گھوڑے کو ایک لات ماری اور ایک جھٹکے میں بکرے کو چھین لیا   جیسے ہی اس نے بکرے کو چھینا، گلسری کو پتہ چل گیا کہ اب رفتار میں جیت ہے —— وہ ہوا سے باتیں کرنے لگا، اس کے پیٹ پر کسا ہوا تنگ زمین سے چھونے لگا، دُم پیٹھ کے برابر آگئی، کنوتیاں جھک گئیں —— دو چار قزاق سوار دوڑے مگر گلسری کی رفتار کو دیکھ کر وہ ششدر رہ گئے، اتنے ششدر کہ گھیرا بھی نہ ڈال سکے ——

دوسری طرف سے کرغیز سواروں نے گھوڑے دوڑائے اور ایک طوفانی شور اُٹھا "گلسری، گلسری —— زندہ باد شاباش —— واہ وا گلسری" پھر کرغیزیوں نے تانا بیگ کو گود میں اٹھا لیا، دو چار نے لپک کے گلسری کی لگام پکڑ لی —— مجمع دیوانہ وار چیخیں مارے جا رہا تھا "گلسری، گلسری، زندہ باد"

قزاقوں نے اپنا جتھا اکٹھا کیا، کرغیزیوں سے گلے ملے، سلام دعا ہوئی۔ پھر وہ اپنے گھوڑوں پر سوار ہوئے اور ہاتھ ہلا ہلا کے رخصت ہوگئے "اب اگلی خزاں میں پھر ملاقات ہوگی۔ خدا حافظ"

رات کو دعوت کا جشن تھا۔

دوسرے گھوڑوں کے ساتھ گلسری بھی باہر احاطے میں بندھا تھا، اور اندر تانا بیگ "معزز مہمان" کی حیثیت سے دوستوں عزیزوں کے جھنڈ میں بیٹھا تھا۔

کسی نے کہا: تانا بیگ ـــــ گلسری کا جام صحت پیا جائے، اگر آج یہ گھوڑا نہ ہوتا تو تم جیت نہیں سکتے تھے بھائی"۔

"ہاں برادر، وہ مرغ گھوڑا تھا کہ جیسے شیر یا اس وجہ ان کو بل پر مگر ایسا تھا بہت آگے جانے کا وہ تجربہ کم ہونے سے مات کھا گیا ورنہ لے ہی گیا تھا"

"کچھ بھی ہو، میری نگاہوں تلے تو وہی منظر گھوم رہا ہے کہ کس طرح گلسری تمھیں لیکے اڑا ہے، کمال کر دیا صاحب اس گھوڑے نے ـــ بالکل زمین سے لگ گیا تھا، میرا تو سانس اوپر کا اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا تھا۔"

"ہاں واقعی، پرانے وقتوں کے جنگجو ایسے ہی گھوڑوں پر سوار ہوتے رہے ہوں گے، کیا گھوڑا ہے ـــــ پورا دلدل ہو رہا ہے"۔

"تانا بیگ، اب اسے گھوڑیوں پر کب چڑھاؤ گے"؟

"ان کا پیچھا تو اس نے کرنا ہی شروع کر دیا ہے، پر میں ابھی ذرا رکے ہوئے ہوں، سوچتا ہوں کہ اگلی بہار تک ایسا ہوتا تو ٹھیک تھا ــــ جلدی میں گھوڑے کے کچے پڑ جانے کا ڈر رہتا ہے"۔

"ہاں اس معاملے میں گھوڑے کی ذرا احتیاط ہی ٹھیک ہے"۔

پھر "الامان" کی باتیں ہوتی رہیں اور جام پر جام چلتے رہے۔

کافی رات گئے جب تانا بیگ نکلا اور گلسری کے پاس آیا تو گلسری کو اس کے منھ سے ایک بھپکا سا آتا ہوا محسوس ہوا، ایک عجیب سی بدبو! اس نے ہنہنا کے گردن گھمائی ـــــ اسے کیا خبر تھی کہ اگلے سال وہ ایک ایسے آدمی کے پلّے پڑ جائے گا جس کے منھ سے ہمیشہ یہ بدبو آیا کرے گی اور گلسری کو اس سے نفرت ہوگی ـــــ اس آدمی سے بھی اور اس کے پاس سے آتی ہوئی اس مہک سے بھی!

تانا بیگ نے گلسری کی ایال پر ہاتھ پھیرا، اس کے کولھے پر شاباشی دی، پھر بولا: کیوں دوست، کچھ ٹھنڈے پڑے؟ کچھ تھکن اتری؟ ـــــ خفا ہو کہ تمھیں اکیلا چھوڑ کر چلا گیا دعوت میں؟ ارے تمھارا ہی تو جام صحت پی رہا تھا بھائی، تم ہی کو سارے وقت یاد کر رہا تھا، تمھارا ہی ذکر چھیڑے ہوئے تھا ـــــ اچھا بس اب ایسے نہ دیکھو جیسے میں نے کوئی بہت بڑا گناہ کر دیا ہے تھوڑی سی پی ہے، کبھی کبھار تو پیتا ہوں، روز کب پیتا ہوں میں؟ ـــــ اچھا چلو گھر چلیں ـــــ تمھیں وہ سفید ٹیکے والی یاد آرہی ہے، اچھا؟ ایں؟ ـــــ تو چلو بھئی، چلو چلو"۔

پھر کچھ اور لوگ اندر سے نکل آئے، کچھ باتیں ہوئیں، سب اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار ہوئے اور نکل گئے۔

لوہار کی دوکان کے سامنے سے ہو کر آخری گلی پڑتی تھی جس میں سے دریا کی طرف راستہ نکلتا تھا، ستانا بیگ اس پر چلتا تو سیدھا گھوڑوں کے باڑے کی طرف نکل جاتا پر وہ بیچ گلی میں سے ہو کر نکلا۔

کھڑکیوں میں اندھیرا تھا، دور کہیں کسی ٹریکٹر کے چلنے کی آواز، اس کی گھڑ گھڑاہٹ سنائی دے رہی تھی، چاند نے پہاڑوں پر سے اٹھنا ہی شروع کیا تھا۔ مکانوں کے ساتھ لگے باغوں میں سیب کے سفید شگوفے چمک رہے تھے اور کہیں سے بلبل کے درد بھرے نغموں کی صدا آ رہی تھی۔

گلسری آہستہ آہستہ چل رہا تھا، دن کی دوڑ کے بعد یہ دھیمے دھیمے چلنا کتنا اچھا لگتا تھا ـــــ پھر مالک نے یکایک اسے روک لیا ـــــ یہ بیو بیوزن کا گھر تھا، اندر سے کتا دوڑتا ہوا نکلا اور دونوں کو سونگھنے لگا ـــــ مگر مالک، وہ تو چپ چاپ زین پہ بیٹھا نہ جانے کیا سوچ رہا تھا، شاید وہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ اندر جائے کہ نہ جائے، دروازے پر دستک دے کہ نہ دے! پھر اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور آگے چل پڑا، اپنے گھر کی طرف!

گلسری چشمہ پار کر رہا تھا، ٹھنڈا ٹھنڈا پانی تھکی ہوئی ٹانگوں پر چھلک چھلک کر کیا لطف دے رہا تھا پھر یکایک مالک نے ایک بار ادھر اسے روک لیا، اور اس کی باگیں پیچھے کو موڑ دیں، گلسری حیران رہ گیا، یہ کیا قصہ تھا اب اتنی دور آجانے کے بعد پھر واپس جانے کا کیا تک تھا۔ انسانوں کی باتیں بھی عجیب ہوتی ہیں!

پھر وہ مالک کو لیے، بیو بیوزن کے دروازے پر پہونچا اور مالک پھر اسی طرح اس پر سوار، چپ چاپ نہ جانے کیا سوچتا رہا۔ کتا دوڑتا ہوا دوبارہ اندر سے نکلا۔ اور اس نے پھر دونوں کو سونگھا۔ گھر پہ بالکل اندھیرا چھایا ہوا تھا، صرف حاطے میں لگے ہوئے سیب کی پتیاں، ہوا کے ہلکے ٹھنڈے جھونکوں سے ہل رہی تھیں اور اس کے شگوفے چاندنی میں چمک رہے تھے ـــــ پھر مالک گلسری پر سے اتر پڑا اور اس کی لگام ہاتھ میں پکڑے ہوئے حاطے کے اندر داخل ہو گیا ـــــ کھڑکی کے پاس جا کر اس نے آہستہ سے شیشے پر دستک دی!

اندر سے ایک آواز آئی، مدہم، میٹھی آواز "کون ہے" ـــــ گلسری نے گردن اٹھا کر کھڑکی کی طرف دیکھا اور پھر گردن جھکالی۔

"میں ہوں، بیو بیوزن، دروازہ کھولو سن رہی ہو، میں ہوں"

اندر روشنی جلی، کھڑکی کے شیشے دمک اٹھے! "کیا بات ہے؟ ـــــ یہ کہاں سے آ رہے ہو تم اتنی رات گئے؟"

بیو بیوزن دروازہ پر آ گئی   وہ گردن سے بالوں تک ایک سفید ڈھیلا ڈھالا لباس پہنے تھی جس کا گریبان کھلا ہوا تھا، اور اس کے گھنے سیاہ بالوں کے بادل، کندھے سے نیچے گرتے ہوئے پیٹھ پر بکھر گئے تھے، اس کے جسم سے کسی اُبٹن کی مدہم، مگر جنوں انگیز لپٹیں اٹھ رہی تھیں۔

تانابیگ آہستہ سے بولا " معاف کرنا بیوبیوزن ہم لوگوں کو" الامان " میں بڑی دیر لگ گئی ـــــ گلسری بھی بہت تھک گیا ہے اور میں بھی، اور تمھیں تو معلوم ہے کہ کیمپ ابھی بہت دور ہے "

بیوبیوزن چپ رہی !

گلسری نے اپنا نام سن کر گردن اٹھائی، اس کا جی چاہتا تھا کہ بیوبیوزن اس کے پاس آجائے۔ اس کی ایال کو تھپکے، اور وہ اس کے ہاتھوں سے آتی ہوئی کسی ابٹن کی مست خوشبو کو اپنے نتھنوں میں سمیٹ لے ـــــ پر وہ چپ چاپ کھڑی رہی اور اس کی آنکھوں میں جھیل کے پتھروں والے رنگ آتے رہے اور جاتے رہے۔ پھر وہ دھیرے سے بولی: " میں نے اندر سے دیکھا تھا، تم ابھی ادھر سے ہو کر گئے تھے، پھر واپس آئے اور باہر کھڑے نہ جانے کیا سوچ رہے تھے ـــــ تو تم نے یہاں آنے کا بہانہ سوچ ہی لیا ـــــ تو پھر آجاؤ اندر، باہر تو سردی ہے "

" بس آتا ہوں، گلسری کو باندھ دوں "

" ہاں ہاں باندھ دو، وہاں سیب کے درخت کے نیچے، دیوار کے پاس باندھ دو، وہاں اسے سردی نہیں لگے گی ـــــ یا میں باندھ دوں "

گلسری کو مالک نے سینکڑوں بار باندھا تھا، پر گلسری نے اس کے ہاتھوں کو یوں کانپتے کبھی نہیں دیکھا، بار بار اس کے ہاتھ باگوں میں الجھتے اور وہ پھر باگوں کو سلجھاتا، آخر اس نے باندھا، اس کی ایال پہ ہاتھ پھیرا اور بیوبیوزن کے ساتھ اندر چلا گیا، تھوڑی دیر بعد اندر کی روشنی بھی بجھ گئی، کھڑکی میں پھر اندھیرا چھا گیا۔

گلسری کو اس اجنبی حاطے میں بڑا عجیب لگ رہا تھا، سیب کے پھولوں کی سفید پنکھڑیاں آہستہ آہستہ گر گر کر اس کی ایال پر بیٹھ رہی تھیں، رات بھیگتی جا رہی تھی، ٹھنڈک بڑھ رہی تھی، اداس چاند پہاڑوں سے جھانک رہا تھا، گلسری کبھی اس پاؤں پر زور ڈالتا، کبھی اس پر، کبھی سموں کو زمین پر مارتا ـــــ پر کھڑکی میں سناٹا تھا ـــــ وہ بڑے صبر سے مالک کا انتظار کرتا رہا ـــــ اور اسے کیا معلوم تھا کہ آج کی رات کے بعد اسے اکثر اس احاطے میں، رات کی اداسی اور چاند کی پیلاہٹ اور اکیلی بلبل کے درد بھرے نغموں کے ساتھ راتیں گذارنی پڑیں گی۔

جب مالک نکلا تو پو پھٹ رہی تھی، وہ جلدی جلدی گلسری پر ساز کسنے لگا، اس کے ہاتھ گرم تھے اور اب اس کے کپڑوں میں سے بھی اسی ابٹن کی مہک آ رہی تھی۔

بیوبیوزن اسے پہنچانے باہر آئی اور تانابیگ نے کئی بار اسے اپنے سینے میں بھینچ کر پیار کیا، اور وہ دبی دبی ہنسی ہنسنے لگی۔ " اوہ، تمھاری مونچھیں بہت چبھتی ہیں مٹ کے میرا سارا منہ چھلنی کر دیا، ارے جلدی کرو نہ، دیکھو روشنی کتنی پھیلتی جا رہی ہے " ـــــ اور وہ اندر جانے کے لیے مڑی !

تانابیگ نے اسے پھر بلایا: " واہ بیوبیوزن، میرے گلسری کو تو تم نے پیار کیا ہی نہیں ـــــ ادھر آؤ بیوبیو

یوں تمھیں ہم دونوں کا دل نہ دُکھانا چاہیئے، میرے گلسری کی پیٹھ ٹھونکو، آج اس نے بڑا معرکہ جیتا ــــ اور پھر مجھے تمھارے پاس بھی تو لایا، اس کا شکریہ تو ادا کرو۔"

وہ کچھ شرمائی، کچھ ہنسی "معاف کرنا گلسری، میں بھول گئی، میں بھول گئی، واہ بھئی یہ تم نے سیب کی سفید پنکھڑیاں خوب سجا رکھی ہیں اپنی ایال پر ــ ایں ؟"

پھر وہ دونوں ہاتھوں سے اس کی ایال سہلانے لگی ــ چکنے، سفید سفید، کسے ہوئے نرم ہاتھ جیسے اس گھوڑی کے ہونٹ جس کے ماتھے پر سفید ٹیکہ تھا، ان ہاتھوں سے کیسی جنون انگیز خوشبو اُٹھ رہی تھی، نہ جانے وہ ابٹن تھا کہ عطر تھا کہ کوئی جادو تھا ــ گلسری نے دو تین بار زمین پر ٹاپیں ماریں، آنکھیں گول گول گھمائیں ــــ وہ بہت خوش تھا!

پھر راتوں کے یہ پھیرے اکثر ہونے لگے ــــ اور اس رات بھی گلسری ہیو بیوزن کے احاطے میں بندھا، بار بار زمین پر ٹاپیں مار رہا تھا ــــ مگر، مگر طوفان آنے سے تھوڑی دیر پہلے وہ کچھ اونگھ گیا تھا ــــ اور پھر وہ طوفان آیا تھا بڑے بڑے درخت یکایک جھومنے لگے اور پھر جھک جھک کر زمین کو چھونے لگے، تند ہوائیں حاطے میں گرنے لگیں، گھر کی چھت پر سے ایک بالٹی بڑے زوروں میں کھڑکھڑاتی ہوئی نیچے آرہی ــــ گلسری ایک بار زور سے ہنہنایا، پھر اس نے ایکدم سر جھٹکالیا، بجلی سے اُس کی آنکھیں چوندھیا گئیں تھیں، پھر وہ زور زور سے ہنہنانے لگا ــــ اس وقت تو اسے اپنے گلّے کے ساتھ ہونا چاہیئے تھا ورنہ سب گھوڑے طوفان کی شدت سے بوکھلا کے اِدھر اُدھر بھٹک جائیں گے ــ دیوانہ وار وہ لگامیں تڑانے کی کوشش کرنے لگا ہی تھا کہ مالک دوڑتا ہوا اندر سے نکلا ــــ وہ شب خوابی کے کپڑے پہنے تھا اس کے پیچھے ہیو بیوزن تھی اور وہ بھی وہی لباس پہنے تھی! گلسری کو کھولتے ہوئے وہ زور سے چیخا "ابے اوٗے، کیا کر رہا ہے ؟"

برستے ہوئے پانی سے مالک اور ہیو بیوزن کے کپڑے منٹوں میں کالے لگنے لگے، سفیدی کے بجائے سیاہی نظر آنے لگی ــــ بجلی ایک بار پھر زور سے تڑپی، ہیو بیوزن مالک کو لپٹ گئی "تانابیگ ــ اب کیا ہوگا ؟"

وہ جلدی جلدی گھوڑے کی الجھی ہوئی راس کھول رہا تھا، پھر اس نے گلسری کو زور کا دھکا دیا "ابے کھولنے دے ــ ناچے جا رہا ہے" ــــ اور پھر وہ چیخ کر ہیو بیوزن سے بولا "ہیو بیوزن، تم راس پیڑ سے کھولو، میں لگام پکڑتا ہوں"

جیسے ہی راس کھلی، گلسری پچھلے دونوں پیروں پر کھڑا ہوگیا، پھر جھٹ زمین میں سیدھا ہوا اور پھر تانابیگ کو گھسیٹنے لگا "ابے ہوئے، رک جا، رک جا، نہیں تو میں جان نکال لوں گا، ہو ہو، چابک دے" ــــ اور اس نے پورے زور سے ایک چابک گلسری کے منھ پر ماری، گلسری ایک دم سیدھا ہوگیا، ہیو بیوزن نے لگام پکڑی اور تانابیگ اچھل کے زین پہ سوار ہوگیا، مالک کا سوار ہونا تھا کہ گلسری ہوا سے باتیں کرنے لگا۔ اِدھر کئی مہینوں سے وہی

گلّے کو سمیٹا کرتا تھا، چاروں طرف دوڑ دوڑ کر تمام بکھرے ہوئے گھوڑوں کو ایک جگہ کرتا، ان کو گھیر کر باڑے میں لے جاتا ـــــ اور اس وقت وہ سب نہ جانے کہاں ہوں گے؟ بجلی کی سی رفتار سے وہ دوڑنے لگا اور دوڑتے دوڑتے زور زور سے ہنہناتا، جنگل اس کی آواز سے گونج اٹھتا، جیسے وہ گلّے کو صدا دے رہا ہو ـــــ کہاں ہو، کہاں ہو، بس ہم آئے، بس پہونچے، بھٹکنا مت، کھونا مت ـــــ مالک اس کی ایال سے لپٹا ہوا تھا "گلسری گرنا مت، ٹھوکر نہ کھا جانا گلسری، شاباش میرے ساتھی، ارے اللہ مدد، میرے گھوڑے سب سلامت ہوں، سب سلامت ہوں، ورنہ میں پنچائت کو کیا منھ دکھاؤں گا، میری آبرو رکھ اللہ، شاباش گلسری، شاباش میرے شیر "

اور گلسری اپنے مجبور اور بے بس مالک کو لیے طوفان سے شرط باندھے میدانوں کو پار کرتا، جھیلوں، چشموں سے اترتا، جنگل سے گذرتا، تند ہوا کی طرح دوڑا جا رہا تھا، ایسا تو نہ وہ گھوڑ دوڑ میں دوڑا تھا، نہ "الامان" میں! صحرا میں جیسے سفید آگ لگی تھی، برف کی بوچھار تھی کہ گولیاں سی برس رہی تھیں، بیچ بیچ میں بجلی بار بار چمکتی اور پھر اندھیرا چھا جاتا ـــــ تڑاق، تڑاق اور پھر تاریکی ـــــ روشنی اور اندھیرا، اندھیرا اور روشنی، ـــــ اور گلسری دوڑے گیا، دوڑے گیا ـــــ

قریب دو گھنٹے کے بعد طوفان بھی تھمنے لگا اور گلسری گلّے کے پاس پہونچ گیا، کئی گڈریے ادھر ادھر گھوم گھام کے گلّوں کو اکٹھا کر رہے تھے، تانا بیگ کی بیوی حیران پریشان اسے ڈھونڈتی پھر رہی تھی، رات میں بہت سے پڑوسی اور دوسرے گلّوں کے گڈریے اسے گھوڑوں کو سمیٹنے میں مدد دینے کے لیے آ پہونچے تھے، مگر تانا بیگ کا کہیں پتہ نہ تھا، سب کا خیال تھا کہ وہ راستہ بھول گیا اور طوفان میں کہیں اور بھٹک گیا ہے مگر اس کی بیوی جیدار خانم کو معلوم تھا کہ ایسا نہیں ہوا ہے۔

پھر ایک چھوٹا سا لڑکا دوڑا ہوا آیا: "جیدار آپا، تانا بھائی آ گئے ـــــ تانا بھائی، جیدار آپا آپ کو ڈھونڈ رہی ہیں، بڑی پریشان ہیں "

معصوم بچّہ!

جیدار دوڑتی ہوئی آئی اور درختوں کی آڑ میں، زمین پر پڑے ہوئے تانا بیگ کو اپنی پرانی، گھِسی ہوئی شال اڑھاتے ہوئے بولی: "یہیں رہو، تمھارے لیے کپڑے لاتی ہوں، اس طرح کیسے باہر نکلو گے، حد کر دی تم نے! پتلون اور جوتے پہننے کا ہوش کیسے رہ گیا تمھیں، ـــــ بے حیا کہیں کے، شرم نہیں آتی، آج کو بچّے چھوٹے ہیں، کل کو بڑے ہوں گے تو کیا تمھارے جسم میں تھوکیں گے ـــــ افسوس، حد ہے "

تانا بیگ کچھ نہیں بولا ـــــ بولتا بھی کیا! جب وہ چلی گئی تو اس نے بس ایک نظر گلسری کی طرف دیکھا، ایک آہ بھری اور پھر اوندھے منھ زمین پر گر کر، پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ گلسری زمین پر ٹاپیں مارنے لگا۔

اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے، اس نے کبھی مالک کی یہ کیفیت نہیں دیکھی تھی۔
تانابیگ رو رہا تھا ــــ شرم اور غم کے مارے! ــــ آج آخری بار جو خوشی ملی تھی، وہ اب کبھی
بیو بیوزن کے حاطے میں سیب کے نیچے نہیں بندھے گا ــــ راتوں کے وہ پھیرے ختم ہوئے!

(۶)

رات آدھی آ چکی تھی۔ اب گلسری میں اور آگے چلنے کی ہمت نہ تھی، کسی نہ کسی طرح وہ اپنے آپ کو اس پہاڑی پگیا تک گھسیٹ لایا تھا، بوڑھے تانابیگ کی بھی سمجھ میں آ گیا تھا کہ اب گلسری سے کوئی اور مطالبہ کرنا بے کار ہے کیونکہ وہ اس طرح کراہ رہا تھا کہ جیسے انسان کراہتا ہے، اور اب کے جو اس نے لیٹنا چاہا تو تانابیگ نے اسے روکا نہیں۔

گلسری ٹھنڈی زمین پر لیٹا تھا ــــ اس کی سانس اکھڑ رہی تھی۔ وہ گردن اِدھر اُدھر پٹیک رہا تھا۔
تانابیگ نے اپنا کوٹ اُتارا اور گلسری کو اڑھاتے ہوئے بولا "سردی لگ رہی ہے؟ بہت خراب ہے طبیعت؟ گلسری تمھارا جسم اور سرد، تم تو کبھی سرد نہیں ہوتے تھے، تمھاری گرمی کیا ہوئی، گلسری؟"
مگر گلسری کچھ نہیں سن رہا تھا۔

تانابیگ بڑبڑاتا رہا اور گلسری کو اپنے دل کی دھڑکن آہستہ آہستہ ہوتی ہوئی محسوس ہوتی رہی، چاند پہاڑوں کی اوٹ سے جھانکنے لگا، فضاؤں پر ایک روشن دھندسی چھاگئی، ایک ستارہ ٹوٹا اور خاموشی کے ساتھ زمین پر آ رہا!
"اچھا گلسری، تم یہاں لیٹو، دیکھوں میں کچھ آگ جلانے کا بندوبست کرتا ہوں۔"

تانابیگ نے اِدھر اُدھر سے جھاڑیاں توڑیں، جھنکاڑ اکٹھا کیا، اس کی انگلیاں چھل گئیں۔ خون بھی رس آیا پر ایک بوجھ پتلی پتلی لکڑیاں اکٹھی ہو گئیں۔

گلسری کو ہمیشہ سے آگ سے ڈر لگتا تھا، پر اس وقت اسے کچھ نہیں محسوس ہوا۔ گرمی اور دھوئیں نے اُسے اپنی آغوش میں لے لیا، پاس ہی تانابیگ ایک بڑے سے پتھر پر بورا بچھا کے بیٹھ گیا، بار بار وہ الاؤ میں اور لکڑیاں ڈالتا شعلوں کی لپک کو دیکھتا اور اپنے ہاتھ آگے بڑھا بڑھا کر سینکتا پھر گلسری پر پڑا ہوا کوٹ برابر کرتا ــــ اور پھر پتھر پر آبیٹھتا، پھر شعلوں کو تکنے لگتا۔

اب گلسری کی کپکپی رک چلی تھی، اسے کچھ گرمی محسوس ہو رہی تھی مگر آنکھوں کے آگے ابھی تک ایک پیلی سی دھند چھائی تھی، سینے میں درد تھا اور جیسے کوئی بوجھ تھا کہ پھیلتا تھا، دبائے دیتا تھا، شعلے کبھی اوپر اُٹھتے تھے، کبھی نیچے بیٹھتے تھے، پاس بیٹھا ہوا اس کا بڈھا اس کا محبوب ایک کبھی نظروں سے اوجھل ہو جاتا تھا کبھی پھر دکھائی دینے لگتا تھا، اور

گلسری کو اپنے بھکتے ہوئے ذہن اور بھٹکتی نگاہوں کے سامنے ایسا دکھائی دینے لگا کہ وہ پھر اسی رات کی طرح دوڑا جا رہا ہے ــــــ وہ جنوبی طوفانی رات، جب وہ میدانوں سے ہوتا، صحرا سے گذرتا، جھیلوں کو پار کرتا، جنگلوں کو چیرتا، بے تحاشہ بھاگا جا رہا تھا، کبھی ہنہناتا، کبھی دونوں پچھلے پیروں پر کھڑا ہو جاتا، گھوڑوں کو ڈھونڈتا ہوا وہ زور زور سے سونگھنے کی کوشش کرتا۔ زور زور سے ہنہناتا، آ گئے ہم آ گئے، گھبرانا نہیں بھٹکنا نہیں ــــــ برف کی سفید آگ کی چادر کبھی پھیلنے لگتی تھی کبھی پھر اندھیرا ہو جاتا، پھر یکایک بجلی چمکتی، پھر اندھیرا ہو جاتا ــــــ اور وہ یکساں دوڑا چلا جا رہا تھا ــــــ روشنی اور اندھیرا، اور روشنی!

(۷)

اس سال پنچایتی فارم میں بڑی تبدیلیاں ہوئی تھیں، کورو کی صحت اتنی خراب ہو گئی تھی کہ اسے اپنا کام چھوڑ کر ہسپتال میں بھرتی ہونا پڑا تھا۔ نیا چیرمین آ گیا تھا، تانابیگ روز ارادہ کرتا کہ ذرا سی فرصت نکال کے اپنے دوست کو دیکھ آئے، جس کا دل دن بدن کمزور ہوتا جا رہا تھا لیکن تانابیگ پر کام اتنا تھا کہ دم مارنے کی مہلت نہیں ملتی تھی۔ گلوں کا نگہبان تو گویا ایک خاندان کا ذمہ دار ہوتا ہے کہ کسی وقت نہیں ہٹ سکتا، اور ہمیشہ مصروف رہتا ہے خاصکر موسم بہار میں اور جاڑوں میں تو اس طرح وہ کورو کو دیکھنے ہسپتال تک نہیں پہونچ پایا، جانوروں کو کس کے حوالے کر کے جاتا اور جانور کوئی مشین تو ہیں نہیں کہ سوئچ بند کر دیا اور چھوڑ دیا، ویسے اس کی بیوی کا نام، دفتر میں اس کی مددگار کی حیثیت سے لکھا ہوا تھا، پر اس کی گود میں بچہ تھا، کام تو وہ بہت کرتی، سارے وقت تانابیگ کا ہاتھ بٹایا کرتی تھی مگر اس پر ذمہ داری نہیں ڈالی جا سکتی تھی ــــــ پھر خبر آئی کہ اب کورو کی طبیعت بہتر ہے اور وہ ہسپتال سے گھر آ گیا ہے۔ دونوں میاں بیوی مطمئن ہو گئے!

اور اس دن تانابیگ بیٹھا اپنی بیوی سے کچھ باتیں کر رہا تھا اور چائے پی رہا تھا، اس کی دوسری بچی اس کے گھٹنوں پر بیٹھی تھی ــــــ "تو پھر گلسری کو لیتا جاؤں گا، ورنہ تو جلدی آنا مشکل ہو گا اور وہاں ٹھہر کر بھی کیا کرنا ہے۔ بس کورو سے مل کر ایک نظر دیکھ کر لوٹ آؤں گا ــــــ ایں؟

"ہاں جیسا مناسب سمجھو" جیدار بولی۔

پھر باہر گھوڑوں کی ٹاپوں کی آہٹ ہوئی۔

"دیکھنا جیدار، کون ہے"

باہر ابراہیم اور ایک دو لوگ اور گھوڑوں پر سے اترے، تانابیگ نے کھڑکی سے دیکھا اور اس کا ماتھا ٹھنک گیا نہ جانے کیوں اُسے نر گھوڑوں کے فارم کے چیرمین ابراہیم سے نفرت تھی ــــــ وہ خوشامدی اور موقعہ پرست تھا بہر حال تانابیگ نے باہر نکل کر کہا "السلام علیکم" دونوں اندر آ گئے، جیدار نے ایک چٹائی بچھائی، مہمان بیٹھے۔

ابراہیم نے بات شروع کی: تانا بیگ، ہم لوگ آپ کے پاس ایک کام سے آئے تھے، ــــ اور اس نے اپنی جیب سے ایک کاغذ نکال کے تانا بیگ کے سامنے رکھ دیا ــــ تانا بیگ کی نظر سب سے پہلے کاغذ کے آخر پر گئی ــــ وہاں سرکاری مہر لگی ہوئی تھی ــــ پھر اس نے اوپر سے پڑھنا شروع کیا اور پھر لفظ بلفظ پڑھتا چلا گیا

حکم نامہ

بنام تانا بیگ لباسوف ــــ گلہ بان

ریس کے گھوڑے گلسری کو سرکاری اصطبل میں داخل کرو، اسے صدر کی سواری کے لیے استعمال کیا جائے گا۔
نیچے ایک دستخط تھا جو پڑھا نہیں جا رہا تھا البتہ یہ الفاظ صاف تھے۔

"صدر پنچایتی فارم ــــ ۵، مارچ ۱۹۵۰ء"

تانا بیگ سن سے رہ گیا، اس نے حکمنامے کو چار تہہ کیا، اپنی قمیض کی جیب میں رکھا اور نگاہیں جھکائے بیٹھا رہا ــــ ایک حرف نہیں بولا!

یہ تانا بیگ کے لیے نئے صدر سے پہلی ملاقات تھی، یوں کہنا چاہیے کہ نئے صدر کے دستخطوں سے آج تانا بیگ کو پہلی بار واسطہ پڑا تھا، اس سے خود سے تو ابھی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ جب یہ شخص کو رو کی جگہ مقرر ہوا تھا تو اس وقت تانا بیگ پہاڑوں میں تھا ــــ البتہ سنا یہ جاتا تھا کہ یہ صدر بڑا سخت گیر آدمی ہے، وہ کسی قسم کے ڈھیلے پن کو برداشت نہیں کرتا تھا اور پھر اس کا یہ بھی پلان تھا کہ ہر شخص باقاعدہ طور پر کام سیکھے ہو اس کے لیے وہ روز میٹنگیں بلاتا تھا آئے دن لیکچر کراتا تھا، جب دیکھو تب سوالیے نکل رہے ہیں، اشتہارات اور کتابچے تقسیم ہو رہے ہیں ــــ اب وہ گلے بان اور گڈریے اور کسان اگر نظریاتی لیکچروں میں اونگھتے رہتے تھے تو اس میں صدر کا کیا قصور تھا، وہ تو بڑی کوشش کرتا تھا کہ ان کی جہالت کو دور کر دے، اور وہ اپنے فرض کو بڑی مستعدی کے ساتھ پورا کرتا تھا، دفتری کارروائیاں اور کاغذات بھی اس نے بہت بڑھا دیئے تھے تاکہ ہر کام باقاعدگی سے ہو، پھر بھی لوگ اس سے نہ جانے کیوں چڑھے رہتے تھے!

ابراہیم نے تانا بیگ کی طرف دیکھا ــــ "تانا بیگ، اب ہم لوگوں کو جانا ہے" ــــ اور وہ اپنی ٹوپی جھاڑنے لگا۔

"تو منیجر صاحب، صدر سے کہہ دیجئے گا کہ میں گلسری کو نہیں دے سکتا، وہ میرے گلے کا محافظ گھوڑا ہے اور پھر میں اسے گھوڑیوں پر بھی ڈالتا ہوں، میں اسے نہیں دے سکتا"

"واہ بھائی تانا بیگ، یہ آپ کیا کرتے ہیں، ہم آپ کو گھوڑیوں پر ڈالنے کے لیے پانچ گھوڑے دے سکتے ہیں، آخر وہ ہمارا صدر ہے، اس کی سواری کے لیے تو بہترین گھوڑا ہونا ہی چاہیئے"

تانا بیگ پھر کے بولا: مجھے آپ کے پانچ گھوڑے چاہئیں نہ دس، اور صدر کی شان کیا اسی میں رہ گئی

ہے کہ وہ میرے ریس کے گھوڑے پر سواری کرے؟"

ابراہیم ذرا سا کھسایا ——— تانا بیگ بڑا بے ڈھب آدمی تھا اُس سے بات کرنے میں ذرا ہوشیاری کی ضرورت تھی۔ یہ تو وہ آدمی تھا جس نے اپنے بھائی کو بھی غداری کی سزا میں سائبیریا بھجوا دیا تھا، اس کے دماغ میں کوئی بات بیٹھی تھی تو نکالے نہیں نکل سکتی تھی ——— ابراہیم نے اپنا لہجہ نرم کرتے ہوئے کہا "بھائی تانا بیگ، آپ تو فوج میں رہ چکے ہیں، کیا ایسا وہاں کبھی ہوا تھا کہ آپ جیپ میں بیٹھے ہوں اور آپ کا جنرل پیدل چلا ہو، آخر صدر کے لیے تو سب سے اچھا گھوڑا ہونا ہی چاہیے"

تانا بیگ کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ اس منطق کا کیا جواب دے، پہلو بدل کر زور سے بولا "میں نہیں دوں گا گلسری کو، واہ یہ کیا زبردستی ہے، کرلیں جو اُن کو کرنا ہے ——— ایسا ہی ہے تو لے لیں گھوڑوں کا گلہ مجھ سے، میں نے کب اُن سے مانگا تھا، میں تو لوہا پیٹ کر بھی اپنا دوزخ بھر سکتا ہوں، گھوڑا تو کوئی مجھ سے نہیں چھین سکتا"

"ایسا نہ کہئے تانا بیگ، ہم لوگوں کے دل میں تو آپ کی بڑی عزت ہے اور آپ ایسی بچوں کی سی باتیں کر رہے ہیں، سوچئے تو یہ باتیں آپ کو زیب دیتی ہیں، صدر کو ہمارے یہاں بھیجا گیا ہے، وہ ایک طرح سے ہمارے مہمان ہیں بھلا یہ رویہ کرغیزیوں کے شایانِ شان ہے؟"

"اچھا تو گاؤں بھر سے پوچھ لیجیے، کورو سے کہئے وہ جو فیصلہ کردے گا وہ مجھے منظور ہوگا"

آپ کے خیال میں کورو آپ کو گھوڑا دینے سے منع کریں گے؟ جو کچھ ہو رہا ہے ان کی مرضی سے ہو رہا ہے اور پھر آپ کورو کو زیادہ بیچ میں گھسیٹیں گے تو خواہ مخواہ اُن کے اور صدر کے تعلقات خراب ہوں گے، کورو آپ کے دوست ہیں آپ کو اُن کی پوزیشن خراب نہ کرنی چاہیئے"

"لیکن آپ کیوں اس قدر اصرار کر رہے ہیں؟" جیدار بولی۔ ابراہیم نے بے چارگی کے ساتھ دونوں ہاتھ پھیلا دیے "میں کیا کر سکتا ہوں جیدار آپا ——— مجھے تو حکم ملا ہے کہ گلسری کو لاؤ اور اگر سرکاری حکم نہ مانے گئے تو آپ ہی بتائیے کیا ڈسپلن رہ جائے گی؟"

جب کورو اور ڈسپلن کی بات ہونے لگی تو میاں بیوی نے ایک دوسرے کا منھ دیکھا اور چپ ہو گئے، پھر جیدار نے ادھر اُدھر دیکھا پھر ایک آہ بھری اور بولی "تانا بیگ، انھیں گھوڑا دے دو"

ابراہیم کھل اُٹھا "دیکھئے تو جیدار آپا، یہ ہوئی عقل کی بات، بے کار دیر کرنے سے کیا فائدہ ——— آپ کا بہت بہت شکریہ" ——— اور اس نے لپک کر جیدار کا ہاتھ چوم لیا۔ جیدار نے نفرت کے ساتھ اپنا ہاتھ کھینچ لیا، ہونٹ بھینچ لیے، چپ بیٹھی رہی!

ابراہیم کا یہ بڑھ بڑھ کر شکریہ ادا کرنا بے وجہ بھی نہ تھا، کچھ ہی عرصے بعد اسے گھوڑوں کے اصطبل کے منیجر کی

جگہ سے ترقی دے کر تمام جانوروں کے فارم کا وائس چیرمین بنا دیا گیا۔

تانابیگ دیکھتا رہا ـــــ اور گلسری پر نیا ساز کسا گیا، دوسری لگامیں لگائی گئیں اور تانابیگ ایک ایک چیز دیکھتا رہا ـــــ گلسری کی حسرت بھری نگاہیں، کھلے ہوئے منھ سے نکلتی ہوئی بھاپ، اُس کی ایال، اس کے کولھے، اس کی مضبوط ٹانگیں، سامنے والی دہنی ٹانگ پر کی بھنوری، اس کی سنہری چمکتی، دمکتی جلد، اس کے کان، گردن کا ہلانا، مالک کو لے کر کس انداز سے چلنا ـــــ اور وہ رات جب اس نے تانابیگ کی آبرو بچائی تھی، وہ اس کی تیز رفتاری، اور وہ طوفانی رات ـــــ روشنی اور اندھیرا، اندھیرا اور روشنی بس ـــــ وہ سر جھکائے بیٹھا رہا!

جب اس نے سر اٹھایا تو وہ لوگ گلسری کو لے کر ایک چڑھائی کے اوٹ میں جا چکے تھے، تانابیگ نے ایک چیخ ماری: "رک جاؤ، تمھاری اتنی ہمت کہ میرے گلسری کو لے جاؤ" ـــــ اس نے جلدی جلدی دوسرے گھوڑے پر ساز کسا، چابک اُٹھائی، ایک پاؤں رکاب میں ڈال کر دوسرا ڈال ہی رہا تھا کہ جیدار دوڑتی ہوئی یورتا[1] سے نکلی بڑی پھرتی سے اس نے دوڑ کر شوہر کے گھوڑے کی لگام پکڑ لی۔ اور تھوڑی دور تک گھسٹتی چلی گئی، تانابیگ کو ایک دم خیال آیا کہ جیدار کو گلسری سے دشمنی تھی کیونکہ وہ اُسے بیوبوزن کے یہاں لے جاتا تھا ـــــ گھوڑا رک گیا، تانابیگ نے چابک سر سے اوپر بلند کی: "تو نے کہا کہ گلسری کو دے دو، تُو ـــــ تُو اس سے جلتی تھی، تو نے میرے گلسری کو مجھ سے چھڑوا دیا ـــــ تُو ...."

پھر اس کی چابک ہوا ہی میں ٹھہر گئی۔ وہ اُسے نیچے جیدار پر نہیں لا سکا، کیونکہ جیدار بالکل سنجیدہ تھی، بڑے وقار کے ساتھ بولی: "پاگل نہ بنو، تانابیگ۔ گلسری کیا تمھاری ذاتی جائداد تھا؟ وہ پنچایتی فارم کے گلّے کا ایک گھوڑا تھا۔ ٹھیک ہے، اگر جانا ہے تو جاؤ اُس کے پاس، وہ مجھ سے زیادہ جوان ہے، مجھ سے زیادہ حسین ہے پر یہ جانے رہو کہ لوٹ کر تمھیں اسی گھر میں آنا ہے۔ بچوں کو بھول گئے ہو تانابیگ؟ فارم کو بھول گئے ہو؟ اپنے کو کمیونسٹ کہتے ہو؟ کہو، آئندہ بھی کہو گے؟ ڈسپلن توڑو گے؟ صدر کا حکم نہیں مانو گے؟ کہاں رہو گے، بتاؤ، بس اتنا بتاؤ"

جیدار کا چہرہ غصّہ ضبط کرتے کرتے لال کے بجائے اب پیلا ہوتا جا رہا تھا!

تانابیگ نے ایک زور کی گالی دے کر چابک پھینک دی، گھوڑے کا منھ پھیرا، پھر اُترا اور اس کی باگیں پکڑے ایک درخت کے پاس گیا، درخت سے گھوڑے کو باندھ کر وہ پیڑ کے نیچے ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ جیدار یورتا میں واپس چلی گئی!

اندھیرا بڑھ رہا تھا جب وہ لوٹ کر آیا، جیدار نے آفتابے میں پانی بھر کر منھ ہاتھ دھونے کو رکھا ـــــ کھانا

---

[1] یورتا ـــــ ایک قسم کا خیمہ۔

گرم کرنے لگی۔

"کھانا رہنے دو، میں کچھ نہیں کھاؤں گا۔"

جیدار نے اس کے پاس آکر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا "کیوں، کھانا کھانے کو دل نہیں چاہتا؟"

تانا بیگ نے اس کا ہاتھ جھٹکا "دل تو میرا گلسری کے ساتھ چلا گیا جیدار" پھر ذرا رک رک کے آہستہ سے بولا "جیدار تمیر کوموز نکالو۔"

جیدار تمیر کوموز بجانے لگی، تانا بیگ سر جھکائے بیٹھا رہا ——— جیدار نے ساز میں منھ لگایا، انگلیوں سے اس کی زبان کو حرکت دینے لگی اور ایک گیت کی دھن ابھرنے لگی ——— ایک اونٹنی کا گیت جس کا بچہ کھوگیا ہے، قدیم زمانے کے گلہ بانوں کا محبوب گیت ——— صحرا میں ادھر اُدھر دوڑتی بھٹکتی ہوئی اونٹنی، بچے کو پکارتی ہوئی، کیسے صبح کو لے کر میدانوں میں نکلوں، کیسے شام کو لے کر پہاڑوں میں جاؤں، نرم ریت پر کون میرے ساتھ ساتھ دوڑے گا، ہری ہری دوب پر منھ مارتے کیسے دیکھوں گی تم یہاں ہو میری کالی آنکھوں والے ——— پکارو، مجھے پکارو، آواز دو مجھے، میرے تھنوں کا بوجھ بڑھ رہا ہے، دودھ ان سے بہہ بہہ کر میری ٹانگوں تک پہنچ گیا ——— آہ میرا دودھ بہہ رہا ہے، میرا سفید دودھ، میٹھا، جھاگ دار دودھ ——— تو کہاں ہے میرے نازوں کے پالے، تو کہاں ہے میرے کالی آنکھوں والے......

جیدار ساز بجاتی رہی اور آنسو اس کے رخساروں پر ڈھلکتے رہے ——— تانا بیگ کبھی کبھی آنکھ اٹھا کر اُسے دیکھ لیتا ——— جوانی میں وہ کتنی بانکی تھی، اس کے ہاتھ کتنے نرم تھے، گردن کیسی گداز، بال کس قدر سیاہ ——— اب محنت نے اس کے ہاتھوں کو کھُردرا کر دیا تھا، زندگی کی سختی نے اس کے سیاہ بالوں میں سفید لکیریں کھینچ دی تھیں، اُس کی بڑی بڑی، ہرن کی سی آنکھوں تلے جھرّیاں پڑ گئیں تھیں!

اونٹنی دشت و در میں ماری پھرتی تھی، تو کہاں ہے میرے کالی آنکھوں والے، میرے تھنوں سے دودھ بہہ رہا ہے ——— میری پکار کا جواب دے، میرے تھنوں سے سفید دودھ بہہ رہا ہے، جھاگ دار، میٹھا، سفید دودھ!

گلسری اصطبل میں قیامت برپا کئے تھا، ٹاپیں مار مار کے ہنہنا ہنہنا کے اس نے آفت جوت رکھی تھی، زندگی میں پہلی بار وہ اصطبل میں بند ہوا تھا ——— اس کا دم گھٹا جا رہا تھا۔

(۸)

تانا بیگ نے گلسری کو دیکھا تو پھولا نہیں سمایا، اس پر ایک اور زین کسی ہوئی تھی، بھاری لگام اور بھاری ہی

ے تمیر کوموز ایک ساز ہوتا ہے جو کھونٹی کی طرح بنا ہوتا ہے اور اس کے بیچ میں فولاد کی ایک زبان سی لگی ہوتی ہے۔

لا میں اور تنگ، مگر تانا بیگ کو غصہ اس بات پر آیا کہ زین پر ایک سرخ مخمل کا تکیہ بھی کسا ہوا تھا، جیسے اس پر کوئی مرد
ہیں، کوئی بھاری کولھوں والی عورت سواری کرتی ہو ۔۔۔۔ تھُو! اس کا جی چاہا کہ یہ سب کچھ نوچ کر گلسری پر سے اُتار
ے، لیکن گلسری کو اتنی فرصت کہاں تھی ۔۔۔۔ وہ تو گھوڑیوں سے جُتا ہوا تھا، اتنے دن کا بچھڑا ہوا۔ وہ ایک ایک کو لیے
الی رہا تھا، بھاگ کر اِدھر جاتا، بھاگ کر اُدھر جاتا، گول گول گھومتا، مالک کی آواز پر دوڑ کر آتا، پھر بھاگ جاتا ۔۔۔۔ ناچتا
پھر کسی طرف غائب ہو جاتا!

اچھا تو تم رسّی تڑا کر نکل بھاگے ۔۔۔۔ ایں ۔۔۔۔ خیر، ٹھیک ہے بھئی لڑکے، نوجوان ہو، تمھارا زمانہ ہے،
ب دھومیں مچاؤ!

گلسری کو بالکل کوئی پرواہ نہ تھی کہ زین کہاں ہے، لگام کدھر، رکابیں کس طرف، ابھی کل ہی وہ اس وقت
ضلع کے دفتر میں کھڑا تھا، سرائے پاس، گذرتی مڑتی لاریوں کی جھک جھک سے وہ بار بار چونک پڑتا تھا۔ پھر نیا مالک
لئے نکلا، اُس کے منہ سے بدبو آرہی تھی، گلسری کا جی گھبرانے لگا تھا، دم گھٹنے لگا تھا، اور اِس وقت ۔۔۔۔ آہ
اں کتنا اچھا تھا، کھلی ہوا تھی، ہری ہری میٹھی رسیلی دُوب تھی، جوان گھوڑیاں تھیں، اس کا پرانا، اس کا محبوب مالک تھا
روہ تھا ۔۔۔۔ وہ میدان بھر میں ناچتا پھرتا، مست، دیوانہ وار!

شام کو سرکاری اصطبل کے کچھ لوگ آئے اور گلسری کو باندھ بوندھ کر واپس لے گئے۔ تانا بیگ کھسیاتا خفا
نا بگڑتا، اصطبل والوں پر چیختا، رہ گیا "تم سب کیا منہ دیکھا کرتے ہو، جو یہ بار بار آجاتا ہے، صدر کے گھوڑے کو قابو میں
یں رکھ سکتے تم لوگ مرد ہو کہ زنخے؟"

پھر ایک رات کو تانا بیگ بڑی دیر کو سویا تھا کہ اس کی بیوی نے کندھا ہلایا "تانا بیگ، تانا بیگ، اُٹھو تو،
نہ جلدی ۔۔۔۔ ارے اُٹھو"

"ایں؟ ۔۔۔۔ ہوں؟ ۔۔۔۔ کیا ہے؟"

"ارے سنو تو، گھوڑوں میں کچھ گڑبڑ ہو رہی ہے، لگتا ہے گلسری پھر آگیا۔ ذرا اُٹھ کر دیکھو تو سہی"

"لعنت ہے اس کمبخت گھوڑے پر، یہ مجھے نہیں جینے دے گا"

تانا بیگ باہر نکلا ۔۔۔۔ ہاں گلسری ہی تھا ۔۔۔۔ مگر یہ کیا، یہ کیسے اُچھل اُچھل کے چل رہا ہے، تانا بیگ نے
سے دیکھا تو اپنا دل پکڑ کے رہ گیا ۔۔۔۔ "کشن[1]! ہائے، گلسری اور یہ سلاسل!"

---

[1] قدیم زمانہ میں گھوڑوں کے پیروں میں ایک خاص قسم کے سلاسل ڈال کے تالا لگا دیا جاتا تھا کہ چور گھوڑا
نہ چُرا سکیں۔

پھر سارے خاندان نے مل کر گلسری کی بیڑیاں اُتاریں۔ جیلر نے گلسری کی لگام پکڑی اور اس کی آنکھوں پر اندھیاری ڈالی۔ تانا بیگ نے اپنا پرانا، لوہاری اوزاروں کا بکس نکالا۔ کیا ہی عمدہ بنی ہوئی بیڑیاں تھیں! بڑے کاریگر لوہاروں کی دستکاری ـــــ بیاہ ابراہیم لایا ہوگا کسی بڈھے لوہار کے یہاں سے ـــــ تانا بیگ کو غصہ آنا شروع ہوا۔ بار بار وہ کُشنوں کو گھما کے دیکھتا اور پھنکارتا، پھر وہ اُن جھنجھناتے ہوئے کُشنوں کو لیے یُورتا میں آیا اور ان بیڑیوں کو جن میں گلسری کا خون لگا تھا، اس نے زور سے ایک کونے میں پھینکا ـــــ اُس کا خون کھول رہا تھا۔ ریس کے گھوڑے کو یوں رکھا جاتا ہے ـــــ ہائے اتنی دور سے ان زنجیروں میں جکڑا ہوا گلسری کیسے آیا ہوگا، چشمے کو پار کرتا، کھائیوں، گڑھوں سے ہوتا، چڑھائیاں چڑھتا ـــــ اور زنجیریں اس کے پیروں میں چھنکتی رہی ہوں گی، اس کے پیروں سے رگڑتی رہی ہوں گی، جبھی تو اس کے پیر اتنے چھل گئے تھے کہ خون بہہ رہا تھا!

تانا بیگ گلسری سے لپٹ گیا تھا ـــــ ایک دوسرے گھوڑے نے بھی گلسری کی یہ پابندی، یہ مجبوری دیکھ لی تھی اور اس کو کاٹ رہا تھا جیسے کوئی بندھے کو مارے! تانا بیگ نے اس گھوڑے کو زور سے ایک لات ماری تھی، "دور ہو کمبخت، ظالم، کمینہ، ـــــ گلسری ہم کیوں آتے ہو؟ تم بے وقوف ہو گلسری، یہ سب نہ کیا کرو، کس نے تمہاری یہ حالت کر دی، آہ تمہارے پاؤں اور بیڑیاں اور زنجیریں، میرے پاس مت آؤ گلسری، مت آؤ"۔

اس کا منھ گلسری کے ہونٹوں سے لگا ہوا تھا، اور گلسری اپنی گردن کو تانا بیگ کی گردن سے رگڑے جا رہا تھا اور تانا بیگ کہتا جا رہا تھا "میرے پاس نہ آؤ گلسری ـــــ نہ آؤ، ورنہ اس کا نہ جانے کیا انجام ہوگا ـــــ اس کا نہ جانے کیا نتیجہ ہوگا، مجھے بھول جاؤ گلسری ـــــ یوں بار بار میرے پاس نہ آؤ ـــــ نہ آؤ"۔

(۹)

دھوپ نکلی ہوئی تھی اور فضا میں بہار کی سی کیفیت، سرکاری اصطبل کے پاس کچھ لڑکے کھیل رہے تھے "دوڑو دوڑو، دھتیا چھوڑو!" ـــــ اُن میں ریس ہو رہی تھی، ایک دوسرے کی گردنوں میں رسی پھنسا کے وہ دوڑ رہے تھے، "یہ رہا میرا گلسری"۔

"یہ سب سے آگے نکلے گا"

"واہ وا ـــــ میرے گلسری، دوڑ چل، شاباش"

دیوار کے اُدھر گلسری اصطبل میں اکیلا کھڑا تھا، آج نہ جانے کیوں اسے باہر نہیں نکالا گیا تھا، سب گھوڑے ایک ایک کرکے نکل گئے، بس وہی اکیلا چھوڑ دیا گیا ـــــ وہ زور تو لگا رہا تھا پر آج اس کے پاؤں میں دوہری زنجیریں بندھی تھیں، اس نے زور زور سے ہنہنانا شروع کیا ـــــ ایک سائیس دوڑتا ہوا آیا "رہ جا کمبخت ـــــ اب

آج کے بعد سے منہناتا ـــــ تیری شرارت کے، تیری مستی کے دن پورے ہو گئے، شیطان، بہت تو نے ہم لوگوں کو ستایا ہے ـــــ"

پھر اس نے چلا کر کسی سے پوچھا: "نکالیں باہر ـــــ؟"

کسی نے باہر سے جواب دیا: "ہاں ہاں ـــــ نکالو"

دو آدمیوں نے مل کر گلسری کو باہر نکالا ـــــ آہ باہر کتنی اچھی روشنی تھی اور کس قدر دل فریب ٹھنڈی ہوا ـــــ اس کے نتھنے آپ ہی آپ پھول گئے ـــــ تازی ہوا کو وہ اپنے پھیپھڑوں کی طرف زور زور سے کھینچنے لگا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا دوڑے، اُچھلے کودے، ناچے ـــــ مگر اس کے پیروں میں زنجیریں تھیں۔

مگر........ مگر آج اس کے چاروں طرف یہ اتنے بہت سے لوگ کیوں تھے، بڑے بڑے بالدار ہاتھوں والے مرد آستینیں چڑھائے ـــــ اور ایک اور آدمی بھورے رنگ کا لبادہ پہنے، ذرا سی دور زمین پر بچھے ہوئے ایک سفید کپڑے پر بہت سے چمکتے جھل جھل کرتے اوزار رکھ رہا تھا۔ دھوپ کی ڈلک سے ان اوزاروں کی طرف دیکھتے ہوئے گلسری کی آنکھیں چندھیا گئیں ـــــ نیا مالک بھی وہیں موجود تھا اور کئی لوگ بالوں کی رسیاں لیے کھڑے تھے ـــــ ابراہیم نے صادر سے پوچھا۔

"تو پھر شروع کریں"

مالک نے حامی بھرتے ہوئے گردن ہلائی۔

ابراہیم بولا "دیکھئے آپ ذرا ہٹے رہئے، لاتیں چلائے گا، گھوڑے کا کیا بھروسہ"

صادر پیچھے کو کھسک گیا۔

پھر گلسری پر بالوں کی بنی رسیوں کے پھندے آگرے اور وہ جکڑ گیا ـــــ افوہ بالدار رسیاں کتنا چبھ رہی تھیں، وہ نتھنے پھلا کے فوں فوں کرنے لگا پھر اس کے پاؤں بھی باندھ دیئے گئے، یہ کیا معاملہ تھا ـــــ گلسری کی آنکھیں باہر کو اُبل آئیں۔ منہ کھل گیا ـــــ یہ کیا مطلب ہے! رسیاں چاروں طرف لوگوں نے پکڑ لیں پھر ان رسیوں کو دوہرا کر کے کھونٹوں میں باندھ دیا گیا ـــــ کئی آدمی گلسری کو دبا کے بیٹھے کئی نے اس کا سر زمین پر دبا لیا، اس کو بالکل پچھاڑ دیا گیا۔ یہ سب کیا تھا؟

بہت سے لڑکے دیوار پر چڑیوں کی طرح بیٹھے تھے!

"دیکھو، دیکھو، کیا ہو رہا ہے؟

"گلسری کی نعلیں صاف کی جا رہی ہیں"

"آہا ـــــ اپنے کو بڑا عقلمند سمجھتا ہے ـــــ یہ نعلیں صاف ہو رہی ہیں؟"

ابراہیم لڑکوں کی طرف دوڑا۔ بھاگو، بھاگو بے۔ تم لوگ کیا دیکھ رہے ہو، بھاگو نہیں ابھی تم سب کو ٹھیک بنا دوں گا۔"

لونڈے دیوار پر سے کود کود کر بھاگے!

پھر گلسری کو محسوس ہوا کہ کوئی اس کی جانگھیں ٹٹول رہا ہے، پھر ٹھنڈی ٹھنڈی کوئی چیز لگی، پھر ایک ایسی چبھن ایسا درد کہ اس کا دماغ پھٹنے لگا ــــ آنکھوں کے سامنے لال لال شعلے ناچنے لگے، پھر ایکدم اندھیرا چھا گیا گھپ اندھیرا ــــ جب سب کچھ ہو چکا تب بھی گلسری کو یوں ہی پڑا رہنے دیا گیا ــــ ابھی خون نہیں بند ہوا تھا!

ابراہیم کہنے لگا "بس اب ٹھیک ہے، جو رفل الدالنوج ــــ اب آج کے بعد سے یہ نہیں بھاگے گا۔ اس کے بھاگنے کے دن گئے۔ اور جہاں تک تانا بیگ کا سوال ہے، آپ اس کے غم کھانے کا کچھ خیال نہ کیجیے گا، آخر اس نے بھی تو اپنے بھائی کو سائبیریا بھجوایا تھا ــــ گواہی دی تھی کہ یہ زمین دار ہے، انقلاب دشمن ہے، اس کی زمین جائداد بھی ضبط کروا دی تھی ــــ کیا اس نے کسی پر اس وقت ترس کھایا تھا جب کہ وہ اپنے کو بڑا پارٹی کا دلارا بنا پھرتا تھا ــــ اچھا ہوا!"

صدر نے حامی بھرتے ہوئے سر ہلایا۔

(۱۰)

رات تاریک تھی، ایک بوڑھا گھوڑا اور ایک بوڑھا انسان، شعلے کبھی ڈوبتے کبھی پھر لپکنے لگتے، ہوا آہستہ آہستہ چل رہی تھی، پہاڑوں کی اونچائیوں سے گرتی، چٹانوں سے گذرتی ــــ سائیں سائیں!

زمین سخت ہے، سرد ہے، گلسری کا پہلو بھی اس کی ٹھنڈک سے سرد ہو جاتا ہے، اس کی گردن سیسے کی طرح بھاری ہوتی جاتی ہے، بے چین ہو ہو کر وہ ادھر ادھر سر ٹپکتا ہے، اوپر نیچے، جیسے اس دن اس کا سر اوپر نیچے ہو رہا تھا جب وہ سامبل اور بڑیوں سمیت بھاگ کر، اپنے پرانے گلے میں، اپنے محبوب مالک کے پاس پہونچ گیا تھا۔ اس وقت بھی وہ دوڑ نہیں سکتا تھا، زنجیروں سے آزاد نہیں ہو سکتا تھا، چاہتا تو وہ اب بھی یہی ہے کہ سرپٹ دوڑے، اتنا تیز کہ اس کی نعلیں جل اٹھیں، وہ زمین پر آرے، زور زور سے سانس لے، بھاگتا ہوا چراگاہ میں جا پہونچے پوری طاقت سے ہنہنانے اس کے ہنہنانے پر گھوڑیاں دوڑیں، بچھیرے بھاگے ہوئے آپہونچیں اور اس کے ساتھ دوڑتے ہوئے، جھاڑیوں کو پھلانگتے دور دور نکل جائیں ــــ مگر گلسری کے پیروں میں تو زنجیریں تھیں ــــ تنہا، اکیلا وہ زنجیریں جھنجھناتا ایک سزا یافتہ، فرار شدہ قیدی کی طرح، ایک ایک قدم اٹھاتا، اچھلتا ہوا چل رہا تھا ــــ اندھیرا، تنہائی، اداسی!

پھر چاند نکل آتا ہے اور پیلے کے دوڑتے ہوئے بادلوں کے ٹکڑوں کی اوٹ میں چھپتا ہے اور پھر نکلتا ہے — اور نکلتا ہے اور پھر چھپتا ہے — گلسری کی آنکھوں کے سامنے چاند کبھی اٹھتا ہے، کبھی گرتا ہے — جب وہ اپنا سر اٹھاتا ہے تو چاند بھی نکل آتا ہے اور جب وہ اپنا سر گرا دیتا ہے تو چاند بھی پتھر کی طرح نیچے کی طرف گر پڑتا ہے — روشنی اندھیرا، اندھیرا روشنی! دیکھتے دیکھتے، کھولے کھولے گلسری کی آنکھیں دکھنے لگتی ہیں — وہ پلک نہیں جھپکا پا رہا ہے۔

زنجیر کھنکتی جا رہی ہے، اس کے پیروں سے رگڑ کھا رہی ہے، انھیں چھیلے ڈال رہی ہے — آہ یہ زنجیروں بھرا راستہ کتنا لمبا ہے اور زنجیروں کو لے کر چلنا کتنا مشکل ہے — کتنا زیادہ مشکل!

دونوں چڑھائیوں کی بیچ والی کھائی میں آگ جل رہی ہے زمین کتنی سخت ہے اور کتنی ٹھنڈی — کتنی سرد کہ گلسری کا پہلو ٹھنڈا ہوا جا رہا ہے!

(۱۱)

دو ہفتے بعد تانا بیگ اور دوسرے گڈریوں اور گلے بانوں کو پہاڑوں میں جانا تھا، جانے سے پہلے بہت کچھ کرنا تھا، آٹا اور کھانے پینے کا دوسرا سامان اکٹھا کرنا، گھوڑوں کی نعلیں لگوانا، کچھ نئی، کچھ پرانوں کی مرمت، اپنے جوتوں کی مرمت، کپڑوں کی مرمت، بورڈنگ اسکول میں لڑکا پڑھتا تھا، جانے سے پہلے اس سے ملاقات، لیکن تانا بیگ جیسے کھویا کھویا گھومتا رہتا تھا — اور اس دن صبح ایک دم سے چونک کر اس کی آنکھ کھل گئی تھی، "جیدار میں نے ایک بہت برا خواب دیکھا"۔

جیدار بولی: "تانا بیگ تمھیں ہو کیا گیا ہے، کیوں اتنے پریشان رہتے ہو، اب تم خوابوں کی بات کرنے لگے تم تو کہتے تھے مذہب کچھ نہیں ہوتا اور توہم پرستی آدمی کو لے ڈوبتی ہے، تم ہی گاؤں کے سب بے دینوں کے لیڈر بنے پھرتے تھے، اور اب یہ کیا حالت ہو گئی ہے تمھاری — خواب دیکھ دیکھ کر پریشان ہو جاتے ہو — کم از کم روانگی سے پہلے کورد سے تو مل آؤ — بیمار دوست کو خدا حافظ تو کہنا ہی چاہیے — کچھ ہوش میں آؤ — گھر کا سب کام کاج تو میں دیکھ ہی رہی ہوں — تم کم از کم کورد سے تو مل آؤ"۔

"تو پھر تم لوگ بھی چلو — سب ہی مل آئیں گے"۔

دوسرے دن صبح تانا بیگ نے ایک نوجوان پڑوسی سے گھوڑوں کی نگرانی کا انتظام کیا، ایک گھوڑے پر جیدار چھوٹی بچی کو لے کر بیٹھی ایک پر تانا بیگ بڑی بچی کو لے کر سوار ہوا، لوہاری کی دکان کے پاس تانا بیگ نے لگام کھینچی "جیدار، ذرا رک جاؤ، میں ابھی آیا — یہاں مجھے ذرا سا کام ہے، میں ابھی آیا، وہ کچھ

نعلین عزیزی ہیں اور کچھ اور سامان تم چلی چلو میں آرہا ہوں بس تمھارے پیچھے ہی پہونچتا ہوں"
"مگر ہم دونوں الگ الگ پہونچیں گے تو کیسا لگے گا؟"
"کوئی حرج نہیں، تم چلو، بس میں آیا ش——"
وہ گھوڑے سے اُترا —— جیدارآگے بڑھ گئی، تانا بیگ نہ ضلع کے دفتر گیا، نہ لوہاری کی دوکان، وہ سیدھا سرکاری اصطبل پہونچا —— اصطبل میں خاموشی تھی، وہ خالی تھا، تانا بیگ نے ایک اطمینان کی سانس لی، پھر ایک ٹھنڈی سانس بھری، پھر وہ پچھلے صحن میں گیا جیسے کچھ ڈھونڈ رہا ہو، وہاں اسے ایک سائیس سے کچھ بات بھی کرنی تھی —— اور وہاں اسے وہ کچھ نظر آیا جس کا اُسے اتنے دنوں سے ڈر تھا۔

اس نے مٹھیاں بھینچیں، دانت پیسے "حرامزادے، کمینے —— میں جانتا تھا وہ یہی کریں گے"
گلسری ایک چھپر کے نیچے کھڑا تھا، اس کی پٹیوں میں بندھی ہوئی دُم اوپر کو اٹھا کے رسی کے ذریعے اس کے گلے میں بندھی ہوئی تھی اور اس کی پچھلی ٹانگوں کے بیچ میں سے سوجن دکھائی دے رہی تھی —— سرخ پھیلی ہوئی گول سی سوجن جیسے کوئی بڑا سا لوٹا —— وہ بے حس و حرکت کھڑا تھا، سر جھکائے وہ گھاس کو صرف تک رہا تھا —— کھا نہیں رہا تھا۔

تانا بیگ نے ایک آہ کھینچی اور اپنے ہونٹ دبا لیے کہ چیخ نہ نکلنے پائے۔ اُس کا دل تو چاہتا تھا کہ دوڑ کر گلسری سے لپٹ جائے پر اس کی ہمت نہیں پڑی —— یہ سنسان اصطبل میں سناٹا، یہ تنہائی اور اس کا گلسری —— آختہ کیا ہوا، زخمی اور اکیلا۔

تانا بیگ مڑ کر دوڑنے لگا —— فوراً اپنے گھوڑے پر سوار ہوا اور نکل گیا۔
رات کو وہ جیدار سے بولا "تمھیں پتہ ہے، میرا خواب سچا تھا، ان حرامزادوں نے گلسری کو آختہ کر دیا، کچھ بھی کہو یہ چیرمین تو مجھے بڑا ہی سوَر معلوم ہوتا ہے، حد درجہ کمینہ اور بزدل"
جیدار بچّوں کو کمبل اُڑھا رہی تھی، دوسری طرف منھ کر کے بولی "تو کیا اتنی آفت آگئی —— ہمیشہ سے دنیا میں گھوڑے آختہ ہوتے آئے ہیں اور ہوتے رہیں گے —— ایک گھوڑا آختہ کر دیا تو چیرمین سوَر ہو گیا، کچھ اپنی زبان کو لگام دو، مت اس طرح کی باتیں کیا کرو" پھر اس نے ایک آہ کھینچی، دوسری طرف منھ کر کے اپنے آنسو پونچھے اور بولی "مجھے تو بہت پہلے سے معلوم تھا —— ہائے ہمارا گلسری"
تانا بیگ حیران ہو کر جیدار کو تکتے کا تکتا رہ گیا!
گھوڑے پہاڑوں کے لیے روانہ ہو رہے تھے، لڑکیاں الوداعی گیت گا رہی تھیں، گاؤں کے بیرے پرے گھر تھا، وہ میدان تھا، جہاں تانا بیگ گلسری پر سواری کیا کرتا تھا —— وہ جا رہا ہے مگر اب کے گلسری اس کے

ساتھ نہیں، وہ سب باتیں، داستان بن گئیں، خواب و خیال ہو گئیں، وہ سب کچھ ختم ہو گیا ــــ جیسے بہار کے موسم میں آسمان پر اڑتی ہوئی ہنسوں کی کوئی ڈار ــــــ کہ نکل گئی تو نکل گئی!

اونٹنی صحراؤں میں دوڑتی پھرتی ہے، دشت و در میں ٹکراتی ہوئی وہ آوازیں دے رہی ہے، پکار رہی ہے ــــ تو کہاں ہے، میرے کالی آنکھوں والے، میرے نازوں کے پالے، کہاں ہے تو، دودھ میرے تھنوں سے بہہ رہا ہے ــــ تو کہاں ہے، کہاں ہے؟۔

(۱۲)

خزاں کے موسم کے ساتھ تانا بیگ کی زندگی میں ایک تبدیلی آئی۔

پنچایتی فارم سے ایک قاصد پیغام لایا: مجھے کورتو نے بھیجا ہے، آپ فوراً ان سے ملنے گاؤں جائیں، وہاں سے آپ کو ایک کانفرنس میں جانا ہوگا۔"

کورتو کے پاس بڑی بھیڑ تھی، کاغذوں کا ڈھیر، درخواستوں کے پلندے، وہ ہانپ ہانپ کر سب کام نبٹا رہا تھا تانا بیگ کو دیکھ کر مسکرایا، "ذرا سا انتظار کرو دوست، ابھی تم سے بات کرتا ہوں" دیسے تانا بیگ کو یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اب وہ بہتر لگ رہا تھا، سانس تو ذرا پھول رہی تھی، مگر چہرے پر رونق تھی اور بشاشت ــــ تانا بیگ باہر ایک بنچ پر بیٹھ گیا ــــ

جب دونوں دوست اکیلے رہ گئے تو کورتو نے تانا بیگ کو اندر بلا کر اس سے بات شروع کی: "دیکھو تانا بیگ جہاں تک تمہارا میرا سوال ہے میں نے تو ہمیشہ تمہاری دوستی اور محبت سے ناجائز فائدہ اٹھایا ہے اور میرا رویّہ تمہاری طرف یہ رہا ہے کہ لاد دے، لدا دے اور لادنے والا ساتھ دے، کل ایک کانفرنس ہے جانوروں کی دیکھ بھال کرنے والوں کی، اور میں چاہتا ہوں کہ تم آج یہیں رہو، کل میرے ساتھ وہاں چلو اور ــــ بات یہ ہے کہ جانوروں کی حالت خراب ہے خاص کر بھیڑوں کی ــــ تم نے ایک بار گھوڑوں کے سلسلے میں ہماری بڑی مدد کی تھی، اب کی بھیڑوں میں ذرا ہاتھ لگا دو نہ تانا بیگ"

تانا بیگ پر سکتہ طاری ہو گیا ــــ بھیڑیں!

"مگر، مگر مجھے جیدار سے پوچھنا ہوگا ــــ اور یہ کام تو بڑا فضول ہے، میرا اس میں بالکل دل نہیں لگے گا، کورتو"

کورتو نے پہلو بدلا: "ہاں یہ تو بات ٹھیک ہے مگر ہم تم پرانے کمیونسٹ ہیں تانا بیگ ہم لوگ اپنے دل کی نہیں عوام کی اور اس حکومت کی بھلائی کی سوچتے ہیں جس کے لیے ہم نے خون پسینہ ایک کیا، اپنی جوانی لٹائی، اپنے رشتہ دار

تک کی مروت نہ کی، سب سے بڑے بنے، سب سے زیادہ محنت کی، سب سے کم پایا ——— اور حیدآر سے ضرور پوچھ لو، وہ بڑی عقل مند عورت ہے ——— پھر وہ ہنس کر بولا: "اگر حیدار نہ ہوتی تو تم تو اب تک کہیں نہ کہیں اپنی گردن توڑ چکے ہوتے!"

تانا بیگ جھینپ گیا، پھر سر اٹھا کر کورو کو ٹہوکا مارتے ہوئے بولا: "کیوں پرانے زخم کریدتے ہو یار — اچھا خیر ——— مگر، مگر مجھے وہ حرامزادہ جو بالکل پسند نہیں ——— میں کیسے اس کے ساتھ کام کروں بھئی ——— یہ بڑا مسئلہ ہے، میں تو تم سے کہنے والا تھا کہ یہ گھوڑے بھی مجھ سے لے لو ——— مجھے میری لوہاری ہی بھلی ہے ——— تھوڑا پیٹ کر بھی پیٹ بھر لوں گا۔"

"کون حرامزادہ؟" کورو نے جان بوجھ کر پوچھا۔

"یہی ——— تمہارا چیرمین، کمینہ، پنچ، دھوکہ باز۔"

"ہیں ہیں" کورو نے آنکھ دبا کر کہا: "بس بس، تم کو تو یار کوئی اچھا ہی نہیں لگتا، نہ جانے کیا چاہتے ہو، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تانا بیگ، ہم تم جٹے رہیں گے تو سب ٹھیک ہو جائے گا ——— آؤ دوسرے کمرے میں، کچھ پئیں۔"

صبح کو لاری انہیں گاؤں سے ضلع کے دفتر لے گئی۔ سب ہی گلّہ بان اس لاری پر فدا تھے نئی اور خوب صورت تیز دوڑنے والی، جیسے "بادشاہ لوگ" جا رہے ہوں تانا بیگ بڑا خوش تھا، جنگ کے بعد پہلی بار پھر لاری میں بیٹھا، سلاواکیہ اور آسٹریا کی سڑکوں پر تو وہ بڑے ٹھاٹھ سے امریکن اسٹوڈی بیکروں میں چلا کرتا تھا ——— اور اس وقت اس کا ایمان اور عقیدہ تھا کہ ایک دن ایسا آئے گا جب سوویت روس میں اس سے اچھی لاریاں چلیں گی ——— سو اس ایمان کا ایک ٹکڑا تو پورا ہو گیا تھا ——— وہ خوش تھا، بہت ہی خوش!۔

ضلع کے دفتر میں بڑی بھیڑ تھی، کورو رات کو ہی پہنچ گیا تھا ——— اور اس نے تانا بیگ کو آواز دی، "آؤ بھئی، کہاں جا رہے ہو، میٹنگ شروع ہونے ہی والی ہے ——— کدھر جا رہے ہو بھئی ——— ارے میٹنگ ادھر ہے"۔

تانا بیگ ہنسنے لگا، اسے معلوم تھا کہ وہ ہمیشہ اپنے دوست کورو کا کہا کرتا تھا، کورو کو ہمیشہ یہ ڈر رہتا تھا کہ یہ سر پھرا نہ جانے کب کیا کر بیٹھے۔ کسی سے لڑ جائے، کسی سے عشق کر بیٹھے، نہ جانے کدھر کو نکل جائے! مگر تانا بیگ چلتا گیا، اس نے لاری سے ہی گھوڑوں کے بیچ میں گلسری کو دیکھ لیا تھا ——— بہت سے لوگ گھوڑوں پر بھی آئے تھے۔ اور گلسری باقی گھوڑوں سے بالکل الگ اور ممتاز لگتا تھا۔ وہ اس کا سنہری رنگ ——— چوڑا سینہ مضبوط کولہے، ہڈیلی روی ناک ——— سیاہ آنکھیں۔

تانا بیگ نے اپنے دونوں بازو گلسری کے گلے میں ڈال دئے: "کہو گلسری، کیسے ہو میری جان، اس وقت تو بڑے مزے میں لگ رہے ہو، بہت پیارے لگ رہے ہو ——— ایں؟"

گلسری نے اپنی آنکھیں گول گول گھمائیں، اپنے پرانے مالک کو فوراً پہچان لیا، نتھنے پھلا پھلا کے ہنہنایا۔

کے وہ موڑ موڑ کرنے لگا ـــــ تو کور و گلسری کو کھلاتا پلاتا تو اچھا تھا ـــــ اچھا بھئی، تم یہاں کھڑے رہو ـــــ مجھے اندر کام ہے "

تانا بیگ دوڑتا ہوا اندر گھس گیا!

اندر پچھلے دروازہ پر ایک بڑا سا تختہ لگا تھا، اس پر بڑے بڑے حروف میں لکھا تھا۔

"کیونسٹو ـــــ آگے بڑھو"

ایک اور تختہ تھا "کومسومول[1] ـــــ سوویت نوجوانوں کا ہراول دستہ"

بڑے کمرے اور برآمدوں میں لوگ بھرے ہوئے تھے ـــــ چیرمین نے تانا بیگ کو دیکھ کر اشارہ کیا "تانا بیگ ادھر آکر بیٹھئے، ہم لوگوں نے حاضری تو آپ کی لگا دی ہے، آپ کو تقریر کرنا ہے نہ ... آپ کی جگہ ہے آپ ہمارے سب سے اچھے گلہ بان ہیں، پارٹی ممبر ہیں، آپ کو بولنا ہوگا "

چیرمین کو دیکھ کر تانا بیگ کا موڈ گڑبڑا یا ہی چاہتا تھا کہ اس کی نظر میز کے کنارے بیٹھے ہوئے کاردد پر پڑی ـــــ اس نے مسکرا کر تانا بیگ کو آنکھ ماری ـــــ تانا بیگ سنبھل گیا ـــــ مگر ذرا گھبرا کر بولا "مگر کامریڈ چیرمین ـــــ مجھے ...... مجھے کیا کہنا ہوگا ـــــ مجھے تقریر کرنی تو نہیں آتی ـــــ"

"تقریر کیا مشکل ہے" چیرمین بولا "بس یہی کہنا ہے کہ ایک کمیونسٹ کی حیثیت سے آپ نے ایک بھیڑوں کے گلہ کی دیکھ بھال قبول کی "

"بس؟"

"نہیں، اپنے وعدے اور عہد کو بھی دوہرانا ہوگا ـــــ کہ میں پارٹی اور عوام سے وعدہ کرتا ہوں کہ سو بھیڑوں پر ایک سو بیس دوں گا اور فی بھیڑ تین سیر اون تراشوں گا "

"مگر یہ میں کیسے کہہ سکتا ہوں، میں نے گلہ تو دیکھا نہیں ہے"

"اب بیکار کی گڑبڑ نہ کرو، گلہ تو تمہیں دیا ہی جائے گا "

کوردو نے بیچ میں بات کو ذرا سنبھالا "تم اپنا گلہ خود پسند کر لینا، جو بھی تمہیں اچھا لگے گا، اس کی بالکل فکر نہ کرو اور ہاں یہ بھی کہو کہ تم دو نوجوان کومسومول کے دئے ہوئے گڈریوں کی افسری قبول کرتے ہو "

"وہ کون ہیں؟"

"قاسم طوت بیگ اور بختائی زار یکوف"

---

[1] کومسومول، کم عمر لڑکے لڑکیوں کی انجمن، جسے نوجوان کمیونسٹ لیگ بھی کہا جا سکتا ہے۔

"لیکن میری تو ابھی ان سے بات چیت بھی نہیں ہوئی ـــــ وہ کہتے کیا ہیں؟"

چیئرمین بگڑ گیا "پھر وہی گڑبڑ ـــــ آخر تمہاری ان سے بات کرنے کی کیا ضرورت ہے، اس سے کیا فرق پڑتا ہے، وہ بھاگ نہیں جائیں گے۔ سب کچھ طے ہو چکا ہے۔"

"جب آپ لوگ خود ہی سب طے کر چکے ہیں تو مجھے یہاں بلانے کی کیا ضرورت تھی۔"

"افوہ" کوزرد دھیمے سے بولا: "اچھا، اب چپ ہی رہو، یاد ہے کیا کہنا ہے؟"

"یاد ہے۔" تانا بیگ غرّایا ـــــ کانفرنس کے بعد کوزرد گلسری پر سوار ہوا اور روانہ ہو گیا۔ تانا بیگ نے چلتے وقت نہ اس سے بات کی تھی، نہ کسی سے ـــــ آہ ـــــ تانا بیگ ـــــ ابھی تک اتنا ہی سنکی ہے جتنا جوانی میں تھا؛ ویسا ہی سادہ لوح اور بھولا بھالا اور مخلص ـــــ کبھی جو سمجھ جائے کہ زمانہ بدل گیا ہے، اب تو اس بات کی قیمت ہے کہ کس کے سامنے کیا کہو، اور کیسے کہو ـــــ کر دو جو چاہے جو کچھ!

کہیں تم سب کچھ گڑبڑ نہ کر دینا میرے دوست!

(۱۳)

ابھی رات باقی ہے ـــــ وہی رات جس نے دونوں مسافروں کو جا لیا تھا ـــــ ایک بوڑھا گھوڑا ایک بوڑھا انسان، گھاٹی کے سرے پر آگ جل رہی ہے۔ تانا بیگ بار بار اٹھ کر، اپنے بھیڑ کے بالوں کے کوٹ کو گلسری کے جسم پر ٹھیک کرتا ہے ـــــ گلسری، جو مر رہا ہے! اور پھر آ کر گلسری کے سرہانے بیٹھ جاتا ہے ـــــ ساری زندگی کی یادیں، آگ کی روشنی میں ابھر رہی ہیں۔ سال نظروں کے آگے سے یوں گذر جاتے ہیں جیسے ریس کا گھوڑا دوڑتا چلا جا رہا ہو...... اور وہاں اس سال کیا ہوا تھا؟ جب خزاں کے آخری دنوں میں اس نے بھیڑوں کا گلہ سنبھالا تھا ـــــ پھر بہار کی شروعات ہو گئی تھی! ـــــ اور وہ بھیڑوں کا گلہ سنبھال رہا ....

ـــــ اور پھر .... اور پھر .... اور پھر ....

(۱۴)

تانا بیگ کے پاس کافی بڑا گلہ تھا، ایسی بھیڑیں جو دوسری تیسری بار بچہ دینے والی تھیں ـــــ پانچ سو بھیڑیں ـــــ جس کے معنی تھے، پانچ سو فکریں! ویسے تو گھوڑوں کی نگہبانی سے زیادہ پُرسکون کام تھا مگر گھوڑوں کو کبھی کبھار دو دو دنوں پر چھوڑا بھی جا سکتا تھا، بھیڑوں کو تو بالکل نہیں ـــــ لوگ کہتے تھے اب گھوڑے پالنے سے کیا فائدہ موٹریں آ گئی ہیں۔ بھیڑوں سے تو گوشت، اون اور کوٹوں کے لیے کھال حاصل کی جا سکتی تھی!

اس طرح دن بھر بھیڑوں کے ساتھ گھومنا رات کو ان کی چوکیداری ــــ یہ تانا بیگ کی تقدیر بن گئی، رجسٹر میں، اس کی بیوی کا نام اس کی مددگار کی حیثیت سے لکھا تھا اور کبھی کبھی تانا بیگ، کی ان دونوں نوجوانوں سے ملاقات ہوتی تھی جو اسے دیئے گئے تھے۔ قاسم تو کسی قدر غنیمت تھا، مگر بختیائی، خوبصورت اور وجیہہ تھا، کھاتے پیتے گھر کا لڑکا ــــ وہ ہر وقت حالات سے بیزار رہتا تھا۔ جب تانا بیگ سے ملاقات ہوتی تو کہتا "تانا بیگ خواہ مخواہ بار بار دوڑ کر آتے ہیں، جائیے اپنے بچوں کے پاس خاموش رہیئے، میری تو ویسے ہی کافی جانچ ہوتی رہی ہے۔"

"آخر تمہیں پریشانی کیا ہے؟" تانا بیگ حیران ہو کر پوچھتا۔

اوہ! یہ نوجوان ــــ یہ تو جیسے کچھ کرنا ہی نہیں چاہتے تھے!

"پریشانی ہو یا نہ ہو، پر مجھے آپ جیسے لوگ پسند نہیں ہیں "تانا بیگ، یہ سب آپ ہی لوگوں کا کیا دھرا ہے ــــ نعرے لگا لگا کے، نعرے لگا لگا کے ــــ آپ کیا جانیں کہ شریفوں کی زندگی کیسی ہوتی ہے، نہ آپ خود چین لیتے ہیں، نہ دوسروں کو لینے دیں گے۔"

تانا بیگ بگڑ گیا۔ "ذرا زبان سنبھال کے میاں صاحبزادے، خبردار جو مجھ پر انگلی اٹھائی ہاں بے شک میرے ایسے لوگوں نے ہی یہ سب کیا اور ہمیں کوئی پچھتاوا نہیں ہے کہ کیوں کیا، کوئی تم جیسوں نے نہیں کیا ہے۔ اور یہ ہمارے ہی کیے کی بدولت تم آج اخبار پڑھتے ہو، سینما دیکھتے ہو ورنہ تو بس تمہارا ایک نام ہوتا ــــ غلام! سمجھے۔"

اور اس دن صبح تانا بیگ اپنے 'یورتا' سے نکلا تو لڑکھڑا کے رہ گیا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ پہاڑ بالکل نزدیک آ گئے ہیں اور ان پر جمی ہوئی سفید برف کیا ہی اچھی لگ رہی تھی، سورج کی روشن، تابناک کرنیں! اس کے دل میں تنہائی ڈنک مارنے لگی، وہ کتنا اکیلا تھا اور اسے ایک بار پھر بیوبیوزن کی یاد آئی ــــ کاش کہ گلسری یہاں ہوتا تو وہ اچک کر اس کی پیٹھ پر سوار ہو جاتا اور اسے دوڑاتا ہوا بیوبیو کے یہاں پہونچ جاتا۔

مگر...... مگر یہ تو سب خواب تھا ــــ انسان کی آدھی زندگی خواب ہی دیکھتے بسر ہوئی ہے، شاید اسی لیے زندگی میں مٹھاس باقی رہتی ہے کہ سب خواب پورے نہیں ہوتے۔ پہاڑوں کو دیکھو، آدھے دھوپ میں تو آدھے چھاؤں میں، یہی انسان کی قسمت ہے، غم اور خوشیاں آدھوں آدھ، کون جانے وہ بھی کبھی مجھے یاد کرتی ہے یا نہیں، ہو سکتا ہے پہاڑوں کی چوٹیوں پر برف کے تاج پر یہ سنہری دھوپ دیکھ کر اُسے بھی میری یاد آئی ہو۔"

انسان بوڑھا ہو جاتا ہے، تھک جاتا ہے، پر اس کا دل ہے کہ کسی منزل پر ہتھیار ڈالنے پر تیار نہیں ہوتا رہ رہ کر جاگ پڑتا ہے۔ رہ رہ کر اپنی آواز سُنا کر چونکا دیتا ہے۔

تانا بیگ نے اپنا گھوڑا کسا، یورتا کا پردہ اٹھا کر اپنی بیوی کو آواز دی "جیدار میں بکریں لئے جا رہا ہوں، جب تم سامان وغیرہ جماؤ گی، تب سے آتا ہوں۔"

اب سردیوں کی آمد آمد تھی، برف ابھی تو تھوڑی تھی، پھر اور جمے گی، یہاں تک کہ کھلے میدان چھوڑ چھوڑ کر آڑ ڈھونڈھنی پڑے گی اور گڈریوں کو اپنا کمال دکھانے کے وقت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اپنے گلّوں کے لئے ایسی جگہوں سے چارہ ڈھونڈھ نکالنا ہوگا جہاں لوروں کو برف کے سوا کچھ نہ دکھائی دے —— تانا کو بھی یہی کرنا تھا —— کبھی کبھار کوئی آنیسر آ نکلے گا، یہ پوچھے گا وہ پوچھے گا، طرح طرح کے دعدے وعید کرے گا اور پھر جلدی سے جلدی اِن پہاڑوں سے نکل بھاگے گا —— رہ جائے گا گڈریا اور ان کی قسمت گلّہ بان اور یہ سردی کا موسم!

تانا بیگ کا بہت جی چاہتا تھا کہ پنچائتی فارم پر جاکر پوچھے کہ جب بھیڑوں کے بچّے ہونے کا وقت آئے گا تو اس کے لیے کیا انتظام ہے، مگر اس کو سانس لینے کی مہلت نہیں ملتی تھی —— جیدار ایک بار لڑکے کو بورڈنگ ہاؤس چھوڑنے گئی تھی مگر فوراً ہی لوٹ آئی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اس کی غیر حاضری میں تانا بیگ بچیوں کی مدد سے گلّے کی دیکھ بھال کرتا تھا، ننھی بچّی کو تو وہ اپنے آگے گھوڑے پر بٹھا لیتا اور اپنا کوٹ اُڑھا لیتا مگر بڑی والی پیچھے بیٹھی سردی میں سکڑتی رہتی!

اس درمیان بھیڑوں کے پیٹ بڑھتے جا رہے تھے، مگر وہ خود دُبلی ہوتی جا رہی تھیں، گھاس کی ایک ایک پتّی برف کے نیچے سے کھود کر نکالنی پڑتی تھی، جن بھیڑوں کو دن میں تین بار چارہ ملنا چاہیئے تھا انھیں ایک بار ملتا تھا اور وہ بھی آدھے پیٹ۔ روز صبح جب تانا بیگ بھیڑوں کو باہر نکالتا تو گیابھنوں کے پیٹ اور تھن ٹٹولتا اور پنچائتی فارم کو کوستا۔ آخر چارہ کب آئے گا! اگر یہ سب زندہ رہ گئیں تو اس نے جتنی بھیڑیں پیدا کرنے کا وعدہ کیا تھا، وہ تو شائد وہ پورا کر دے گا، مگر اون؟ اتنی کمزور بھیڑوں پر اون کیا پیدا ہو سکتا تھا۔ پھر وہ پنچائتی فارم سے زیادہ اپنے آپ کو کوستا کہ کیوں اس جھنجھٹ میں جان پھنسائی، کورد کو گالیاں دیتا۔ دوست ہو کر اس نے کیسی دغا کی مگر کورد کا کیا قصور تھا، اگر تھا تو یہی تھا کہ وہ تانا بیگ پر بہت بھروسہ کرتا تھا —— ایسی کی تیسی بھروسے کی، واہ جو کام سب سے مشکل تھا وہی اُٹھا کے حوالے کر دیا اور اب پلٹ کر کوئی نہیں دیکھتا کہ ہو کیا رہا ہے! پر وہ کیا کرتا، وہ خود ہی ناک تک کام سے لدا تھا!

پھر فارموں کے دفتر سے دو عورتیں بھیجی گئیں —— آج کل دفتر سے ہر جگہ ایسی عورتیں بھیجی جا رہی تھیں جو بوڑھی تھیں، یا جن کے چھوٹے بچے نہیں تھے —— سو تانا بیگ کی مدد کے لیے بھی ایسی دو عورتیں، بستر بوریا سنبھالے آ پہونچیں، کچھ تو زندگی میں رونق آ گئی، ویسے ضرورت تو کئی عدد کی تھی —— خیر اب دھیرے دھیرے بھیڑوں کو پہاڑوں کے دامن میں لے جایا جانے لگا، ان کے بچے دینے کا وقت قریب تھا۔ بھیڑیں بہت دھیرے دھیرے چلتی تھیں، یہاں تک کہ کتّا بھی اکتا کر ایک طرف کو ہو جاتا —— مگر وہ اپنی ہی رفتار سے چلتی تھیں —— بھاری بھاری پیٹ ہلاتی —— دبلی دبلی ٹانگیں گھسیٹتی —— سورج ڈوب رہا تھا مگر [illegible] تانا بیگ

اور انس کا گلہ جتنی ہی دور اندر کی طرف گھستا جاتا اتنا ہی گرمی زیادہ محسوس ہوتی ہے۔

راستہ لمبا تھا مگر تانا بیگ کے حساب سے ان لوگوں کو اچھے ٹھکانے پہونچ جانا چاہیے تھا — جو یکا یک سڑک کے بیچ میں رکنا پڑا — پہلی بھیڑ نے بچّہ دے دیا! تانا بیگ نے ننھے بچّے کے نتھنوں اور کانوں میں اپنے منھ سے گرم گرم سانس پھونکی مگر اس کا دل دھونکنی کی طرح دھڑک رہا تھا۔ ابھی تو اس کے حساب سے ایک ہفتہ باقی تھا — اور یہ لیجئے! اگر سب نے یہی شروع کیا تب کیا ہوگا! تانا بیگ نے ایک ایک بھیڑ کا پیٹ ٹٹولا ٹھن ٹٹولے، ہیں معلوم تو نہیں ہوتا تھا اس کے دل کو کچھ اطمینان ہوا — اس کے بچے اس ننھے سے میمنے کو دیکھ کر کتنے خوش ہونگے، اس نے میمنے کو پیار سے اٹھا کر اپنے بڑے کوٹ کے اندر دبا لیا۔ برف سا سفید کالی آنکھیں، کالی کھریں، کتنا معصوم، کتنا پیارا — اس نے بچے کو بھینچا اور ریوڑ کو آگے ہنکانے لگا — !

شام تک تانا بیگ نے ریوڑ کو نئے ٹھکانے پر پہونچا دیا! نیا ٹھکانہ! یہاں بھیڑوں کے بچّہ ہونے کا انتظام کیا گیا تھا؟ تانا بیگ کے پیر تلے سے زمین نکل گئی!

جنگ سے پہلے یہاں باڑہ رہا ہوگا، اب تو سب کھنڈر پڑا تھا، نہ دلواریں تھیں، نہ کیواڑ تھے، چاروں طرف پچھلے سال کی مینگنیاں پڑی تھیں، چھپر میں بڑے بڑے سوراخ تھے، سامنے کچھ سڑی گلی گھاس پڑی تھی۔ اندر ایک کونے میں چارے کے دس بیس گٹھے تھے، دو بورے جو تھا، اور ایک لکڑی کے بکس میں نمک! اتنی ساری بھیڑوں کے لیے جو بچّے دینے والی تھیں، بس یہی خوراک تھی!

تانا بیگ پر بجلی سی گری! یہ تو تمام بھیڑوں کے مرنے کا انتظام کیا گیا تھا! بار بار وہ مینگنیوں کے ڈھیروں سے ٹھوکریں کھاتا، باڑے بھر میں بھٹکتا پھر رہا تھا اور پاگلوں کی طرح بڑبڑاتا جا رہا تھا: یہ کیسے ہو سکتا ہے" — پھر وہ تیر کی طرح باڑے سے باہر نکلا اور اپنا گھوڑا کسنے لگا — وہ ابھی دفتر جائے گا، چاہے آدھی رات ہو، سب دفتر والوں کو جگا کر اٹھا کے بٹھا دے گا، چیخے گا، چلّائے گا، گالیاں دے گا، یہ آخر کیا مطلب ہے، اتنی بدانتظامی، یہ لاپرواہی، ساری بھیڑیں مر جائیں گی تو کون جواب دے گا؟ مارے غصّے کے اس کے ہاتھ پیر تھر تھر تھر تھر کانپ رہے تھے!

اب وہ کبھی ان بے ایمانوں کا کوئی کام نہیں کرے گا، اپنے دفتر میں بیٹھے بیٹھے حکم بھیجتے رہتے ہیں، کچھ جانتے بھی ہیں کہ کام کرنے والے کس مصیبتوں میں ہیں، ابھی جا کے ان سب کے دماغ ٹھیک کرتا ہوں! وہ لپک کر گھوڑے پر سوار ہوا —

جیدا نے دوڑ کر اس کی باگ پکڑ لی: "تانا بیگ کہاں جا رہے ہو، رک جاؤ، رکو، رکو"

"چھوڑ دے میرے گھوڑے کی باگ دیکھ نہیں رہی ہے کیا حالت ہے، تین چار دن میں یہ پانچ سو بھیڑیں بچے دیں گی — یہاں نہ چھت ہے، نہ دلواریں، نہ چارا میں آج ان سب کو مار ڈالوں گا پھر چاہے حکومت مجھے گولی

ہی مار دے ـــــ جتنے دفتر میں ہیں آج سب کا خون پی جاؤں گا ــــــ کورو سمیت ـــــــ چھوڑ دے مجھے"
اس نے بیوی کے ہاتھ سے باگیں چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے چابک اٹھائی" ہٹ جا ورنہ تجھے بھی مار ڈالوں گا"
"ہاں ہاں، مجھے تو ضرور مار ڈال ـــــ ضرور مار ڈال" جیدار اور زور سے رونے لگی مگر باگیں
اس نے نہیں چھوڑیں ـــــ
دونوں عورتیں دوڑی ہوئی آئیں، بچیاں زور زور سے رونے لگیں ــــ "ابا ــــ ابا ــــــــ
اماں کو مت مارو"
"مجھے کوئی نہ روکے، ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا" تانا بیگ چیخا ـــــ
"تو کرو گے کیا وہاں جاکر؟ چیخو گے چلاؤ گے؟ اس سے کیا بنے گا؟ اگر اب تک ان لوگوں نے نہیں
بنایا باڑہ تو اس کے معنی نہیں کہ بنا ہی نہیں سکتے تھے، اگر بنا سکتے تو بنا نہ دیتے ــــــ؟"
"مگر چھپّر تو ڈال دیتے مرمت ہی کر دیتے اس کی، باڑے کے اندر تک برف جمی ہے، مینگنیاں شاید
اس برس سے صاف نہیں ہوئی ہیں اور یہ کمبخت گھاس جو انھوں نے کھلانے کو دی ہے! تو میمنوں کو یہ گھاس کھلائے
گی؟ کیا بچھائیں گے ہم بھیڑوں کے بچّے دینے کے لیے؟ بچّے ایسی کیچڑ میں ہوں گے؟ چھوڑ دے مجھے"
"تانا بیگ ہوش میں آؤ ــــــ تم میں کیا سرخاب کا پر ہے، ہر جگہ یہی حالت ہے، پورا ملک تباہ ہو گیا ہے
تانا بیگ، اور ہم ہی اس کے بنانے والے ہیں ــــــ اترو آؤ گھوڑے سے، دیر نہ لگاؤ، سوچو کہ کیا کیا جائے ــــ
آؤ، جھاڑیاں کاٹیں گے، چھپّر کی مرمت کریں گے، جھاڑیوں پر مینگنیاں ڈال کر پاٹ دیں گے جنگلی گھاس اکٹھی کریں
گے ــــــ کچھ نہ کچھ کریں گے ــــــ بس موسم ذرا سا ساتھ دے دے، اترو آؤ، بہت کچھ کرنا ہے" ـــــ
تانا بیگ نے باگیں چھوڑ دیں، سر دونوں ہاتھوں سے پکڑے پکڑے گھوڑے پر بیٹھا رہا، جیدار نے لگامیں
نہیں چھوڑیں!
آخر وہ گھوڑے سے اُترا، جیدار کے پیچھے پیچھے باڑے میں آیا ــــــ سب نے مل کر باڑے کے کئی چکر لگائے
اور اس میں جٹ گئے!
تانا بیگ چھپّر پر جھاڑ جھنکاڑ جماتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ کورو نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ اگر جیدار نہ ہوتی تو
اب تک تم کہیں نہ کہیں اپنی گردن توڑ چکے ہوتے!

(۱۵)

بہار کے موسم سے بڑی امیدیں تھیں پر اس نے بھی ساتھ نہیں دیا، رات کو یکایک پانی برسنے لگا، اور اس

پانی میں بھیڑوں کے کراہنے کی آوازیں آنے لگیں ـــــ ایک کے بعد ایک ـــــ تانا بیگ کے یورتا میں بھی پانی ٹپک رہا تھا، اس نے اپنے بچوں پر چمڑا اڑھایا اور لالٹین لے کے باڑے کی طرف دوڑا، جیپار اور دونوں عورتیں اس کے پیچھے پیچھے تھیں!

اب ہر گھنٹے پر کوئی نہ کوئی بھیڑ بچہ دے رہی تھی ـــــ!

تانا بیگ نہ کھاتا تھا، نہ سوتا تھا، نہ بیٹھتا تھا۔ رات دن وہ بھیڑوں کے پیشاب اور مینگنی سے بھرے ہوئے باڑے میں کھڑا رہتا، جو ہاتھ میں آتا وہ میمنوں پر ڈالتا، روشنائی سے بھیڑوں اور بچوں پر نمبر لگاتا، میمنوں کو ان کی ماؤں کے تھنوں سے لگاتا ـــــ لیکن باڑے میں اتنے سوراخ تھے، سرد ہوائیں یوں اندر آتی تھیں اور جگہ اتنی کم تھی، چارہ تھا ہی نہیں! کمزور بھیڑوں اور نوزائیدہ میمنوں کو موت گھیر رہی تھی ـــــ ایک ایک بار بار میں کئی کئی بچے مرتے تھے اور تانا بیگ، ان کو اٹھا اٹھا کر باہر پھینکتا تھا!

ایسے میں تانا بیگ نے مدتوں سے آئینہ نہیں دیکھا تھا، اسے یہ پتہ نہ تھا کہ اس کے سر کے بال سفید ہو چکے ہیں، اس کے چہرے پر جھریاں پڑ چکی ہیں، اس کی آنکھیں اندر کو دھنس چکی ہیں ـــــ غم اور غصے کی آگ نے اس کا خون سکھا کر اسے جوانی سے بڑھاپے کی سرحدوں پر لا کھڑا کیا ہے۔ اسے تو بس بھیڑوں کی فکر تھی، صرف بھیڑوں کی ـــــ اب کیا ہوگا!

اور جب اسے یہ نظر آنے لگا کہ اب مکمل تباہی اس کی قسمت بن چکی ہے تو اس نے ان دونوں عورتوں میں سے ایک سے کہا: "کوزرو کے پاس جاؤ، اس سے کہنا ابھی آئے، اسی دم ـــــ اور اگر اس وقت نہ آیا کبھی مجھے اپنی صورت نہ دکھائے!"

وہ گھوڑے پر گئی، شام کو لوٹی: "کوزرو بہت بیمار ہے تانا بیگ، وہ ہسپتال میں ہے مگر اس نے کہا ہے کہ دو دن بعد وہ ضرور آئے گا چاہے مرا ہوا ہی آئے۔"

"مر بھی جائے کمبخت" تانا بیگ نے دوسری طرف منہ کر لیا!

پھر ایک دن ابراہیم آ پہونچا ـــــ ایک پورا آنا لئے! اور بڑی ڈھٹائی سے بولا: "اب میں آپ کے لئے محل تو نہیں کھڑا کروا سکتا ہوں تانا بیگ، فارم کے پاس بس یہی باڑے ہیں، سب ان ہی سے کام چلا رہے ہیں۔"

تانا بیگ کے ہاتھ میں کھجلی ہونے لگی۔ زنانے کا ایک تھپڑ اس آدمی کے منہ پر مارا جائے اور کہا جائے ذرا تم اس باڑے سے کام چلا کے دیکھو تو پتہ چلے مگر وہ ہنکارہ دینے لگا: "تانا بیگ آپ کا جی چاہے تو مجھے ٹکڑے ٹکڑے کر دیجئے پر کیا کروں کہ کوئی ادھر آنے پر راضی نہیں ہوتا، آپ کے سپرد تو ایک گلہ ہے میرے سپرد تو تمام

ریوڑوں کا انتظام ہے۔"

تانا بیگ خون کے گھونٹ پی کے چپ ہو رہا!

ابھی تک تو کوئی سو بھیڑوں نے اس کے ریوڑ میں بچے دئے تھے، مگر رتیتم اور بجنتائی کا گلہ بھی تھا ——— وہاں ابھی بھیڑوں نے بچے دینے نہیں شروع کئے تھے لیکن بس ایک ہی ہفتے کی بات اور تھی ——— پھر کیا ہوگا؟ کل جمع چھ آدمی، ایک سات آٹھ سال کی بچی اور اتنی ساری بھیڑیں!

تانا بیگ کا دل بیٹھ گیا تھا، ایک عجیب سی بے نیازی جو بے ہوشی کی سی تھی اس پر رفتہ رفتہ چھائی جا رہی تھی راتوں کی نیند اُڑ گئی تھی، دن میں خیر بیٹھنے کا بھی سوال نہ تھا ——— اور ایسی ہی ایک رات کو جب وہ باڑے سے آکر دو چار منٹ کو بیٹھا، کچھ کھانے ہی لگا تھا کہ باڑے کی طرف سے ایک چیخ سنائی دی ——— وہ کھانا چھوڑ کر بھاگا جیدار ایک شہتیر کے نیچے دبی پڑی تھی۔

"تانا بیگ، تانا بیگ، بچاؤ۔"

تانا بیگ نے اپنا ایک کندھا شہتیر کے نیچے اڑاکر زور سے ایک آہ بھری، جیدار اس کے نیچے سے رینگ کر نکلی "تانا بیگ یہ، یہ ادھر مو کھا سا کھلا تھا، میں نے سوچا یہ پتھر اس میں اڑا دوں ورنہ تیز ہوا اندر آئے گی، بس دیوار سے جو ہاتھ لگا تو ایک دو پتھر نکل گئے اور یہ شہتیر...... آہ...... اُٹھاؤ مجھے۔"

تانا بیگ نے کوٹ اُتارا اس پر جیدار کو لٹایا، سب نے مل کر پکڑا، اندر لے گئے ——— تانا بیگ کو کیا خبر تھی کہ اس کی قسمت نے اس کا کتنا ساتھ دیا، کتنی بڑی بدبختی ٹل گئی تھی، ورنہ جیدار کے مرنے میں کیا کسر رہ گئی تھی۔

جیدار کو اندر لٹا کر تانا بیگ باہر نکلا تو اسے تھوڑی دور پر ایک ریوڑ دکھائی دیا، کوئی گڈریا بھی تھا، جو انھیں ہانک رہا تھا، جب ریوڑ قریب آیا تو تانا بیگ نے دیکھا کہ وہ بجنتائی تھا۔

"ارے بجنتائی، تم، ادھر کیسے آ گئے؟"

بجنتائی کچھ نہیں بولا، بس بھیڑوں کو ڈنڈے مار مار کے ہنکاتا رہا، تانا بیگ کو غصہ آنے لگا ——— گیا بھن بھیڑوں کو ڈنڈا مارنے کے کیا معنی۔"

"لیجئے گنئے چاہے نہ گنئے ——— تین سو بچاسی بھیڑیں ہیں۔"

"کیا مطلب"؟

"میں جا رہا ہوں، میں ان سے بھر پایا۔"

"کیا بکتے ہو، دو چار دن میں تمہاری بھیڑیں بچے دینے والی ہیں۔"

"تو دیں، میں اب یہاں نہیں رہ سکتا، میں آپ کا ماتحت تھا، آپ کے حوالے کر کے جاتا ہوں!!"

"ارے بختائی، سنو تو، میں تمہیں سمجھاتا ہوں۔"

"سمجھائیے گا احمقوں کو، یا اپنے ایسے بے وقوفوں کو، میں کیوں یہاں مروں۔"...

"بختائی تم پر مقدمہ چل جائے گا، میری بات سنو...........۔"

"چاہے مقدمہ چلے، اس سے تو اچھا ہی ہوگا، آپ ایسے احمق ہی یوں فارموں کے لیے جان دے سکتے ہیں، میں تو نہیں دوں گا، میں جارہا ہوں۔"

تانا بیگ چکرا گیا اور ـــــ اور چکر سے جب اسے ہوش آیا تو اسے بختائی دور جاتا دکھائی دیا ـــــ بھیڑیں وہیں کھڑی تھیں ـــــ تین سو پیاسی بھیڑیں اور ....!

پھر فارم کے دفتر سے لڑکا گھوڑے پر سوار آ پہونچا ـــــ وہ حساب کتاب کرنے والا کلرک تھا تانا بیگ کا جی چاہا اس کی گردن مروڑ دے مگر اس کا کیا قصور تھا ـــــ وہ بے چارہ تو حساب لکھنے کے لئے بھیجا گیا تھا ـــــ تو حساب ان مضبوط نوجوانوں کے سپرد تھا اور بھیڑوں کی حفاظت کے لیے مضبوط نوجوان مر گئے تھے!

"اب تک آپ کہاں تھے" تانا بیگ غرّایا۔

"کہاں تھا کیا مطلب؟" تمام ریوڑوں کا حساب کرتا ہوں، اکیلا ہوں، مجھ سے تو اتنا حساب سپٹر تا بھی نہیں سبھی ریوڑ تو ہیں۔"

"اور ریوڑوں کا کیا حال ہے؟"

"ایسا ہی ہے، کچھ بہتر نہیں ہے۔"

"گڈریئے کیا کہتے ہیں؟"

"کہیں گے کیا؟ سب رو رہے ہیں، کئی ایک نے تو مجھ سے بات بھی نہیں کی، کئی ایک مجھے مارنے دوڑے بھلا بتایئے، میرا کیا قصور، میں تو حساب لکھتا ہوں، جی ہاں، میں تو کلرک ہوں دیکھئے۔"

"ہم لوگوں کو کچھ مدد ملے گی، کچھ اور لوگ بھیجے جائیں گے؟"

"جی ہاں سنا ہے کہ کورتو ٹھیک ہو گئے ہیں، جلدی ہی وہ کچھ کریں گے! یہ بھی سنا ہے کہ چارے کی گاڑیاں دفتر سے تو کو تورے بھجوائی تھیں، مگر وہ نہ جانے کہاں اٹکی ہوئی ہیں، سڑکوں کا حال تو آپ جانتے ہیں۔"

"ہاں! ہم لوگ تو بہت کچھ جانتے ہیں پر آپ لوگ کچھ نہیں جانتے" تانا بیگ نے جل کر دل میں کہا۔

گاؤں میں فارم کے دفتر کے پاس سے دو گھوڑ سوار نکلے اور پہاڑوں کی طرف روانہ ہو گئے۔ گھوڑوں

میں سے ایک گلسری تھا لیکن اس وقت اس پر اس کا مالک نہیں کوئی اور سوار تھا ـــــ ضلع کا وکیل سرکار ـــــ صغیر بیگ! اس کے ساتھ پارٹی کا پنچایتی فارموں کا افسر کورو تھا ـــــ جو بالکل خاموش اور چپ چاپ تھا ـــ پہاڑوں سے اطلاعات آئی تھیں کہ بھیڑوں کی حالت بالکل تباہ ہے، ہر چراگاہ سے یہی خبر آ رہی تھی کہ بھیڑیں مر رہی ہیں!

سامنے بڑے بڑے پہاڑ سرمئی دھند سے ڈھکے کھڑے تھے جیسے سورج نے انہیں بالکل بھلا دیا۔ روشنی نے انہیں فراموش کر دیا ہو، بہار تو آئی تھی پر یہ ایک بالکل غیر معمولی بہار تھی۔ سر پر بادل پاؤں تلے برف اور کیچڑ!

تانا بیگ اپنے یورتا میں بیٹھا، بختائی کی حرکت پر پیچ و تاب کھا رہا تھا ـــــ ان نوجوانوں کو دیکھو! خود غرض، کاہل الوجود نافرض شناس! اور وہ بھی تو کچھ نہیں کر سکا، اتنا پرانا کمیونسٹ اور اسے سمجھا نہیں سکا، کیا سمجھاتا، اس نے تو کچھ سنا ہی نہیں، اور یہ کلرک، آ گیا سب حساب لکھنے کتنی بھیڑیں مریں، کتنے بچے پیدا ہوئے، ان میں سے کتنے جیئے، کتنے مرے! ارے لوگو! یہ بھی تو کہیں لکھو کہ کیوں مرے؟ کیسے مرے؟ سردی ہو، بھوک ہو، حفاظت کرنے والے دو چار ہی ہوں، باڑے میں ٹھنڈی ہواؤں کے گھسنے کے لیے ڈھیروں چھید ہوں، چھت نہ ہو، دیواریں نہ ہوں ـــــ تو بھیڑیں جئیں گی کہ مریں گی؟ جو بچ گئیں وہ بھی رات و دن ایک کرکے بچائی گئیں، یہ کون کہاں لکھے!

اس کی بچی دوڑتی ہوئی آئی: "ابا، ابا، کچھ لوگ آ رہے ہیں"

تانا بیگ زور سے چیخا: "آنے دے، تو جا اپنی ماں کے پاس"

آ ئیں تو، دیکھیں تو ـــــ تانا بیگ اٹھا اور سر گھسیٹتا باڑے کے اندر چلا گیا ـــــ دو تین بچے اور مر چکے تھے، ایک بھیڑ نے ابھی دو بچے دئے تھے، تانا بیگ نے ایک گود میں ان دونوں کو اٹھایا، دوسری گود میں مرے ہوؤں کو اور باہر نکلا ـــــ مرے ہوؤں کو لاشوں کے ڈھیر پر پھینک کر وہ پھر اندر گھس گیا، ان دونوں بچوں کی ناک اور منھ میں اپنی سانس پھونکی اور انہیں ماں کے پاس رکھ دیا!

دونوں گھوڑے اب قریب آ گئے تھے اور زور زور سے ہانپ رہے تھے، کورو کے چہرے پر شرمندگی تھی، اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں اسی نے تو اپنے سب سے پرانے سب سے پیارے دوست کو اس آفت میں پھنسایا تھا لیکن گلسری پر سوار وکیل سرکار نے تو کسی سے نہ سلام دعا کی، نہ کچھ کہا، بس ایکدم ڈانٹ پھٹکار شروع کر دی ـــ شرمناک شرمناک، جہاں جاؤ یہی منظر! پھر تانا بیگ کی طرف مڑا اور مرے ہوئے میمنوں کے ڈھیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا: "اس کا کیا مطلب ہے کامریڈ؟ کمیونسٹ گڈریا اور بھیڑیں مر رہی ہیں؟ ایں؟"

"شاید ان بے چاروں کو یہ معلوم نہیں ہے کہ میں کمیونسٹ ہوں" تانا بیگ نے ترشی سے جواب دیا۔

صغیر بیگ کا چہرہ لال ہو گیا: "یہ کیا بات ہوئی؟ آپ نے تو سوشلسٹ عہد کیا تھا"

"جی سرکار، کیا تو تھا۔" تانا بیگ کے لہجے میں سخت طنز تھا، اسے اپنے منھ میں ریت کی سی کرکراہٹ اور نیم کی سی تلخی محسوس ہو رہی تھی۔

"اور وہ عہد کیا تھا"؟

"مجھے یاد نہیں کیا تھا"۔

"جب ہی تمہاری بھیڑیں مر رہی ہیں" صغیر بیگ نے چابک اٹھائی اور رکابوں میں کھڑا ہو گیا، اس گستاخ گڈریے کو سبق سکھانے کا یہی موقع تھا، لیکن اس نے پہلا حملہ کورتو پر کیا "آپ کیا سوچ رہے ہیں؟ لوگوں کو یہ بھی یاد نہیں کہ انھوں نے کیا عہد کیا تھا، یہ لوگ جانوروں کو مار رہے ہیں، بلالوں کو خاک میں ملا رہے ہیں، اور آپ ——— آپ کیا کر رہے ہیں؟ یہ آپ سوشلسٹ تعلیم دے رہے ہیں لوگوں کو؟ یہی ہیں آپ کے کمیونسٹ؟ میں کہتا ہوں یہ کس قسم کے کمیونسٹ ہیں؟

کورتو چپ چاپ نگاہوں کو مرغزار پر ڈالے ہوئے تھا، سر جھکائے وہ اسی طرح گھوڑے پر بیٹھا تھا مگر تانا بیگ سے ضبط نہ ہو سکا، کورتو کی طرف اشارہ کر کے اپنی طرف اشارہ کیا اور بولا "ہم لوگ اسی قسم کے کمیونسٹ ہیں، جیسا کہ یہ خود ہے"۔

"ہاں ہاں، تم سب ایک ہی قسم کے ہو، تم پنچایتی فارم کی جائداد تباہ کر رہے ہو، تم غارت گر ہو، تم عوام کے دشمن ہو، تمہاری جگہ حوالات ہے، پارٹی نہیں ——— سوشلسٹ مقابلے کا مذاق اڑاتے ہو!"۔

تانا بیگ کا پیمانۂ صبر بالکل لبریز ہو چکا تھا، محنت سے چور، بدبختی کا کچلا ہوا، غصے اور غم کو دباتے دباتے اس کا دل پھٹنے کے قریب تھا، پھر بھی تلخ مسکراہٹ کے ساتھ بولا "جی حضور، میری جگہ حوالات ہے، آپ ٹھیک فرماتے ہیں، مجھے حوالات ہی میں ہونا چاہیے تھا تو سوشلسٹ مقابلے کے لیے بہتر رہتا"۔ اس کے ہونٹ ضبط کرتے کرتے کانپنے لگے تھے: "کہیے، آپ کو کچھ اور کہنا ہے؟"

کورتو نے ایک ہاتھ آگے بڑھا کر اپنے دوست کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی: "تانا بیگ، اس طرح بات نہ کرو، جو کچھ بھی ہے رسانیت سے سمجھا دو ——— اب جو ہے وہ تو ہے ہی"۔

تانا بیگ چیخنے لگا: "اچھا تو یہ بات ہے، تو میں تمہارے آگے اپنی صفائی پیش کروں؟ تم آئے کیوں ہو؟ مجھے یہ جتانے کے لیے کہ میری بھیڑیں مر رہی ہیں ——— یہ تو میں خود ہی جانتا تھا۔ اتنے دن تک تم کہاں تھے؟ تم مجھے یہ دکھانے آئے ہو کہ میں کمر کمر تک مینگنیوں اور بھیڑوں کے پیشاب میں سنا ہوا ہوں؟ یہ تو میں خود ہی دیکھ رہا ہوں ——— یہ تو میں جانتا ہی ہوں کہ میں گدھا ہوں، احمق ہوں، میں بے وقوف ہوں جو اب تک پنچایتی فارم کے لیے اپنی جان دیتا رہا ——— میں نے اپنے وجود کے چیتھڑے چیتھڑے کر دیے اور الزامات کا ٹوکرا اپنے سر پر اوندھا لیا۔

—— یہ تو میں جانتا ہوں "

کوڑو ایکدم گھوڑے سے اتر پڑا، اس کے ہونٹ سفید ہو رہے تھے، ہاتھ کانپ رہے تھے،

"تانا بیگ، ہوش میں آؤ "

"خبردار جو مجھے ہاتھ لگایا، دور ہو میرے سامنے سے، میں اپنے عہد پر، اپنے وعدوں پر تھوکتا ہوں، تھوڑی ہے میری زندگی پر، نکل جاؤ یہاں سے —— میری جگہ حوالات میں ہے! یہ کون۔ ہے رئیس زادہ جسے تم اپنے ساتھ لے کر آئے ہو۔؟ یہ چمڑے کا شاندار کوٹ پہنے، بالوں کی ٹوپی لگائے، کہاں سے آیا ہے یہ جاگیردار؟ وکیل سرکار کا بچہ! مجھے گالیاں دلوانے لائے ہو اس اپنے یار کو؟ ٹھیک ہے، ڈال دو مجھے حوالات میں "——

اور جنونی عالم میں وہ ادھر ادھر بھاگنے لگا کہ کچھ مل جائے تو اٹھا کر ان دونوں پر دے مارے —— دیوار کے پاس ایک کانٹے دار پھاوڑا بانس میں لگا رکھا تھا، جس سے مینگنیاں سمیٹی جاتی تھیں، تانا بیگ نے وہ اٹھایا اور صغیر بیگ کی طرف لپکا، "دور ہو یہاں سے، حرامزادے، نکل یہاں سے "

صغیر بیگ ڈر کر پیچھے کو ہو گیا اور گلسری کو ادھر ادھر کرنے لگا، کانٹا گلسری کے سر پر لگا، اچھلا اور پھر گلسری کے سر پر گرا، تانا بیگ نے اپنے جنونی غصے میں یہ بھی نہیں دیکھا کہ گلسری کیوں بار بار اپنا سر جھٹک رہا تھا۔ اپنے کھولتے ہوئے سرخ منہ میں پڑے ہوئے دہانے کو کیوں چبائے جا رہا ہے، اس کی آنکھیں کیوں اس وحشت کے ساتھ باہر کو ابل رہی ہیں جیسے اب اپنے گڑھوں سے باہر اچھل پڑیں گی،—— تانا بیگ نے اس وقت یہ سب کچھ نہیں سمجھا، زور سے چیخ کر کہا "گلسری، تو ہٹ جا، تو بیچ میں سے ہٹ جا گلسری، میں اس جاگیردار کی، اس وکیل سرکار کی جان لے کے رہوں گا چمڑے کا کوٹ پہن کے آیا ہے "

دونوں عورتوں میں سے جو جوان تھی وہ دوڑی ہوئی آئی اور تانا بیگ کے اس ہاتھ میں لٹک گئی جس میں وہ بانس پکڑے تھا مگر تانا بیگ نے اس زور سے اسے دھکیلا کہ وہ زمین پر گر گئی۔

کوڑو لپک کر تانا بیگ اور صغیر بیگ کے بیچ میں کھڑا ہو گیا اور صغیر بیگ سے بولا "چلو، فوراً روانہ ہو جاؤ ورنہ یہ سچ مچ مار ڈالے گا" صغیر بیگ کسی نہ کسی طرح اچک کر گھوڑے پر چڑھا اور پھر کوڑو چڑھا، تانا بیگ نے لپک کر ایک بانس دیا، وہ گلسری کے کولھے پر لگا اور پھر دونوں روانہ ہو گئے، بھونکتے ہوئے کتے ان کا پیچھا کرنے لگے۔ اور اچھل اچھل کے رکابوں اور گھوڑوں کی دموں میں دانت مارنے لگے، تانا بیگ بھی لڑکھڑاتا ہوا ان کے پیچھے دوڑا، مٹی کا ایک بڑا سا ڈھیلا اٹھا کر اس نے زور سے پھینکا "ہاں میری جگہ حوالات میں ہے، حوالات میں ہے، نکل جاؤ یہاں سے دور ہو جاؤ، میری جگہ حوالات میں ہے، حوالات میں "

ڈھیلا زور سے جا کر گلسری کے کولھے پر لگا اور ٹوٹ کر مٹی چاروں طرف بکھر گئی —— دونوں گھوڑے

غائب ہو گئے۔

تانا بیگ بڑبڑاتا ہوا لوٹا: "میری جگہ حوالات میں ہے، حوالات میں ہے۔" اب کتے بھی لوٹ کر آ گئے تھے اور اس کے چاروں طرف ناچ رہے تھے جیسے اپنا فرض بڑی ہی خوش اسلوبی سے پورا کر کے آنے پر بیحد خوش ہوں۔

جیدار کمرے سے نکلی اور تانا بیگ کی طرف بڑھی۔ اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا، آنکھوں میں خوف اور وحشت تھی: "تانا بیگ یہ تم نے کیا کیا ـــــ یہ کیا کیا تم نے؟"

"ہاں غلط تو ضرور کیا۔"

"کیا غلط کیا؟ ـــــ ظاہر ہے بالکل غلط۔"

"ہاں میں نے گلسری کو بیکار مارا، میرا گلسری۔"

"کچھ پاگل ہو گئے ہو۔ گلسری کو ہی مارنے کا غم ہے؟ سمجھ بھی رہے ہو کہ کیا کر بیٹھے ہو؟"

تانا بیگ یورتا میں گھسا اور میز کے پاس اینٹوں پر بیٹھ گیا، جیدار پیچھے پیچھے آئی۔

"ارے مجھ غارت گر کو تو کہاں تک سمجھائے گی بھائی، رہنے دے، میں جانتا ہوں میں تباہ کار ہوں، بدبخت ہوں، میں عوام کا دشمن ہوں، میری جگہ حوالات میں ہے۔" اس نے مشکل سے ایک بار سانس کھینچی، دوبارہ کھینچی پھر رک گیا، اپنا سر تھاما اور زور سے میز پر دے مارا، اس کا سارا جسم جھکولے کھا رہا تھا، پاؤں آگے پیچھے ہو رہے تھے ـــــ وہ پھوٹ پھوٹ کر زور زور سے رو رہا تھا! شوہر کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر جیدار بھی چپکے چپکے رونے لگی: "مت روؤ تانا بیگ، مت روؤ میری جان۔"

مگر تانا بیگ کا جسم ادھر ادھر ڈولتے ہوئے ہچکیوں سے ہل رہا تھا، وہ برابر روئے جا رہا تھا... آج زندگی میں پہلی بار جیدار نے تانا بیگ کو روتے دیکھا!

(۱۷)

اس واقعے کے تیسرے دن ضلع پارٹی کی میٹنگ ہوئی ـــــ!

تانا بیگ ایکا سوف باہر کے کمرے میں بٹھایا گیا تھا، جب اس کی ضرورت ہوگی بلا لیا جائے گا۔

ان چند دنوں میں اس نے بہت کچھ سوچا مگر یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ اس نے ٹھیک کیا تھا یا غلط ـــــ ویسے وہ ہر سزا بھگتنے کے لیے تیار ہو کر آیا تھا مگر سوچ رہا تھا کہ آج وہ دل کی بھڑاس بھی خوب نکالے گا، سب کچھ کہے گا خوب کہے گا ـــــ وہ سخت سردی، وہ موسم کی تبدیلی، وہ بہار کا ظلم، وہ ٹوٹا ہوا باڑہ، وہ پھٹا ہوا یورتا جس میں اس نے اور اس کے بیوی بچوں نے نہ جانے کتنے دن گیلے کپڑوں میں بسر کئے تھے، گدڑیوں کی کمی، بھنائی کی

غداری ــــ سب کچھ ــــ شاید کوئی سمجھ جائے ــــ آخر ایسا ہی ہوتا رہا تو کام کیسے چلے گا؟ سب کچھ کہا ہوگا۔ صرف زبانی سوشلسٹ عہد بھلا کیا معنی رکھتے ہیں۔ ابراہیم بھی دوسرے کمرے میں بیٹھا تھا، شاید اس سے بھی جواب طلب ہوگا، یا شاید وہ بھی گدھ کی طرح اس کی ہی بوٹیاں نوچنے آیا تھا ــــ

آخر یہ لوگ اتنی دیر سے کیا بحث کر رہے ہیں؟ جو کچھ کرنا ہے کسی طرح کر کے ختم بھی کریں، ایسا لگتا تھا، ساری پارٹی ہی اس کمرے میں جمع ہوگئی ہے ــــ آخری آدمی جو ابھی چند منٹ پہلے آیا تھا وہ کورو تھا ــــ اس کے جوتوں میں کچھ سنہری بال لگے ہوئے تھے، گلسری کے بال ــــ ضرور وہ بہت تیز آیا ہوگا، بار بار اس نے ایڑ لگائی ہوگی ــــ کیا گلسری باہر کھڑا ہے؟ اس کا جی چاہا اٹھ کر باہر جائے اور گلسری کو دیکھے ــــ مگر اس سے اٹھا نہیں گیا۔

کورو نے اندر جاتے ہوئے ایک نظر تانابیگ پر ڈالی تھی، ذرا سا جھجھکا تھا، جیسے رک کر کچھ کہنا چاہتا ہو مگر تانابیگ نے سر بھی نہیں اٹھایا تھا ــــ پھر کورو ایکدم اندر چلا گیا۔

پھر تھوڑی دیر بعد سکریٹری نے کھڑکی سے جھانک کر کہا: "کامریڈ تانابیگ بکاسوف، مہربانی کر کے اندر آیئے۔"

تانابیگ کا دل اتنے زور زور سے دھڑک رہا تھا، جیسے اس کے کانوں میں گولے چھوٹ رہے ہوں؛ وہ اٹھ کر آہستہ آہستہ اندر والے دفتر کی طرف چلا، آنکھوں کے سامنے ایسی دھندسی چھائی تھی کہ کسی کی صورت نظر نہ آتی تھی۔ لڑکھڑاتا ہوا وہ کمرے میں داخل ہوا۔

کاشکاتائیف ضلع کمیٹی کا پہلا سکریٹری تھا، اس نے لمبی سی میز کے آخیر میں رکھی ہوئی ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا: "بیٹھیے۔"

تانابیگ بھد سے بیٹھ گیا، دونوں ہاتھ گھٹنوں پہ رکھ لئے اور انتظار کرنے لگا کب یہ دھند آنکھوں کے آگے سے ہٹے اور وہ ٹھیک سے دیکھ سکے، پھر یکایک اس نے دیکھا کہ سکریٹری کے داہنے ہاتھ پر صغیر بیگ بیٹھا ہے، اور اس آدمی کے لیے تانابیگ کے دل میں سے نفرت کا ایک فوارہ چھوٹا اور اس نفرت نے اس کی آنکھوں کے آگے چھائی ہوئی دھند کو بالکل صاف کر دیا۔ سب چہرے دکھائی دینے لگے ــــ سب سے سیاہ چہرہ صغیر بیگ کا تھا اور سب سے زرد کورو کا تھا، وہ بار بار اپنے دبلے پتلے ہاتھوں کو میز پر چڑھی ہوئی بانات پر پھیلاتا جیسے ان کی کپکپاہٹ کو روکنے کی کوشش کر رہا ہو، پنچایتی فارم کا صدر، الدانوف بار بار کچھ اس طرح خرخراتا جیسے اب ہونے والی بحث کے متعلق اپنا رویہ طے کر چکا ہو، اور لوگوں کا کچھ اندازہ نہیں ہو سکتا تھا ــــ پتہ نہیں وہ کیا کہیں گے ــــ!

پھر سکریٹری نے نگاہیں اٹھائیں، کچھ کاغذ سامنے ادھر ادھر کئے اور بولا

"اب ہم کمیونسٹ لکا سوف کے کیس کو لیتے ہیں۔"

کسی نے بڑی کینہ پروری کے ساتھ دبی زبان کہا "کمیونسٹ! آپ اُسے کمیونسٹ کہہ سکتے ہیں۔"

تانا بیگ کو کیا معلوم تھا کہ اس سلسلہ میں اندر بھی ایک جھگڑا اور ایک مقابلہ تھا، صغیر بیگ سکریٹری ہونا چاہتا تھا اور کاشکا تائیف، کسی نہ کسی طرح اس معاملے کو ٹالے رکھنا چاہتا تھا، اس سلسلہ میں وہ صغیر بیگ کو کسی نہ کسی طرح خاموش بھی کرنا چاہتا تھا۔

پھر ضلع کمیٹی کے سکریٹری نے صغیر بیگ کی رپورٹ پڑھ کر سنائی جس میں نہایت تفصیل کے ساتھ ان جرائم کا ذکر تھا جو تانا بیگ لکا سوف نے زبانی و عملی طور پر کئے تھے ــــ تانا بیگ جو "سنگ سفید پنچائتی فارم" کا گلہ بان تھا!

اس رپورٹ میں بات تو ایسی کوئی بھی نہیں تھی جس سے تانا بیگ انکار کر سکتا، مگر رپورٹ کا انداز اور اس کا لہجہ ایسا تھا کہ تانا بیگ کو اپنا خاتمہ صاف نظر آرہا تھا ــــ یہ کاغذ ایک ایسا وار تھا جس سے کوئی بچاؤ نہ تھا!

جب رپورٹ ختم ہوگئی تو کاشکا تائیف نے پوچھا "کامریڈ لکا سوف کیا آپ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ بیورو کے ممبر کامریڈ صغیر بیگ نے اس رپورٹ میں جو واقعات بیان کئے ہیں، وہ سچ ہیں؟"

تانا بیگ نے سر اٹھا کر ایک بار چاروں طرف نظر ڈالی اور پھر سر جھکا کر کہا "جی ہاں ــــ" اس کی آواز بالکل بے جان تھی!

کوئی اور کچھ نہیں بولا، ایسا لگتا تھا کہ سب ہی اس کاغذ سے سہم گئے تھے!

صغیر بیگ نے کہنا شروع کیا "ساتھیو، میں اس معاملہ کے متعلق ایک بات اور بھی کہنا چاہتا ہوں اور صاف کہنا چاہتا ہوں ــــ تانا بیگ! اس ہمارے نئے نظام سے نفرت کرتا ہے، سوشلسٹ مقابلہ سے نفرت کرتا ہے، ہم سب سے نفرت کرتا ہے اور ہم پر تھوکتا ہے۔ اس نے پنچائتی فارم کے افسر، کورد سیاکوف کی موجودگی میں یہ الفاظ کہے، اور اس کے علاوہ اس نے ایک ایسے شخص پر حملہ کیا جو بیورو کا ممبر تھا اور اپنی ڈیوٹی پوری کرنے وہاں گیا تھا ــــ اس لیے میں آپ سے اجازت چاہتا ہوں کہ کامریڈ لکا سوف پر مقدمہ چلایا جائے۔ اس کمرے سے باہر نکلتے ہی اس کو گرفتار کیا جائے ــ اور جہاں تک لکا سوف کے پارٹی کے اندر رہنے کا سوال ہے میرے خیال میں تو ایسی بات اب سوچی بھی نہیں جا سکتی۔"

صغیر بیگ جانتا تھا کہ اس کا یہ مطالبہ نہیں مانا جائے گا، لیکن اس نے یوں حساب بٹھایا تھا کہ اگر بیورو نے تانا بیگ کی گرفتاری کا حکم نہ بھی دیا تو بھی کم از کم وہ پارٹی سے تو باہر کر ہی دیا جائے گا۔

کاشکا تائیف بڑا پریشان نظر آرہا تھا، بیداری کے ساتھ بولا "کامریڈ لکا سوف ــــ آپ کو اپنی حرکتوں کے متعلق کچھ کہنا ہے؟"

"کچھ نہیں، سب کچھ تو کہہ دیا گیا ہے، ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ میں غارت گر ہوں، عوام کا دشمن ہوں، پھر آپ مجھ سے

کیوں پوچھتے ہیں کہ میں کیا سوچتا ہوں، خود ہی سوچئے، خود ہی فیصلہ کیجئے، آپ ہی بہتر جانتے ہیں "
"لیکن کیا آپ اپنے آپ کو ایک ایماندار کمیونسٹ سمجھتے ہیں؟"
"اب یہ کہاں ثابت کیا جا سکتا ہے "
"کیا آپ اپنا جرم تسلیم کرتے ہیں؟"
"نہیں "
"کیا؟ یعنی کہ آپ اپنے آپ کو سب سے زیادہ عقلمند سمجھتے ہیں؟"
"جی نہیں، اس کے برخلاف میں یہ سمجھتا ہوں کہ مجھ سے بڑا بے وقوف کوئی نہ ہوگا "

ایک کم عمر لڑکا ایک طرف سے اٹھ کھڑا ہوا "جناب! مجھے کچھ کہنے کی اجازت دی جائے " اس کے کوٹ میں سینے پر کوسومول (نوجوان کمیونسٹ لیگ) کا نشان لگا ہوا تھا اور وہ وہاں سب سے کم عمر تھا ——— دُبلا پتلا چہرہ صورت پر لڑکپن کا جوش بھی معصومیت بھی! تاتا بیگ نے اب اس کو دیکھا ——— ہاں ٹھیک ہے! میاں لڑکے، تم بھی مجھے مارلو۔ دو چار چابک! میں نے بھی تمہاری عمر میں یہی کیا تھا، میں نے بھی کسی پر ترس نہیں کھایا تھا، ارے میں نے تو پارٹی کے لیے اپنے بھائی کے خلاف گواہی دی تھی !

کاشکاتائیف نے سر ہلایا " ہاں کہئے، کریم بیگ "

کریم بیگ بولا " میں کامریڈ بکاسوف کی طرف داری نہیں کرنا چاہتا، جو کچھ انھوں نے کیا، ٹھیک نہیں کیا، پارٹی ضرور ان کو سرزنش کرے لیکن کامریڈ صغیر بیگ سے بھی مجھے اتفاق نہیں ہے، میری رائے ہے کہ کامریڈ صغیر بیگ کے متعلق بھی بحث ہونی چاہئے " وہ اپنی آواز کے غصّے اور کپکپاہٹ کو بار بار دبانے کی کوشش کر رہا تھا۔

ایک طرف سے آواز آئی " واہ وا ——— کیا بات ہے، تو آپ کے یہاں کوسومول میں یوں کام ہوتا ہے؟"

"ہر جگہ یوں ہی کام ہوتا ہے " کریم بیگ نے جھپٹ کر جواب دیا " آپ کو کیا حق ہے کہ آپ ایک پنچایتی فارم کے ممبر، ایک گلّہ بان، ایک پرانے کمیونسٹ کو عوام کا دشمن کہیں ——— ذرا مجھ کو عوام کا دشمن کہہ کے دیکھئے! آپ نے تو یہ کہہ دیا کہ فارم پر بھیڑوں کی حالت دیکھ کر آپ پریشان ہو گئے، مگر وہ گلّہ بان خود کتنا پریشان تھا یہ آپ نے جاننے کی کوشش کی تھی؟ ——— جب آپ وہاں پہونچے تو کیا آپ نے یہ پوچھا تھا کہ وہ کس طرح جی رہا ہے؟ اس پر کیا بیت رہی ہے؟ کیوں بھیڑیں مر رہی ہیں، کیوں اُن کے بچے مر رہے ہیں؟ ——— نہیں نہ ——— خود آپ کی رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے چھوٹتے ہی اس پر گالیوں کی بوچھار شروع کر دی، اس کو پھٹکارنے لگے ——— یہ کوئی چھپی بات نہیں ہے کہ فارموں میں بھیڑوں کا کیا حال ہے، کس مشکل کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے، میں بھی اکثر فارموں کا معائنہ کرنے جاتا ہوں اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اپنے کوسومول کے ساتھیوں سے کیا کہوں؟ ہمیں تو اس بات پہ ڈوب مرنا

چاہیے کہ ہم ان سے مطالبے تو اتنے کرتے ہیں، مردان کو کچھ بھی نہیں دیتے، ذرا باڑوں کی حالت دیکھیے، چارے کی مقدار دیکھیے ـــــ میں بھی ایک گڈریے کا بیٹا ہوں، مجھے معلوم ہے کہ جب بھیڑیں مرنے لگتی ہیں تو گڈریے کے دل پر کیا گزرتی ہے، وہ اپنی اولاد کی طرح ان کا ماتم کرتا ہے ـــــ ہم لوگوں کو کالجوں میں کچھ سکھایا جاتا ہے مگر فارموں پر ابھی تک وہی حالت ہے، وہی پرانے حالات، وہی ماحول، وہی سامان ـــــ یہ سب دیکھ کر اتنی شرم آتی ہے اتنا دکھ ہوتا ہے!"

صغیر بیگ بیچ میں بولا: "کامریڈ کریم بگوف، یہاں احساسات اور جذبات کا کام نہیں ہے، واقعات سامنے رکھیے، ہمارے رحم وکرم کے جذبے کو بیدار کرنے کی کوشش نہ کیجیے۔"

کریم بیگ غصے سے کانپنے لگا: "رحم وکرم اور انصاف کے الفاظ آپ کے منھ میں زیب نہیں دیتے، صغیر بیگ..... معاف کیجیے گا یہ کسی مجرم کا مقدمہ آپ نہیں فیصل کرنے بیٹھے ہیں، یہ پارٹی کے ایک پرانے ساتھی کے متعلق ایک رفیقانہ بحث ہے، ایک کمیونسٹ، ایک دوست کی تقدیر کا فیصلہ ہو رہا ہے یہاں، اس لیے ہمیں یہ سوچنا ہے کہ کامریڈ بکاسوف نے ایسا کیوں کیا؟ جو کچھ انھوں نے کیا ہے، اس کی بے شک مذمت کیجیے، مگر یہ بھی تو معلوم کیجیے کہ ایسا ہوا کیوں ـــــ ہمارے علاقے کے بہترین گڈریئے تانابیگ بکاسوف کی یہ نوبت کیسے پہونچی؟"

کاشکاتائیف بگڑ کے بولا: "بیٹھ جائیے، کامریڈ کریم بگوف، آپ ہم لوگوں کو اصل بات سے دور ہٹا لے جانا چاہتے ہیں ـ ہم کسی شخص کو یہ اجازت نہیں دے سکتے کہ وہ ہمارے افسروں پر سرکاری کارکنوں پر پھاوڑا لے کر دوڑے آپ یہاں جذبات اور احساسات کی بات کرنے کے بجائے کو مسوموں کے معاملات کو بہتر بنائیے ـــــ کیوں کامریڈ کورو سیاکوف، آپ بھی تو موقعہ واردات پر موجود تھے ـــــ آپ ان باتوں کی تصدیق کرتے ہیں؟"

کورو کا چہرہ پیلا ہو رہا تھا، ماتھے پر پسینے کی بوندیں تھیں، وہ میز کا کنارہ پکڑ کر مشکل سے کھڑا ہوا، اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے، بار بار دہنا ہاتھ دل پر جاتا تھا، کپکپاتی آواز میں بولا: "جی ہاں میں وہاں موجود تھا اور اس واقعہ کی تو میں تصدیق کرتا ہوں مگر میں کچھ اور بھی کہنا چاہتا ہوں۔"

"اب آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

"پہلی بات تو یہ ہے کہ کامریڈ بکاسوف کا کیس پہلے ہماری پارٹی کی یونٹ میں آنا چاہیے ـــــ وہاں پہلے بحث ہونا چاہیے۔"

"ایسا بالکل ضروری نہیں ہے۔" صغیر بیگ بولا: "آپ اپنی پارٹی کی یونٹ کو ضلع کمیٹی کے فیصلے کی اطلاع دے سکتے ہیں۔"

"مگر میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ..." کورو ہانپ رہا تھا ـ

کاشکا تائیف بیزاری سے بولا میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اب زیادہ کہنے کا کیا مطلب ہے؟ لیکاسوف کی پارٹی دشمن حرکات صاف ظاہر ہیں، یہی نہیں، آپ پر بھی ذمہ داری آتی ہے کہ آپ نے اپنی یونٹ کے کمیونسٹوں کو کیا یہی تعلیم تربیت دی ہے ــــ اوپر سے آپ نے کامریڈ صغیر سے الگ کر کے کہا کہ اس معاملے کو ضلع کمیٹی میں نہ لے جایا جائے ــــ ایں؟ شرم کی بات ہے، بیٹھ جایئے "

پھر سب ایک ساتھ بولنے لگے، بحث ہونے لگی،

ٹریکٹروں کا ڈائرکٹر اور ضلع کے روزانہ اخبار کا ایڈیٹر یہ دونوں کریم بیگوف کا ساتھ دے رہے تھے اور ایک موقعہ تو ایسا آیا کہ لگتا تھا وہ کامیاب ہو جائیں گے اور تانا بیگ کو بچا لے جائیں گے ــــ لیکن تانا بیگ خود بالکل ٹوٹ چکا تھا، اسے سنائی ہی نہیں دے رہا تھا کہ کیا بات ہو رہی ہے ــــ سر جھکائے وہ کسی اور ہی دنیا میں تھا ساری زندگی انقلاب کے لیے لڑے، تمام عمر پنچایتی فارم کو دے دی، کیا پایا؟ مجھ سے بڑا کوئی احمق نہ ہوگا ــــ میں خطرناک ہوں، میں عوام کا دشمن ہوں، ٹھیک ہے میری جگہ حوالات ہے، درست، بہت درست! میرا جو حال کرو سو ٹھیک ہے، مگر جو کچھ کرنا ہے وہ کر بھی چکو کسی طرح ــــ اور پھر جہنم میں جاؤ تم سب، نکالنا ہے مجھے پارٹی سے تو نکال بھی دو کسی طرح!

سپیر فارم کے چیرمین الرانوف نے کچھ کہا، تانا بیگ کے پہلے تو سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا بات ہو رہی ہے۔ پھر وہ چونک پڑا ــــ گلسری ــــ گلسری کا ذکر ہو رہا تھا" ساتھیو، اس شخص نے کھلم کھلا کہا تھا کہ میرا سر توڑ دے گا بس اتنی سی بات پر کہ ہم نے ایک شریر گھوڑے گلسری کو آختہ کر دیا تھا اور ایک بار جب اس گھوڑے کے پیروں میں زنجیریں پہنائی گئیں اور وہ گھوڑا لڑکھڑاتا، زنجیریں لیے اس کے گھر پہونچا تو بجائے اس کے یہ اس گھوڑے کو واپس کرتا، سرکاری فارم پہونچاتا، اس نے اس کو آزاد کر دیا، اس کی زنجیریں کاٹ دیں ــــ اور جو لوگ اسے لینے گئے ان کو گالیاں دیں باہر کچھ لوگ موجود ہیں جو اس بات کی گواہی دے سکتے ہیں کہ اس نے میرا سر توڑنے کی دھمکی دی تھی اُن کو یہاں بلاؤں؟"

"نہیں، اس کی ضرورت نہیں ہے، یہاں یوں ہی کافی ہلڑ ہو رہا ہے، ــــ آپ تشریف رکھئے"

صدر بیٹھ گیا،

پھر وہ ٹنگ بولا" صرف ایک ہی تجویز ہے ــــ کہ کامریڈ لیکاسوف کو پارٹی سے نکال دیا جائے ــــ کون اس کی موافقت میں ہے؟"

کریم بیگ پھر اچھل کر اپنی جگہ کھڑا ہو گیا" ٹھہریئے کامریڈ کاشکا تائیف ایک تجویز اور بھی ہے کہ کامریڈ لیکاسوف کو سختی کے ساتھ خبردار کر دیا جائے اور ساتھ ہی بیورو کے ممبر صغیر بیگ کو فہمائش کی جائے کہ انھوں نے پارٹی کو ذلیل کیا اور

کامریڈ بکاسوف کے انسانی وقار کو ٹھیس پہونچائی اور یہ کہ ضلع کمیٹی کے نمائندے کی حیثیت سے ان کا کام کرنے کا طریقہ نہایت قابل اعتراض ہے "

" واہ، یہ دوغلا پن" صغیر بیگ چیخا،

" ساتھیو خاموش رہو، یہ پارٹی میٹنگ ہے، تمھارے گھر کی پنچایت نہیں ہے، اچھا، اب آپ لوگ ووٹ دیجئے ——— بکاسوف کے نکالے جانے سے کس کو اتفاق ہے؟ "

بیورو کے سات ممبر تھے، تین نے موافق اور تین نے مخالف ووٹ دیا، کاشکا تائیف نے اپنا ووٹ مخالف دے کر تانا بیگ کی قسمت پر مہر لگا دی۔

لوگ کرسیاں کھسکانے لگے، میٹنگ ختم ہو گئی، تانا بیگ بھی اٹھا، اور چپ چاپ دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ کاشکا تائیف نے اسے آواز دی: " بکاسوف، کہاں چلے، پہلے پارٹی کارڈ نکال کر یہاں چھوڑ جاؤ "

" چھوڑ دوں؟ ——— تانا بیگ نے حیران ہو کر پوچھا ——— اب جا کے اس پر یہ حقیقت کھلی کہ کیا ہو چکا تھا۔

" ہاں ہاں، اپنا پارٹی کارڈ نکال کر یہاں میز پر رکھو، اب تم پارٹی کے ممبر نہیں ہو، اور تمھیں اس کارڈ کو رکھنے کا کوئی حق نہیں ہے "

تانا بیگ اپنا پارٹی کارڈ نکالنے لگا، اس کے نکالنے میں کافی دیر لگی اور اتنی دیر ایک گھٹی سی خاموشی سب پر طاری رہی، کارڈ اس کے کوٹ کے نیچے پہنی ہوئی قمیض کی اندرونی جیب میں تھا ——— ایک چمڑے کی تھیلی میں جسے جیدار نے اپنے ہاتھ سے سیا تھا، تانا بیگ اسے بائیں طرف کی جیب میں دل کے پاس رکھتا تھا۔

آخر بڑی الٹ پلٹ کے بعد کارڈ نکلا ——— کارڈ جو تانا بیگ کے خون کی روانی اور اسکے دل کی دھڑکن سے گرم ہو رہا تھا اور اس میں تانا بیگ کے وجود کی مہک بسی ہوئی تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر وہ کارڈ کاشکا تائیف کے سامنے رکھی ہوئی، چمکتی ہوئی پالش والی ٹھنڈی میز پر رکھ دیا، پھر اس خالی چمڑے کی تھیلی کو کسی نہ کسی طرح اندر کی جیب میں ٹھونسا اور پھر باہر جانے کے لیے مڑا!

کریم بیگ ایک بار پھر تڑپ کر اٹھا اور زور سے بولا: " کامریڈ بکاسوف، کیا آپ کو کچھ نہیں کہنا ہے، آپ تو بالکل چپ رہے، آپ کیوں نہیں کچھ کہتے کیا آپ سے کہا نہیں جا رہا ہے ——— کامریڈ بکاسوف یوں نہ جائیے، کچھ کہئے، ایک نہ ایک دن آپ ضرور پھر لوٹ کر آئیں گے، ضرور آئیں گے، اتنا تو کہئے کہ اس وقت آپ کیا سوچ رہے ہیں "

آہ ——— کون تھا یہ نوجوان لڑکا جو ابھی تک اسکے زخم پر مرہم رکھنے کی کوشش کئے جا رہا تھا۔ تانا بیگ نے بس ایک بار اسے نظر بھر کے دیکھا اور باہر نکل گیا۔ باہر سے وہ پھر لوٹا اور دروازے کے پاس کھڑے ہو کے کہنے لگا: " یہاں کیا بات ہو سکتی ہے، مجھے بس اتنا ہی کہنا ہے کہ میں نے بے شک ایسی باتیں کہیں جو مجھے نہیں کہنا چاہئے تھا، میں نے ہاتھ بھی اٹھایا لیکن میں اپنے کو مجرم نہیں سمجھتا، آپ کو کیسے سمجھاؤں، بس یہی ہے اور کچھ نہیں "

کاشکا تائیف غصے سے بولا "اچھا تو آپ اپنے دل میں پارٹی کی طرف سے کینہ رکھ رہے ہیں کہ آپ کے ساتھ زیادتی ہوئی، اس کے تو یہی معنی ہیں کہ واقعی آپ پارٹی ممبر ہونے کے لائق نہیں ہیں، پھر آپ کیسے یہ اُمید کر سکتے ہیں کہ آپ پھر کبھی لوٹ کر آئیں گے "

"میں آپ لوگوں سے کوئی امید نہیں کرتا" تانابیگ نے بڑے سکون سے اور ادب سے کہا ——— اور باہر نکل گیا، بہتر ہو کہ اب فوراً ہی بھاگ چلو تانابیگ کبھی اور آفت نازل ہو جائے!

باہر جنگلے کے ساتھ، اس کے اپنے گھوڑے کے پاس، گلسری بندھا ہوا تھا کیونکہ اب وہ کورزو کی سواری میں رہتا تھا، لمبا چوڑا مضبوط گلسری جس پر کورزو آیا تھا۔ گلسری نے اپنے پرانے اپنے محبوب مالک کو دیکھتے کے ساتھ ہی پاؤں بدلنے شروع کئے اور اس کی آنکھیں باہر کو اُبل آئیں، گول گول گھومنے لگیں، وہ بھول چکا تھا کہ تانابیگ نے کتنی زور سے اس کے مُنھ پر کاٹا مارا تھا ——— وہ بھول چکا تھا کیونکہ وہ گھوڑا تھا، انسان نہیں تھا۔

تانابیگ نے اپنے دونوں ہاتھ اس کی گردن میں حائل کر دیئے "گلسری، تو مجھے معاف کر دے، مجھے معاف کر دے گلسری، میں نے تجھے بڑی زور سے مارا تھا، پر تو بیچ میں آ گیا تھا نہ اسی لیے تو تجھے لگ گئی، میں نے تجھے جان کے تھوڑا ہی مارا تھا" پھر وہ چپکے سے بولا "گلسری، میں بڑی مصیبت میں ہوں، میں بہت پریشان ہوں" اور اس کا دل چاہا کہ پھوٹ پھوٹ کر رو دے مگر ضبط کر گیا۔

لیک کر وہ اپنے گھوڑے پر سوار ہوا اور اس کی باگیں پہاڑوں کی طرف موڑ دیں! آج کورزو نے بھی اسے دغا دے دی تھی، آخر یہ کیا بات تھی کہ کاشکا تائیف نے ذرا اپنی آواز اونچی کی اور کورزو دبک گیا، وہ تو بڑھا لکھا تھا، اعلیٰ منصبوں پر رہ چکا تھا، اسے یہ معلوم نہیں ہو سکتا تھا کہ حالات وہ نہیں تھے جو کاشکا تائیف اور صغیر بیگ جیسے لوگ ظاہر کر رہے تھے، ویسے بات ان کی اوپر اوپر سے ٹھیک لگتی تھی، تھی تو جھوٹ ہی ——— اور کورزو تو یہ جانتا ہی تھا!

پھر تانابیگ نے گلسری کی ٹاپوں کی آواز پہچان لی، مگر مڑ کر پیچھے نہیں دیکھا، کورزو اس کے برابر میں آتے ہوئے بولا "میں نے سوچا تھا کہ ساتھ ہی چلیں گے پھر دیکھا تو تم روانہ ہو چکے تھے "

تانابیگ نے اس کی طرف دیکھے بنا جواب دیا "اب تم مجھ سے کیا چاہتے ہو کورزو؟"

"تانابیگ، آؤ ہم تم دوستوں کی طرح بات کریں، کمیونسٹوں کی طرح بات کریں، تم سنو تو میں کیا کہنا چاہتا ہوں "

"میں تمہارا دوست نہیں ہوں، اور اب تو میں کمیونسٹ بھی نہیں ہوں، میں انقلاب دشمن ہوں، میری جگہ حوالات میں ہے ——— تم کبھی میرے دوست نہیں تھے کورزو، تم نے مجھے دھوکہ دیا "

"ایسا سوچتے ہو تانابیگ تم ——— کورزو نے بے جان آواز میں کہا۔

"ہاں ایسا ہی سوچتا ہوں، بات یہ ہے کہ مجھے چکنے چپڑے الفاظ بولنے نہیں آتے، [illegible]

نہیں سیکھا ــــ یہ بھی نہیں سیکھا کہ کیا بات کہنی چاہیے، کہاں کہنی چاہیئے اور کیسے کہنی چاہیئے ــــ اچھا اب خدا حافظ تمہارا راستہ اُدھر ہے اور میرا ادھر "۔

اس نے دوہا ہے پرے گھوڑے کو موڑا اور اپنے دوست کی طرف دیکھے بنا پہاڑوں کے رخ پر دوڑا دیا، اس نے یہ بھی نہیں دیکھا کہ کورَد نے ایک آہ بھری، ایک ہاتھ سے دل کو پکڑا اور دوسرے سے گلسری کی ایال تھامی گلسری دوڑ ــــ دوڑ گلسری "۔

گلسری تیزی کے ساتھ دوڑنے لگا!

(۱۸)

ابھی تانا بیگ گھر نہیں پہونچا تھا، رات کافی آ گئی تھی، ایک گھوڑسوار اعلان کرتا پھر رہا تھا، پارٹی کی ایک اشد ضروری میٹنگ ہے، صبح کو سب لوگ پارٹی یونٹ کے دفتر میں حاضر ہوں "۔

"کیا بات ہے" تانا بیگ نے گھوڑے کو روک کے پوچھا۔

"یہ تو مجھے نہیں معلوم، کورَد نے آپ کو فوراً بلایا ہے "۔

تانا بیگ علی الصباح گھر پہونچا، جیدار اُسے منہ ہاتھ دھونے کے لیے گرم پانی دیتی ہوئی بولی "فارم سے کچھ لوگ آئے تھے، بختائی والا ریوڑ لے گئے "۔

"جہنم میں جائیں وہ بھی اور بختائی بھی اور ریوڑ بھی ......"

"کیا بات ہے، بہت پریشان ہو، زیادہ تھک گئے ہو؟ "

"تھک گیا ہوں؟ ارے ان لوگوں نے مجھے پارٹی سے نکال دیا "۔

"اچھا تو ذرا آہستہ تو بولو، وہ دونوں عورتیں سنتی ہوں گی "۔

"سنتی ہیں تو سنیں، میں کیوں آہستہ بولوں، میں نے آخر کیا جرم کیا ہے جو چھپاؤں، چلو اچھا ہے، میں اسی قابل تھا اور تم بھی دسی قابل تھیں ۔ بلکہ ہم لوگوں سے اور بدتر سلوک ہوتا تو ٹھیک تھا، اب کھڑی کھڑی گھور کیا رہی ہو؟ تم بھی مجھ کو لعنت ملامت کرو "۔

"اچھا خیر، اب پریشان ہونے سے کیا فائدہ، اٹھو، بستر لگا ہے "۔

"مجھے پتہ ہے کیا کرنا چاہیے ــــ تمہاری رائے کی ضرورت نہیں "۔

تانا بیگ نے نہ کچھ کھایا، نہ کچھ اور بات کی، ایک کونے میں پڑے ہوئے پیال پردہ بھد سے لیٹ گیا اور ساکت رہا ــــ زندگی اب بالکل خالی تھی، نہ کوئی فکر تھی، نہ پریشانی، اب بس صرف خلا تھا۔ اب وہ کیوں زندہ رہے، کس لیے

اور سارے واقعات اسے ایک ایک کرکے یاد آنے لگے ـــــ صبح کو آنکھ کھلی تو سر میں جیسے سیسہ بھرا تھا، پہلے تو اس کی سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ وہ تھا کہاں اور اسے ہوا کیا تھا۔ قریب کہیں سے بھیڑوں کے ممیانے کی آواز آرہی تھی، دور سے دھوپ اور صبح کی روشنی کے کچھ آثار تھے، ـــــ اچھا تو وہ اپنے پورتا میں تھا، کیوں اس کی آنکھ کھلی، کاش کہ وہ سوتا ہی رہتا اب موت ہی ایک واحد علاج تھی، ہمیشہ کی نیند ہی اسے اس کرب سے چھڑا سکتی تھی۔

جب وہ چشمے پر سے لوٹا تو اس نے بندوق اور گولی ایک کونے میں رکھ دی ـــــ نہیں، جان دینا کوئی بات نہیں ہوتی، صغیر بیگ ایسے لوگوں کو وہ کبھی یہ احساس نہ ہونے دے گا کہ وہ جیت گئے، اس دن اس نے دن بھر کام کیا، بچوں کو پیار کیا، بیوی سے بات کی، بھیڑیں دیکھنے والی عورتوں سے نرمی سے بولا۔

رات کا اندھیرا بڑھ رہا تھا کہ جیدار نے باہر سے آواز دی "تانا بیگ، تم سے کوئی ملنے آیا ہے"

وہ باہر نکلا "ایں عہد بیگ! آؤ آؤ، کدھر سے آئے؟ آؤ بیٹھو"

"نہیں، میں جلدی میں ہوں، گاؤں گیا تھا، کورز کی حالت بہت خراب ہے اور انھوں نے کہا ہے کہ آپ فوراً آئیں"

تانا بیگ کھول گیا ـــــ پھر وہی کورز ـــــ پھر کے بولا "کیوں، میں کیا ڈاکٹر حکیم ہوں .... وہ تو جب دیکھو بیمار ہی رہتا ہے، یہاں اپنے آپ ہی گلے گلے تک کام میں لدے ہیں، موسم بدل رہا ہے ...... اُنہہ"

"اب یہ سب تو آپ جانیں، مجھ سے جو کہا گیا تھا وہ میں نے آپ تک پہونچا دیا ہے، مجھے خود ہی دور جانا ہے اور رات آگئی ہے"

عہد بیگ نے اتنا کہہ کر گھوڑے کی باگیں اٹھائیں اور روانہ ہونے سے پہلے پھر بولا "اچھی طرح سوچ لیجئے تانا بیگ اب کے کورز بچیں گے نہیں، ان کے لڑکے کو بھی تار دے کر بلایا گیا ہے، سب اسے لینے اسٹیشن گئے ہیں"

"یہ سب اطلاع مجھے پہنچانے کا شکریہ، مگر میں نہیں جاؤں گا"

اتنے میں جیدار بھی آکر کھڑی ہوگئی تھی، اسے اپنے شوہر پر بڑی شرم آئی، آگے بڑھ کر بولی "نہیں، نہیں، جائیں گے ـــــ جائیں گے کیسے نہیں"

اس وقت تو تانا بیگ چپ رہا مگر جب عہد بیگ چلا گیا تو وہ جیدار پر برس پڑا، "یہ تو میری طرف سے جواب دینے کی عادت چھوڑ دے جیدار، جب میں نے کہہ دیا کہ میں نہیں جاؤں گا، تو نہیں جاؤں گا، بڑی آئی بھائیں گے۔ میں ہرگز نہیں جاؤں گا"

"تانا بیگ، ذرا سوچو تو کیا کہہ رہے ہو؟"

"سوچنے کو اب کیا رہ گیا ہے نیک بخت، سوچتے سوچتے تو یہ نوبت پہونچ گئی، اور بے شک جب میں مروں تو کوئی نہ آئے ـــــ میں اکیلا ہی دم توڑ لوں گا"

بھنبھناتا ہوا وہ چھپر میں چلا گیا مگر اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا بچہ دیتی ہوئی بھیڑوں کو سنبھالتے ہوئے، ننھے ننھے میمنوں کو اٹھاتے ہوئے، ان کو کونوں کھدروں میں چھپاتے ہوئے وہ برابر بڑبڑاتا جا رہا تھا، کتنا کتنا سمجھایا کمبخت کو کہ چھوڑ دے یہ سب، نہیں مانا ——— کہتے جب دل کا دورہ پڑا تھا تو میٹنگ کرنے کی کیا ضرورت تھی، میٹنگ کیا چار دن بعد نہیں ہو سکتی تھی، ساری زندگی دل کو پکڑے کراہتا رہا، پر چیخے گیا، اپنے کو جنتا کا لیڈر سمجھتا ہے بے چارہ، میں تو تیری صورت نہیں دیکھوں گا، بے کہا کہیں کا، مان برا، کون پروا کرتا ہے، ارے اب مجھے کیوں بلاتا ہے ——— نہیں، جا اپنی ایسی تیسی میں، ہرگز تو آؤں گا نہیں بڑا آیا بلانے والا ...... بات سنتا نہیں کسی کی۔ کام، کام، کام ——— مرد کام کے پیچھے ......؟

جیدار باڑے میں آئی تو اس کے کندھے پر تانا بیگ کا بڑا کوٹ تھا، پیٹی تھی، ہاتھ میں بڑے جوتے، دستانے اور بالدار ٹوپی تھی جسے پہن کر وہ باہر نکلتا تھا۔

"چلو، تیار ہو۔"

"بک بک نہ کر، میں نہیں جاؤں گا۔"

تانا بیگ، میں نے زندگی میں تم سے کبھی کچھ نہیں مانگا ——— اب میں تم سے بھیک مانگتی ہوں، مجھ پر اپنا غصہ اتارو، اپنا غم مجھے دے دو، پر اس وقت تم کورو کے پاس جاؤ تانا بیگ ——— تمھیں جانا ہی ہوگا، انسانیت کا یہی تقاضہ ہے۔"

"انسانیت، ہونہہ! کس نے مجھ سے انسانیت برتی تھی، تم لوگ سب دکھاوے کو ہی سب کچھ سمجھتے ہو، تو بھی تو یہی سوچ رہی ہے نہ کہ میں نہیں گیا تو دنیا کیا کہے گی، لوگ کیا سوچیں گے ——— سوچیں، کہیں، مجھے کچھ پرواہ نہیں ——— ضرور مجھے برا بھلا کہیں، وہ تو میں ہوں ہی۔"

"اچھا سوچ لو، میں ذرا آتش دان دیکھ آؤں، ابھی آگ جلائی ہے۔ کبھی کوئی چنگاری پیال میں جا پڑی تو غضب ہو جائے گا ——— وہ یورتا میں چلی گئی۔

تانا بیگ باڑے کی ایک ٹوٹی ہوئی دیوار سے اپنی دکھتی ہوئی پیٹھ لگا کر زمین پر ہی بیٹھ گیا، اور سوچنے لگا کہ اس نے کورو سے کیا کیا کہہ دیا تھا ——— مگر ...... مگر اب وہ کیا کہے گا۔ "کیسے ہو کورو، دیکھو میں تمھیں دیکھنے آ گیا، اب تمھاری طبیعت کیسی ہے، کہو تمھاری کیا خدمت کروں یار!"

نہیں نہیں، ایسا ریاکار تو وہ نہیں بن سکتا تھا،

جیدار پھر آئی، "ارے، تم اب تک تیار نہیں ہوئے؟"

"میری جان نہ کھا، کہہ تو دیا، نہیں جاؤں گا۔"

جیدار بپھر کر زور سے چلائی "اب اٹھتے ہو کہ نہیں؟"

تانا بیگ بوکھلا کے ایسا کھٹاک سے اٹھ کھڑا ہوا جیسے افسر کے حکم پر سپاہی ——— وہ اپنے آپ پر

خود حیران رہ گیا تھا کہ اس نے فوراً جیدار کی بات مان لی! جیدار اس کے پاس آئی، لالٹین اونچی کر کے اس نے شوہر کے جھکے ہوئے چہرے، دھنسی ہوئی آنکھوں اور مرجھائی ہوئی صورت پر ایک نظر ڈالی، ایک آہ بھری اور پھر دل کو مضبوط کر کے کہنے لگی "دیکھو تانا بیگ، اگر تم مرد نہیں بنتے، انسان نہیں بنتے تو یہاں بیٹھ کر بڑبڑاؤ، چیختاؤ ——— میں جا رہی ہوں، فوراً میرے لیے گھوڑا کسو، ابھی، اسی دم۔"

جب تانا بیگ گھوڑا کس کر چھپر میں واپس آیا تو جیدار نے اس کے ہاتھ میں بڑا کوٹ پکڑا دیا "لو، سوار ہو جاؤ۔"

تانا بیگ پیچ و تاب کھانے لگا "کل صبح چلا جاؤں گا، جیدار، اس وقت رہنے دے۔"

"نہیں، ابھی جاؤ، ورنہ دیر ہو جائے گی، زندگی بھر پچھتاؤ گے۔"

صبح کی پہلی کرن دکھائی دے رہی تھی جب تانا بیگ گاؤں میں داخل ہوا۔ — پورے گاؤں پر ایک عجیب سناٹا طاری تھا جیسے سب اپنے گھروں میں تالے ڈال گئے ہوں، اور اسی دم دور سے ایک عجیب سی آواز آئی۔ جیسے کوئی کتا منہ اٹھائے بڑے زوروں سے رو رہا ہو ——— تانا بیگ کا گھوڑا ایک بار چونکا، پھر سرپٹ دوڑنے لگا! ——— پھر تانا بیگ نے دیکھا کہ ایک جگہ بہت سے لوگ جمع ہیں، اور تاریکی میں بھوتوں کی طرح لگ رہے ہیں۔ ——— وہ کورو کا گھر تھا ——— اور تانا بیگ کو اس راستے کا سرا نظر آیا جس پر کورو گلسری پر سوار، تانا بیگ کے پیچھے پیچھے آیا تھا، تانا بیگ نے اس سے کتنی دل شکن باتیں کی تھیں ——— اب کیا ہوگا۔

پھر کورو کے گھر سے ذرا دور پر بہت سے گھوڑے دکھائی دینے لگے ——— بہت سے گھوڑے اور سوار، اور وہ آہستہ آہستہ کورو کے گھر کی طرف بڑھنے لگے، اور بڑھتے بڑھتے ان میں سے ایک نے زور سے سیاپا کیا "ہائے، ہمارا سردار ہائے سردار" ——— اس نوحے کے معنی یہ تھے کہ قزاق لوگ آ پہنچے تھے اور اس کا مطلب یہ تھا کہ اب کوئی امید باقی نہ تھی ——— سب کچھ ختم ہو چکا تھا، دریا پار کے قزاق کورو کے لیے ایسا نوحہ کر رہے تھے جیسے اپنے بھائی کے لیے ——— آہ، قزاق بھائیو، ہمارے آباؤ اجداد سے لے کر اب تک تم نے ہر خوشی اور ہر غم میں ہمارا ساتھ دیا، آؤ آج بھی ہم تم مل کر اپنے سردار کا ماتم کریں ——— وہ جو سب کو چاہتا تھا، ایک ایک کے لیے لڑتا تھا!

تانا بیگ نے ایک زور کا نالہ بلند کیا "کورو" ——— پھر وہ گھوڑے کی ایال پکڑ کر ڈھے پڑا، لگامیں اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئیں، اس کا جسم کبھی اِدھر کبھی اُدھر ڈولنے لگا اور وہ اپنے دوست کے لیے پھوٹ پھوٹ کے رونے لگا، اس کا دوست جو دنیا کو چھوڑ گیا تھا۔

گھر کے باہر حاطے میں گلسری بندھا تھا، اس کی زین اور ساز پر کالی چادر ڈال دی گئی تھی کیونکہ اس پر سواری کرنے والا ختم ہو چکا تھا۔

تانا بیگ پر غشی طاری ہونے لگی، اس نے ایک بار سر اٹھا کر، پاگلوں کی طرح آنکھیں پھاڑ کر اِدھر اُدھر دیکھا، پھر

گھوڑے پر ہی ڈھے پڑا کسی نے دوڑتے ہوئے گھوڑے کی نیچے لٹکتی ہوئی لگامیں پکڑلیں "ارے تانا بیگ کو اتارو، کورو کے بیٹے کے پاس لے چلو"

کئی ہاتھوں نے ملکر تانا بیگ کو سنبھالا، رکابوں میں سے اس کے پاؤں نکالے اور دونوں طرف سے پکڑ کے اندر لے چلے "تانا بیگ دونوں ہاتھوں میں اپنا سر پکڑے زور زور سے رو رہا تھا" کورو، مجھے معاف کردے، مجھے معاف کردے دوست"

کورو کا بیٹا صحن میں ننگے سر کھڑا تھا، تانا بیگ دوڑکر اس سے لپٹ گیا "بیٹا، تیرا باپ مرگیا، میرا دوست چلا گیا، کورو مجھے معاف کردے"

بڑی مشکلوں سے لوگوں نے دونوں کو الگ کیا ـــــ تانا بیگ بھد سے مٹی پر بیٹھ گیا اور ایک کالی شال سے ٹکرایا، اس نے مڑکر دیکھا اور ایک پل کے لئے وہ سب کچھ بھول گیا، اس پر سکتہ ساطاری ہوگیا ـــــ وہ بیوہ عورت تھی جو زور زور سے نوحہ کر رہی تھی "ہمارا سردار، ہائے ہمارا سردار"

ایک بار اس نے نگاہیں اٹھاکر تانا بیگ کو دیکھا اور اسے پہچان کر اور بھی زیادہ زور زور سے بلک بلک کے رونے لگی۔

جب جنازہ روانہ ہوا تو تانا بیگ، گلسری کی باگیں پکڑے، اس کے پیچھے پیچھے تھا اور آہستہ آہستہ کہتا جارہا تھا "تو گلسری، ہمارا کورو چل بسا؟ ایں؟ وہ ہمیشہ کو چلا گیا، اب کورو کہاں، اب وہ کبھی نظر نہ آئے گا مگر گلسری تو نے اس دن مجھے کیوں نہیں روکا جب میں نے اسے اتنی باتیں کہیں، تو نے میرا منھ بند کردیا ہوتا گلسری ـــــ پر تو کیا کرتا، تو تو بے زبان ہے مگر مجھ سے تو اچھا ہی ہے، میں تو اپنے دوست کو راستے پر کھڑا چھوڑ گیا، میں نے تو مڑکر اسے دیکھا بھی نہیں، کاش کہ آخری بار دیکھ ہی لیتا، اب میں کیا کروں گلسری ـــــ کیا کروں"

(۱۹)

دفن کے بعد کورو کے بیٹے سمنصور نے تانا بیگ کو الگ لے جاکر کہا "چچا تانا بیگ مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے"

تانا بیگ نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا، اپنی نگاہیں نیچی کرکے بولا "کہو بیٹے، میں سن رہا ہوں"

"ابا نے مرتے وقت مجھ سے کہا تھا کہ تانا بیگ سے میرا پیار کہنا اور کہنا کہ مجھے معاف کردے اور میرے طرف سے اپنے دل میں غبار نہ رکھے، اور میرا پارٹی کارڈ وہ خود لے جاکر ضلع کمیٹی میں داخل کرے تاکہ سب کو پتہ چل جائے کہ زندگی میں بھی مجھے تانا بیگ پر ہی سب سے زیادہ بھروسہ تھا اور مرنے کے بعد بھی میں نے اسی کو اس قابل سمجھا تھا کہ اپنی سب سے قیمتی چیز اس کے حوالے کروں"

تانا بیگ کے ہونٹ کانپنے لگے، آنکھوں سے آنسو رخساروں پر بہہ کر داڑھی میں غائب ہونے لگے

پر وہ فوراً کچھ نہیں بولا ـــــ پھر اپنے کو سنبھال کر کہنے لگا: "خدا تمھیں اچھا رکھے بیٹا، کوزرو کا بہت شکریہ کہ اس نے مجھے مرتے دم تک یاد رکھا، ورنہ میں بدبخت اس قابل نہ تھا ـــــ بس یہی ذرا خیال آتا ہے کہ... کہ ..... تمھیں معلوم ہے مجھے پارٹی سے نکال دیا گیا ہے"

"جی ہاں، وہ مجھے معلوم ہے"

"تو پھر مجھ کو کیا حق ہے کہ میں کوزرو کا پارٹی کارڈ لے کر ضلع کمیٹی کے دفتر جاؤں، نہ جانے وہ لوگ مجھ سے کیا کہیں"

"وہ تو آپ جیسا مناسب سمجھیں، لیکن مجھے تو اپنے باپ کی وصیت پوری کرنی ہے۔ انھوں نے مجھ سے یہی خواہش ظاہر کی تھی"

"میں سر آنکھوں سے اپنے دوست کی خواہش پوری کرنے کو تیار ہوں بیٹا .... مگر.... کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ تم خود لے جاؤ؟"

"نہیں چچا تانابیگ، ابا نے جو کچھ کہا ہے اس کی مصلحت وہ خوب جانتے تھے، اور اگر ان کو صرف آپ ہی پر بھروسہ تھا تو میں بھی صرف آپ ہی پر بھروسہ کیوں نہ کروں، کارڈ آپ ہی کو لے جانا ہوگا"

"اچھا ـــــ لاؤ دو، لے جاتا ہوں"

علی الصباح گلسری کوزرو کے گھر سے نکلا، اس پر تانابیگ سوار تھا، اپنے دوست کا کارڈ وہ جیب میں رکھے تھا ـــــ پھر اس نے گلسری کو دوڑانا شروع کیا ـــــ گلسری جو خوشی کا بھی شریک تھا اور غم کا بھی، تیزی کے ساتھ اس نے پہاڑوں کو پار کیا اور الیکزنڈر روسکی کی اترائی اترنے لگا!

"کامریڈ کاشکاتائیف ہیں" تانابیگ نے باہر کے کمرے میں بیٹھی ہوئی سکریٹری سے پوچھا۔

"جی ہاں"

"مجھے ان سے کچھ بات کرنی ہے، میں ایک گڈریا ہوں، "سنگ سفید پنچایتی فارم" سے آیا ہوں۔ مجھے بکاسوف کہتے ہیں"

"ہاں، میں آپ کو جانتی ہوں" ـــــ وہ منھ سکوڑ کے مسکرائی۔

"تو ان سے کہیے کہ ہمارے پارٹی لیڈر، کوروسیاکوف کا انتقال ہو گیا اور مرنے سے پہلے انھوں نے مجھ سے کہا تھا کہ ان کا یہ پارٹی کارڈ ضلع کمیٹی کے دفتر پہونچا دوں، سو وہ میں لے کر آیا ہوں"

"اچھی بات ہے، ایک منٹ رکیے"

سیکریٹری جلدی ہی اندر کے کمرے سے نکلی اور اندر والا دروازہ اچھی طرح بند کرتے ہوئے بولی: "کامریڈ

کاشکا تائیف مصروف ہیں، انھوں نے کہا ہے کہ آپ اس کارڈ کو رجسٹریشن کے دفتر میں داخل کر دیجیے ——— ادھر سے جائیے، برآمدے ہو کر داہنے ہاتھ کو مڑ جائیے گا ——— وہیں ہے "

رجسٹریشن آفس ؟ برآمدے سے ہو کر داہنے ہاتھ کو! کیا یہ بات اتنی معمولی تھی، اتنی آسان تھی، کورو کی موت اتنی سستی تھی! ——— تانا بیگ حیران رہ گیا، گڑگڑا کے بولا "ان سے کہیے، مجھے ان سے کچھ بات کرنی تھی، مہربانی ہوگی اگر ذرا سن لیں، ذرا کہہ دیجیے، آپ کا احسان ہوگا، بہت ضروری بات ہے "

لڑکی پہلے تو ذرا ہچکچائی، پھر اس نے تانا بیگ کو ہمدردی سے دیکھا، اندر چلی گئی، مگر پھر فوراً ہی نکل آئی "وہ بہت مصروف ہیں " ——— پھر ذرا رک کے، تانا بیگ سے آہستہ سے بولی "وہ آپ سے نہیں ملیں گے، بہتر ہو کہ آپ چلے جائیں، کیا کیجیے گا بے کار اپنا وقت ضائع کر کے "

تانا بیگ برآمدے سے ہو کر داہنی طرف مڑا، وہاں ایک بورڈ لگا تھا "رجسٹریشن آفس" ——— اور دروازے میں ایک چھوٹی سی کھڑکی تھی، اس نے دستک دی، کھڑکی کے پٹ کھل گئے، ایک عورت نے پوچھا "کیا بات ہے ؟"

"میں ایک پارٹی کارڈ یہاں داخل کرانے لایا ہوں، ہمارے پارٹی لیڈر کا انتقال ہو گیا ہے۔ ان کا کارڈ ہے ——— کورو سیاکوف، سنگ سفید پنچایتی فارم "

پھر تانا بیگ نے اپنی قمیص کی اندر والی جیب میں سے پارٹی کارڈ نکالا، جو اسی چمڑے کی تھیلی میں تھا جس میں کچھ ہی دن پہلے وہ اپنا کارڈ رکھتا تھا، الٹ پلٹ کر اس نے کارڈ کو دو تین بار دیکھا، پھر کانپتے ہوئے ہاتھوں سے کھڑکی کے اندر دے دیا ——— الوداع کورو، الوداع دوست، الوداع سردار!

اور پھر وہ کھڑکی سے لگ کر کھڑا ہو گیا اور دیکھتا رہا!

عورت نے کارڈ کا نمبر لکھا ——— کورو کا اپنا نام، ولدیت، خاندانی نام، اور سن جس میں وہ پارٹی ممبر بنا تھا ——— یہ کورو کی آخری یادگار تھی!

پھر عورت نے تانا بیگ کی طرف رجسٹر بڑھایا کہ وہ اپنے دستخط اور کارڈ پہونچانے کی تاریخ اور وقت لکھ دے۔

"کیا بس اتنا ہی ؟"

"ہاں ——— اور کیا، بس "

"اچھا خدا حافظ "

"خدا حافظ "

تانا بیگ برآمدے سے ہو کر باہر آیا اور پیڑ میں بندھے گلسری کی باگیں کھولتے ہوئے بولا "چلو، گلسری وہ افسانہ ختم ہو گیا "

اسی شام تانا بیگ پہاڑوں کو واپس چلا گیا۔

اُس کی بیوی چپ چاپ اس کے پاس آئی، لگام پکڑی، شوہر کی بانہہ پکڑ کر اسے گھوڑے سے اُترنے میں مدد دی، تانا بیگ اُترتے ہی جیدار سے لپٹ کے زار زار رونے لگا، جیدار بھی بلکنے لگی: "آہ جیدار، ہم اُسے دفنا آئے، ہم اپنے دوست کو کھو آئے، اُسے منوں مٹی تلے دبا آئے جیدار، میرا دوست چلا گیا، مجھ بدبخت کو چھوڑ کر وہ ہمیشہ کو چلا گیا۔"

وہ یورتا میں جانے کے بجائے پاس ہی ایک چٹان پر اکیلا جا بیٹھا۔ وہ تنہائی چاہتا تھا، مکمل تنہائی!

یُورتا میں جیدار نے ایک بار پھر تمیز کو موز نکالا اور بجانے لگی۔ تانا بیگ جانتا تھا کہ وہ اسی کے لیے یہ دُھن بجا رہی ہے ــــــ "بوڑھے شکاری کا گیت" ــــــ اور وہ چٹان پر اکیلا بیٹھا بیٹھا وہ دُھن سُنتا رہا۔

میں نے تجھے مار ڈالا، قردگل

میرے بیٹے قردگل،

میں نے تجھے کیوں شکار کرنا سکھایا!

تو نے زندہ جانوروں اور پرندوں کی جان کیوں لی

میرے بیٹے قردگل۔

اب میں اکیلا ہوں،

میری آواز کون سُنے،

میری بات کا جواب کون دے،

میرے بیٹے قردگل

میں نے ہی تیرے مرنے کا سامان کیا

میرے بیٹے قردگل۔

تانا بیگ اکیلا بیٹھا اس قدیم کرغیزی نوحے کی دُھن سُنتا رہا ــــــ تاریک سنسان پہاڑوں پر سے چاند دبے پاؤں آہستہ آہستہ اُٹھنے لگا، اور پہاڑوں کی چوٹیاں روشنی میں کھلتی گئیں اور تانا بیگ اپنے مرنے والے دوست سے معافی مانگتا رہا ــــــ اور یورتا کے اندر جیدار، کرغیزیہ کے عظیم اور قدیم شکاری قردگل کے نوحے کی دُھن بجاتی رہی۔

آہ میں نے ہی تجھے مار ڈالا،

میرے بیٹے قردگل

(۲۰)

پو پھوٹ رہی تھی، مرتے ہوئے گلسری کے سرہانے بیٹھے ہوئے تانا بیگ کو یاد آرہا تھا کہ کورو کے مرنے کے بعد پھر کیا ہوا تھا۔

گلسری بے حس و حرکت پڑا تھا، زندگی آہستہ آہستہ اس کے جسم سے رخصت ہو رہی تھی، اس کے گلے سے ایک گڑگڑاہٹ سنائی دے رہی تھی، موت کا گھرا ——— جیسے کچھ پھنس گیا ہو، اس کی آنکھیں پھیل کر دھندلا گئی تھیں، ایسا لگتا تھا کہ وہ پلک جھپکائے بنا آگ کو تکے جا رہا ہے، اس کی ٹانگیں اکڑ کر لکڑی کی طرح آگے کو نکلی ہوئی تھیں اور تانا بیگ کو یاد آرہا تھا کہ کورو کے مرنے کے بعد کیا ہوا تھا ——— ایک بار پھر وہ علاقائی دفتر میں گیا تھا علاقے کا سیکریٹری اچھا آدمی تھا، شاید وہ مدد کرے، کورو نے بھی اس کی تعریف کی تھی لیکن وہاں پہنچ کر پتہ چلا تھا کہ سیکریٹری کا تبادلہ ہو گیا ہے۔

"آپ کو نہیں معلوم تھا؟" باہر کے کمرے میں بیٹھی ہوئی سیکریٹری نے تعجب سے کہا تھا۔

"نہیں بھائی، مجھے دفتروں کی الٹ پلٹ ذرا کم معلوم رہتی ہے۔"

"تو اگر کوئی ضروری کام ہو تو میں آپ کے آنے کی اطلاع ان نئے سیکریٹری کو کردوں ——— یہ بھی اچھے آدمی ہیں۔"

"نہیں رہنے دیجئے، ایک ذاتی معاملہ تھا، ان کو میں ذاتی طور پر جانتا تھا، اب یہ نہ جانے کیا کہیں گے۔"

دفتر سے نکل کر وہ بس کی طرف چلا تھا، ——— سات برس میں دنیا بدل گئی تھی چاروں طرف بسیں دوڑتی پھرتی تھیں، اور بس کے پاس ایک لاری کھڑی تھی، پاس ہی بیئر کی دوکان تھی، جہاں سے بیئر کے خالی کنٹر لاری میں لادے جا رہے تھے اور ان لادنے والوں میں ... بختائی تھا! تانا بیگ کو دیکھ کر وہ حیران رہ گیا اور یوں تکتا رہا کہ اوپر لاری سے میٹ نے آواز دی: "ابے، او نگھ گیا ہے کیا؟"

تانا بیگ بھی حیرانی سے دیکھتا جا رہا تھا، تو تم نے شہر کی چکا چوند کی لالچ میں یہ پایا بختائی ——— تم نے مجھ سے غداری کی، فارم سے غداری کی، کمیونسٹ نظام سے غداری کی: کیا اس لئے؟ زندگی کے پھیر عجیب ہیں!

پھر اسے گرمیوں کے موسم کا وہ دن یاد آیا ——— دریا کے کنارے وہ گھاس چھیل رہا تھا، بیٹیاں بڑی ہو کر بیاہی جا چکی تھیں، بیٹا بھی ضلع بجلی گھر میں نوکر تھا، اس نے بھی شادی کر لی تھی ——— اب تانا بیگ اور جیدار سا ریگاؤں میں رہتے تھے، چوکی دار کے لئے وہاں ایک کمرہ تھا، ضرورت کا سب سامان گاؤں میں آسانی سے مل جاتا تھا ——— وہ گھاس چھیلے جا رہا تھا کہ ایک چھوٹی سی موٹر بالکل اس کے پاس آکر رکی، ——— اس میں سے دو آدمی اترے! پھر اسے ابراہیم کی مسکراہٹ دکھائی پڑی: "السلام علیکم تانا بیگ، آخر ہم لوگوں نے

آپ کو ڈھونڈ ہی نکالا — ضلع کے نئے سیکریٹری بہت دنوں سے آپ کی تلاش میں تھے ؟

تانا بیگ کا جی چاہا کہ اسے ایک زناٹے کا تھپڑ رسید کرے ——— چالاک کیدڑ موقع پرست، جہاں دیکھو، جس کے ساتھ دیکھو، بنائے رکھتا ہے ——— جب دیکھو کسی نہ کسی افسر کی خوشامد میں لگا ہوا۔

پھر ابراہیم کے ساتھ والے آدمی نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا، تانا بیگ کا ہاتھ پکڑ لیا اور پکڑے ہی رہا۔

"تانا بیگ آپ نے مجھے پہچانا ؟ یا آپ بھول گئے"۔

تانا بیگ ہچکچایا ——— میں نے اسے کہاں دیکھا تھا ——— وہ زور زور سے سوچنے لگا صورت تو جانی پہچانی لگتی ہے، یا شاید لڑکا تھا جب میں نے اسے دیکھا تھا، آواز بھی سنی ہوئی محسوس ہوتی ہے، ابراہیم کچھ کہنے ہی والا تھا کہ تانا بیگ ایکدم چیخ کر بولا "رکو، رکو، میں سمجھ گیا، مجھے یاد آگیا، میں تمھیں جانتا ہوں بیٹے، بھلا میں تمھیں کیسے بھول سکتا ہوں ——— تمھیں بھول جاؤں گا تو کسے یاد رکھوں گا، آہ ——— میں تمھیں دیکھ کر کتنا خوش ہوا بیٹا، برسوں سے ایسی خوشی میرے حصے میں نہ آئی تھی کریم بیگ" ——— وہ آنسو پونچھنے لگا تھا۔

تو یہ کریم بیگ تھا، کوسوموں کا کمسن سیکریٹری، جس نے بڑی جرأت کے ساتھ اس دن ضلع کمیٹی میں تانا بیگ کی حمایت کی تھی۔

کریم بیگ نے پھر تانا بیگ کا ہاتھ پکڑا "تو اب جب کہ آپ نے مجھے پہچان لیا ہے، آیئے، ادھر دریا کے کنارے چلیں، مجھے آپ سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں، ابراہیم تم جب تک گھاس چھیلو" ——— اس نے تانا بیگ سے کھرپی لے کر ابراہیم کی طرف پھینکی ——— ابراہیم فوراً کھرپی لے کر گھاس میں جٹ گیا ——— تانا بیگ اس کی یہ مستعدی دیکھ کر حیران رہ گیا ——— چاپلوس کہیں گا!

کریم بیگ چلتے چلتے بولا "آپ کو کام کرتے دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی، اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ کی صحت ابھی اچھی ہے ——— اور یہ تو آپ دیکھ ہی رہے ہوں گے کہ چاروں طرف حالات کتنے بہتر ہوتے جا رہے ہیں"۔

"ہاں بیٹے، میں بھی دیکھ رہا ہوں۔ ابھی کچھ دن ہوئے ہیں میں "پانچ درختوں والی وادی" میں گیا تھا جہاں میں نے ہی ایک زمانے میں گڈریئے کی حیثیت سے کام کیا تھا اور سب کچھ بدل گیا تھا ——— وہ ایک پل کے لیے چپ ہو گیا ——— پھر بولا "اب تو وہاں کی حالت دیکھ کر رشک آتا ہے، کایا ہی پلٹ گئی ہے"۔

"نہیں تانا بیگ، ابھی ایسا تو نہیں ہوا ہے، جیسا کہ ہم چاہتے ہیں مگر پھر بھی پہلے سے بہتر حالت ہے ——— تو میں آپ سے یہی کہنے آیا تھا کہ آپ پارٹی میں واپس آجایئے، ہم لوگ آپ کا کیس پھر سے اٹھائیں گے، اب تو میں ضلع کا سکریٹری ہوں، جس نے اپنے کچھ اور ساتھیوں سے بھی صلاح کی تھی، ان کی بھی یہی رائے ہے کہ آپ ……

"مگر بیٹے، اب تو میں بوڑھا ہو گیا ہوں، تمھارے کس کام آؤں گا، تمھاری بڑی مہربانی جو تم نے ایک بھلائے ہوئے دوست کو پھر سے یاد کیا، مگر پرانا ماننا، میرا زمانہ بیت گیا ..... اب ..... اچھا میں سوچوں گا، جیلر سے صلاح کروں "

"آپ ضرور سوچیے تانا بیگ ــــــ اور اسے میری ذاتی اور ہماری کمیٹی کی درخواست سمجھیے"

لیکن تانا بیگ کچھ فیصلہ نہ کر سکا ــــ ایک خواہش البتہ دل میں اب تک کروٹیں لیا کرتی تھی ــــ گلسری کسی طرح مل جائے!

(۲۱)

اور اب جبکہ گلسری پھر اسے مل گیا تھا، اس نے کسی نہ کسی طرح اسے کھلا پلا کے اس کی طاقت بحال کر دی تھی تو آج ــــ گلسری اسے الیگزنڈر روکی کی چڑھائی پر آخری بار لے کر چڑھا تھا اور دم توڑ رہا تھا!

تانا بیگ گلسری کو رخصت کر رہا تھا، "تو تم بھی چلے گلسری، تم جو میرے مخلص دوست تھے، میری خوشیوں میرے غموں کے شریک تھے، تم ایک عظیم راہوار تھے گلسری ــــ تم میرے بہترین ایام، میری زندگی کا بہترین حصہ، میرا بہترین زمانہ اپنے ساتھ لیے جاتے ہو۔ میں تمھیں ہمیشہ یاد کروں گا ــــ نہ تم اس وقت یہاں دم توڑتے نہ مجھے اپنی ساری زندگی اس طرح یاد آتی جیسے یہ سب کچھ ابھی ہوا ہے، کل ہی ہوا ہے ــــ کبھی نہ کبھی ہم تم پھر ملیں گے گلسری ــــ اس دنیا سے دور مگر مجھے وہاں تمھاری ٹاپوں کی آواز کیسے سنائی دے گی، وہاں تو سڑکیں نہیں، گھاس نہیں، زندگی نہیں ــــ گلسری تمھاری ٹاپوں کی گونج میرا سب سے محبوب نغمہ تھی ــــ یقین نہیں آتا کہ اب میں کبھی اس کو نہیں سن سکوں گا......"

پھر صبح بھی ہو گئی!

پہاڑوں کی چوٹیوں سے روشنی نمودار ہو رہی ہے، دھند چھٹنے لگی ہے، نیچے میدان نظر آ رہے ہیں، گھاٹی کے سرے پر آگ کے کوئلوں پر راکھ جمتی جا رہی ہے، پر وہ اب بھی انارو سے دہک رہے ہیں اور ان کے پاس ایک بوڑھا انسان کھڑا ہے ــــ سفید بال، جھکی ہوئی کمر، کندھے پر پھیڑ کے بالوں والا کوٹ ڈالے ــــ کیونکہ گلسری کو اب اس کوٹ کی ضرورت نہیں رہی تھی، وہ ایسی جگہ چلا گیا تھا جہاں ان چیزوں سے بے نیازی حاصل ہو جاتی ہے۔

تانا بیگ نے ایک نظر گلسری کو دیکھا اور حیران رہ گیا ــــ کیا تھا اور کیا رہ گیا ــــ گلسری کروٹ لیٹا تھا، گردن پیچھے کو کھنچی ہوئی تھی، اور اس پر گہرے نشان تھے، پیٹے ملگاموں کے نشان، اس کی دونوں ٹانگیں اکڑی ہوئی باہر کو نکلی ہوئی تھیں، کئی گھسے سموں پر پرانے گھسے ہوئے نعل، اب وہ کبھی زمین پر دوڑے گا نہیں، اب کسی راستے پر اس کے سموں کے نشان نہیں بنیں گے!!

پھرے ہی طرح آپہونچی، تاتا بیگ نے جھک کر آخری بار اس کے منہ پر پیار کیا، اس کی ایال میں انگلیاں پھیریں، اس کی آنکھیں بند کیں جو ہمیشہ اپنے مالک کو دیکھ کر گول گول گھومتی تھیں اور باہر کو ابل پڑتی تھیں۔ تاتا بیگ نے اس کی باگیں کھول کر اپنے جھکے ہوئے کندھے پر ڈالیں ——— اور روانہ ہوگیا ——— پھر اس نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔

پہاڑوں میں چڑھتا وہ اپنے خیالات میں کھویا ہوا تھا ——— اب اس کے سبھی دن بیت چکے تھے، مگر وہ اکیلا نہیں مرنا چاہتا تھا، وہ اس ہنس کی طرح مرنا چاہتا تھا جو کسی نہ کسی طرح اپنے ساتھ اڑنے والوں میں مل کر برابر اڑتا جائے ——— اور پھر کسی دن یکایک گر پڑے ——— جیسے کورو، آہ کورو ——— مجھے معاف کر دینا میرے دوست ——— میں منصور کو خط لکھوں گا، میں کورو کے بیٹے کو خط لکھوں گا کہ بیٹے، تمہیں گلسری یاد ہے؟ جو تمہارے ابا کی سواری میں رہتا تھا، جس پر بیٹھ کر میں تمہارے ابا کا کارڈ لے کر ضلع کمیٹی کے دفتر گیا تھا؟ تمہیں نے تو مجھے بھیجا تھا بیٹا، تو ایسا ہوا کہ کل رات میں الیکزنڈروسکی کی چڑھائی چڑھ رہا تھا کہ میرا وہ شاندار گھوڑا یکایک مر گیا ——— اور میں ساری رات اس کے سرہانے بیٹھا اپنی بیتی ہوئی زندگی کے بارے میں سوچتا رہا ——— شاید کسی دن میں بھی یوں ہی رستہ چلتے چلتے گر کر مر جاؤں گا، اس لئے بیٹے، تم میری مدد کرو، اور مجھے پھر سے پارٹی میں آنے کو کہو تو مجھے اطمینان ہو جائے گا کہ یہ ٹھیک بات ہے ——— اب میری سمجھ میں آگیا ہے کہ تمہارے ابا اور میرے دوست کورو نے مجھ ہی سے وہ پارٹی کارڈ کیوں بھجوایا تھا.... تم میرے اسی دوست کے بیٹے ہو جو میرا بھائی تھا.... مجھے پہچانتے ہو نہ .... میں تمہارا بوڑھا چچا ہوں ——— تاتا بیگ بکاسوف.... تمہارے ابا میرے دوست تھے ....'

تاتا بیگ پہاڑوں پر چڑھتا رہا اور آنسو اس کے گالوں پر سے ڈھلک ڈھلک کے اس کی داڑھی کو بھگوتے رہے.... اس نے ان آنسوؤں کو پونچھا بھی نہیں، کیونکہ وہ گلسری کے ماتم کے آنسو تھے ——— آنسوؤں کی جھلملی سے اس نے صبح کی پہلی کرن کو نکلتے دیکھا اور ایک ہنس کو دیکھا ——— جو پہاڑوں سے پرے اکیلا اڑتا چلا جا رہا تھا۔ ..

اور چلتے چلتے تاتا بیگ بکاسوف کے کانوں میں وہ نغمہ پھر سے گونجنے لگا۔

اونٹنی نہ جانے کب سے صحراؤں میں بھٹک رہی ہے، وہ اپنے کھوئے ہوئے بچے کو آوازیں دے رہی ہے پکار رہی ہے .... دشت و در میں ٹکراتی وہ چلا رہی ہے .... تو کہاں ہے میری کالی آنکھوں والے' مجھے آواز دے، دودھ میرے تھنوں سے نکل نکل کر میری ٹانگوں پر بہہ رہا ہے ——— مجھے پکار میرے کلیلیں کرنے والے' تو کہاں ہے .... میرا دودھ بہہ رہا ہے .... میٹھا، سفید، جھاگ دار دودھ .... تو کہاں ہے میرے لاڈلے' میرے نازوں کے پلے، مجھے آواز دے میرے کالی آنکھوں والے.... کہاں ہے تو .... کہاں ہے تو .... "

پانچ غزلیں

تاریکیوں کا راز نمایاں ہوا تو کیا
کیا جانے ذوق و شوق کے بازار کیا ہوئے

چمن میں تھے تو چمن ہی کی داستاں سنتے
فضائے شب میں ستارے ہزار گزرے ہیں
ہم ایک دل کی اگر شرح پر اُتر آئیں

معین احسن جذبی

●

تاریکیوں کا راز نمایاں ہوا تو کیا
ایک اک نفس کی لو سے چراغاں ہوا تو کیا

روشن ہوئے نہ پھر بھی در و بام آرزو
ایک ایک اشک مہرِ درخشاں ہوا تو کیا

مہکا نہ کوئی پھول، نہ چٹکی کوئی کلی
دل خون ہو کے صرفِ گلستاں ہوا تو کیا

چونکیں نہ آندھیاں، نہ بگولے کہیں اُٹھے
اپنا جنوں محیطِ بیاباں ہوا تو کیا

کچھ اُڑ گئیں دامنِ گل و بلبل کی دھجیاں
اپنا ہی تار تار گریباں ہوا تو کیا

جن کے لئے ہیں بے سر و سامانیاں بھی عیش
اُن کی نظر میں بے سر و ساماں ہوا تو کیا

صحنِ چمن میں کون تھا ہم راز و ہم نوا
جذبی ہزار طرح غزل خواں ہوا تو کیا

●

کیا جانے ذوق و شوق کے بازار کیا ہوئے
یوسف پکارتا ہے خریدار کیا ہوئے

گستاخیٔ نگاہِ تمنا کدھر گئی
تعزیرِ درد کے وہ سزاوار کیا ہوئے

صبر آزما وہ شوقِ نظارہ کہاں گیا
آسودگانِ سایۂ دیوار کیا ہوئے

ہر سانس بوئے بادہ، نہ ہر گام لغزشیں
جانے وہ محتسب کے گنہ گار کیا ہوئے

دے تو کوئی تبسمِ دوراں کو پھر جواب
وہ میرے دردِ غم کے طرفدار کیا ہوئے

تھا جن کے پاس زخم کا مرہم کہاں گئے
جو دل کو جوڑتے تھے وہ معمار کیا ہوئے

ڈھونڈو تو کچھ ستارے ابھی ہوں گے عرش پر
دیکھو تو وہ حریفِ شبِ تار کیا ہوئے

دھوکا نہ تھا نظر کا تو پھر اے شبِ دراز
وہ ہلکے ہلکے صبح کے آثار کیا ہوئے

جذبی کہاں گئیں وہ تری دل فروزیاں
ڈوبے ہوئے وہ سوز میں اشعار کیا ہوئے

●

چمن میں تھے جو چمن تن کی داستاں سنتے
کوئی نوا، کوئی نغمہ، کوئی فغاں سنتے

قدم نہ چھوڑتے راہوں کو تا بہ منزلِ شوق
ہماری بات جو یہ اہلِ کارواں سنتے

ترے قلم سے تو گلزار بے نوا کا قفس
تری زباں سے بھی کچھ حالِ بے زباں سنتے

ہمارے درد کا طوفاں کہاں کہاں نہ اٹھا
یہ شور آپ جہاں چاہتے وہاں سنتے

اِک عمر اپنی بھی گزری ہے اے چمن والو
گلوں کے کنج میں اندیشۂ خزاں سنتے

کسی کا رنج، کسی کا اَلم، کسی کا مَلال
اَب اور کیا تھا جو ہم زیرِ آسماں سنتے

گلوں سے بچ کے چلے بلبلوں سے کترائے
وہ میرا قصۂ خونیں کہاں کہاں سنتے

کچھ اس میں اپنا بھی سوزِ بیاں تھا اے جذبی
وگرنہ لوگ کب افسانۂ جہاں سنتے

●

فضائے شب میں ستارے ہزار گزرے ہیں
یہ آسماں سے دلوں کے غبار گزرے ہیں

چہک اُٹھے ہیں در و بام و کوچہ و بازار
جہاں جہاں سے تری بادہ خوار گزرے ہیں

مزاج پوچھتے پھرتے ہیں ذرّے ذرّے کا
دلوں کی راہ سے کچھ خاکسار گزرے ہیں

کلی نے بڑھ کے پکارا گلوں نے پیار کیا
کسی چمن سے جو سینہ فگار گزرے ہیں

مجھے دکھاؤ نہ خونِ جمال لالہ و گل
مری نظر سے یہ نقش و نگار گزرے ہیں

بہا سکا نہ انھیں وقت کا بھی سیلِ رواں
وہ چند لمحے جو اس دل پہ بار گزرے ہیں

ہماری راہ میں جذبی پہاڑ آئے پہ ہم
مثالِ ابرِ سرِ کوہسار گزرے ہیں

●

ہم ایک دل کی اگر شرح پر اُتر آئیں
ہزاروں درد کی صدیاں نظر میں پھر جائیں

کوئی تو قاتلِ نا دیدہ کا پتہ دے گا
ہم اپنا زخم زمانے کو لاؤ دکھلائیں

یہ وحشیوں سے کہو چپ رہیں نہ زنداں میں
جنوں کا ساز اٹھائیں کوئی غزل گائیں

زمیں کے دل سے اٹھا ہے ہزار شب کا غبار
کہیں یہ چاند ستارے نہ گھٹ کے مر جائیں

چمن کی نذر ہیں یہ پارہ ہائے قلب و جگر
یہ پھول وہ ہیں کہ شاید کبھی نہ مرجھائیں

پانچ غزلیں

چھوڑ دوں شہر ترا چھوڑ دوں دنیا تیری
مرے نصیب نے جب مجھ سے انتقام لیا
کیا قیامت ہے کہ اک شخص کا ہو بھی نہ سکوں
وفا کی رسم اٹھا دیتے عمارت دل کی ڈھا دیتے
کیا کروں رنج گوارا نہ خوشی راس مجھے

شاذ تمکنت

○

چھوڑ دوں شہر ترا، چھوڑ دوں دنیا تیری
مجھ کو معلوم نہ تھا کیا ہے تمنّا تیری

میں اندھیرے میں نہیں دن کے اُجالے میں لُٹا
اب کسے ڈھونڈے ہے شمعِ رُخِ زیبا تیری

جب کوئی پاسِ مروّت سے کرم کرتا ہے
یاد آتی ہے بہت رنجشِ بے جا تیری

پَے بہ پَے ساتھ چھٹا جاتا ہے اک دنیا کا
دم بہ دم یاد چلی آتی ہے گویا تیری

دامن و دستِ رسا بات خدا ساز تو ہے
نارسائی بھی مشیّت ہے خدایا تیری

منہدم ہو گئی دیوارِ دلِ دیوانہ
میری قسمت میں تھی تصویر شکستہ تیری

تارِ تارِ نفسِ جاں میں ترا نغمہ ہے
پیرہن میں ہے ابھی بوئے شناسا تیری

غزل شاذ ہے صدقہ تری رعنائی کا
رگِ ہر شعر میں ہے موجِ سراپا تیری

○

مرے نصیب نے جب مجھ سے انتقام لیا
کہاں کہاں تری یادوں نے ہاتھ تھام لیا

فضا کی آنکھ بھر آئی ہوا کا رنگ اُڑا
سکوتِ شام نے چپکے سے تیرا نام لیا

وہ میں نہیں تھا کہ اک حرف بھی نہ کہہ پایا
وہ بے بسی تھی کہ جس نے ترا سلام لیا

ہر اک خوشی نے ترے غم کی آبرو رکھ لی
ہر اک خوشی سے ترے غم نے انتقام لیا

وہ معرکہ تھا کہ فتح و شکست بھی نہ ملی
غریبِ شہر نے کیا جانے کس سے کام لیا

○

کیا قیامت ہے کہ اک شخص کا ہو بھی نہ سکوں
زندگی کون سی دولت ہے کہ کھو بھی نہ سکوں

گھر سے نکلوں تو بھرے شہر کے ہنگامے ہیں
میں وہ مجبور تری یاد میں رو بھی نہ سکوں

دن کے پہلو سے لگا رہتا ہے اندیشۂ شام
صبح کے خوف سے نیند آئے تو سو بھی نہ سکوں

کس کو سمجھاؤں کہ دریا سے سراب اچھا تھا
پار اُتر بھی نہ سکوں، ناؤ ڈبو بھی نہ سکوں

ساؔز معلوم ہوا عجزِ بیانی کیا ہے
دل میں وہ آگ ہے لفظوں میں سمو بھی نہ سکوں

○

وفا کی رسم اٹھا دیتے، عمارت دل کی ڈھا دیتے
نہ ملتے تم تو ہم اس شہر کو صحرا بنا دیتے

خطا کو خواہشِ بارِ دگر کا حوصلہ دیتے
قیامت ہے تمھارا بخش دینا کچھ سزا دیتے

تمھارے پاس تھی تحریرِ بختِ نارسا اپنی
تمھارے بس میں تھا ترمیم کرتے یا مٹا دیتے

اگر سنتے وہ پچھلی رات کا پُرسوز سناٹا
مری آواز کو پہچان کر شاید صدا دیتے

گدائے آخرِ شب تھے تہی کاسہ پھرے برسوں
کوئی ملتا تو ہم اہلِ کرم کا واسطہ دیتے

تم آئے ہی نہیں اس خانۂ تیرہ سے گھبرا کر
ہماری سادہ لوحی دیکھنا تھی گھر جلا دیتے

مزاجِ اسکندری قسمت ایازی لے کے آئے تھے
کہاں ممکن تھا دستِ سنگ میں ہم آئینہ دیتے

○

کیا کروں رنج گوارا نہ خوشی راس مجھے
جینے دے گی نہ مری شدّتِ احساس مجھے

میں کسی بزم کے قابل نہ رہا تیرے بعد
ہنس پڑا ہوں تو ہوا جرم کا احساس مجھے

ہم نے اک دوسرے کو پُرسۂ فرقت نہ دیا
میری خاطر تھی تجھے اور ترا پاس مجھے

ایک ٹھہرا ہوا دریا ہے مری آنکھوں میں
جانے کس گھاٹ پہ مارے گی تری پیاس مجھے

جیسے پہلوئے طرب میں کوئی نشتر رکھ دے
آج تک یاد ہے تیری نگہِ یاس مجھے

ریزہ ریزہ ہوا جاتا ہے مرا سنگِ وجود
یوں صدا دے نہ پسِ پردۂ انفاس مجھے

شاخ سے برگِ چکیدہ کا تقاضا جیسے
کچھ اسی طرح ابھی تک ہے تری آس مجھے

روح کے دشت میں اک ہو کا سماں ہے اے شاذ
دے گیا کون بھرے شہر میں بن باس مجھے

ایک رباعی پانچ غزلیں

رباعی

عروج اوروں کو کچھ دن ہے اہرمن کی طرح
قتالوں پہ اکرام ہے، اکرام بڑھیں گے
ہر تصور مشاہدات سے ہے
ہے تو یہ بے ادبی صاحب محفل کی طرف
میرا سر کب کسی دربار میں خم ہوتا ہے

کمال احمد صدیقی

○

اے نعرۂ انقلاب زندہ رہنا
اے سُرخئ آفتاب زندہ رہنا
ہے تشنہ لبی یاد مجھے مستی میں
اے میرے حسین خواب زندہ رہنا

○

عروج اور دل کو کچھ دن ہے اہرمن کی طرح
فروغ کس کو ہے رندوں کے بانکپن کی طرح

بتوں سے لطف نہیں مجھ کو برہمن کی طرح
ہر ایک سنگ تراشا ہے کوہکن کی طرح

لہک رہا ہے چمن تیرے پیرہن کی طرح
مہک رہے ہیں شگوفے ترے بدن کی طرح

مرا خیال نہیں ہے تو اور کیا ہوگا
گزر گیا ترے ماتھے سے جو شکن کی طرح

کبھی تو گزروں گا اس رہگزار سے ہٹ کر
خود اپنی تاک میں بیٹھا ہوں راہزن کی طرح

یہ سرزمینِ گل و لالہ سو بھی جاتی ہے
لبادہ برف کا اوڑھے ہوئے کفن کی طرح

○

قاتلوں پہ اکرام ہیں، اکرام بڑھیں گے
مقتولوں پہ الزام ہیں، الزام بڑھیں گے

خود اپنی ہی شمشیر سے زخمی ہوئے قاتل
مقتل میں ابھی اور بھی کہرام بڑھیں گے

دو چار تنک ظرف ہیں میخانے میں بدمست
رندانِ خرابات پہ دشنام بڑھیں گے

کچھ لوگ جو خاموش ہیں، یہ سوچ رہے ہیں
سچ بولیں گے جب سچ کے ذرا دام بڑھیں گے

کملائے ہوئے ہونٹوں پہ ہے حرفِ صداقت
اِس دور میں کچھ زہر بھرے جام بڑھیں گے

سقراط، یہ منصور، یہ عیسیٰ، یہ کماں آب
فہرست میں کچھ اور ابھی نام بڑھیں گے

○

ہر تصور مشاہدات سے ہے
ہر نظارہ تصورات سے ہے

ذہن میں اک خیال تھا تو ضرور
پر یہ تصویر میرے ہات سے ہے

شعر آئینہ ہے حقیقت کا
اور یہ آئینہ میری ذات سے ہے

کوئی تنہا نہیں ہے دنیا میں
زندگی بھی تعلقات سے ہے

رشتے واضح ہیں رشتے پنہاں ہیں
آگہی تو انھیں نکات سے ہے

نغمہ و برق و نور اس کے لباس
ایک ایک ذرہ کائنات سے ہے

کائنات آج بھی جواں ہے کمال
یہ جوانی تغیرات سے ہے

○

ہے تو یہ بے ادبی صاحبِ محفل کی طرف
نظریں اُٹھ جاتی ہیں ہر جورِ شمائل کی طرف

اُس نے ٹوٹے ہوئے آئینے کو بے کار کہا
میں یہ سمجھا کہ اشارہ ہے مرے دل کی طرف

ہم سے پہلے بھی کئی قتل ہوئے ہیں یارو
انگلیاں آج ہی کیوں اٹھی ہیں قاتل کی طرف

کون جانے کوئی جلتی ہوئی کشتی ہی نہ ہو
روشنی سی نظر آتی ہے جو ساحل کی طرف

جس کو منزل کی تمنا ہے مرے ساتھ چلے
یوں تو ہر راہ گزر جاتی ہے منزل کی طرف

خونِ ناحق کی مرے کون گواہی دے گا
دل بھی کم بخت مرا ہے اسی قاتل کی طرف

رقص کرتے ہوئے جاتے ہیں بگولے سوئے دشت
اور میں دیکھتا ہوں طوق و سلاسل کی طرف

کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ
جاؤ اے بوالہوسو کوچۂ قاتل کی طرف

○

میرا سر کب کسی دربار میں خم ہوتا ہے
کوچۂ یار میں لیکن یہ قدم ہوتا ہے
پردۂ سنگ میں رُو پوش تو کم ہوتا ہے
ہاں صنم گر کے تخیل میں صنم ہوتا ہے
پُرسشِ حال بھی اتنی کہ میں کچھ کہہ نہ سکوں
اِس تکلف سے کرم ہو تو ستم ہوتا ہے
سر اگر سر ہے تو ہر سنگ سے ٹکراتا ہے
دل اگر دل ہے تو شائستۂ غم ہوتا ہے
بات کیجئے تو حیا اس کو نہ کچھ کہنے دے
یہ بھی اُس شوخ کا اندازِ ستم ہوتا ہے
تشنگی ذہن کو ادراک بنا دیتی ہے
تشنہ لب جام اُٹھاتا ہے تو جم ہوتا ہے
شیخ مے خانے میں کرتا ہے ارم کی باتیں
اسی مے خانے کا اک گوشہ ارم ہوتا ہے
ہائے یہ لوگ جو پتھر کو صنم کہتے ہیں
میرے تیشے سے جو ترشے تو صنم ہوتا ہے
ایک دل ہے کہ اُجڑتا ہے تو بستا ہی نہیں
ایک بُت خانہ ہے اُجڑے تو حرم ہوتا ہے
راہبر راہ نوردی سے پریشان ہے آج
جس طرف جائے مرا نقشِ قدم ہوتا ہے

غزلیں

اختر سعید
نازش پرتاپ گڑھی
اظہر سعید
عظمت بدنام
شمیم حنفی
ذکا صدیقی
مظفر حسین رزمی
محمود خاور
سعادت نظیر
شاہد اکبرپوری
نثار پرویز
طلحہ رضوی برق
ابوالخیر کشفی
زیب غوری

اختر سعید

○

پھونک ڈالے تپشِ غم تو بُرا بھی کیا ہے
چند یادوں کے سوا دل میں رہا بھی کیا ہے

بے نوا ہوگا نہ اس شہر میں ہم سا کوئی
زندگی تجھ سے مگر ہم کو گلا بھی کیا ہے

کہیں اک آہ میں افسانے بیاں ہوتے ہیں
ہم نے اس دشمنِ ارماں سے کہا بھی کیا ہے

کیا کرے تھک کے اگر بیٹھ نہ جائے دلِ زار
اک خریدار نہیں جنسِ وفا بھی کیا ہے

تم ہو غم خوار، تمھیں اتنا تکلف کیوں ہے
زہر دے دو مجھے اب میری دوا بھی کیا ہے

زندگی چھین لے بخشی ہوئی دولت اپنی
تو نے خوابوں کے سوا مجھ کو دیا بھی کیا ہے

ہم نے اُس بت کو کلیجے سے لگایا ہے جسے
ہے یہ پندارِ خدائی کہ خدا بھی کیا ہے

دیدۂ حسن بھی بے خواب ہوئے جاتے ہیں
نالۂ اخترِ شوریدہ نوا بھی کیا ہے

نازش پرتاب گڈھی

○

زخم کو میں نے سدا پھول کہا ہے یارو — یہ سیاست ہے کہ جینے کی ادا ہے یارو
قافلہ وقت کا کس جا پہ رُکا ہے یارو — آدمی میر[1] کا دیوان بنا ہے یارو
تم میں واقف ہو جو کوئی تو کرے ذکرِ خلوص — میں نے یہ لفظ کتابوں میں پڑھا ہے یارو
ہے ذرا مشقِ سیاست پہ تبسّم کا مدار — ورنہ اک عمرِ محبت کا صلہ ہے یارو
دوستی یوں تو بڑی چیز ہے دنیا میں مگر — دوست کے نام سے جی ڈر سا گیا ہے یارو
صرف ماحول و زمانہ ہی پہ الزام نہیں — عشق کو ہم نے بھی مایوس کیا ہے یارو
اک ہمارے ہی زمانے میں ہوا قحطِ رجال — ورنہ ہر دور کو منصور ملا ہے یارو
زلفِ برہم سے اُلجھنے کی اجازت ہے مگر — سوچتا ہوں یہ سزا ہے کہ جزا ہے یارو
ہو نہ ہو ہے کہیں نزدیک ہی وہ جانِ حیات — دل دھڑکنے کی ادا بھول رہا ہے یارو
پیرِ مے خانہ ہوا محتسبوں کے بس میں — میں نے کہتے ہوئے رندوں کو سنا ہے یارو
اپنی دھرتی ہی بھلی جس پہ نہیں کوئی کمی — آسمانوں پہ تو صرف ایک خدا ہے یارو
زندگی کے یہ کڑے کوس حقائق کی یہ دھوپ — شاعری سایۂ دیوار رہا ہے یارو
کیا زمانہ ہے کہ صرف اپنی انا کی خاطر — آدمی نام وطن بھول چکا ہے یارو

لفظ و معنی کی یہ توہین کہ نازشؔ ہم نے
دشمنوں کو بھی لکھا اور کہا ہے "یارو"

---

[1] مجھ کو شاعر نہ کہو میرؔ کہ صاحب میں نے — درد و غم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا — میرؔ

نازش پرتاب گڈھی

۰

خاموشیوں کو ندرتِ گفتار کہہ گئے
کیا لوگ تھے جو دار کو دلدار کہہ گئے

طوقِ ورسن کو نام دیا زلفِ دوست کا
زنداں کو سایۂ مژۂ یار کہہ گئے

اپنی ہی طرح وہ بھی رہینِ ستم تھے ۔ جو
شام و سحر کو کاکل و رخسار کہہ گئے

ہاں اے حیاتِ سخت و گراں! ہم یہ ناز کر
ہم تھے کہ ہر ستم کو ترا پیار کہہ گئے

اب اور کیا رکھا ہے ترے وحشیوں کے پاس
اک حرفِ شوق تھا جو سرِ دار کہہ گئے

سمجھے تھے ذمہ دارِ وقارِ چمن جنھیں
نرگس کو وہ بھی دیدۂ بیمار کہہ گئے

اپنی ذہانتوں نے دیا اس طرح فریب
خوابوں کو ہم بلندیٔ افکار کہہ گئے

اے زندگی! وہی قدِ رعنائے حسن تھا
تیرے ادا پرست جسے دار کہہ گئے

ملتے مرے غموں سے تو بیخ اٹھتے وہ بزرگ
جو خامشی کو عظمتِ کردار کہہ گئے

نازشؔ وہ خود بھی آخری دم تک جیا کئے
جو لوگ زندگی کو اک آزار کہہ گئے

نازش پرتاب گڈھی

○

غربت میں پوچھتے پھرے اک اک بشر سے ہم
کیوں کتنی دور چل گئے بھلا اپنے گھر سے ہم

اس شوق کم کہ بچ کے چلیں سنگِ در سے ہم
اُلجھے قدم قدم پہ خود اپنے ہی سر سے ہم

کچھ یوں اُٹے غبارِ سرِ رہ گزر سے ہم
منزل پہ آکے ہوگئے نامعتبر سے ہم

چپ ہیں کہ یہ وقارِ چمن کا سوال ہے
واقف ہیں ورنہ موسمِ دیوانہ گر سے ہم

ذوقِ جنوں، یقینِ محبت، خلوصِ غم
کس کس کو ساتھ لے کے اُٹھیں تیرے در سے ہم

ہے صرف پاسِ وضع کہ چلتے ہیں ساتھ ساتھ
ورنہ بہت بلند ہیں شام و سحر سے ہم

آتا نہیں ہے یاد بیابانِ زیست میں
کچھ تو ضرور سوچ کے نکلے تھے گھر سے ہم

دنیا نے کاروبارِ پرستش دیا قرار
کچھ کہہ رہے تھے جھک کے ترے سنگِ در سے ہم

حیراں کھڑے ہیں مصلحتِ وقت کے حضور
کیوں اے جنوں! اسی لئے نکلے تھے گھر سے ہم

آوارۂ حیاتِ ستم ہو کے رہ گئے
دو ہی قدم ہٹے تھے تری رہگزر سے ہم

ترکِ تعلقات کے بعد اب یہ حال ہے
بے گانہ ہو چلے ہیں خود اپنی نظر سے ہم

سو بار اِس فرار سے بہتر ہے خودکشی
کیا گلستاں کو چھوڑ دیں بجلی کے ڈر سے ہم

نازشؔ گلہ تو خیر کسی سے نہیں مگر
پچھتائے اپنی کاوشِ عرضِ ہنر سے ہم

اظہر سعید

○

دم بھر کو پاس آ کے ٹھہرتا نہیں کوئی
اب تو کسی سے بات بھی کرتا نہیں کوئی

یوں اُٹھ گئی جہاں سے اُمیدِ وفا کہ اب
اہلِ جفا کو نام بھی دھرتا نہیں کوئی

اب وجہِ انفعال نہیں ہے شکستِ عہد
وعدہ وفا نہ ہو تو مُکرتا نہیں کوئی

جاں صدقۂ نگاہ تھی کچھ قرض تو نہیں
آنکھیں چُرا کے ہم سے گزرتا نہیں کوئی

اب دل کو خون کیجے، کہ جاں کو لٹائیے
بہرِ نظارہ بھی تو ٹھہرتا نہیں کوئی

کانٹوں سے ربطِ آبلہ پائی نہیں رہا
راہیں پکارتی ہیں گزرتا نہیں کوئی

کیا قحطِ آرزو ہے کہ ہر پیکرِ بہار
آنکھوں میں ہے پہ دل میں اُترتا نہیں کوئی

ہم داد خواہ ہوں ہمیں یہ شرم اور اُدھر
اقرار اپنے جرم کا کرتا نہیں کوئی

بے خونِ دل دوام کہاں سعیِ شوق کو
کھینچو ہزار نقش اُبھرتا نہیں کوئی

اُس بزمِ ناز سے کوئی آئے تو پوچھیے
کیا اب ہمارا ذکر بھی کرتا نہیں کوئی

○

خواہشِ نکہت و شوقِ گُلِ تر رکھتے ہیں
ہم کو سودائے بہاراں ہے کہ سر رکھتے ہیں

ہم نے بھی گردشِ دوراں سے بہت پایا ہے
ہم بھی اک سلسلۂ شام و سحر رکھتے ہیں

کیا ملا دوست تری جلوہ گری سے ہم کو
مگر اتنا کہ اک اندازِ نظر رکھتے ہیں

بزمِ خورشید میں شبنم کے خریدار کہاں
کس کو دکھلائیں کہ ہم دیدۂ تر رکھتے ہیں

اپنے گھر کو بھی کبھی کہہ نہ سکے گھر اپنا
ہائے وہ لوگ جو اُس کوچہ میں گھر رکھتے ہیں

دل جلایا ہے کہ منزل کے نشاں ہیں کم کم
اک چراغ اور سرِ راہ گزر رکھتے ہیں

پھر ہوا وقت کہ ہو تیشۂ فرہاد بلند
بے ہنر ٹھہرے ہیں جو دستِ ہنر رکھتے ہیں

عظمت بدنام

○

دور سے آتی ہوئی کوئی صدا ہوں جیسے
روز و شب خود کو ہی میں ڈھونڈ رہا ہوں جیسے

میں کہ خورشید و قمر میں کہ چراغِ محفل
اک زمانے سے مگر بجھ سا گیا ہوں جیسے

کبھی معلوم ہوا کوئی خدا ہے میرا
کبھی محسوس ہوا میں ہی خدا ہوں جیسے

تو کسی گوشے میں محوِ غمِ تنہائی ہے
میں کسی موڑ پہ خاموش کھڑا ہوں جیسے

بند کر لیتا ہوں آنکھیں تو سکوں ملتا ہے
سینکڑوں راتوں سے میں جاگ رہا ہوں جیسے

کوئی آنسو بھی نہیں ہے سرِ مژگاں لیکن
کوششِ ضبطِ الم چھوڑ چکا ہوں جیسے

اک سمندر سا ہے پھیلا ہوا تا حدِّ نظر
تشنہ لب میں کسی ساحل پہ کھڑا ہوں جیسے

مجھ کو یوں لگتا ہے عظمت کئی صدیوں سے
درد بن کر دلِ گیتی میں پلا ہوں جیسے

○

کیا خریدیں کوئی غم اس جگمگاتے شہر میں
بک گئے ہیں خود ہی ہم اس جگمگاتے شہر میں

سینکڑوں خورشیدِ تاباں سینکڑوں ماہ و نجوم
روشنی ہے پھر بھی کم اس جگمگاتے شہر میں

خود کو بھی میں بھول جاتا ہوں گھڑی بھر کے لئے
تیرے عارض کی قسم اس جگمگاتے شہر میں

دیکھنا یہ ہے پسِ ہنگامۂ رقص و سرود
کتنے خوابیدہ ہیں غم اس جگمگاتے شہر میں

ہیں نمایاں مثلِ داغِ سینۂ ماہِ فلک
اب کے نقشِ قدم اس جگمگاتے شہر میں

کوئی دامن تھام کر پوچھے اگر تو کیا کہیں
کس لئے آئے تھے ہم اس جگمگاتے شہر میں

اب کہاں جائیں مقدر آزمانے کے لئے
سوچتے ہیں آ کے ہم اس جگمگاتے شہر میں

پھر رہا ہوں کوبکو عظمت میں غالب کی طرح
کان پر رکھ کر قلم اس جگمگاتے شہر میں

شمیم حنفی

○

بند کر لے کھڑکیاں یوں رات کو باہر نہ دیکھ
ڈوبتی آنکھوں سے اپنے شہر کا منظر نہ دیکھ

میں نے پتھر سہہ لئے، لیکن صدا قاتل ہوئی
خود کو لفظوں سے بچا، گرتے ہوئے پتھر نہ دیکھ

ایسا ہنگامہ کہ آوازِ نفس خاموش ہے
زندگی کی بات کر یہ عرصۂ محشر نہ دیکھ

مدتیں گزریں اسی گھر میں تری تصویر تھی
آج خود کو دیکھ لے، میرا پرانا گھر نہ دیکھ

تو نے جو پرچھائیاں چھوڑیں وہ صحرا بن گئیں
اے نگارِ وقت اب پیچھے کبھی مڑ کر نہ دیکھ

کیا پتہ زنجیر میں ڈھل جائے چادر کی شکن
یہ سفر کا وقت ہے اب جانب بستر نہ دیکھ

خاک و خوں میراث میری، خاک و خوں تیرا نصیب
اس زیاں خانے میں اپنے پاؤں کا چکر نہ دیکھ

○

دل اگر دل ہے تو پھر درد سے ڈرتا کیوں ہے
ایک آواز کی جنبش پہ بکھرتا کیوں ہے

کیوں اُسے دیکھ کے جی اٹھتا ہے سورج تیرا
اور راتوں کو اسی شخص پہ مرتا کیوں ہے

جس کی دیوار میں گھٹ جاتا ہے سایہ میرا
نیند آنے پہ اسی گھر میں ٹھہرتا کیوں ہے

تو خفا ہے کہ تری سمت نہ دیکھا میں نے
پھر مرے ذہن کی وادی سے گزرتا کیوں ہے

اَن گنت اُلجھی لکیریں ہیں ترے ماتھے پر
تیز چلتی ہیں ہوائیں تو سنورتا کیوں ہے

جس کے ذرّوں میں چھپے بیٹھے ہیں شعلوں کے سفیر
دل اُسی ریت کے دریا میں اُترتا کیوں ہے

ٹوٹ جاتا ہے نشہ لذتِ تنہائی کا
لوحِ خلوت پہ کوئی نقش اُبھرتا کیوں ہے

ذکا صدیقی

○

حقیقتوں کے خداؤ! ذرا ٹھہر جاؤ
کچھ اور خواب دکھاؤ، ذرا ٹھہر جاؤ

اخیرِ شب کی دعاؤ! ذرا ٹھہر جاؤ
مرا بھرم نہ گنواؤ، ذرا ٹھہر جاؤ

کس اعتماد سے غنچوں نے سر اُٹھایا ہے
خزاں کی تیز ہواؤ! ذرا ٹھہر جاؤ

سحر بھی آئے گی، شب کے مؤرخو! ٹھہرو
ابھی قلم نہ اٹھاؤ! ذرا ٹھہر جاؤ

اُبھر رہی ہے درِ دل پہ پھر کوئی دستک
خموشیوں کی صداؤ! ذرا ٹھہر جاؤ

گماں ہی رہو اے میری حسرتو کچھ اور
یقین بن کے نہ آؤ! ذرا ٹھہر جاؤ

تمھارے شعر ہیں یا جوگیا کی تصویریں
ذکاؔ کچھ اور سناؤ! ذرا ٹھہر جاؤ

○

دل ہے اک تنہا مسافر، آرزو اک شہر ہے
کس گلی کو ڈھونڈیئے، یاں کو بہ کو اک شہر ہے

وہ گلی جو کھو گئی ہے جستجو کے شہر میں
کیا پتا بتلائیں اس کا، ہو بہو اک شہر ہے

حسرت و امید ہی کیا، زندگی کے سامنے
ہرطرن سو راستے ہیں، چار سو اک شہر ہے

یاس کہتی ہے کہ آگے بند ہے ہر راستہ
آس کہتی ہے؛ وہ تیرے روبرو اک شہر ہے

جانے کب سے پھر رہا ہوں آپ اپنے ارد گرد
زندگی اک قافلہ ہے، جستجو اک شہر ہے

کتنی آوازوں کا دم گھونٹے ہوئے ہے خامشی
کیسے ویرانے تھے وہ جن کا لہو اک شہر ہے

سید مظہر حسین رزمی

○

جب بھی امیدوارِ نگاہِ کرم ہوئے
کچھ اور حادثات کے ساماں بہم ہوئے

کچھ اور بڑھ گئی خلشِ دل کی آرزو
جب حسنِ اتفاق سے ہم تم بہم ہوئے

الزام کیسے کیسے دئے اہلِ بزم نے
کیا کیا مری وفا کے فسانے رقم ہوئے

یہ دیکھئے کہ کس کو زمانے نے کیا دیا
جو بے نیازِ علم رہے محترم ہوئے

اس اک نگاہِ خاص کا حاصل نہ پوچھئے
بارِ غمِ جہاں سے سُبک دوش ہم ہوئے

وہ لوگ تھے جو عظمتِ دیرینہ کے نشاں
کیا جانئے وہ آج کہاں جا کے ضم ہوئے

دیکھا اُسے تو پایا سراپا وفا شعار
رزمی سے آج مل کے بہت شاد ہم ہوئے

○

جذبۂ دل کا اثر کس پہ ہوا آخرِ شب
کون پیمانِ وفا باندھ گیا آخرِ شب

کس کو یاد آ گئے ہم کس نے پکارا ہم کو
کون دیتا ہے درِ دل پہ صدا آخرِ شب

جانے کس رنگ میں ہوتی ہے نمودارِ سحر
آئی غنچوں کے چٹکنے کی صدا آخرِ شب

دل سلگ اٹھتا ہے بڑھ جاتی ہے بیتابیٔ جاں
جب سنکتی ہے ذرا سرد ہوا آخرِ شب

دل پہ اک چوٹ سی لگتی ہے جو یاد آتا ہے
مجھ سے مل کر ترا ہونا وہ جدا آخرِ شب

تیرے غم خانے میں ہو جاتی ہے یادوں کے طفیل
وقت سے پہلے سحر جلوہ نما آخرِ شب

آؤ غم خانۂ رزمی میں تو دکھلائیں تمہیں
دلِ بسمل کے تڑپنے کی ادا آخرِ شب

محمود خاور

○

گیتوں کی صدائیں ہیں نہ خوابوں کا پتا ہے
اک شخص ترے شہر میں حیران کھڑا ہے
آہوں کی مناجات نہ اشکوں کی دعا ہے
جیسے کوئی مجھ سے مرے گیتوں سے خفا ہے
پیوست ہوئی تیغِ سحر سینۂ شب میں
تاریک روایات نے دم توڑ دیا ہے
پھولوں کے ستاروں کے دھڑکتے ہوئے دل سے
دنیا نے ترے پیار کا افسانہ سنا ہے
اُمید کی اک شمع جلائے ہوئے کوئی
یادوں کے دریچے میں اسی طرح کھڑا ہے
لرزاں مرے احساس کے پیروں پہ ابھی تک
اللہ یہ کس ٹوٹے ہوئے دل کی صدا ہے
ایسے میں کرے کس سے دلاسے کی توقع
وہ دامنِ گل ہے نہ کہیں دستِ صبا ہے
اس رات بھی صدیوں کی امیدوں کو جلائیں
اس رات بھی کہتے ہیں خدا جاگ رہا ہے
امید کا اک لمحۂ آوارہ ابھی تک
سائے کے تعاقب میں سرِ دشتِ وفا ہے
ملتا ہے مجھے غم کے اندھیروں سے اُجالا
محمود مرے شعر کا اسلوب نیا ہے

سعادت نظیر

○

نہ غم گسار نہ مونس، نہ رازدار کے پاس
سکوں ملا تو اسی شوخ فتنہ کار کے پاس
مری حیات کا عالم ہی اب کچھ ایسا ہے
فضائے غنچہ و گل جیسے خارزار کے پاس
ہر ایک سانس پہ آہٹ نہ جانے کس کی ہے؟
نظر کی حد سے اُدھر، دل کی رہ گزار کے پاس
حسین خواب محبت کے، زخمِ دل کے گلاب
یہ نعمتیں ہیں فقط تیرے بے قرار کے پاس
خیال آیا ہے تعمیرِ آرزو کا مجھے
غمِ خیال کے اُجڑے ہوئے دیار کے پاس
کشش یہ تشنہ لبی کی ہے، پیرِ مے خانہ
چھلکتے جام کہاں ورنہ بادہ خوار کے پاس
الٰہی آگ کہیں پھر بھڑک نہ اٹھی ہو
قفس سے دور اُجالا ہے لالہ زار کے پاس
غمِ معاش، غمِ دل، غمِ جہاں کے سوا
کچھ اور پاؤ گے کیا مجھ سے دل فگار کے پاس
بلا سے بدلے ہر اک لمحہ گردشِ افلاک
رہا ہی کیا ہے اب اس تیرے خاکسار کے پاس
نظیر جس کی نظر میں ہو احترام اپنا
مقام اسی کا ہے دنیائے اعتبار کے پاس

نثار پرویز

○

تری ہی یاد لئے اپنے ہم سفر کی طرح
چلا ہوں جانے کہاں تیری رہ گزر کی طرح

تمھیں بتائیں، کہاں رات ختم ہوتی ہے
کبھی ملو تو سہی صبحِ منتظر کی طرح

نگاہ و فکر، بگولوں کی دھول ہو جیسے
یہ زندگی ہے کسی تیز دوپہر کی طرح

یہ میرا شہر ہے یا کوئی آئینہ خانہ
ہر اک نظر ہے مری غمزدہ نظر کی طرح

بکھرے، دھوپ میں یہ دن کہ جد و جہدِ حیات
گھٹی گھٹی ہوئی راتیں غمِ بشر کی طرح

خیال و فکر ہی ہر رہ گزر بناتے ہیں
نگاہِ شوق ہی ہوتی ہے راہبر کی طرح

یہ درد جان ہی لے لے تو ٹھیک ہے ورنہ
جہاں میں کون ہے پرویز چارہ گر کی طرح

شاہد اکبر پوری

○

دور سے کرن کوئی جب بھی گنگناتی ہے
روشنی کی آہٹ پر رات چونک جاتی ہے
طور تک صدا کوئی جا کے لوٹ آتی ہے
جانے کس اُجالے کو چاندنی بلاتی ہے
صبح فیصلہ شاید اب قریب آ پہنچی
مجرموں کی محفل میں شمع تھرتھراتی ہے
سبز باغ کی خوشبو ہم کو کیا سُلائے گی
خواب دیکھتے ہیں جو اُن کو نیند آتی ہے
تیرگی کی آنکھوں میں خاک ڈال دیں گے ہم
گر ہی نظر اپنی وہ قدم اٹھاتی ہے
شمعِ تشنگی میری، ہنس کے پھونکنے والو!
صبح نے کدھر دیکھیں کس کے کام آتی ہے
ایک صبحِ نو جس کا انتظار ہے ہم کو
وہ سحر تمھیں دیکھیں کیسے داغ کھاتی ہے
میرے شعر کی خوشبو، خلد تک گئی شاہد
پھول کی مہک لیکن، کس کے ہاتھ آتی ہے

طلحہ رضوی برقؔ

○

گماں ہے برقِ تپاں کو شاید اِدھر وہ عزم جواں نہیں ہے
جو بال و پر ہیں مرے سلامت تو آشیانہ کہاں نہیں ہے
مرے جنوں سے سنور گئی ہے عروسِ دوراں کی زُلفِ پُر خم
نہ ہو جو رنگیں لہو سے میرے کہیں کوئی داستاں نہیں ہے
ہوں خود ہی میں خوگرِ حوادث جو موجِ طوفاں سے کھیلتا ہوں
غلط سمجھتے ہیں اہلِ ساحل سفینۂ دباد باں نہیں ہے
میں دشتِ پُرہول تک گیا ہوں تلاشِ منزل میں پا بہ جولاں
جنونِ وارفتہ میرا ہرگز اسیرِ کوئے بُتاں نہیں ہے
نظامِ مے خانہ منحصر ہے پسندِ رندانِ بادہ کش پر
خلافِ جمہورِ مے کدہ ہو مجالِ پیرِ مغاں نہیں ہے
نہ جانے کیا سوچتی ہے بلبل بہار میں بھی رواں ہیں آنسو
کلی کلی کھل کے کہہ رہی ہے خزاں نہیں ہے خزاں نہیں ہے
چمن کو صیّاد کی نگاہِ بہانہ جو نے قفس کیا ہے
طیورِ گلشن سمجھ رہے ہیں کہ گھات میں باغباں نہیں ہے
جمالِ محبوب پردوں ہی میں جو دیکھ لینے کی شرط ٹھہری
یہ کیسے کہہ دیں بتا تو ناصح کہاں وہ ہے اور کہاں نہیں ہے
سوا ہے ان سے مقام اپنا میں برقؔ رشکِ ملک ہوں خود ہی
مری نظر میں عروجِ نوعِ بشر کی حد آسماں نہیں ہے

ابوالخیر کشفی
(نیویارک سے)

اس کو بھی غزل کہیے

فن کار کی آنکھوں میں تھکن کل نہ رہے گی
ناقدریٔ اربابِ سخن کل نہ رہے گی
چٹکے گی تخیّل کی کلی اپنے چمن میں
افکار کے ماتھے پہ شکن کل نہ رہے گی
ہے زخمِ جگر مطلعِ انوارِ تمنّا
یہ شامِ غریبانِ وطن کل نہ رہے گی

امید کے سبزے پہ چلیں گے سبھی راہی
یوں خاک بسر خاکِ وطن اب نہ رہے گی
دیکھے ہیں نگاہوں میں محبت کے کنائے
بے مہری آہوئے ختن اب نہ رہے گی

آئی جرسِ گُل کی صدا میرے نفس سے
پامالِ خزاں میرا چمن اب نہ رہے گا
منصور کی آواز صلیبوں سے بڑی ہے
وہ مرحلۂ دار و رسن اب نہ رہے گا
اک سیلِ رواں ہے کہ نئی فکر کا دھارا
وہ سلسلۂ رسمِ کہن اب نہ رہے گا

ابوالخیر کشفی

○

سوادِ وحشت و ظلمت میں ہے سحر خاموش
دعائے نیم شبی، غنچۂ لب اثر خاموش

کسی کے لب پہ کوئی حرفِ اعتبار نہیں
ہوئے ہیں کیسے رفیقانِ معتبر خاموش

ہنر فروش بنے صدرِ بزمِ گویائی
تمہارے دور میں ہیں صاحبِ نظر خاموش

اگر فسانۂ منزل نہیں، غزل ہی سہی
کٹے گا ہم سفرو کس طرح سفر خاموش

کسی کے شہر میں کشفی ملی تھی گویائی
دیارِ حضرتِ واعظ میں حرفِ تر خاموش

زیب غوری

○

دلوں کو دردِ تمنّا سے بے قرار کرو
طوافِ رہ گزرِ موسمِ بہار کرو

بہار آ کے رہے گی مناؤ جشنِ بہار
دلوں کو چاک، گریباں کو تار تار کرو

اُڑا کے خاک کرو دشتِ شوق کی تنظیم
بڑھا کے قدموں کو تکریمِ نوکِ خار کرو

کوئی بھی دل نہ رہے دردِ زیست سے خالی
روش اب ایسی کریمانہ اختیار کرو

اُتر رہا ہے تجلّی کا قافلہ، یارو
سحر کے دام میں خورشید کو شکار کرو

رواں ہے خونِ شہیداں برس رہی ہے حیات
کبھی تو ایک نظر سوئے جشن دار کرو

حریمِ ناز میں برپا ہے شورِ عیش و طرب
جبیں کو سجدۂ در سے نہ داغدار کرو

ابھی جھلکتا ہے مایوسی حیات کا رنگ
کچھ اور اپنے تبسّم کو باوقار کرو

تکلّفاتِ الم چھوڑو، آہ و گریہ کیا
غموں پہ ہنس کے زمانے کو شرمسار کرو

نسیمِ صبح نویدِ بہار لائی ہے
لہو کی آگ سے زنداں کو لالہ زار کرو

رہو گے شاکرِ تقدیرِ بے عمل کب تک
کچھ اپنی قوّتِ بازو پہ اعتبار کرو

ابھی مہک نہیں سکتے یہاں لبوں کے گلاب
اٹھو فضائے گلستاں کو سازگار کرو

بدل نہ دے گا حقیقت کو زیست کی یہ گریز
بڑھو تو آگے نگاہیں تو اپنی چار کرو

کم اپنا زور نہ ہوگا صفوں کے گھٹنے سے
ہمارے ساتھ شہیدوں کو بھی شمار کرو

جنوں کو نذر کرو درد کی کوئی سوغات
دلوں کو پھول کی پتّی ہی سے فگار کرو

ملا کے خاک میں بھی زندگی کو دیکھ لیا
کچھ اور شرحِ سکوتِ نگاہِ یار کرو

یہ اضطراب ہی جانِ حیات ہے اے زیب
[illegible] تڑپنے سے زخموں کو غم سے پیار کرو

زیب خوردی

○

فروغِ لالہ و گل سے دلوں کی پامالی تک
تمناؤں پہ کیا گزری ہے جشنِ برشگالی تک

بہر عنوان لہو محنت کشوں کا جگمگاتا ہے
شفق کے رنگ سے پگھلے ہوئے لوہے کی لالی تک

ہماری بے صلہ محنت نے کیا کیا گل کھلائے ہیں
طلائی طرۂ دستار سے گیہوں کی بالی تک

فضا کیا کیا ملی نشو و نمائے غیرتِ دل کی
کسی محوِ خود آرائی سے اپنی خستہ حالی تک

اسیری میں بھی میرے بارِ نغمہ سے لچکتی ہے
قفس کی تیلی تیلی، گلستاں کی ڈالی ڈالی تک

بہکنے کا بہانہ چاہیے بس میری مستی کو
مجھے سرشار کر دیتا ہے یارو جام خالی تک

ادا و غمزہ و انداز کی قسمت چمک اٹھی
بیانِ حسن جب پہنچا مری نازک خیالی تک

رسائی کم نہیں ہے گردشِ ایام کی یارو
بہت سمجھو اگر پہنچی ہے یہ مجھ لاابالی تک

ٹھکانا ہے کوئی اے زیب اپنی تیرہ بختی کا
عروج مہر کب پہنچا ہماری پائمالی تک

نظمیں

- احمد ندیم قاسمی
- مجروح سلطان پوری
- نازش پرتاب گڑھی
- قمر ہاشمی
- فروغ تکنت
- اسلم آزاد

احمد ندیم قاسمی

عشق کرو

عشق کرنے کا یہی وقت ہے اے انسانو
اس سے بہتر کوئی لمحہ تمھیں شاید ہی ملے

اس سے پہلے کبھی نفرت کے یہ معیار نہ تھے
جنگ کرتے تھے فقط اپنے تحفظ کے لئے
نوعِ انساں سے تو تم برسرِ پیکار نہ تھے
حسن و زیبائیٔ عالم سے تو بیزار نہ تھے

وہ بھی کیا دن تھے کہ تہذیب ترقی پہ نہ تھی
جب عداوت کے بھی آداب ہوا کرتے تھے
ذہن بنجر نہیں، شاداب ہوا کرتے تھے

اب تو انسان کچھ اس زور کا جذباتی ہے
جنگ، کلیوں کے چٹکنے سے بھی چھڑ جاتی ہے

اِس طرح چاک ہوا پیرہنِ امن و سکوں
رہ نمایانِ سیاست سے یہ شاید ہی سِلے
اپنے فن کار کا اک بار تو کہنا مانو
اِس سے بہتر کوئی لمحہ تمھیں شاید ہی ملے
عشق کرنے کا یہی وقت ہے اے انسانو
اتنی نفرت بھی نہ بوؤ کہ قیامت کاٹو
عشق کر لو کہ یہی عشق ہے اب شرطِ بقا

پتّھروں نے اسی قوّت سے اُبھارے کہسار
یہی قوّت ہے سمندر، یہی قوّت صحرا
اسی قوّت سے ہے مربوط ستاروں کا نظام
شاخِ گل ہے اسی قوّت کے سہارے گلنار
یہی قوّت ہے توازن، یہی قوّت ہے خدا

آج ہو جائے جو انسان کو انسان سے پیار
چار سو ایک تبسّم کا ہو عالم طاری
صحنِ گلشن میں بدل جائے یہ دھرتی ساری
توپ ہو روئے زمیں پر، نہ فضا میں بم بار

لاکھ طوفان اُٹھیں، لاکھ عناصر گرجیں
عشق چاہے تو شجر کیا کوئی پتّا نہ ہلے
آدمیّت کا جو منصب ہے، اُسے پہچانو
اِس سے بہتر کوئی لمحہ تمھیں شاید ہی ملے
عشق کرنے کا یہی وقت ہے اے انسانو

مجروح سلطان پوری

قصیدہ

(لتا منگیشکر کے نام)

مجھ سے چلتا ہے سرِ بزمِ سخن کا جادو
چاند لفظوں کے نکلتے ہیں مرے سینے سے
میں دکھاتا ہوں خیالات کے چہرے سب کو
صورتیں آتی ہیں باہر مرے آئینے سے

ہاں مگر آج مرے طرزِ بیاں کا یہ حال
اجنبی کوئی کسی بزمِ سخن میں جیسے
یہ خیالوں کے صنم اور یہ الفاظ کے چاند
بے وطن ہو گئے اپنے ہی وطن میں جیسے

پھر بھی کیا کم ہے جہاں رنگ نہ خوشبو کوئی
تیرے ہونٹوں سے مہک جاتے ہیں افکار مرے
میرے لفظوں کو جو چھو لیتی ہے آواز تری
سرحدیں توڑ کے اُڑ جاتے ہیں اشعار مرے

جس گھڑی ڈوب کے آہنگ میں تو گاتی ہے
آیتیں پڑھتی ہے سازوں کی صدا تیرے لئے
دم بدم خیر مناتے ہیں تری چنگ و رباب
سینۂ نے سے نکلتی ہے دعا تیرے لئے

تجھ کو معلوم نہ ہو یا تجھے معلوم بھی ہو
وہ سیہ بخت جنھیں غم نے ستایا برسوں
ایک لمحے کو جو سن لیتے ہیں نغمہ تیرا
پھر انھیں رہتی ہے جینے کی تمنا برسوں

نغمہ و ساز کے زیور سے رہے تیرا سنگار
ہو تری مانگ میں تیرے ہی سُروں کی افشاں
تیری تانوں سے تری آنکھ میں کاجل کی لکیر
ہاتھ میں تیرے ہی گیتوں کی حنا ہو رخشاں

نازش پرتاپ گڑھی

متاعِ قلم

عجب مقام پر انسان کا بسیرا ہے
چمن ہے کنجِ قفس، راہبر لٹیرا ہے
رہِ حیات میں تا دور سخت اندھیرا ہے
سخن کی جوت بڑی چیز ہے، جگائے رہو
لٹا دو خود کو ـــــ متاعِ قلم بچائے رہو

قلم کی آن پر آئے نہ آنچ دیوانو ـــــ
قلم اٹھانے سے پہلے قلم کو پہچانو ـــــ
زماں، مکاں سے بھی آگے ہے منتہائے قلم
جنوں کی آخری منزل ہے ابتدائے قلم
قلم سے اپنے بھی ناخوش ہیں، غیر بھی برہم
قلم نے توڑ دیا ہے بڑے بڑوں کا بھرم
قلم اندھیروں کو دیتا ہے روشنی کا مزاج
قلم خداؤں سے لیتا ہے بندگی کا خراج

رموزِ جنبشِ اعراب جاننے والو
اک ایک لفظ کے آداب جاننے والو
حروف چیخ رہے ہیں ہمیں اُجالے رہو
سخن کی لاج بچاؤ، قلم سنبھالے رہو

قلم کے درپئے آزار ہے مروّت بھی
قلم کی گھات میں بازی گرِ سیاست بھی
قلم کا دشمنِ جاں نشۂ حکومت بھی
قلم خریدنے اُٹھے ہیں اہلِ دولت بھی
قلم دبے گا تو پھر رات زہر بوئے گی
قلم بکے گا تو اک نسل خون روئے گی
خبر ہے کہ تمہارا جو لمحہ گزرے گا
پلٹ کے صفحۂ تاریخ پردہ اُبھرے گا
تمہارے بعد نئی نسل جو بھی آئے گی
تمہاری لغزشِ مبہم کو بھی نہ بھولے گی
قلم سے ٹپکے شرارے الاؤ بنتے ہیں
قلم کے چھوڑے ہوئے داغ گھاؤ بنتے ہیں
مؤرّخ اور تو سب پر نظر نہیں کرتا
قلم کا جرم مگر درگزر نہیں کرتا

فریب و کذب کا طوفان بڑھتا جاتا ہے
فسونِ تیرہ شبی ہے کہ بڑھتا جاتا ہے
یہ وقت وہ ہے کہ شمعوں کی طرح جلتے رہو
قلم کی نوک سے نورِ حیات اُگلتے رہو
بہ کارِ حوصلۂ زندگی لکھے جاؤ ——
برائے نور و پئے روشنی لکھے جاؤ
بہ فیضِ دانش و صد آگہی لکھے جاؤ
لکھو لکھو کہ مسلّط جنون ہو نہ سکے!
لکھو لکھو کہ صداقت کا خون ہو نہ سکے!
لکھو۔ بگاڑ کو نادان کہہ رہے ہیں بناؤ

لکھو کہ سڑکوں پہ نوحہ کناں ہیں روح کے گھاؤ
لکھو کہ زیست کی دیوار سے وہ ٹیک لگاؤ
لکھو سراب ہیں یہ پھول ان کے پاس نہ جاؤ
لکھو کہ ساقیٔ میخانہ سائلوں میں ہے
لکھو کہ جھوٹ کا انبار فائلوں میں ہے
لکھو فریب کے چہرے یہاں سنورتے ہیں
لکھو کہ لوگ نہ جیتے ہیں اور نہ مرتے ہیں
لکھو حیات کو قسطوں میں قتل کرتے ہیں
لکھو کہ صرف اندھیرا ہے جلوہ گاہوں میں
لکھو کہ عدل بھی شامل ہوا گناہوں میں
ہر ایک درد کو غم کو رقم کئے جاؤ
ہر اک ستم کو سپردِ قلم کئے جاؤ
قلم سنبھال کے رکھے گا اس امانت کو
سپردِ فردا کرے گا تمہاری جرأت کو
نشانِ جادۂ حق ہر نفس دئے جاؤ
یہ قرضِ زیست ہے تم پر ادا کئے جاؤ

نگاہِ زیست پہ تاریکیوں کا پردہ ہے
دلِ حیات پہ جو زخم بھی ہے، گہرا ہے
نفس نفس غمِ زنداں ہے اتحاں کے لئے
ہزار عشوۂ ظلم اک تمہاری جاں کے لئے
ٹہل رہے ہیں سرِ راہ، مکر کے اژدر
قدم قدم پہ ہیں ذہن و نظر کے سوداگر
ہے موڑ موڑ پہ فکر اور فن کی لوٹ مگر

کسی جتن سے متاعِ قلم بچائے رہو
خود اپنے دوش پر اپنی صلیب اُٹھائے رہو
سخن کی جوت بڑی چیز ہے جگائے رہو
فرازِ دار کو ٹھہراؤ بزمِ جشنِ طرب
جو بڑھ رہی ہے تو بڑھتی رہے سیاہیٔ شب
قلم بچائے رہو ساکنانِ عرشِ ادب

کسی قلم کے تلے آفتاب جاگے گا
کوئی قلم ہی لئے انقلاب جاگے گا

قمر ہاشمی

فصیل

فطرت ہے ازل سے آدمی کی
ساحل پہ اُمید و بیم کے وہ
تعمیر کرے نئے گھروندے
اور جب یہ گھروندے ٹوٹ جائیں
خود اپنا مذاق اڑا کے خوش ہو

خوابوں میں اُبھر کے ڈوبتے ہیں
دیوار ہیں ریت کی جزیرے
تاروں کی سفید اپسرائیں
ہوتا ہے جہاں کبھی اوپیرا
انسان کی دسترس سے ہیں دور
یادوں کے رسول ــــ غنچہ و گل
تشریح نشاط کر رہے ہیں
بیتے ہوئے دن اُبھر رہے ہیں
خوشبو کسی اجنبی بدن کی

پھیلی ہے فصیل جسم وجاں تک
دل ڈوب رہا ہے چاندنی میں
گزرے گی یہ رات بے کلی میں
میں سایۂ شعلۂ چمن ہوں
تم قیصر کے گھر کی چاندنی ہو
میں پیار کی چھاؤں میں پلا ہوں
اب پیار کے زہر سے مروں گا
تم شبنم گل کا ہو مقدّر
ڈوبو گی خود اپنے آنسوؤں میں
تم میری فصیل آرزو تھیں
اور اب یہ فصیل گر چکی ہے
میں دب کے اسی میں مر گیا ہوں

فروغ تمکنت

نیا عہد نامہ

اس نئے عہد میں
زندگی سخت ہے بے ستوں کی طرح
ہاتھ میں لے کے تیشے اٹھیں جہد کے
ہم کہ فرہاد ہیں اس نئے عہد کے
کوئی پرویز ہو
کوئی چنگیز ہو
خسروی بہہ گئی
عہدِ ماضی کی پگھلی ہوئی برف میں
اب کوئی پیرزن
اپنی منزل کا پتھر نہ بن پائے گی
کوئی آواز
خودکشی کے لئے نوکِ خنجر نہ بن پائے گی
اب ہماری ڈگر ہے ہماری ڈگر
اب ہمارا سفر ہے ہمارا سفر
اب ہماری نظر ہے ہماری نظر
—— تیرگی اب مقدر نہ بن پائے گی
دودھ کی نہر کی آرزوئے حسیں
ذہن پر چھا گئی ہے فسوں کی طرح
سخت ہیں زندگی کی چٹانیں تو کیا
کاٹ دیں گے انھیں بے ستوں کی طرح
ہم کہ فرہاد ہیں اس نئے عہد کے

تبصرے

"پت جھڑ کی آواز"

قرۃ العین حیدر کے افسانوں کا مجموعہ

مطبوعہ :- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ۔ نئی دہلی

قیمت :- پانچ روپے پچیس پیسے

اس کتاب کو ۱۹۶۷ء کا ساہتیہ اکیڈمی انعام ملا ہے

'پت جھڑ کی آواز' قرۃ العین کے آٹھ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ لیکن ذرا ٹھہریے۔ کیا انھیں افسانہ کا نام دینا مناسب اور ضروری ہے۔ اس لیے کہ ان میں ناولٹ بھی نظر آتے ہیں۔ مثلاً جلا وطن یا ہاؤسنگ سوسائٹی۔ باریک دھاگے میں پروئے یادوں کے دلفریب نقوش بھی ہیں مثلاً "ڈالن والا" یا پھر 'یاد کی ایک دھنک جلے'۔ خاکے بھی ہیں' مثلاً قلندر' کہانیاں بھی جیسے 'کارمن' اور پھر ایک مکالمہ بھی ہے۔ اس لیے فارم اور ٹیکنک یا فنی اسلوب کے اعتبار سے انھیں ایک نام دینا مشکل ہے۔ انصاف کی بات یہ ہے کہ قرۃ العین نے اپنی تخلیقی ذہانت، تازگیٔ احساس اور شعور کی رَو کی ٹیکنک کے محتاط اور ماہرانہ استعمال سے اردو میں افسانے کا روایتی تصوّر بدل دیا۔ اسے نیا رُخ دیا اور نئے امکانات سے آشنا کیا۔ ایک ناقد BATES کے الفاظ میں ان کے یہاں افسانہ سیّال، تغیّر پذیر، غیر متعین اور غیر محدود بادلوں سے مشابہ ہے۔ ایک عام قاری کو بھی داخلی اور خارجی ہیئت کے اعتبار سے ان کی تخلیقات کا نیا پن اور نوع متاثر کیے بغیر نہیں رہتا۔

قرۃ العین کی تخلیقات کے مطالعہ سے یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ حقیقت کی کوئی ایک سطح نہیں ہوتی۔ بلکہ ان گنت ہوتی ہے اور ہر سطح پر دوسری سطحوں کا عکس پڑتا ہے۔ انسانی وجود حقیقت کے اس پیچیدہ روپ کا بہترین مظہر ہے۔ فنکار اسے کسی بھی سطح پر دیکھے اس کے فن کی کامیابی اور کمال کا انحصار اس پر ہے کہ اس نے اسے کس دقتِ نظر سے، کتنی گہرائی تک اور کس زاویۂ نگاہ سے دیکھا ہے۔ قرۃ العین کے فن کے بارے میں یہ واقعہ ادھوری سچائی ہے کہ ان کا موضوع انسان ہے یا اس کے وجود کے وہ لمحے جب وہ بھری دنیا میں تنہا ہوتا ہے جسے ورجینیا ولف نے MOMENTS OF BEING کہا ہے۔ جب وہ خارجی حشر آرائیوں سے بیگانہ اپنی روح کے سناٹے میں اپنی محرومیوں اور نارسائیوں کا حساب کرتا ہے۔ اور جب زمان و مکاں کے حصار اس کے سمندِ شعور کی گردِ پا بن جاتے ہیں۔ بے شک وہ اکثر حقیقت کو اسی سطح پر دیکھتیں اور تلاش کرتی ہیں اور ایسا بھی ہوا ہے خصوصاً ابتدائی دَور میں، جب انھیں یہاں حباب کی طرح نازک، نگوں سار اور بے وزن یادوں اور تمثالوں کے سوا کچھ بھی نہ مل سکا۔ لیکن گزشتہ بیس سال میں ان کے دیکھنے کا زاویہ بدلا ہے۔ اس میں گہرائی اور وسعت پیدا ہوئی ہے۔ اب حقیقت کی اس سطح پر انھیں صرف وقت کا ازلی جبر ہی نہیں سماجی اور طبقاتی تضادات کا جبر بھی صاف نظر آتا ہے' آدمی اور زندگی کے بارے میں ان کا جو وژن ہے وہ بھی بدلتا رہا ہے۔ جذباتی رومان پرستی کے دھندلکوں سے نکل کر اب وہ عقل و شعور سے کسبِ نور کر رہا ہے۔ اس سے ان کے فن میں زیادہ پختگی اور دلآویزی پیدا ہو گئی ہے۔ حقیقت پسندی کا یہ عنصر اس مجموعہ میں "ہاؤسنگ سوسائٹی" اور ایک

مکالمہ' میں خاص طور پر نمایاں ہے۔

اس مجموعہ میں شامل تخلیقات کے دو پہلو قابل ذکر ہیں جو قرۃ العین کے تخلیقی عمل اور فکر و شعور پر خصوصیت سے اثر انداز ہوتے ہیں۔ اوّل یہ کہ تقسیم سے قبل خصوصاً ان کی نو عمری کے متحدہ ہندوستان کی زندگی اور اس عہد کے تجربات و واقعات NOSTALGIC انداز میں ان کے ذہن پر حاوی رہے ہیں۔ دوسرے یہ کہ مذہب اور سیاست کی سازش سے' صدیوں کے صحت مند اور فطری سماجی ارتباط کی بنیاد پر تعمیر ہونے والی مشترکہ تہذیب کی تقسیم سے برصغیر کے انسانوں کی زندگی میں جو زہر گھلا اور مقدس انسانی رشتوں پر جو ضرب لگی اسکی اذیت بار بار انھیں اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ شاید نفسیاتی سطح پر یہ دونوں پہلو ایک دوسرے کا جواز پیش کرتے ہیں۔

"ڈالن والا' کی واحد متکلم وہ خود ہیں۔ یہ ان کے بچپن کے دہرہ دون کے سول لائنس علاقہ کی زندگی کا مرقع ہے۔ بچپن کے جو نقوش تلخ و شیریں یادوں کی شکل میں ان کے حافظہ میں محفوظ تھے وہ سب مل کر ایک فضا ایک کہانی بن گئے ہیں۔ ڈائنا بیکٹ، سائمن اور ڈاکٹر زبیدہ ہی نہیں' اس میں نیگس (کتا) اور ریشم (بلی) بھی ایسے منفرد کرداروں کی حیثیت اختیار کرلیتے ہیں' جن سے قاری کو دوستوں کی طرح دلچسپی اور ہمدردی پیدا ہوجاتی ہے۔ اور پھر 'ڈالن والا' کی یہ ساری متحرک اور زندہ فضا ایک دوسری کہانی 'یاد کی اک دھنک جلے' میں اس طرح ابھرتی ہے۔

> "شام کو میں نامرچا کو ڈالن والا کی خاموش اور معطر سڑکوں پر چہل قدمی کے لئے لے جاتی اور ایک مستعد گائیڈ کی طرح اپنے نزدیک سارے اہم لینڈ مارک ان کو دکھلاتی جاتی' اپنے واقف کار کتوں' بلیوں' اور پرندوں سے اُن کا تعارف کراتی' اور آس پاس کے مکانوں کے متعلق بے حد اہم اطلاعات انھیں فراہم کرتی۔ 'دیکھئے چچا وہ یوکلپٹس کے پیڑ ہیں نا ان کے پیچھے ہماری دوست رہتی ہے..... اور چچا وہ پلیا پر انگریز کھڑا ہے نا وہ سخت سنکی ہے" وغیرہ وغیرہ

'ڈالن والا' ان ہی یادوں کا زیادہ تفصیلی' زیادہ مکمل' اور موثر خاکہ ہے۔ اس خاکہ میں پہاڑی نوکر فقیرا اور اسکی بھاوج جل دھرا کے نقوش ایسی ہمدردی اور مہارت سے بنائے گئے ہیں کہ ان کو بھلانا آسان نہیں۔

"جلاوطن"' "ہاؤسنگ سوسائٹی" "قلندر" اور "یت جھڑ کی آواز" میں تقسیم کے قبل اور تقسیم کے بعد' دونوں ادوار کی زندگی کا احاطہ کیا گیا ہے۔ یہ ایسے افراد کی کہانیاں ہیں جنھوں نے متحدہ ہندوستان میں آنکھیں کھولی ہیں۔ مشترکہ تہذیب کے آغوش میں تربیت پائی ہے' انھوں نے مل کر غلامی کی صعوبتیں سہیں۔ ملک کی آزادی' خوش حالی' امن اور روحانیت کے مشترکہ خواب دیکھے لیکن ملک کی تقسیم کے بعد ان خوابوں کی شکست سے ان کی روح پر جو کچھ بیتی' قرۃ العین ان کہانیوں میں اس باطنی اذیت

AGONY OF THE SELF کے مختلف گوشوں کو گرفت میں لانے کی کوشش کرتی ہیں۔

'ہاؤسنگ سوسائٹی' اس مجموعہ کی ایک شاہکار تخلیق ہے جس میں قرۃ العین نے پاکستان کے نئے سرمایہ دارانہ معاشرہ کے طبقاتی کردار کا مطالعہ قریب سے کیا ہے۔ اس ناولٹ کا ایک اہم کردار سلمان ایک موقع پر کہتا ہے۔

"جس نظام نے اس مذہبی عصبیت کو جنم دیا، اسی عصبیت کے ہاتھوں
اس سلطنت کے محل جلائے گئے ...... ماضی کی محل سرائیں جل کر
راکھ ہو گئیں، مگر ابھی اس طبقہ کی بنیادوں پر دو نئی طاقتیں نئی بورژوازی
کے نئے محل کھڑے ہو رہے ہیں، کل کے جاگیردار کی جگہ آج کا سرمایہ دار حاصل
کرے گا۔ ہماری اصل جدوجہد کا آغاز آج سے ہوتا ہے"

مدت بعد کراچی کے 'جمشید ہاؤس' کی الف لیلوی ضیافت میں اسکی محبوبہ ثریا اس کے یہ الفاظ پھر یاد کرتی ہے۔ جمشید — جو سلطان پور کے ایک گاؤں کے ایک معمولی کاشتکار کا بھتیجا اور بے روزگار باپ کا بیٹا تھا، مہاجر کی حیثیت سے کراچی پہنچ کر دیکھتے ہی دیکھتے سرمایہ دار بن جاتا ہے اور بورژوا طبقہ کی عیاریوں کی نقاب پہن کر اپنی پچھلی حیثیت کو چھپاتا ہے، وہ خود کہتا ہے کہ۔

"آج کی دنیا ایک عظیم الشان بلیک مارکیٹ ہے، جس میں ذہنوں، دماغوں
دلوں اور روحوں کی اعلیٰ پیمانے پر خرید و فروخت ہوتی ہے۔ بڑے بڑے
فنکار، دانشور، عینیت پسند اور خدا پرست میں نے اس چور بازار میں
بکتے دیکھے ہیں، میں خود اکثر ان کی خرید و فروخت کرتا ہوں"

دوسری جانب اعلیٰ طبقہ کے ایک خاندان اور الہ آباد کے 'قیصر سلطان' کا چشم و چراغ سلمان اپنے طبقہ کے سارے 'مفادات' اسکی نفسیات سے دست بردار ہو کر ایک سچا انقلابی بن جاتا ہے۔ قرۃ العین دکھاتی ہیں کہ وہ دنیا سے سمجھوتہ نہیں کرتا، کوئی اسے خرید نہیں پاتا، یہاں تک کہ عزم و استقامت کا یہ پیکر اپنے خوابوں کو سینے سے لگائے کراچی کے ایک زنداں میں دم توڑ دیتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس طرح IRONY OF TIME دکھا کر اور ناولٹ کے آخری حصہ میں ڈرامائی منظر پیدا کر کے کیا قرۃ العین نے حقیقت کی دیانتدارانہ تلاش کا حق ادا کیا ہے۔ میں نہیں کہتا کہ فیوڈل نظام کے خاتمے اور سرمایہ دارانہ نظام کی تشکیل کے عبوری دور میں ایسے اتفاقات نہیں ہوتے کہ ایک معمولی کسان سرمایہ دار بن جائے اور اعلیٰ طبقہ کا ایک فرد کسانوں اور مزدوروں کا سچا رہنما۔ بے شک ایسا بھی ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی اس حقیقت کو نظر انداز کرنا مشکل ہے کہ طبقاتی سماج کی پیچیدہ حقیقتوں کو سمجھنے اور سمجھانے میں اتفاقی حادثے نہیں بلکہ سماجی ارتقا کے ضابطے ہی صحیح رہبری کرتے ہیں۔

نسبتہً مختصر کہانیوں میں 'قلندر'، 'کارمن' اور 'پت جھڑ کی آواز' کا ذکر ضروری ہے جو دراصل کسی ایک سیرت کے گہرے اور موثر خاکے ہیں۔ 'قلندر' میں اقبال بخت کا کردار ہندوستان کی مشترکہ تہذیب اور اسکی اقدار کی علامت ہے۔ 'کارمن' کے کردار [illegible]

مصنف نے ان ہی قصوں کو دریافت کیا ہے جو اقبال بخت کی سیرت میں مضمر ہیں۔ روح کی معصومیت، محبت، جذبۂ ایثار و خدمت اور وفاداری لیکن پاکستانی تحریک ان کے خمیر کے اجزا ہیں۔ کردار میں ہی اقدار و اوصاف 'یاد کی ایک دھنک جلے' میں ہمیں کرسٹی کے کردار میں ملتے ہیں، لیکن 'پت جھڑ کی آواز' اس کے برعکس ایک معصوم لیکن بے چین اور باغی روح کی المیہ روداد ہے۔ یہ سارے کردار ہمیں ہمدردی، لگن اور مہارت سے تراشے گئے ہیں کہ قاری انھیں بھول کر بھی بھلا نہیں پاتا۔

قرۃ العین نے اپنی مخصوص ٹیکنیک اور منفرد اسٹائل سے افسانے کے آرٹ کو بہت وسیع اور متنوع کر دیا ہے۔ تلازمۂ خیال یا تجاذب کے استعمال سے وہ کہانی میں بے شمار واقعات، اشخاص اور مناظر یکجا کر دیتی ہیں۔ ایک مخصوص نظام میں عقیدوں کا تصادم قدروں کی آویزش، طبقاتی مفادات کی جنگ، انسان کی باطنی کشاکش، اس کی تہ در تہ نفسیات کے اسرار سب ان کی کہانی کی فضا میں سمٹ آتے ہیں۔ اس کی کثرت آرائی میں وحدت اور دلچسپی وہ زندہ نقوش اور ایک مانوس فضا کی تخلیق سے پیدا کرتی ہیں۔ شگفتگیٔ بیان اور لطیف طنز و مزاح سے بھی قاری کی دلچسپی میں اضافہ ہوتا ہے۔ تاہم کبھی کبھی ان کے افسانہ میں قاری کو الجھن بھی ہوتی ہے۔ وہ واقعات اور اسباب و علل کے سلسلہ کو آسانی سے جوڑ نہیں پاتا۔ کہانی ختم کر کے وہ اپنے تصور کی زبان سے کہانی کو دہرا نہیں پاتا۔ اشخاص اور نقوش جو کہانی پڑھتے ہوئے حقیقی اور جاندار معلوم ہوتے تھے، بڑی سرعت سے دھندلانے لگتے ہیں۔ صرف چند کہانیوں کے چند کردار ہی پوری شدت اور قوت سے ذہن میں محفوظ رہتے ہیں۔ ان کی کہانیوں میں اشخاص اور فضا کی مشابہت اور یکسانیت بھی قاری کو اکثر محسوس ہو جاتی ہے۔ لیکن ان چند کوتاہیوں سے قطع نظر یہ مجموعہ قرۃ العین کے ارتقا پذیر فن کا نمائندہ ہے۔ اگر اس میں ستیا ہرن بھی شامل ہوتا تو اس کی قدر و قیمت میں اضافہ ہو جاتا۔

—— قمر رئیس

Statement about ownership and other particulars about Newspaper, Guftugu Quarterly.

FORM IV

1. Place of Publication	:	20, Khetan Bhavan, J. Tata Road, Bombay 1.
2. Periodicity of its publication	:	Quarterly.
3. Printer's Name	:	Ali Sardar Jafri,
Nationality	:	Indian.
Address	:	10, Seeta Mahal, Bomanji Petit Rd., Bombay 26.
4. Publisher's Name	:	Ali Sardar Jafri
Nationality	:	Indian.
Address	:	10, Seeta Mahal, Bomanji Petit Rd., Bombay 28.
5. Editor's Name	:	Ali Sardar Jafri,
Nationality	:	Indian.
Address	:	10, Seeta Mahal, Bomanji Petit Rd., Bombay 26.
6. Names and addresses of individuals who own the newspaper and partners or share holders holding more than one per cent total capital.		Ali Sardar Jafri, 10, Seeta Mahal, Bomanji Petit Rd., Bombay 28.

I Ali Sardar Jafri, hereby declare that the particulars given above are true to the best of my knowledge and belief.

Date: *1-2-68*. *Signature*: Ali Sardar Jafri.

Together, let us fight the calar

گفتگو

ادب اور تہذیب کا باشعور ترجمان ہے۔

اس میں لکھنے والے وہ ترقی پسند ادیب ہیں، جنہوں نے نئی راہوں سے نئی منزلوں کی طرف سفر کیا ہے۔ ان پر جدید اُردو ادب کو بجا طور سے ناز ہے اور ان کی تخلیقات دنیا کے بہترین ادب سے آنکھیں ملا سکتی ہیں۔

اِس میں لکھنے والے وہ بزرگ ادیب ہیں، جو اپنے نام کے ساتھ کسی صفت کا اضافہ پسند نہیں کرتے، لیکن انسانیت کی اعلیٰ قدروں، زندگی کے حسن اور تہذیب کی لطافت پر ایمان رکھتے ہیں۔ اُن کی تحریریں اُردو ادب کی آبرو ہیں۔

اس میں لکھنے والے وہ جدید تر ادیب ہیں، جو تذبذب، تشکیک اور بے دلی کی نیم تاریک، نیم روشن فضاؤں سے گزر رہے ہیں۔ اگر وہ پُرانی اقدار سے مایوس ہیں تو یقیناً اُن کے دل میں نئی اقدار کی روشنی موجود ہے اور ایک نہ ایک دن وہ اس روشنی کو تلاش کرلیں گے۔ اُردو ادب کا مستقبل اُن کے وجود سے تابناک ہے۔

Registered with the Registerar of Newspapers No. R.N. 14078/67